حیدرآباد دکن

کی

تاریخ احمدیت

ابتداء سے موجودہ دور تک

جلد اوّل

مؤلفہ

سید جہانگیر علی

نام کتاب : تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن (جلد اول)
مؤلف : سید جہانگیر علی (فلک نما حیدرآباد)
سنِ اشاعت : 2009ء
تعداد : 1000
ناشران : سید جہانگیر علی آئنڈ سنز
50-2-18 فلک نما حیدرآباد 500053-(A.P.)
مطبع : پرنٹ ویل پریس امرتسر

فہرست عنوانات تاریخ احمدیت حیدرآباد

☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریمؐ وعلی عبدہ المسیح الموعودؑ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو الناصر

عرضِ حال

بعض حالات اور واقعات' اتفاقات کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ نومبر 1996ء کا سال تھا ۔ احمدیہ مسجد افضل گنج میں خاکسار کی نگرانی میں وقارِعمل ہو رہا تھا بہت سے پرانے اخبارات کو اکٹھا کردیا گیا تھا ۔ میری نظر ایک پرانے اخبار پر پڑی یہ الحکم 1924ء کا شمارہ تھا۔ میں نے اس کو پڑھا ۔ اس کا ایک مضمون بعنوان حیدرآباد دکن میں احمدیت کا شیوع (داخلہ) جو حضرت مولانا ابوالحمید آزادؓ ایڈوکیٹ کا لکھا ہوا تھا ۔ جو حضرت مسیح موعودؑ کے تین سو تیرہ صحابہ میں سے ایک اور جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن کے دوسرے امیر جماعت تھے ۔ مضمون مختصر تھا ۔ اس میں حیدرآباد دکن کے اولین احمدیوں کا ذکر تھا ۔ اس وقت اخبار الحکم کے ایڈیٹر حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ تھے انہیں کی تحریک پر حضرت ابوالحمید آزادؓ صاحب نے یہ مضمون لکھا تھا ۔ مضمون پر ایڈیٹر صاحب الحکم نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس مضمون سے حیدرآباد دکن میں اشاعت احمدیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے مضمون مختصر ہے اور لاریب اس مختصر مضمون میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی ۔ اس میں اس بات کی وضاحت تھی کہ تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن' نہایت شاندار اور جماعت احمدیہ حیدرآباد کے کارنامے بہت نمایاں ہیں ۔ ''میں حیدرآباد کی تاریخ مرتب کروں گا ۔ انشاء اللہ زندگی نے ان کو اس کام کی مہلت نہیں دی اور وہ 1957ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے ۔

اُس وقت حیدرآباد میں کئی قدآور شخصیتیں موجود تھیں جو اس موضوع پر لکھ سکتی تھیں اور

یہ لوگ کوشش بھی کررہے تھے کہ حیدرآباد دکن کی تاریخ احمدیت وہ مرتب کریں ۔ برملا اِسکا اظہار
اپنی نجی محفلوں میں اور جلسوں میں کرتے تھے اس زمانہ میں بعض پرانے بزرگ بھی بقید حیات تھے ۔
اس کے باوجود نہ معلوم کیوں ان احباب نے ہمت نہیں فرمائی اور نہ ہی جمع کیا ہوا مواد استعمال کیا
چنانچہ ان میں سے ایک دوست ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے اور دوسرے وفات پا چکے ہیں ۔

چونکہ حیدرآباد کی تاریخ مرتب کرنے کی تحریک حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ
نے کی تھی اور میرے ذہن میں ان کے بعض جملوں سے تحریک پیدا ہوئی ۔ خاکسار کو ذاتی طور پر
تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن کے موضوع سے دلچسپی تھی 1996ء کے بعد سے میری یہ مسلسل
کوشش رہی اور ان دوستوں سے ملتا رہا اور تحریک بھی کرتا تھا اور ساتھ ہی اپنی خدمات کی پیش کش
کرتا رہا مگر معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا ۔ میرے قریبی دوست مکرم میر احمد صادق صاحب جن کے
متعلق مجھے وثوق تھا کہ یہ صاحب اس عظیم کام کو انجام دے سکیں گے ان کے پاس اس موضوع پر
بہت سا مواد اکٹھا تھا وہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے امریکہ چلے گئے ۔ جب بھی وہ حیدرآباد
آتے میں ان کو یاد دہانی کرواتا رہتا تھا ۔ اس عظیم کام کے لئے اپنی خدمات بھی ان کو پیش کی تھیں
افسوس ان کا بھی 2003ء میں بمقام شکاگو امریکہ انتقال ہوگیا ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

اکتوبر 2003ء میں خاکسار اپنے بھائی ڈاکٹر سید جعفر علی صاحب M.D سے ملنے
امریکہ گیا ۔ واپسی کے دوران اپنے بھانجوں سے جو شکاگو میں مقیم ہیں ان کے پاس جا کر واپسی
ہوئی ۔ ائیر پورٹ جانے کے راستہ پر سڑک کے کنارے میرے بھانجے نے ایک قبرستان کے
باہر اپنی کار روک کر مجھے بتایا کہ اس قبرستان میں میر احمد صادق صاحب مدفون ہیں چونکہ فلائٹ کا
وقت تنگ تھا قبرستان میں جانے کے لئے وقت نہیں تھا ۔ کار سے اُتر کر میں نے وہیں سے ان
کے لئے دعا کی ۔ دوران دعا مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی ۔ جو ناقابل بیان ہے ۔ محسوس
ہوا کہ یہ اہم کام ہمارے پیش رو نہ معلوم کن حالات میں ادھورا چھوڑ گئے ہیں میں نے اللہ تعالیٰ

سے دعا کی اور عزم کیا کہ جو کچھ مواد میں نے جمع کیا ہے ۔ اس کو ترتیب دے کر شائع کردوں ۔
چنانچہ میں نے یہ کام اللہ کا نام لیکر شروع کردیا ۔ میری کوشش یہ رہی کہ تاریخ احمدیت حیدرآباد
دکن کے ناقابل فراموش تاریخی واقعات ضبط تحریر میں لے آؤں اور ایک مستند تاریخ نئی نسل کے
لئے مرتب کردوں لیکن اپنی کم علمی اور ناامیدی کی کشمکش میں دن گزرتے گئے ۔ چنانچہ 2003ء
سے لیکر 2005ء کے جلسہ سالانہ قادیان تک یہی کیفیت رہی ۔ جلسہ سالانہ قادیان کے اختتام پر
حضور اقدس خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ۔
خاکسار نے حیدرآباد دکن کی تاریخ احمدیت مرتب کرنے کی کوششوں کا ذکر اختصار کے ساتھ حضور
انور کی خدمت میں کیا ۔ حضور انور نے خوشنودی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں دعا کروں گا ۔
اب میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ جلسہ سے واپسی کے فوراً بعد یہ کام شروع کروں گا ۔ مگر واپسی جلسہ
کے بعد ماہ جنوری 2006ء میں مختلف عوارض میں مبتلا رہا اور یہ علالت چھ ماہ تک برقرار رہی ۔
دوران علالت دعائیں کرتا رہا کہ پروردگار مجھے تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن کا کام مکمل کرنے کی
مہلت عطا فرما ۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعائیں سن لیں ۔ اور اس لمبی علالت کے بعد صحت یابی ہوئی

مجھے اس تاریخ کو مرتب کرنے کی بعض تحریکوں کے علاوہ بڑی تحریک یہ رہی کہ ہمارے
خلفاء نے اپنے ماضی کو دہرانے کے متعلق مختلف اوقات میں ارشادات فرمائے ہیں کہ اپنی تاریخ
سے واقفیت کے لئے اور نوجوان نسل کی تربیت کیلئے اپنی تاریخ کو یاد رکھنے کی اور اس کو دہرانے
کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ارشاد فرمایا تھا کہ لوگوں کو اپنی خاندانی نیک
روایات اور کارناموں کو یاد رکھنا چاہئے اور اپنے بچوں کو سنانا چاہئے اس طرح قومیں زندہ رہتی
ہیں ۔ اگر خاندانوں میں قابل ذکر واقعات نہ ہوں تو اُن پر اِسلام نے ایک اور احسان کیا ہے کہ
تمام اسلام کے بزرگ ان کے بھی بزرگ ہیں ان کے کارناموں اور روایات کو یاد رکھیں اور ان کا

تذکرہ نئی نسل کے سامنے کرتے رہیں کیونکہ اسلام کے تمام بزرگ اور ہیرو ان کے بھی بزرگ ہیں اور اُن کے بھی ہیرو ہیں (رفیق نکتہ داں صفحہ ۱۸ مصنفہ)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ مزید فرماتے ہیں کہ جب کل کا مسلمان تاریخ کے آئینہ میں یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ماں باپ ہمالیہ پہاڑ سے بھی اونچے قدموں والے تھے کہ آسمان بھی ان کے دبدبے سے کانپتا تھا۔ تو بہادر اور ہمت والا انسان اس آئینہ کو اٹھاتا ہے کہ وہاں میرے آباء واجداد اگر چٹان تھے۔ تو میں بھی چٹان بن کر رہوں گا۔ اور اگر وہ طوفان تھے تو میں بھی ان سے اونچا طوفان بنوں گا۔ اگر وہ سمندر کی لہروں کی طرح اٹھتے تھے تو میں بھی ان سے اونچا اٹھوں گا
(صد سالہ تاریخ احمدیت صفحہ ۸ مصنفہ)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا بھی ارشاد ہے کہ تاریخ کو جاننا، خصوصاً اپنی تاریخ کا جاننا ہم سب کے لئے ضروری ہے کیونکہ انسان کی اور کسی جماعت کی زندگی اپنے ماضی سے کلیتاً منقطع نہیں ہوتی۔ مجھے احساس ہے کہ بہت سے احمدی شہروں میں سلسلہ کی تاریخ اور حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ کے واقعات دہرائے نہیں جاتے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی کتب میں بعض جگہ ان واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔ ان واقعات کو بچوں کے سامنے دہرانا چاہئے۔ ہماری یہ نامور تاریخ ایک کامیاب تاریخ ہے (الفضل ۱۰/جنوری ۱۹۷۶ء)

حیدرآباد دکن کی تاریخ احمدیت کی تالیف کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہماری نئی نسل کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے آبا و اجداد اور ان کے بزرگان کی تاریخ کتنی شاندار ہے کیونکہ آج کل کی نوجوان نسل اپنے ماضی کو بھول رہی ہے اس تالیف سے انشاء اللہ ہمارا مقصد ضرور پورا ہوگا۔ اور بزرگان کے حالات ایک جگہ جمع ہوجائیں گے۔ خاکسار کی یہ کوشش تھی کہ کوئی ایسی خدمت کرجاؤں جو یادگار رہے اور بزرگوں کی دعائیں پہنچتی رہیں۔ بادی النظر میں تو یہ کام آسان معلوم ہوتا تھا، مگر جب قلم اٹھایا تو کئی مشکلات کا سامنا ہوا۔ کیونکہ اس موضوع پر پہلے سے کوئی

کتاب یا کوئی مواد موجود نہ تھا کسی بزرگ نے بھی یہ کام انجام نہیں دیا تھا۔ یہ کام میرے لئے نیا تھا۔ نیز مرحوم احمدی بزرگوں اور ریاستی صحابہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بڑی تگ ودو کرنی پڑی۔ مگر ان موانعات اور مشکلات کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور دعاؤں کے ساتھ کوشش جاری رکھی اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی مختلف ذرائع اور وسائل اور لمبے عرصہ کی محنت اور عرق ریزی اور صرفہ سے جو حالات میسر ہوئے وہ افادہ عام کی غرض سے کتاب کی شکل میں احباب کرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہوگئے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے پاس جو تاریخی اور قلمی تحریرات تھیں ان سے بھی استفادہ کیا گیا، اس طرح حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک کے بزرگوں اور ریاستی صحابہ کے حالات کا بڑا حصہ محفوظ ہوگیا۔ الحمدللہ۔

اس وقت بھی ان وفات یافتہ بزرگوں کے حالات معلوم کرنے میں مشکلات اور دقتیں پیش آئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ حالات محفوظ نہ کئے جاتے تو نہ معلوم بعد میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

تاریخ کا کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بقایا کام کوئی اور بھی انجام دے سکے گا۔ مگر ان حالات سے جو اس تاریخ میں محفوظ ہوگئے ہیں آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک بنیاد قائم ہوگئی ہے اور سلسلہ عالیہ احمدیہ دکن کی تاریخ کا کثیر اہم حصہ محفوظ ہوگیا ہے۔ اور ضائع ہونے سے بچ گیا جو تبلیغ اور تربیت کے میدان میں کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔

ہم نے بعض صحابہ کے حالات اور بعض احباب کے حالات مفصل اور بعض کے مختصر درج کئے ہیں اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جن کے حالات مفصل ہیں وہ مختصر حالات والوں سے افضل ہیں بلکہ ممکن ہے کہ جن کے حالات مختصر ہیں وہ مفصل حالات والوں سے خدا تعالیٰ کے نزدیک بہتر ہوں۔

دراصل جن کے حالات ہمیں مفصل مل سکے ان کے مفصل اور جن کے مختصر مل سکے ان

کے مختصر لکھے گئے۔ اس میں ہماری طرف سے کمی یا زیادتی نہیں کی گئی۔ تاریخوں میں اکثر حصہ روایات پر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں انسان سے سہو بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کہیں تاریخی حالات کے بیان کرنے میں سہو یا غلطی سرزد ہوئی ہو۔ جس کے لئے ہم اول اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہیں دوسرے احباب سے گذارش ہے کہ بھول چوک کے لئے ہمیں معاف فرمائیں اور مطلع فرمائیں تا کہ دوسرے ایڈیشن میں تصحیح ہوسکے۔ چونکہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے اس خیال سے کہ میرے پاس تاریخ احمدیت دکن کی جو جماعتی امانت ہے اسے شائع کر کے اس کام سے سبکدوش ہو جاؤں' احباب کی طرف سے جو حالات بروقت موصول نہ ہوسکے وہ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں شامل ہوسکیں گے۔ میرے ایک دوست احمد عبدالحمید صاحب جو اس وقت واشنگٹن امریکہ میں مقیم ہیں چند سال قبل حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ تو میں نے ان سے برسبیل تذکرہ عرض کیا تھا کہ میرے پاس تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن کا کچھ مواد جمع ہے۔ اس پر انہوں نے بمقام بنجارہ ہلز مجھے کھانے کی دعوت پر مدعو کیا۔ دعوت میں شرکت کے وقت میں نے جو مواد تاریخ احمدیت دکن کے متعلق اکٹھا کیا تھا ان کو دکھلایا۔ کھانے کے بعد تقریباً تین گھنٹہ تک بڑے غور اور انہماک کے ساتھ انہوں نے مواد کا جائزہ لیا۔ جائزہ لینے کے بعد ان کا یہ تاثر تھا کہ جو کچھ مواد تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن کا آپ کے پاس اکٹھا ہے اس کو فوراً شائع کر دینا چاہئے۔
اور ساتھ ہی انہوں نے میری ہمت افزائی کی اور میرے اس کام کو سراہا اور بار بار یہی مشورہ دیا کہ اس مواد کو فوراً شائع کر دیا جائے اور وعدہ کیا کہ وہ امریکہ جا کر میر احمد صادق صاحب کے لڑکے میر احمد ناصر صاحب سے ربط قائم کر کے جو کچھ مواد بھی تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن کے متعلق ان کے پاس موجود ہوگا وہ اُس مواد کو لیکر میرے پاس روانہ کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے میر ناصر احمد صاحب کے خسر خواجہ عبدالوحید صاحب انصاری سے جو اس وقت شکاگو میں اپنی بیٹی داماد کے پاس مقیم ہیں' تاریخ احمدیہ حیدرآباد دکن سے متعلق کچھ مواد حاصل کر کے مجھے روانہ کر دیا۔

اس طرح عنوانات کی ترتیب میں انہوں نے میری بہت مدد کی۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

میرے ایک دوست جو طباعت کے کام میں مہارت رکھتے ہیں انہوں نے بھی میری رہنمائی کی ان ہی کی کوششوں کی وجہ سے DTP کا کام آگے بڑھ سکا۔ انہوں نے پروف ریڈنگ' عنوانات اور مضامین کی ترتیب میں میری بہت مدد کی۔ اسی طرح خواجہ عبدالحمید انصاری صاحب نے بھی پروف ریڈنگ وغیرہ میں میری مدد فرمائی سب سے زیادہ میں مکرم ومحترم مولانا محمد انعام صاحب غوری ناظر اعلیٰ و امیر مقامی قادیان ہیں اُن کا ممنون ہوں کہ باوجود اپنی بے پناہ مصروفیت کے اس تاریخ کے کئی سو صفحات کو نہایت باریک بینی اور عرق ریزی کے ساتھ ملاحظہ فرمایا۔ اور ایک طویل خط سے اپنے بیش بہا مشوروں سے نوازا۔

تاریخ احمدیت دکن کے عنوانات اور ترتیب میں ان کے قیمتی مشورے بہت مفید ثابت ہوئے اور کتاب میں دلچسپی اور تسلسل برقرار رہا اللہ تعالیٰ ان کو اسکا اجر عظیم عطا کرے۔ صاحبزادہ حضرت مرزا وسیم احمد صاحب مرحوم ومغفور اپنی وفات سے چند ماہ قبل حیدرآباد تشریف لائے تھے ۔ عنوانات پڑھکر اور مسودے پر سرسری نظر ڈال کر میری کاوشوں کو سراہا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے چند ماہ بعد ان کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ مکرم حافظ صالح محمد الہٰ دین صاحب صدر صدر انجمن احمدیہ قادیان نے بھی میری بہت ہمت افزائی فرمائی اور اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے نوازا اسی طرح میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید جعفر علی صاحب نے بھی میری ہمت افزائی فرمائی۔ اور جلد از جلد اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا مشورہ دیتے رہے۔ میں مکرم فاروق احمد صاحب گنائی معلم وقف جدید بیرون کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ اس نوجوان نے مسودے کی تدوین میں اور لکھنے میں بہت مدد کی اور آخر میں میں محترم سید وسیم احمد صاحب تیماپوری منیجر فضل عمر پرنٹنگ پریس قادیان نے کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب کی اشاعت کی منظوری ومسودہ کی تصحیح چھپائی میں تعاون فرمایا۔

اللہ تعالیٰ تمام احباب کو جو اس کام میں م... معاون رہے ہیں اجرِ عظیم عطاء فرمائے آمین ۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ چند مبلغین ...رات کی مختصر سوانح اور حالات نہ مل سکے' ان کے نام فہرست میں شامل کر دیئے گئے ہیں اسی طرح قائدین خدام الاحمدیہ صدور صاحبان اور امراء صاحبان کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے اور جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن میں پانچ ہزاری مجاہدین تحریک جدید کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔

مکرم ومحترم جناب محمد انعام غوری صاحب نے یہ وضاحت چاہی تھی کہ مکرم حضرت سید محمد رضوی صاحبؓ جو حضرت مسیح موعودؑ کے تین سو تیرہ صحابہ میں شامل ہیں ان کی سوانح میں سوانح نگار نے پہلی بیعت حیدرآباد دکن میں میر عرفان علی صاحب کی تحریر کی تھی ۔ خاکسار تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ پہلی بیعت میر محمد سعید صاحبؓ نے کی تھی احمدیہ لٹریچر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت ابوالحمید صاحبؓ دوسرے امیر جماعت کے مضمون حیدرآباد دکن میں احمدیت کا شیوع میں بھی میر عرفان علی صاحب کا ذکر نہیں ہے چنانچہ اس زمانہ کے چودہ (۱۴)' پندرہ (۱۵) یا اس سے زیادہ احباب میں میر عرفان علی صاحب کا کہیں بھی نام موجود نہیں ہے ۔ واللہ اعلم ۔

بعض احباب و دوستوں کے مشوروں کو مدنظر رکھ کر کہ حیدرآباد دکن کی چار سو سالہ تاریخ جو چودہ مسلم بادشاہوں پر مشتمل ہے' ان کے مختصر حالات اور دکن کی جغرافیہ بھی شامل ہو جائے تو مناسب ہے اس کے ساتھ حضرت مسیح موعودؑ اور ان کے پانچوں خلفاء کی مختصر سوانح شامل کرنا مناسب معلوم ہوا ۔ چنانچہ حیدرآباد دکن کی تاریخ احمدیت کو مرتب کرنے میں اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے ۔ نیز آخر میں چند مخلص احمدیوں کے حالات اور چند ابتدائی جماعتوں کے قیام کی تفصیلات جن میں عثمان آباد دیودرگ شامل کئے گئے ہیں البتہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس اورنگ آباد ،ناندیڑ، بیڑ، رائچور، محبوب نگر، ظہیر آباد، تماپور، گلبرگہ، شاہ پور وغیرہ میں سابق ریاست حیدرآباد

کن میں احمدیت کا نفوذ ہوگیا تھا اور جماعتیں قائم ہوگئی تھیں ۔ حیدرآباد میں پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء سے پہلے ورنگل اور اس کے مضافات میں بھی جماعتیں قائم ہوگئیں تھیں؛ جن میں موضع کنڈور تعلقہ رامنا پیٹ ضلع ورنگل کو خاص اہمیت حاصل ہے یہاں پر جماعت قائم کرنے کا سہرا مکرم سید حسین صاحب مدرس کے سر پر ہے جو کنڈور کے مدرسہ میں تعینات ہو کر آئے تھے ان کی تبلیغ سے سارے کا سارا گاؤں جو پانچ سو مسلم آبادی پر مشتمل تھا احمدی ہوگیا ۔ مکرم سید حسین صاحب جو مکرم عبداللہ صاحب BSc کے خالو تھے ۔ اُنہوں نے اپنا مکان بھی اور اس کے ساتھ ملحقہ زمین بھی جماعت کنڈور کو وقف کی تھی وہاں پر مرکزی فنڈ سے ابھی چند سال قبل ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے ۔ نیز وقفِ جدید بیرون کی کوششوں سے کنڈور کے اطراف کئی گاؤں بھی احمدیت میں شامل ہو چکے ہیں ۔ یہ بھی تاریخ کا ایک باب ہے انشاء اللہ توفیق ملی تو آئندہ ایڈیشن میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی ۔

کسی بھی قوم کی تاریخ میں کتب خانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ خاکسار حیدرآباد کی دو لائبریریوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے حیدرآباد دکن جوبلی بلڈنگ افضل گنج میں ایک عظیم الشان لائبریری قائم تھی جس کی نگرانی کے لئے مکرم عبدالعزیز صاحب تلاپوری کو اکبر یار جنگ بہادر نے تقرر کیا تھا ۔ افسوس کہ 1967ء میں بارش کی وجہ سے احمدیہ بلڈنگ کے منہدم ہو جانے سے اس لائبریری کی کتابیں مختلف دوست لیکر چلے گئے' کچھ کتابیں جو ضائع ہونے سے بچ گئی تھیں وہ موجود ہیں ۔ اس لائبریری کو سنٹرل لائبریری قادیان کے بعد نمایاں مقام حاصل تھا ۔ افسوس کہ انہدام جوبلی بلڈنگ کی وجہ سے یہ لائبریری ضائع ہوگئی ۔ اب حیدرآباد میں خاکسار نے تاریخ احمدیت کے مرتب کرنے کے دوران اور اس سے پہلے احمدیت پر مختلف اعتراضات وغیرہ کے جوابات دینے کے لئے احمدیہ لٹریچر اور خلفاء کرام کی کتابیں، اخبار بدر کی جلدیں جمع کرنے شروع کئے اس طرح احمدیہ لائبریری فلک نما کے نام سے ایک چھوٹی سی لائبریری جو تقریباً

چار ہزار کتابوں پر مشتمل ہے خاکسار نے رفتہ رفتہ قائم کی ہے۔اس میں تفاسیر احادیث' خلفاء احمدیہ کے خطبات پر مشتمل کتابیں اور دوسرے احمدی بزرگان کی لکھی ہوئی کتابیں جن میں حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ اور محترم ملک صلاح الدین صاحب مرحوم کی اصحاب احمدؑ کے نام سے جو لٹریچر انہوں نے چھاپا ہے اس کی تقریباً ساری کتابیں موجود ہیں اس طرح اردو ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اس لائبریری میں شامل ہے یہ لائبریری بھی حیدرآباد کی تاریخ دکن میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

اس تاریخی کتاب کو خاکسار اپنے والدِ بزرگوار غلام دستگیر صاحب مرحوم جن کے ذریعے خاکسار کے خاندان کو احمدیت کی نعمت نصیب ہوئی اور اپنی بزرگ والدہ ماجدہ جن سے خاکسار نے تربیت پائی' کے نام منسوب کرتا ہے تا کہ قارئین کرام ان کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل رکھیں۔

کتاب کا حجم بڑھتے بڑھتے ۷۰۰ صفحات کے قریب ہو چکا ہے۔اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ جلدوں میں شائع کر دیا جائے چنانچہ حصہ اول جو تقریباً ۴۷۵ صفحات پر مشتمل ہے شائع کیا جا رہا ہے تا کہ خلافت احمدیہ کی صد سالہ جوبلی کے اس تاریخی سال میں احباب جماعت کی خدمت میں کم از کم اس تاریخ کی پہلی جلد پیش کر دی جائے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور نافع الناس بنائے۔آمین۔

خاکسار طالب دُعا

سید جہانگیر علی

(سابق امیر جماعت احمد حیدرآباد و
حال قاضی سلسلہ عالیہ احمدیہ حیدرآباد)

آغاز پیغامِ احمدیت

مملکت آصفیہ حیدرآباد میں

حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ:-

ریاست حیدرآباد دکن میں احمدیت کی تاریخ پر میں نے حضرت مولوی ابوالحمید صاحب آزاد وکیل ہائی کورٹ و وظیفہ یاب سرکار عالی کو اس موضوع پر ایک مضمون لکھنے کی تحریک کی تھی انہوں نے ازراہ کرم ایک مضمون لکھا تھا اور میں نے ۱۹۲۴ء میں الحکم کے خاص نمبر کے لئے اظہار خیال کیا تھا کہ اس خصوص میں ایک تاریخ لکھوں گا۔کیا بعید کہ اللہ مجھے توفیق دیدے۔ میں اس مضمون کو اس لئے درج کر رہا ہوں کہ حیدرآباد میں احمدیت کے سابقون الاولون کا ذکر خیر ہو جائے۔

ابتدائی جماعت کے کارکن نہ صرف اپنی دنیوی حیثیت سے ممتاز تھے بلکہ وہ علوم دینیہ میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے اخلاص وایثار کے قابل رشک کارناموں کا تو کیا کہنا ہے۔

حضرت میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہٗ کو قادیان میں چھ ماہ کی اقامت کے لئے ہمارے بزرگوں نے اس مقصد سے بھیجا تھا کہ وہ وہاں رہ کر حضرت حکیم الامۃ کے درس اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انفاس قدسیہ سے راست فیض حاصل کر کے جماعت کو مستفید کریں۔اس سلسلہ میں حضرت آزادؓ کا مضمون حسب ذیل ہے۔

دنیا میں انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت ومجددین اور محدثین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ماموریت اسوقت ہوا کرتی ہے جب دنیا میں ضلالت کا طوفان اور گمراہی کی تیز وتند آندھیوں کا زور وشور ہوتا ہے۔ دنیا سے توحید باری تعالیٰ مٹنے کو ہوتی ہے اور تقویٰ وطہارت۔ امانت ودیانت مروّت وفتوت اور اطاعت لامراللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ کی جگہ؛ فسق وفجور۔ ظلم وجور ہوا وہوس۔ شرک و بدعت کا دریا موجزن ہوتا ہے قلوب انسانی مادہ پرستی اور دنیا طلبی کی طرف جھکے ہوتے ہیں اور گمراہی وضلالت اپنے انتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہے اور ظہر الفساد فی البر والبحر کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ایسے وقت میں غیرت الٰہی اپنی توحید کو پھیلانے اور رحمت باری اپنے بندوں کو درطۂ ضلالت وچاہ ہلاکت سے بچانے اور نکالنے کے واسطے تقاضا کرتی ہے اور جوش مارتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس شخص کو جس میں پیغام حق پہنچانے کا مادہ اور اصلاح خلق کی استعداد دیکھتا اور پاتا ہے چن لیتا ہے۔ اور اس کو حسب تقاضا ومصلحتِ وقت خلعتِ رسالت ونبوت یا حلۂ مجددیت ومحدثیت سے آراستہ وپیراستہ کرکے دنیا کی اصلاح وہدایت اور اپنے بندوں کی فلاح وبہبود کے واسطے مبعوث ومامور کرتا ہے۔

یادرہے کہ دنیا کے فسادات فتن کے وقت جب کوئی مصلح آتا ہے تو اس کے ظہور کے وقت آسمان سے ایک نورانیت کا انتشار ہوتا ہے۔ اس کے اترنے کے ساتھ زمین پر ایک نور بھی اترتا ہے اور مستعد دلوں پر نازل ہوتا ہے اس وقت دنیا خود بخود بشرط استعداد نیکی اور سعادت کی طرف رغبت کرتی ہے اور ہر ایک دل تدقیق وتحقیق کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور نامعلوم اسباب سے طلب حق کے لئے ہر ایک طبیعت مستعدہ میں ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے غرض ایک ایسی ہوا چلتی ہے جو مستعد دلوں کو آخرت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور سوئی ہوئی قوتوں کو جگادیتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زمانہ ایک انقلاب عظیم کی طرف حرکت کررہا ہے۔ یہ علامتیں اس بات پر شاہد ہوتی ہیں کہ وہ مصلح دنیا میں پیدا ہوگیا۔ پھر جس قدر آنے والا عظیم الشان ہو یہ تحریکات غیبی قوت کے ساتھ مستعد دلوں میں اپنا کام کرتی ہیں۔ ہر ایک سعید الفطرت جاگ اٹھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کو کس نے جگایا اور ہر ایک صحیح الجبلت اپنے اندر تبدیلی پاتا ہے اور نہیں معلوم کرسکتا کہ یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی۔

غرض ایک تحریک دلوں میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اور نادان خیال کرتے ہیں یہ جنبش خود بخود پیدا ہوگئی ہے لیکن درپردہ ایک رسول (یا مجدد یا محدث) کے ساتھ انوار نازل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ القدر میں اس کو بتایا ہے۔

چونکہ حضرت اقدس جری اللہ فی حلل الانبیاء علیہ وعلیٰ صاحبہ تحیۃ والثناء منصۂ شہود پر جلوہ فرما چکے تھے۔ اسی سنت اللہ کے بموجب جو اوپر بیان ہوئی ہے ضروری تھا کہ بلدہ حیدرآباد اور اس کے اضلاع میں بھی اس نورانیت کا انتشار پیدا ہوتا۔ جو ہوکر رہا یہ زمانہ تصنیف براہین احمدیہ اور اس کے طبع کے سوال کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں کاتب الحروف اور اخویم سرمردان علی صاحب مرحوم مددگار دفتر صدر محاسبی سرکار عالی اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب مرحوم وکیل ہائیکورٹ اور مولوی مرزا صادق علی بیگ صاحب مرحوم استاد وملازم نواب سروقار الامراء بہادر مدار المہام سرکار عالی ریاست حیدرآباد دکن کی ایک صحبت اخویم مولوی ظہور علی صاحب کے مکان واقع محبوب گنج متصل افضل گنج پر ہوا کرتی تھی اسی زمانے میں طبع براہین احمدیہ کا اشتہار ہم لوگوں کو ملا مگر یہ یاد نہیں کہ کس ذریعہ سے یہ ہم تک پہنچا۔ اس اشتہار سے ہم لوگوں میں تحریک پیدا ہوئی کہ اس کتاب کی طباعت میں کوشش کرنی چاہئے چنانچہ مرزا صادق بیگ صاحب مرحوم نے مناسب وقت پر اس کا تذکرہ نواب سروقار الامراء بہادر مرحوم سے کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنی جیب خاص سے ایک سو روپیہ عنایت فرمایا۔

مجھے جہاں تک یاد ہے ''براہین احمدیہ'' کے پہلے ایڈیشن میں خود حضرت اقدس علیہ السلام نے اس کا ذکر فرمایا ہے یہ ایڈیشن اب میرے پاس نہیں ہے۔

جب براہین احمدیہ کی وہ جلد چھپ کر آئی جس کے ساتھ دس ہزار روپے کا انعام کا اشتہار ہے اور ہم لوگوں نے جب اسے پڑھا تو ہمارے قلوب کی جو حالت اس کو پڑھنے سے ہوئی اس کا بہتر علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اس کے بعد رسالہ جات فتح اسلام اور توضیح المرام بھی ہم نے پڑھے جس میں حضرت اقدس علیہ السلام نے اپنی ماموریت کا اعلان فرمایا اس وقت جہاں تک مجھے یاد ہے اخویم مولوی میر مردان علی صاحب مرحوم اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب مرحوم نے اپنی اپنی عمروں سے پانچ پانچ سال حضرت اقدس علیہ السلام کو دینے کے

متعلق خطوط روانہ کئے اور بیعت کے عریضے تحریر کئے مگر ازالہ اوہام جلد دوم طبع جدید کے صفحہ ۱۱، ۱۲ پر جو تحریر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اخویم مولوی مردان علی صاحب مرحوم نے پہلے اپنی عمر کے پانچ سال دیئے اور بیعت کا خط لکھا اور سبقت حاصل کی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔

اس جگہ اخویم میر مردان علی صاحب صدر محاسب دفتر سرکار نظام حیدرآباد دکن بھی ذکر کے قابل ہیں (مددگار کا لفظ سہو کاتب سے رہ گیا ہے) مولوی صاحب موصوف نے درخواست کی ہے کہ میرا نام سلسلہ بیعت کنندہ میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ داخل کیا گیا۔ ان کی تحریرات میں نہایت محبت و اخلاص پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے سچے دل سے پانچ برس اپنی عمر میں سے آپ کے نام لگا دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری عمر میں سے کاٹ کر آپ کی عمر میں شامل کر دے' سو اللہ تعالیٰ اس ایثار کی جزا ان کو بخشے اور ان کی عمر دراز کرے۔ انہوں نے اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب اور مولوی غضنفر علی صاحب نے نہایت اخلاص سے دس دس روپے ماہوار چندہ دینا قبول کیا ہے اور ۲۷ روپے امداد کے لئے بھیجے ہیں۔ جزاھم اللّٰہ الخیر الجزا

ازالہ اوہام کے پڑھنے کے بعد اخویم مولوی میر مردان علی صاحب اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب مرحوم نے قادیان دارالامان کے سفر کی تیاری کرلی جب یہ چلنے لگے تو روانگی سے ایک دو روز پیشتر اخویم مولوی میر مردان علی صاحب مرحوم نے تحریر کے ذریعہ حضرت اقدس علیہ السلام کے بارے میں مجھ سے اپنے خیالات کے اظہار کی خواہش کی اس عرصہ میں' میں نے کئی مرتبہ غالباً تین بار ازالہ اوہام کو پڑھ کر ختم کرلیا تھا۔ میں نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے اور ان کو یہ بھی کہا کہ اس تحریر کو حضرت اقدس علیہ السلام کی خدمت مبارک میں کسی موقع و محل پر پیش کریں بعد ملاحظہ کے جو کچھ ارشاد ہو اس سے مطلع کریں۔ جب یہ حضرت دارالامان سے تشریف لائے تو مجھ سے وہ الفاظ بیان کئے جو حضرت اقدس علیہ السلام نے اس خاکسار کی نسبت ارشاد فرمائے۔ اس مقام پر میں ان الفاظ کا اعادہ کرنا مناسب خیال نہیں کرتا اور نہ مجھے یاد ہیں' اللہ تعالیٰ مجھے ان الفاظ مبارکہ کے مصداق بنائے۔ آمین ثم آمین

البتہ خاکسار حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی خدمت عالی میں خصوصاً اور

تمام بزرگان سلسلہ اور برادران جماعت سے عموماً بعجز تمام التماس کرتا ہے کہ دردِ دل سے اس خاکسار کے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مبارک الفاظ کا پورا پورا مصداق و وارث بنائے

جب وہ مژدۂ جاں بخش و روح پرور مجھے پہنچا تو یہ خاکسار بھی سلسلہ بیعت میں داخل ہوگیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ

جس طرح بلدہ حیدرآباد میں وہ انتشار نور اپنا کام کر رہا تھا اسی طرح ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع میں یہی نور اپنا اثر پھیلا رہا تھا بلدہ حیدرآباد میں جہاں یہ کاتب الحروف اور اخویم مولوی میر مردان علی صاحب مرحوم اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب مرحوم اور مولوی سید محمد رضوی صاحب وکیل ہائیکورٹ سرکار عالی جو اب ایک زمانہ سے ممبئی میں اقامت گزین ہیں سلسلہ بیعت میں داخل ہوئے وہاں اضلاع کے لوگوں سے اخویم مولوی صفدر حسین صاحب مرحوم مہتمم تعمیرات اور اخویم سید ظہور اللہ احمد صاحب ڈاکٹر نے بھی بیعت کی۔ تین سو تیرہ کی فہرست میں یہ تین نام درج ہیں۔

پھر جب ہماری جماعت کے امیر حضرت مولانا مولوی میر محمد سعید صاحب دام فیوضہ چھ ماہ کی اقامت کے بعد دارالامان سے بلدہ حیدرآباد تشریف لائے تو جناب ممدوح نے افراد جماعت کو جمع کر کے باقاعدہ نماز باجماعت وعیدین کا انتظام فرمایا جو ان کے مکان واقع محلّہ مستعد پورہ میں ہوا کرتی تھی۔ حضرت امیر کی تشریف آوری کے بعد سے تبلیغ کا سلسلہ بڑے زور سے شروع ہوا۔ موضع یادگیر ضلع رائچور میں ایک خاصی تعداد جماعت کی موجود ہے جن میں سیٹھ شیخ حسن صاحب اور ان کے بھائی سیٹھ محمد خواجہ صاحب ہیں اور بلدہ میں ہمارے جماعت کے درخشندہ گوہر نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت وکوتوالی و امور عامہ سرکار عالی اور اخویم مولوی سید بشارت احمد صاحب جنرل سکریٹری صدر انجمن احمدیہ حیدرآباد۔ اور ان کے بھائی اخویم حکیم میر سعادت علی صاحب اور اخویم مولوی بہاء الدین صاحب اور اخویم مولوی حافظ عبدالعلی صاحب وکیل ہائیکورٹ اور اخویم معتمد عبدالقادر صاحب مچھلی بندری اور اخویم مولوی محمد عثمان صاحب اور اخویم قاضی عبدالکریم صاحب اور اخویم سیٹھ محمد غوث صاحب اور سکندرآباد میں سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب اخویم سیٹھ ابراھیم علاء الدین اور اخویم سیٹھ جی' ایم ابراھیم صاحب۔ غرض

یہ ایک لمبی فہرست ہے جو بخوف طوالت ترک کی گئی ہے اسی طرح دوسرے اضلاع سرکار عالی میں بھی ہماری جماعت کے افراد موجود ہیں۔

حضرت امیر جماعت کے اس تبلیغی مساعی جمیلہ اور اس کے مبارک اثرات کو دیکھ کر بعض خفاش چشموں کی آنکھوں کو آفتاب صداقت کی تجلی نے اندھا کردیا اور ان کے سینوں میں آتش حسد و عناد کے شعلے بلند ہونے لگے۔ مولوی انوار اللہ صاحب مرحوم افسر اعلیٰ امور مذہبی سرکار عالی نے ازالہ اوہام کے جواب میں انوارالحق نامی ایک کتاب لکھی۔ اخویم مولوی صفدر حسین صاحب نے اس پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس کا نام "انوارالحق پر ایک سرسری نظر" تحریر کرکے شائع کیا۔ اور حضرت امیر جماعت نے مکمل جواب نہایت شرح و بسط کے ساتھ تصنیف فرمایا اور اس کا نام انوار اللہ رکھا جو جماعت کی طرف سے طبع کرایا گیا الغرض اللہ تعالیٰ متعدد لوگوں کو کھینچ کھینچ کرلاتا رہا اور سلسلہ بیعت میں لوگوں کو داخل کرتا رہا ہے۔ اللھم زدفزد

حضرت امیر جماعت کی سعی یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ جب آپ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے مکہ معظمہ میں بھی ایک جماعت قایم فرمائی جس کا ذکر ہمارے سلسلہ کے اخباروں میں آچکا ہے۔

یہ مختصر تذکرہ بلدہ حیدرآباد اور اس کے اضلاع میں شیوع احمدیت کا ہے جو درج کیا گیا ہے۔ اور بخوف طوالت چشم پوشی کی گئی ہے۔ اگر فرداً فرداً ہر ایک شخص کی کیفیت اور وجہ سلسلہ بیعت میں داخل ہونے کی لکھی یا بتائی جائے کہ کیونکر اس سلسلہ حقہ کی صداقت معلوم ہوئی تو ایک کئی سو صفحوں کی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اس لئے اتنے ہی پر میں مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس سلسلہ کو فروغ دے اور عوام میں پھیلائے۔ اور یوماً فیوماً اس کو ترقی دے۔ اور ہمارے بادشاہ ذی جاہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ کو حضرت اقدس علیہ السلام کے اس الہام (بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈھیں گے) کا اولین مصداق بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

الحکم: حیدرآباد میں احمدیت کے شیوع کی مختصر تاریخ مخدومی حضرت ابوالحمید صاحب سلمہٗ اللہ الوحید نے لکھی ہے وہ حیدرآباد میں اشاعت احمدیت پر کسی قدر روشنی ڈالتی ہے اور لاریب اس

مختصر مضمون میں اس سے زیادہ کی گنجایش بھی نہ تھی۔ حیدرآباد کی تاریخ احمدیت نہایت شاندار اور جماعت کے کارنامے بہت نمایاں ہیں۔ اور میں کہتا ہوں شاید حیدرآبادی احباب اس کو اپنے ہاتھ سے نہ لکھ سکیں اور اگر خدا نے چاہا تو خاکسار عرفانی اس پر لکھے گا۔ حیدرآباد میں احمدیت کی تاریخ کا یہ خاکہ نامکمل رہ جائے گا۔ جب تک میں اس میں بعض ضروری امور کا تذکرہ نہ کروں۔

۶؍فروری ۱۸۹۸ء کو جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے طاعون کے متعلق اعلان کیا تو جماعت حیدرآباد نے اس اشتہار پر ایک خاص جلسہ منعقد کرکے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک عریضہ نامہ لکھا جس میں اپنے عقیدے اور ایمان کا جو وہ حضرت مسیح موعود پر رکھتی تھی علی الاعلان اظہار کرکے حضرت مسیح موعودؑ کو اس پر گواہ ٹھیرایا۔ حضرت اقدس نے خاص طور پر اس کی اشاعت کا مجھے حکم دیا اور وہ الحکم ۲۰؍مارچ ۱۸۹۸ء میں شایع کیا گیا۔ اس پر صرف دس آدمیوں کے دستخط تھے۔ (۱) میر مردان علی (۲) محمد نصیر الدین (۳) محمد ابوالحمید (۴) سید عبدالحی (۵) سید محمد رضوی (۶) صفدر حسین (۷) محمد عباس (۸) مرزا محمد بیگ (۹) محمد ظہور علی (۱۰) مرزا صادق علی بیگ گویا اس وقت تک یہ دس آدمی تھے۔ پھر یہ جماعت ترقی کرنے لگی اور اب اس کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہٗ کے عہد خلافت میں رودموسیٰ کی طغیانی نے حیدرآباد پر طوفان نازل کیا مگر اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو محفوظ رکھا۔ چادر گھاٹ دروازہ کے اندر امور مذہبی کے دفتر سے متصل اب تک درۃ الدرانی کے مصنف کے کھنڈرات ایک عبرت ناک دشمن حق کے انجام کو پیش کرتے ہیں اور حیدرآبادیوں کو سبق دیتے ہیں۔ میں جب وہاں سے گذرتا ہوں تو میرا دل ایک ایمانی لذت اور خدا کی قہری تجلی کے خوف سے دہل جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہٗ نے خاص طور پر ابوسعید عربی کو جماعت کی خیر و عافیت اور حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کے عہد میں جماعت کی ترقی و حرکت زور سے شروع ہوگئی تھی اور جماعت نہ صرف تعداد میں بلکہ اپنے شرکاء کے اعزازی و اقتداری حیثیت سے بھی بڑھ رہی تھی جماعت میں ہر طبقے کے لوگ آرہے تھے۔ اللھم زدفزد۔

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی نے ایک رویاء کی بناء پر اعلیٰ حضرت خسرو دکن کو تحفۃ الملوک لکھ

کر بھیجا۔ جس کے پہنچانے کی سعادت مخدومی حکیم محمد حسین قریشی کے حصہ میں آئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے حیدرآباد میں دو مرتبہ تبلیغی مشن بھیجے جن کا نمایاں اثر حیدرآباد میں جماعت کی ترقی اور سکندرآبادی جماعت کا قیام ہے میں اس جائز فخر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سکندرآبادی جماعت کی تحریک کا بیج خاکسار عرفانی کے ہاتھ سے بویا گیا تھا۔ اور قدرتی طور پر میں اس جماعت کی ترقی کے لئے دائماً دعا کرتا ہوں۔

حیدرآبادی تاریخ احمدیت میں یہ واقعہ بھی شاندار ہے کہ ثناء اللہ امرتسری کے تعاقب کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ایک وفد کو بھیجا جو کامیابی سے واپس آیا۔ اور اس تحریک کے نتائج اب ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے اس امر کا اظہار بھی کرنا ضروری ہے کہ یہ جماعت اپنی تعداد اور اخلاص میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جماعت پر مختلف قسم کے انعامات ہو رہے ہیں۔

سکندرآباد کی جماعت برادرم سیٹھ عبداللہ صاحب کی مخلصانہ مساعی اور دردمندانہ دعاؤں کا ایک خاص نتیجہ ہے اور جس قدر اشاعتی کام تحریک کے ذریعہ سکندرآباد سے ہو رہا ہے وہ قابل رشک ہے۔ اور یہ سب ایک مشت استخوان انسان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت ہوتی ہے۔

بہت سا لٹریچر انگریزی اور گجراتی میں سیٹھ عبداللہ بھائی نے مہیا کیا ہے۔ کئی لاکھ روپیہ اس کام پر خرچ کر دیا ہے اور صبح سے شام تک اسی دھن اور فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح پر یہ پیغام احمدیت دنیا میں پہنچ جاوے۔

حیدرآباد کے مخلصین میں سیٹھ محمد غوث صاحب ایک خاص رنگ رکھتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ساتھ ان کو ایک عاشقانہ والہانہ محبت تھی۔ میں نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ اسی ٹوہ اور تلاش میں رہتے کہ سلسلہ کی خدمت کے لئے کوئی موقعہ پاسکیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح کی بعض کشوف حیدرآباد میں احمدیت کے مستقبل کی شاندار بنیادیں اپنے اندر رکھتے ہیں اور ہم امیدوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیک ارادوں میں کامیابی عطا

فرماوے۔ اور ہم سب کو توفیق دے۔ آمین۔

نوٹ: ان تمام بزرگوں میں سے جن کے اسماء اس مضمون میں درج ہیں ان میں سے اس وقت صرف حضرت نواب اکبر یار جنگ بہادر، حضرت میر بشارت احمد صاحب اور حضرت سیٹھ عبداللہ صاحب (متعنا اللہ بطول حیاتہم) زندہ ہیں۔ سکندرآباد کی جماعت کے آدم سیٹھ عبداللہ بھائی کو ابتدائی تحریک احمدیت کی سعادت خاکسار عرفانی الکبیر کو حاصل ہوئی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

قادیان سے حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کی واپسی کے بعد جیسا کہ حضرت آزادؓ نے لکھا ہے سلسلہ کی تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ اس تحریک اشاعت میں حضرت مولوی عبدالقادر صاحب عرف یوحنا تاجر کتب رضی اللہ عنہٗ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ وہ ابتدائی زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے پھر دوبارہ اسلام میں واپس آئے۔ عیسائی مشنریوں کا ناطقہ بحث میں بند کر دیا کرتے تھے۔ کتب فروشی کے سلسلہ میں ہر جگہ جاتے اور تبلیغ کرتے اور اس سلسلہ تبلیغ میں گرفتار بھی ہوئے اور آہنی سلاخوں کے پیچھے ان کو بڑی تکالیف دی گئیں۔ مگر وہ حضرت بلالؓ کی طرح ان تکلیفوں کے اوقات میں، احمدیت کی صداقت کا اعلان کرتے رہے۔ ان کا یہ ذکر بھی میں نے ضمناً کر دیا ہے تا کہ احباب کو تحریک دعا ہو۔ اس سلسلہ تبلیغ میں حضرت شیخ حسن صاحب کو بھی پیغام احمدیت حضرت میر محمد سعید صاحب کے ذریعہ پہنچا۔ فطرت سلیم تھی اور قلب صافی تھا اس لئے فوراً احمدیت کو قبول کر لیا۔ اور بیعت کر لی۔ اور اس بیعت نے ایک نیا حسن پیدا کر دیا۔

جس طرح انسان پیدائش کے مختلف مدارج طئے کرتا ہے۔ یعنی نطفہ سے علقہ اور پھر مُضغہ وغیرہ اور آخری درجہ ثم انشا نہ خلقا اخر ط فتبرک اللّٰہ احسن الخالقین ۵ (سورۃ المومنون آیت ۱۵) حاصل کر کے تکمیل پاتا ہے اور اس درجہ کی حقیقت بالفاظ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ ہے کہ مومن کی محبت ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جل شانہٗ کی محبت ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب اللہ تعالیٰ کی وہ محبت ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی ہے اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے جیسے ایک دل بے جان میں روح داخل ہو جاتی ہے بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر در حقیقت ایک روح کا کام کرتی ہے۔ الاخرہ (براہین احمدیہ پنجم ص ۱۸)
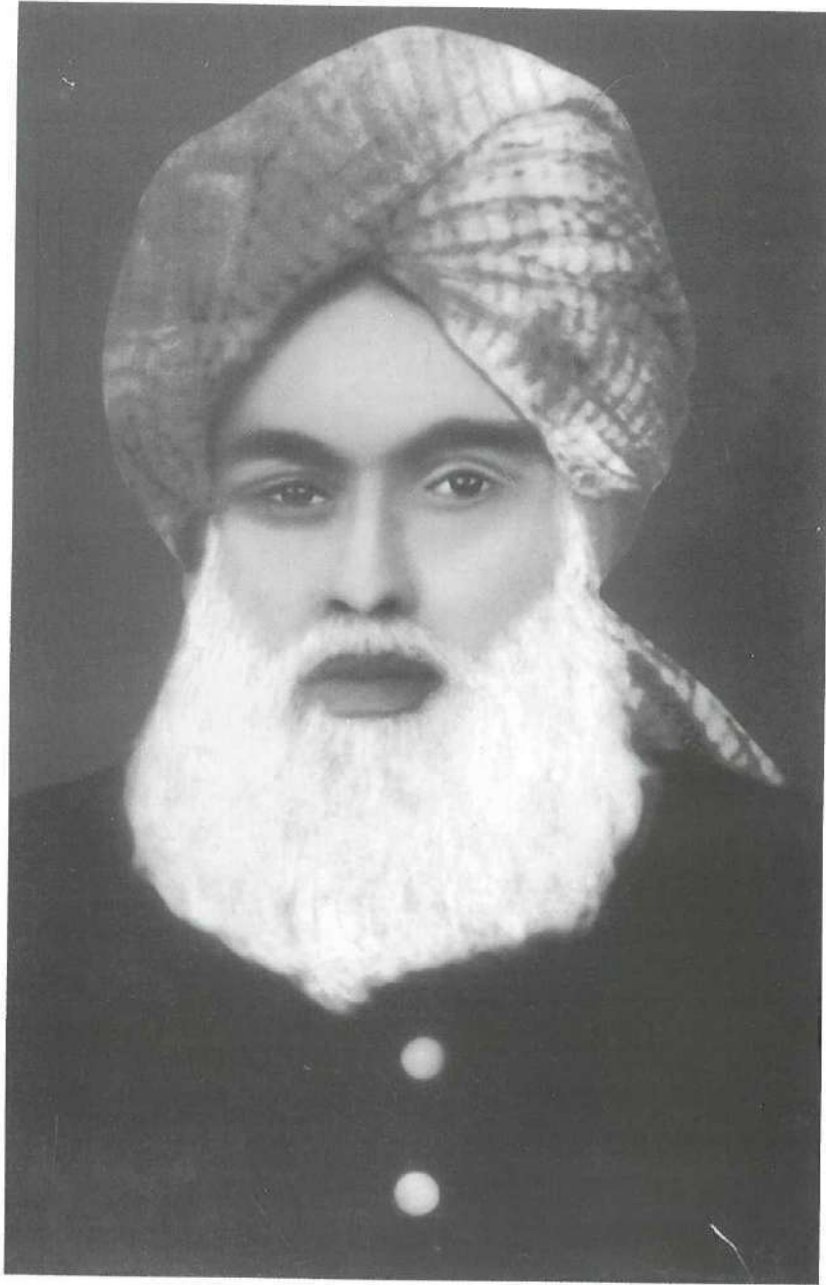
حضرت میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہ پہلے امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد

اس وقت تک حسن ایک ہیولیٰ انسانیت کا تھا روح احمدیت میں داخل ہو کر اس میں پیدا ہوئی۔ اور اس کا ظہور ان کاموں سے ہوا جو احمدیت کے بعد اس نے کر دکھائے۔

میں جب شیخ حسن صاحب کی لائیف پر غور کرتا ہوں تو اس کی زندگی کی جدوجہد اور کشمکش میں مصروفیت اور دنیوی حالت کے مختلف ادوار سے گذرنا گویا ایک قسم کی تربیت تھی اس حصول مقصد کے لئے جو اس کی پیدائش کا تھا۔

جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن کے پہلے احمدی
حضرت میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات

آپ کے حالاتِ زندگی مختصراً دو حصوں میں تحریر کئے جا رہے ہیں۔ ایک حصہ احمدیت سے قبل اور دوسرا احمدیت قبول کرنے کے بعد کا۔ حضرت میر محمد سعید صاحب کے والد محترم حضرت عبدالعزیز صاحب کشمیری ہیں۔ جو زہد و تقویٰ اور علم و عمل کی وجہ سے مشہور تھے۔ جن کا نسب نامہ ستائیسویں سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ملتا ہے اور تیرھواں سلسلہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ مجدد ساتویں صدی سے ملتا ہے۔

آپ ۱۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ہندو ڈوگرا خاندان حاکم ہو گیا تھا۔ علماء کی قدر و منزلت گرنے لگی تھی آپ کے والد آپ کو ساتھ لے کر کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے۔ مختلف ریاستوں میں ٹھیرتے ہوئے بھوپال تک آئے۔ اسی دوران آپ کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حصولِ تعلیم کے لئے خود بھوپال سے حیدرآباد دکن چلے آئے اس وقت دکن میں کمسن بادشاہ میر محبوب علی خان کی حکومت تھی۔ یہ بڑا نیک دل اور خدا ترس بادشاہ تھا۔ یہاں آپ نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے علم اور تقدس کی وجہ سے ایک وسیع حلقہ مریدوں اور وفا کش شاگردوں کا آپ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ بے نیازی اور زہد تقویٰ سے زندگی بسر کر کے آپ اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پا گئے اور اسی

بادشاہ کے عہد میں دکن میں قطب زماں کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔

حضرت میر محمد سعید صاحبؒ والد محترم کی وفات تک ہندوستان کی مشہور درس گاہوں میں تحصیل علم کی تکمیل کرتے رہے۔ بالخصوص آپ شاہ ولی اللہؒ کے مکتبہ رحیمیہ سے وابستہ رہے۔ اور مختلف علوم وفنون میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ آپ ۱۲۹۹ھ میں فارغ تحصیل ہو کر حیدرآباد دکن آ گئے۔ اس وقت دکن میں میر محبوب علی خان بادشاہ ہی کی حکومت تھی۔ آپ نے یہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ خاص و عام کو فیض علم سے آراستہ کرتے رہے۔ محلہ مستعد پورہ میں آپ کا قیام تھا۔ وہیں پر شہر کے نامور حکیم عبداللہ خاں منصبدار بھی رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کے زہد وتقویٰ سے متاثر ہو کر اپنی بڑی بیٹی سے آپ کا نکاح کر دیا۔ فخر النساء بیگم صاحبہ ایک نیک دل خاتون تھیں۔ وفا شعار بیوی کی طرح تمام مدوجزر میں آپ کا ساتھ دیا۔ چند سال بعد جناب محمد غالب جو بادشاہ وقت کے خادم خاص تھے نے آپ کی تعلیمی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے بادشاہ وقت سے پندرہ ہزار روپئے کی رقم منظور کروا کر ایک مدرسہ تعمیر کروایا اور اس مدرسہ کو آپ کی تحویل میں دے دیا۔ جیسا کہ تولیت نامہ کے اقتباس سے واضح ہوگا۔ وہ رقم طراز ہیں ع

''بنظر حصول ثواب دارین و اجراء خیر''

''تجویز ذریعہ معاش کے لئے از سعادات عزام یعنی مرشدی حضرت والا میر محمد سعید صاحب قادری حنفی ابن مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کشمیری قطب زماں قدس سرّہ الشریف''

نیز لکھا ہے کہ غربا کے بچے تعلیم حاصل کر کے موجب دوام خیر جاریہ وحصول ثواب سعادت میں والی وصورت معاش حضرت مولوی صاحب و متعلقین صاحب موصوف ہو اور جو بلحاظ اپنے مشہور علم وعمل و تقدس ذاتی کے ایک بافیض وجود اور شرف سعادت ہیں اور ہمیشہ درس و تدریس علوم دینی میں اپنے عزیز اوقات کو رات دن صرف فرمایا کرتے تھے۔ اکثر بندگان خدا آپ سے مختلف علوم وفنون سے مستفیض ہوتے رہے۔ مدرسہ مذکور کو سالانہ سرکاری امداد بھی جاری تھی۔ اس مدرسہ کی صدارت آپ ۱۹۰۰ء تک کرتے رہے۔ آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت ولی اللہ شاہؒ کے فلسفہ کو بھی عملی جامہ پہناتے رہے تھے۔ کسی کا قول ہے کہ جو ایک مدرسہ کھولتا ہے ایک قید خانہ بند کرتا ہے۔ دکن میں تعلیم کا فقدان تھا وہاں مسلمان جہالت، فرقہ بندی،

پیر پرستی اور قبر پرستی کا شکار تھے بلکہ یوں کہہ لیجئے صرف دکن ہی نہیں سارا ہندوستان مسلمانوں کی زبوں حالی کا آئینہ دار تھا۔ رجعت پرست قوتیں حکومت پر قابض تھیں۔ بادشاہت اور خلافت ختم ہو رہی تھی اسی زمانہ میں حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف ”براہین احمدیہ“ شائع ہوئی اور ملک کے کونے کونے میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔

”براہین احمدیہ“ کا آپ نے بھی مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ آپ مرزا صاحب (مسیح موعودؑ) سے خط و کتابت کرتے رہے بعد میں آپ کے دعویٰ کو تسلیم کرتے ہوئے بیعت کرلی۔ اس طرح حیدرآباد دکن سے آپ ہی پہلے احمدی ہوئے اور صحابہ مسیح موعودؑ میں شامل ہوئے۔ بلحاظ علم و تقدس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کو ذاتی طور پر بیعت لینے کا اختیار بھی دے دیا تھا۔ ابتداء میں چند غریب اور چند خاص لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سے آپ نے حیدرآباد دکن میں باقاعدہ جماعت کا قیام فرمایا۔ بحیثیت امیر جماعت منتخب کیا گیا (اخبار الحکم)

ایک انجمن کا قیام: بتدریج آپ کے اور بھی شاگرد احمدی ہوتے گئے۔ اس طرح خلافت علیٰ منہاج نبوت کی تکمیل میں حصہ لیا۔ آپ کے ساتھ کچھ سرکاری عہدوں پر مامور قاضی، جج اور ڈاکٹر بھی تھے اور کچھ تاجر بھی تھے اس طرح اِس مختصر جماعت نے چند ہی سالوں میں مالی قربانیوں کا عظیم نمونہ پیش کر کے مرکز کو مالی امداد سے بھی مستحکم کیا۔ اشاعت اسلام کے لئے مدرسہ اور مبلغ تیار کرنے تھے...... ایک تاجر تھے جن کا کاروبار بہت ہی معمولی تھا اس تاجر کا نام شیخ حسن تھا لاکھوں روپے اشاعت اسلام کے لئے مرکز کو دئے۔ ایک اور نوعمر تاجر محمد غوث تھے جو تیل کا کاروبار کرتے تھے وہ کافی ترقی کر گیا اور انہوں نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپے مرکز کو دئے اس کے علاوہ انفرادی اور جزوی بھی ہزاروں روپے چندے مرکز میں بھیجتے جاتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں ایک خاندانی تاجر حضرت عبداللہ الہ دینؓ صاحب سکندرآباد میر محمد سعید صاحبؓ کے دست مبارک پر احمدی ہوگئے۔ یہ چوٹی کے تاجروں میں تھے یہ بھی اخلاص میں آگے بڑھ گئے اور لاکھوں روپے اشاعت اسلام کے لئے مرکز کو دئے۔ اللہ کی راہ میں جو خرچ کیا جائے وہ خیر جاریہ سمجھنے والے لوگ خاندانی ابدی روحانی مسرت میں سرشار رہتے ہیں۔

آپ نے اپنے فیض روحانی سے جماعت کے گنے چنے ممبران کو اس رنگ میں تربیت دی کہ مالی قربانی کے ساتھ ساتھ آپ کے بعد مولوی ابوالحمید آزاد رجسٹرار اور ان کے بعد سید بشارت احمد ایڈوکیٹ امیر جماعت ہوتے رہے اور اپنی زندگی جماعت کی تنظیم میں وقف کردی۔ ایک اور شاگرد رشید میر فضل احمد منصب دار آپ کی زندگی تک تالیف تصنیف کے مددگار رہے۔

حضرت میر محمد سعید صاحبؓ نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اوّلیت ترجمہ قرآن کو دی آپ شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ سے اپنی طالب علمی کے زمانے سے متاثر تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۰ کے آغاز سے درس قرآن جاری فرمایا اور ساتھ ساتھ سلیس اُردو میں ترجمہ بھی کرتے رہے۔ اسی طرح فارسی ترجمہ کو سلیس اُردو کا جامہ پہنایا۔ یہ بیسویں صدی کا پہلا اُردو ترجمہ ہے جو سلیس اور عام فہم ہے۔ آپ مرکز بھی جایا کرتے تھے (قادیان) اور سال میں چند ماہ قیام فرماتے تھے۔ حضرت خلیفہ اوّل مولوی حکیم نورالدین صاحبؓ کے درس میں شریک رہتے اور ان کے درس سے استفادہ کرتے ہوئے تفسیر بھی لکھی اور بالآخر ۱۹۱۵ء میں قرآن باترجمہ اوضح القرآن مسمّٰی بہ تفسیر احمدی علیحدہ علیحدہ جلدوں میں شائع فرمائی۔

حالات کے مطابق مخالفتوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انفرادی تکالیف پر صبر سے کام لیتے اور جماعت کے احباب کو بھی صبر کی تلقین کرتے۔ آپ کے ایک ہمعصر و عالم مولوی انوار اللہ صاحب صدر جامعہ نظامیہ نے 'احمدیت کی تردید میں ایک ضخیم کتاب انوار الحق لکھی۔ آپ نے اس کتاب کے جواب میں ایک کتاب مسمّٰی بہ انوار اللہ شائع فرمائی جس میں تمام اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیا گیا تھا۔

سپٹمبر ۱۹۰۸ء تاریخ حیدرآباد میں عظیم طغیانی کی بربادی کے لئے مشہور ہے۔ ہزاروں نفوس غرقِ آب ہوگئے تھے' طغیانی سے قبل احمدیت کا اثر و نفوذ دیکھ کر حکومت کے رجعت پرست حکّام اس تنظیم کو ایک آنکھ گوارا نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں قرآن مجید کا عام فہم ترجمہ اور تفسیر اُن کے رجعت پرست عقائد کا پردہ چاک کرنے کے مترادف تھی لہٰذا آپ کی جماعت کا گھیراؤ شروع کیا آپ کو مع جماعت کے چند احباب کے ساتھ ایک ایسے علاقے میں بسا دیا گیا جو بری طرح پس ماندہ تھا نیز جماعتی ضرورتوں سے محروم تھا۔ البتہ بڑے بڑے شعرا اور امرا کے محلات تھے جو

اس مقام کو گھیرے ہوئے تھے ۔ یہاں بعد میں مسجد جس کی اجازت نہ مل سکی ایک حال تعمیر ہوا تھا
(الموسوم لکچر حال بی بی بازار) وہاں آتے جاتے احتساب ہوتا رہتا تھا ۔ ان تمام رکاوٹوں کے
باوجود جماعت محدود تعداد میں ترقی کرتی رہی ۔ احیاء دین کے لئے بہت کم لوگ توفیق پاتے
رہے ۔ جماعت میں رہ کر بھی آپ کو عام مسلمانوں کا خیال رہتا تھا ۔ اس کے لئے آپ نے ایک
ٹھوس تاریخی قدم اٹھایا ۔ ۱۹۱۲ء میں مجلس اتحاد اسلامی کی داغ بیل ڈالی ۔ یہ مجلس دینی تربیت
بلالحاظ فرقہ بندی یک جہتی کی غماز تھی ۔ مجلس کا منشور عام طور پر شائع ہوا نتیجتاً یہ مجلس آہستہ آہستہ
بارآور ہوتی گئی ۔ بالآخر مجلس اتحادالمسلمین کی تحریک بن گئی ۔ جو نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ اس کے
۱۶ اضلاع میں پھیل گئی ۔ اس سے مسلمانوں کو جمہوری قوت کا اندازہ ہوا اور وہ اپنی تنظیم میں آگے
بڑھتے گئے ۔ قدامت پرست مرشدوں اور کٹ حجت ملاؤں سے ان کو نجات ملی اور کئی خطیب
بے بدل پیدا ہوئے ۔

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد آپ نے ایک امیرزادی بیوہ بادشاہ بیگم سے نکاح کیا تھا ۔
اس خاتون کی بدولت آپ کی مالی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی ۔ پرفضاء مقام پر ایک انجمن حال تعمیر
کرنے کا ارادہ فرمایا تھا جس کا نقشہ بھی منظور ہوچکا تھا ۔ لیکن جس زمین پر یہ حال تعمیر کیا جانا تھا
وہاں نزاع کھڑا کر دیا گیا تھا ۔

۱۹۲۱ء میں آپ نے حج کا قصد کیا تھا ۔ حج کو روانگی سے پہلے اپنے اکلوتے صاحبزادے
میر احمد سعید صاحب کا فاطمہ بیگم بنت قاضی علیم الدین سے نکاح کر دیا تھا ۔ حج کرنے کے بعد
آپ بلادعرب کی سیاحت کرتے ہوئے وطن لوٹے دمشق کے سفر میں آپ نے وہاں کے معزز
شہریوں کو خطاب فرمایا تھا اور احمدیت کا پیغام پہنچایا ۔ چند سعید فطرت اور خدا ترس شہریوں نے
احمدیت قبول کرتے ہوئے آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی ۔ الحکم اخبار نے اس امر میں تبصرہ
بھی دیا تھا ۱۹۲۱ء کے بعد حج سے واپس آنے کے تین چار سال بعد آپ پر اچانک ایک جان
لیوا مرض کا حملہ ہوا اور آپ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ کو انتقال فرما گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔
آپ نے دکن کے دو معزز اور مدبر بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا میر محبوب علی خاں
صاحب کا ۱۹۱۱ء تک اور ۱۹۱۱ء کے بعد ۱۹۲۵ء تک میر عثمان علی خان سابع کا دور دیکھا ۔ بادشاہ نے

آپ کو شرف باریابی بھی بخشا تھا ۔ آپ کی وفات کے بعد مولوی ابوالحمید آزاد امیر جماعت منتخب
ہوئے ۔ آپ کے پسماندگان میں زوجہ محترمہ فخر النساء بیگم جن کا مرکز میں ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا
۔ اور ان کے ۳ لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے بڑی صاحبزادی امتہ اللہ بشیرہ بیگم ان کا نکاح سید بشارت
احمد صاحب ایڈوکیٹ و امیر جماعت حیدرآباد سے ہوا ۔ ان کو کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ ۱۹۷۴ء میں
لاہور میں وفات پائی ۔ دوسری صاحبزادی فہیم النساء بیگم ان کا نکاح سید مجید اللہ صاحب منصبدار
سے ہوا تھا ۔ تیسری صاحبزادی مبشرہ صغریٰ بیگم صاحبہ ان کا نکاح مولوی عبدالسلام صاحب عمر خلف
اوّل حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل حکیم نورالدین صاحبؓ سے ہوا تھا ۔ لاہور میں اپنے صاحبزادوں
کے ساتھ قیام پذیر ہیں (بعد میں یہ لوگ امریکہ منتقل ہوگئے)

آپ کے اکلوتے صاحبزادے میر احمد صاحب سب رجسٹرار جو عمر میں اپنی بڑی ہمشیرہ
سے چھوٹے ہیں ان سے آپ کے دو نبیرے میر یوسف سعید اور میر محمد سعید ہیں اور ایک پوتی
محمدی بیگم جن کی شادی محمد سلیمان صاحب امیر جماعت ممبئی سے ہوئی اور ممبئی میں قیام کیا ۔ (بقید
حیات ہیں اور ریاست نگر حیدرآباد میں مقیم ہیں) میر احمد سعید صاحب سب رجسٹرار پنشن پر
گزربسر کرتے ہوئے ۱۹۶۸ء میں ۶۷ سال کی عمر میں وفات پاگئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔
آپ کی زوجہ محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ اپنے دونوں صاحبزادوں میر یوسف سعید اور میر محمد سعید جو
بالترتیب کراچی اور لاہور میں رہتے ہیں کے ساتھ ہیں ۔ (اب یہ تمام وفات پاچکے ہیں)
المختصر حضرت میر محمد سعید صاحب خاندانی مرشد تھے ۔ حسب نسب کے مطابق حسنی اور
حسینی تھے ۔ حنفی عقیدہ کے پابند تھے ۔ احمدی ہونے کے بعد نام کے ساتھ احمدی بھی لکھتے تھے ۔
الغرض جماعت احمدیہ کی ۶۵ سال خدمت کی اور اپنے ہمعصر عالموں اور مرشدوں کے
لئے جو غیراز جماعت تھے زندگی بھر اتمامِ حجت تھے اور دو خلفاء کا دور دیکھا آپ کی تمام زندگی
سادگی کا مرقعہ تھی ۔ زھد وتقویٰ کے علاوہ روحانی طور پر آپ ایک خاص مقام پر فائز تھے ۔ آپ
کے پاس ایک مختصر رہائشی مکان کے علاوہ کوئی بڑی جائیداد نہ تھی اور نہ ان کے پس ماندگان کے
پاس اب بھی کوئی جائیداد ہے ۔ بے حد بے نیازی شیوۂ زندگی رہی ۔
صاحب کشف کرامات ہونے کے ساتھ جمالی رنگ میں بھی حسنی اور حسینی اور اسلام کی

نشاۃ ثانیہ میں جماعت احمدیہ کے اہم ستون رہے ۔ اب تحریک احمدیت احیاءِ دین اسلام کے لئے آخری تحریک ثابت ہوگی انشاء اللہ العزیز ۔

لو وہ گہن سے نکلا سورج   برج محل سے نکلا سورج

تفصیلات سوانح حضرت میر محمد سعید صاحبؓ

مکرم محترم میر محمد سعید صاحب کے واقعات مندرج بہ توضیح القرآن مولانا میر محمد سعید صاحب کے آخری صفحہ پر مکرم مولانا عبدالقادر صاحب مچھلی بندری صاحب تحریر فرماتے ہیں ۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

ولادت : ۱۰ رذی الحجہ ۱۲۷۸ھ بمقام اندور ملک مالوہ (بھوپال)

تعلیم : فارسی ایک سال تک پڑھی گئی' زیادہ تر انشاپردازی پر زور دیا گیا ۔ عربی میں ۱۱ سال تعلیم حاصل کی ۔ ۔

اساتذہ عربی : حضرت مولوی عباس علی صاحب چڑیاکوٹی ۔ سید عبدالرحیم ملتانی ۔ مولوی ابوالقاسم صاحب دیوبندی ۔ میر احمد علی صاحب چڑیاکوٹی ۔

اساتذہ فارسی : زمہری صاحب ایرانی تھے اور مجتہد مہر ثابت صاحب باشندہ چیتاپور لکھنؤ سے فارسی پڑھی ۔

دینیات : مولانا ابوالقاسم دیوبندی ۔ میر احمد علی کوہاٹی اور مولانا مولوی نورالدین اعظم بھیروی سے کلام اللہ اور دیگر کتب دینیات کا علم حاصل کیا ۔

فیض روحانی : حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدسرہ قادری چشتی نقشبندی سہروردی ۔ خود ان کے والد بزرگوار اور سعدتا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود سے حاصل کیا ۔ آپ حضرت غوث اعظم دستگیرؒ سے بارہ پشت میں ہیں ۔

شعرگوئی : آپ فارسی میں شاعری فرماتے تھے تخلص واصل فرماتے اور طرز کلام

صائب سے ملتا ہے جو کہ فارسی کے اساتذہ شعرا سے تھے ۔

حفظ قرآن : از حافظ محمد صادق صاحب رام پوری اور سید احمد مدنی قادری سے حفظ فرمایا ۔

تصانیف : آپ کی تصانیف جو چھپ چکی ہیں ۔ انوار اللہ ۔ صوتِ قادیانی ۔ اظہار الحق درس احمدی ۔ تشیع ازالہ اوھام ۔ ترجمۃ القرآن معہ تفسیر احمدی ۔

غیر مطبوعہ کلام و تصانیف : آپ کی تصانیف اور کلام جو چھپا نہیں فقہ اربعہ ۔ فارسی دیوان ۔ حقیقت المہدی ۔ ابن مریم ۔ المبعوث فی المسلمین من فیض الخاتم النبیین ۔ دیگر اشتہارات اور عقائد نامہ جات اور راس الحدیث فیض مطلق ۔ نور الحق ۔ انیس العارفین ۔ مثنوی اعجاز البیان فی لغاۃ القرآن ۔ سبکۃ الذہبیب فی فہرست الکتاب العزیز ۔ جامع الوصول فی فقہ وحدیث ۔

ان کے دور کے معروف احباب اور ان کے حالاتِ زندگی:

(۱) مولوی عبدالحمید صاحب آزاد (۲) مولانا میر مردان علی صاحب ، صدر محاسب دفتر سرکار نظام حیدرآباد دکن (۳) اخویم مولوی ظہور علی صاحب (۴) مولوی سید محمد رضوی صاحب وکیل ہائی کورٹ سرکار عالی (۵) مولوی صفدر حسین صاحب مرحوم مہتمم تعمیرات سرکار عالی ، انہوں نے اپنے دور میں بیت الارشاد نامی عمارت جو برکت پورہ میں واقع ہے دوسری عمارت انور منزل کاچی گوڑہ میں واقع ہے جماعت کے نام وقف فرمایا ۔ یہ لاولد تھے ۔

ڈاکٹر سید ظہور اللہ صاحب (ان احباب میں چند 313 کی فہرست میں شامل ہیں) ۔

چنانچہ بعض احباب میں شیخ حسن صاحب احمدی اور ان کے بھائی سیٹھ محمد خواجہ صاحب شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ جماعت احمدیہ کے معروف شخصیت اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی ۔ مولوی سید بشارت احمد صاحب جنرل سکریٹری صدر انجمن احمدیہ حیدرآباد اور ان کے بھائی حکیم میر سعادت علی اور مولوی بہاء الدین صاحب ، مولوی حافظ عبدالعلی صاحب وکیل ہائی کورٹ ، مولوی عبدالقادر صاحب مچھلی بندری ، مولوی محمد عثمان صاحب ، قاضی عبدالحکیم صاحب اور سیٹھ محمد غوث صاحب سکندرآباد میں سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب (علاؤالدین) سیٹھ ابراھیم

علاؤالدین سیٹھ جی ایم علاؤالدین صاحب نصیرالدین صاحب ۔(بحوالہ شاہ نامہ احمدیہ)

احمدیوں کی قائم کردہ مجلس اتحاد اسلامی کے مقاصد اور دستور العمل

بہ منظوری حضرت امام مہدی آخرالزماں

دکن میں جناب سید محمد صاحب رضوی کی تبلیغی سرگرمی عمدہ نتائج پیدا کر رہی ہے۔ سید صاحب تبلیغ میں بڑی دلچسپی سے حصہ لے رہے ہیں اور ڈیڑھ سو افراد صرف ان کی مساعی جمیلہ سے اس سلسلہ حقہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس کام کو اور بھی عمدہ طریقہ پر سرانجام دینے کے لیے بتائید وسرپرستی میر محمد رضوی صاحب وکیل ایک انجمن قائم کی ہے جس کی روئیداد ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس امت مرحومہ کی صفات میں سے اللہ جل جلالہ نے یہ بھی ایک بڑی صفت ارشاد فرمائی ہے کہ کنتم خیر اُمۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر.

(ایڈیٹر) اخبار الحکم ۱۳؍جولائی ۱۸۹۹ء جلد ۳

پس حسب تجویز جلسہ منعقدہ ۵؍ربیع الاول شریف ۱۳۱۷ھ بروز جمعہ یہ مسودہ مرتب کر کے بغرض ترمیم ومنظوری پیش کیا جاتا ہے اس کا نام دستور العمل ترقی اتحاد اسلامی جماعت حضرت اقدس واقع حیدرآباد دکن رکھا جاوے۔ اس کام کا اجراء ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ یوم عید السعید والمیلا دیعنی روز جمعہ سے ہوگا اور تاوقت کہ اجلاس عام سے اس کے خلاف میں کوئی امر طئے نہ کیا جائے۔ واجب العمل ہر شریک پر ہوگا الغرض حسب الارشاد عالی غالباً اغراض اتحاد اسلامی یہ ہونا چاہیے۔

مقاصد: فقرہ۔(۱) کل فرقہ اہل اسلام میں باہم حقیقی اتحاد پیدا کرنا۔

حقیقی اتحاد سے غرض یہ ہے کہ اہل اسلام عملی طور پر اتفاق کے پابند ہوں کیوں کہ اسلام کی لاانتہا خوبیوں میں سے یہی مہتمم بالشان ایسی خوبی ہے جو بنی نوع انسان کو متحد الخلق والخلق العمل وخیال بننے کی تعلیم دیتی ہے مگر افسوس کہ اس وقت یہ ساری باتیں ہماری زبان میں برائے

گفتن خواندن ہیں۔ عملی نتیجہ تو الا ماشاء اللہ حکم عنقا رکھتا ہے بلکہ قریب تھا کہ یہ جوش لسانی وتحریری بالکل بے سود پڑ جائے۔ مگر واللہ متم نورہ کے ازلی اور زبردست اقتضاء نے ایسے نازک وقت میں ایک متبع سنت اور نائب الرسول امام الوقت کو اس کی تقویت کے لیے حریص علیکم بالمؤمنین روف رحیم کی صفت عنایت فرما کر کھڑا کر دیا جو ملک پنجاب سے ہدایت کے انوار کو بڑے زور کے ساتھ ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے اور ہمارے نبی فداہ امی وابی کا زندہ معجزہ ہے لہٰذا اب ہم سب مسلمانوں کو چاہیے کہ باہم سچے اتفاق سے اس مقدس امام کی پیروی کریں اور زندہ اسلام سے مشرف ہو کر اپنی گم کردہ گراں مایہ پونجی کو حاصل کریں۔

○ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کی اتباع میں ہر شریک بقدر طاقت خود حصہ لیا کرے۔

○ باہمی ہر شریک اس جماعت کے اغراض و مقاصد کا محافظ رہے گا اور حتی الامکان باہمی مواصلات و ہمدردی ذاتی بھی کرنی ہوگی۔

○ ہر شخص موجودہ حیدرآبادی جس کو حضرت اقدس سے بیعت ہو یا حضرت موصوف کا معتقد ہو شریک جماعت شمار کیا جائے گا۔

ہر شریک جماعت کے سامنے فہرست چندہ پیش کی جائے گی، جو ہر شخص اپنی استطاعت اور طیب خاطر سے جو مقدار چندہ درج فہرست کر دے گا ماہانہ اس کی ادائی اس پر لازم ہوگی۔

محافظ وخازن کا فرض: اس جماعت سے دو شخص منتخب کیے جائیں گے جس میں سے ایک کو محافظ کی خدمت اور دوسرے کو خازن کی سپرد رہے گی اور شخص خازن کے پاس ماہانہ چندہ ہر شریک ماہانہ جلسہ میں دے دیا کرے گا اور اس کے لیے ایک کتاب رہے گی جس میں شریک چندہ دہندہ کے نام کے محاذی بعد وصول رقم چندہ خازن لکھ لیا کرے گا۔

○ ایک کتاب جس میں کل شرکاء جماعت کے نام مع ولدیت وسکونت و علاقہ بتصریح درج رہیں گے، وہ خازن کے پاس رہے گی۔

○ ایک کتاب مصرف چندہ کی جس میں ابواب خرچ وقتاً فوقتاً لکھے جایا کریں گے خازن کی تحویل میں رہیں گی۔ شریک جماعت جس وقت چاہے معائنہ کرے اور ختم سال جماعت موجودہ حساب کتاب کو جانچ لیا کرے گی۔

O حضرت اقدس کی کل تحریرات یعنی کتب اشتہارات و اخبار وغیرہ کسی خاص مقام میں جو اندرون بلدہ واقع ہو فراہم کردیئے جائیں اور کتب کا سلسلہ ہمیشہ مکرر ہوتا کہ خریدار کی بھی حاجت روائی ہوسکے، قیمت مع خرچ مساوی ہے۔ O کتب و اخبارات و اشتہارات دیکھنے کے عام و خاص مجاز رہیں، بشرطیکہ وہ کتاب وغیرہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ O کتب کی نگہداشت وسلسلہ خرید وفروخت محافظ کے سپرد رہے جو کم سے کم تین روپے ماہوار کا تجویز کیا جائے۔ O محافظ کو لازم ہوگا کہ وہ بہت خوش اخلاق نرم مزاج و متحمل ہو اور اپنی کارگذاری کا حال ہفتہ وار بذریعہ تحریر کسی خاص رکن یا جماعتی عہدہ دار کو دکھایا کرے اور خازن کے دستخط لیا کرے۔ O ممکن ہو تو ملاحظہ کنندگان کتب کے اسماء کسی رجسٹر میں درج کرے۔

O حضرت اقدس کی تصانیف سے ہفتہ وار بعد نماز جمعہ دو گھنٹہ کے لیے ہمیشہ کچھ پڑھا جائے جس کو بالخصوص ہماری جماعت کے لوگ سنیں اور بشرط مصلحت عام لوگوں کو بھی اس کے سننے کی اجازت رہے۔ O علی الخصوص رجوع الی اللہ اور تاکید نماز وغیرہ کا مضمون پڑھا جائے۔ O حضرت اقدس کے خطوط اخبار الحکم کا مضمون بقدر ضرورت سنایا جائے۔ O از قسم مذکورہ بالا مضمون حضرت کے کسی خادم کا جس کو ارکان مجلس پسند فرمالیں پڑھنے کی اجازت رہے۔

O اس کام کے لیے وسیع مکان کی ضرورت ہے جو اندرون بلدہ ہو اور ہماری جماعت میں سے کوئی صاحب سردست بلا کرایہ دے دیں۔ O اس مکان میں پانی وغیرہ کا انتظام صاحب خانہ سے متعلق رہے اور اس کے اسباب کی نگرانی فقرہ (۴) ذیل (ب) کے سپرد رہے۔

O اس مجلس سے کسی کو مناظرہ وغیرہ کرنے کا حق نہ ہوگا اور نہ یہ جماعت بطور خود کسی سے مناظرہ کرے گی۔ اس جماعت کے ہر شخص کو لازم ہے کہ وہ اپنے غصہ کا سخت دشمن بنکر والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کا ثواب لیں۔ O جو صاحب بعد ملاحظہ کامل کتب حضرت اقدس کے کوئی شبہ حق جوئی کے طور پر تحریری یا تقریری پیش ہو تو حسب تقرر مجلس وقت معینہ پر جواب ادا کیا جائے۔

O ہماری جماعت کو جہاں تک ممکن ہو ہفتہ وار حسب تصریح فقرہ (۵) کارروائی کے لیے مقام

مقررہ پر حاضر ہونا ہوگا اور ماہانہ حاضری یعنی ہر ماہ کے آخر جمعہ کو بلا عذر لازم سمجھی جائے گی۔

O ممکن ہو تو اس مجلس کو اضلاع بلدہ کی جماعت کے لیے جو ہماری جماعت ہے اگر وہ منظور کریں صدر قرار دیا جائے اور وہاں کی حوائج کا رفع یعنی مقاصد دستور العمل ہذا کے حتیٰ المقدور اس مجلس سے ہو۔

O حضرت اقدس امام الزماں سے عرض معروض ومراسلت کا دائمی سلسلہ جاری کرکے وقتاً فوقتاً مقاصد مجلس کی اشاعت میں استہدا و استماء ہوا کرے اور یہاں کی کارروائیوں کو اگر مصلحت سمجھی جاوے تو کسی اخبار یا اخبار الحکم کو اشاعت کے لیے دیا جائے مگر کوئی شخص بطور خود اس کا مجاز نہ ہوگا۔

ہمیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا ہے ہمارا ایمان۔ اور ایسے ہیں ہم مسلمان! لیکن یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسلامی زمانہ جس میں سچے اور دیندار مسلمانوں کی جیتی جاگتی مثالیں بکثرت موجود تھیں جن کے طرز عمل کو دیکھ کر غیروں کو عبرت آتی تھی دلوں میں جوش پیدا ہوتا تھا اب وہ زمانہ گیا اور اگر نہیں اٹھ گیا ہے تو اب اٹھا جاتا ہے۔ ارکان دین اور عقاید درست کردینے والے اخلاق کو سنبھال سکتا تھا۔ اب ہم اس سے بحث کریں کہ ہمارا مذہب کیسا ہو اور ہم کو کیا کرنا چاہیے، بس اس کے لیے اس قدر کافی ہے کہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ ہمارا اسلام اب رسم و رواج کی قبیل ہوگیا۔ چاہیے تو یہ کہ مسلمان ہوکر ہمارے نام اور اسلام کو پہلے ایمان والوں سے زیادہ قوت ہوتی۔ ان سے زیادہ جوش ہوتا، رگ وپے میں اسلامیت بھری ہوتی اور محبت کے جذبہ سے بڑھ کر عشق کے مرتبہ کو پہنچ جاتے، مگر نہیں ہم نے اسلام کو آباء اجداد سے پایا اور ہم کو میراث میں ملا تھا اس کو ہم نے اسی طرح سے برباد وتباہ کردیا جس طرح ایک اولاد اپنے مرجانے والے باپ کا اندوختہ بڑی بیدردی کے ساتھ آوارگی میں اڑادیتی ہے۔

ہماری افلاس، ہماری بے عزتی، ہماری غفلت کا یہی قوی سبب ہے جو اپنے اچھے طور طریقوں کو برے سے بدل لیا اور پھر ہم اس کے مصداق بن گئے۔

لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما با نفسھم۔ حق تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلے۔ (بحوالہ اخبار الحکم ۳۱/جولائی ۱۸۹۹ء جلد ۳)

عریضۂ نیاز بحضور حضرت امام مہدی علیہ السلام

منجانب جماعت احمدیہ حیدرآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم . نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسوله الکریمؐ

السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ!

سالک مسالک حقیقت وعرفان واقف رموز عارف قرآن۔ خواص بحر توحید آشنائی۔ یم تجرید مظہر انوار الٰہی۔ مصدر برکات نامتناہی۔ مقبول جناب احدیت۔ مقرب بارگاہ صمدیت۔ حافظ کلام ربانی۔ ہادی مراحل خدارسی وخدادانی محی ملت بیضا۔ حامی شریعت غرا۔ فخر الاولیاء تاج الاتقیا۔ قدوۃ السالکین عمدۃ العارفین۔ امیر المومنین امام المسلمین۔ آفتاب عالمتاب آسمان امامت۔ شہسوار عرصۂ ارشاد وہدایت۔ حضرت امام آخر الزماں۔ مہدی دوراں۔ مسیح موعود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز۔

ہم لوگ جو اللہ تعالیٰ کے عاجز گناہگار بندے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ امتی اور حضور اقدس کے جان نثار خدام میں سے ہیں۔ یہ عریضہ نیاز نہایت ادب کے ساتھ ایک خاص غرض سے خدمت فیض رحمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ جناب عالی بہ نظر یہ رحمت وشفقت اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ حضور کا اشتہار مورخہ ۶ فروری ۱۸۹۸ء جو مرض طاعون کے بارہ میں شائع ہوا ہے ہم لوگ بھی اُس کے شرف مطالعہ سے مشرف ہوئے۔ عالی جناب ہم لوگ اس بات کو پہلے سے جانتے تھے اور اسی سبب سے خوف زدہ بھی تھے کہ ایک طرف سے اس ظلماتی زمانہ کی نئی روشنی اور اس پرفتن زمانہ کی منافقانہ تہذیب اور اس زہرناک زمانہ کی نامعقول نیچریت نے اہل عالم کو عموماً نہایت درجہ کا چالاک و بیتاب وآزاد وگستاخ وشوخ وشریر بنادیا ہے اور دوسری طرف سے اس زمانہ آخر کے خشک ملاؤں

نے اپنے نفسانی جذبات کو انتہا تک پہنچا کر باہمی اتحاد ومحبت وزخند وہدایت کی تمام راہیں مسدود کردی ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ایک ہادی کی مبارک آواز اُن کے ناشنوا گوش تک نہ پہنچ سکے اور انہوں نے اس خداداد نعمت کی کچھ قدر نہ کی جو عین ضرورت کے وقت حضرت قیوم عالم جل شانہ نے ان کو عطا کی تھی۔ روحانی نور اور آسمانی امور سے وہ اس درجہ محروم و بے نصیب ہو گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ان قدیم سنتوں کو بھی انہوں نے بالکلیہ دل سے فراموش کردیا ہے۔ جس کے آثار ونقوش نظام فطرت و قانون قدرت میں مندرج ہیں۔ اگر ان کی سعید فطرت ان کو مضطر کرتی اور وہ اپنی بصیرت سے کام لیتے اور حضور اقدس کی جان بخش و روح پرور تصنیفات کو تدبر سے دیکھتے۔ اور جناب عالی کی پاک ہدایت ومبارک تعلیم پر ایک منصف و دانا دل لیکر غور کرتے تو ان کے خون کا قطرہ قطرہ اور ان کی خاک کا ذرہ ذرہ اس امر پر شہادت دیتا کہ اللہ جل شانہ نے اس پرُ آشوب پرُظلمت زمانہ میں اپنی رحمانی تجلّی کے ساتھ اس عالم کی طرف توجہ کی ہے اور اپنی عظیم الشان رحمت کو ایک نہایت عالی خیال وروشن دماغ و بلند حوصلہ وسلیم العقل وحلیم المزاج و سعید الفطرت و کامل الایمان و پاک باز و پاک نہاد و متقی ومقدس وکریم النفس انسان کی صورت میں نازل کیا ہے۔ تا کہ ابدی زندگی کے طلب گار ہلاکت کی راہ سے بچ کر صراط مستقیم کو پالیں اور اس منزل مقصود پر پہنچ جائیں جس پر پہنچنا پیدائش انسان کی علت غائی ہے۔

مگر ہم اس بات سے سخت دردمند ہیں کہ بجائے قدر شناسی وشکر گذاری کے ان لوگوں نے حضور کی تکلیف وتوہین کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور کوئی پہلو مخالفت ومخاصمت کا باقی نہ چھوڑا۔ ان حالات کو عرصہ سے دیکھ دیکھ کر اس بات سے دل ڈرتا تھا اور خوف آتا تھا۔

نہ دل مروختہ انا مدبرد   ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

آخر کار وہی ہوا۔ کہ قحط وزلزلہ کے متواتر ومسلسل صدمات سے ایک عالم تباہ ہوگیا ہے اور اب خدا تعالیٰ کے قہری تجلّی کے آثار اور بھی زیادہ نمایاں ہونے لگے اور طاعون جیسا مرض مہلک ترقی کرتا جاتا ہے اور اس عالمگیر موت کے احاطہ سے نکل جانا انسان ضعیف البنیان کی طاقت وامکان سے باہر ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عالم اسباب کے تمام حوادث اسباب سے وابستہ ہیں۔ مگر ذات پاک حضرت صانع عالم جل شانہ جو متصرف فی الاسباب ہے قدرت کے ارادہ

مشیت کے بموجب اس کائنات کی ہر ایک کی تباہی واقع ہوتی ہے۔

چوں کہ اس مرض کا شیوع اس ملک کے حدود میں بھی شروع ہوگیا ہے۔ روز متوحش خبریں پہنچتی جاتی ہیں اور ظاہری آثار بہت خطرناک ہیں اور معلوم نہیں کہ کس وقت کیا حادثہ وقوع میں آئے۔ لہٰذا ہم لوگ اپنے ایمان وعقائد کا اسی طرح جس طرح حضور نے اپنی پاک ومقدس کتابوں میں تحریر فرمایا ہے۔ حضور کو شاہد ٹھہراتے ہیں جس پر اول الشاہدی خود خداوند تعالیٰ جل شانہ کی ذات ...... ہے اور امیدوار ہیں کہ میدان محشر میں بروز حساب ان کی گواہی اخبار کو دے سکے۔ ذلک عشرة كاملة .

(بحوالہ اخبار الحکم ۱۸۹۸ء جلد ۲۔ شمارہ ۴)

جناب میر محمد سعید صاحبؓ کی

عرض گذاشت

اے یہ بھی کس غضب کا جملہ ہے، ...... کیسی حسرت ٹپک رہی ہے۔ نہیں معلوم دیکھنے والے نے اسلامی دنیا میں کس بلا کا چھایا ہوا سناٹا دیکھا ہوگا کہ اس قسم کی اداسی برستی ہوئی دیکھی ہوگی کہ جس کو دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دل بھڑکا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا کہ مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب'' اصل تو یہ ہے کہ خدا کسی دشمن کو بھی وہ روز بد نہ دکھائے کہ کسی مذہب کا کوئی آدمی خود اپنے ہی مذہب پر سوز وگداز کے ساتھ مرثیہ پڑھنے کے لیے بیٹھے ۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اسلام ایک جامع صفات انسانی طریقہ کا نام تھا مگر افسوس اب تو اس کی صورت کچھ ایسی بدل گئی کہ پہچانی ہی نہیں جاتی۔

عرب کی سرزمین پر جاہلیت کے زمانہ میں کفر کی آندھیاں چل رہی تھیں جب ضلالت اور گمراہی کی گھنگور گھٹائیں بڑے زور شور کے ساتھ چاروں طرف سے اٹھ رہی تھیں، نفاق پھیلا ہوا تھا، خود پسندی ہر شخص کی گھٹی میں پڑی تھی، اس وقت اسلام کے چمکتے ہوئے آفتاب نے خاک بطحیٰ سے نکل کر اہل دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور پھر انہوں نے اسلام کی اس پیاری صورت کو دیکھا جو سر سے پاؤں تک دلکش زیوروں سے آراستہ تھی اور جس میں دل فریبی کچھ ایسی کوٹ کوٹ کر بھردی گئی تھی کہ جس کو لوگ دیکھتے ہی دیکھتے دل پکڑ کر رہ گئے اور پھر یکے بعد دیگرے اپنے اس آبائی مذہب کو جس کی محبت ان کے خون کے ساتھ ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی چھوڑ چھوڑ کر اسلام کے شمع جمال کے پروانے بن گئے اور لطف یہ تھا کہ جو مسلمان ہوتا تھا وہ اسلام کی اس دلکش صورت کا ایک بہت اچھا آئینہ بن جاتا تھا۔ جھوٹ سے اس کو قطعی دشمنی ہوجاتی تھی، غیبت کو وہ برا جانتا تھا، بری باتوں سے اس کو نفرت ہوجاتی تھی اور اچھے کاموں کی طرف بالطبع رغبت۔ اس کے دل میں اسلام کا ایک نیا جوش پیدا ہوجاتا تھا جس سے وہ سخت سے سخت آنے والی آفتوں کا بڑے استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتا تھا۔ اس کے ہر کام کی بنا خلوص اور محبت پر ہوتی تھی اور جو کام وہ کرتا تھا خاص خدا ہی کے لیے کرتا تھا، مکر اور فریب کو ان کے اعمال میں دخل نہ تھا، آپس میں ایک دوسرے کا سچا بہی خواہ اور ہمدرد تھا اور رنج وخوشی کا دل سے شریک۔ آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اخوت تھی، اتفاق تھا اور ان عمدہ خصلتوں نے اسلام کو وہ برقی قوت عطا کردی تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی روشنی مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیل گئی تھی۔ گو نو مسلموں کو اپنے قدیم آبائی مذہب کو چھوڑنے اور اسلام کے قبول کرلینے کی وجہ سے ان کے عزیز واقارب اور دوست احباب کی طرف سے ان پر سخت سے سخت اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ طعنہ کشی ہوتی تھی، گھر بار سے نکالے جاتے تھے، کھانا پینا بند کردیا جاتا تھا، تاجر اور دکاندار ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچتے نہ تھے مگر وہ اسلام کے کچھ ایسے دل دادہ اور عاشق تھے کہ یہ سب کچھ سہتے تھے، مگر اسلام نہیں چھوڑتے تھے، اس موقع پر اسلام سے میری مراد فقط اس قدر نہیں ہے کہ خدا کی خدائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ہی وہ قائل ہوں، بس اور کچھ نہیں۔ نہیں وہ ان سب صفات کے بھی جامع تھے جن کا سبق اسلام نے ان کو دیا تھا۔ زہدان پر فخر کررہا تھا اور پرہیزگاری ان پر ناز کررہی تھی، بری خصلتوں سے

ان کو عار تھا، جس سے ملتے تھے خُلق سے ملتے تھے۔ خلوص اور صفائی ان کا شعار تھا۔ اپنے پرائے
کے حقوق کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے اور بہت مستعدی کے ساتھ ان باتوں پر ان کا عمل تھا وہ
اسلام کے سچے عاشق تھے اور رات دن ان کو انہیں باتوں کا شوق تھا جن کی طرف اسلام اپنی تیکھی
چتونوں سے اشارہ کر رہا تھا۔ اسلام زبان سے فقط ایک بار **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کہہ
لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس پر سچے دل سے اعتقاد لانا اور اسی کے ساتھ ان احکام پر ایمان لانا بھی
مشروط تھا جن کے کرنے نہ کرنے کے لیے اس کا کلام پاک نصیحت کا مجموعہ بن کر نازل ہوا تھا یا
جس کی ہدایت اس کے رسول برحق نے فرمائی تھی۔

صوم، صلوٰۃ، حج اور زکوٰۃ خیر یہ تو اسلام کے رکن ہیں۔ ان کو فرض نہ جاننے والے پر تو
کفر کا اطلاق ہو جاتا ہے لیکن ان کی وہ حُسنِ خُلق، حسن معاشرت، تمدن، صلہ رحمی، ذوی القربیٰ
کے حقوق، مسافر، فقرا اور یتیموں کے ساتھ عہد کی وفا۔ قول کی راستی اور ان کے علاوہ وہ سب
باتیں جن سے انسان، انسان ہوسکتا ہے۔ اگر ان کی پابندی کے احکام کلام مجید میں ڈھونڈو گے تو
ایک نہیں صدہا آیتیں ملیں گی۔

**ان اللہ یامُروا بالعدل و الاحسان واِتاءِ ذی القربٰی وینھٰی عن الفحشا
والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون**۔ خدا کا حکم ہے عدل کرو، احسان کرو، ذوالقربےٰ
کے حقوق ادا کرو۔ بری، بدنما اور فساد کی باتوں سے پرہیز کرو۔ خدا تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم ان
کو یاد رکھو۔ ان پر عمل کرو۔

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے مگر غور کرنے کے قابل ہے کہ اس پر عمل کرنا انسان کو کہاں
تک لوگوں کی نظروں میں ذی عزت بنا سکتا ہے۔ اسی کے بعد پھر ارشاد فرماتا ہے
واوفو بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا لایمان بعد توکیدھا ۔ اس بات کا عہد کرو،
وعدہ کرو اس کو پورا کرو اور قسم کھا کر بدلو نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو جس کو سنت رسول اللہ کہتے ہیں، اگر غور سے
دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہم سب آپس میں کس طرح پیش آتے ہیں، کس طرح آنا چاہیے اور
ہمارے رسول نبی و امی کس طرح ہر کس و ناکس کے ساتھ پیش آتے تھے۔ آپؐ کے حضور میں

جب کفار آتے تھے تو آپؐ اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دیتے تھے اور کفار کے لیے اپنی جگہ
خالی کرتے کرتے، اس جگہ تک پہنچ جاتے تھے جہاں پر جوتے رکھے ہوتے تھے۔

**روی ھشام عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ قالت ما کان احداحسن خلقا من
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مادعاہ احد من اصحبہ ولا عن اھل بیتہ الاقال
لبیک**۔ ہشام ابن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی
تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دنیا میں کوئی خلیق نہ تھا، اصحاب یا اہل بیت میں سے
جب کوئی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک ہی فرماتے تھے یعنی حاضر ہوں۔

**قال انس خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین فما قال
لدنی فی شئی فعلتہ ، لم فعلت ولا فی شئی لم افعلہ ھل لا فعلت** ۔ حضرت انس کہتے
ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دس برس رہا اتنے عرصہ میں کبھی کسی کام پر
حضرت نے اعتراضاً یہ نہیں فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور مجھ سے آپ کا کوئی کام نہ ہوسکا تو
آپؐ نے تحکماً اتنا بھی نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔

یہی وہ خوبیاں تھیں جن میں مقناطیسی قوت تھی، جو لوگوں کے دل کو بے اختیار اپنی
طرف کھینچ لیتی تھیں اور عام لوگ مسلمانوں کا طرز عمل دیکھ کر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ جوق
درجوق اسلام میں داخل ہوتے جاتے تھے، جو مسلمان ہوتا وہ اسلام کا سچا عاشق ہوتا تھا اور اس
کے عشق میں جو جو تکلیفیں کھانے پینے اور اذیتوں کی ان پر ہوتی تھیں ان کو وہ اسی طرح راحت
سمجھتا تھا جس طرح کسی دوست کے عشق میں اس کا جاندادہ عاشق سب طرح کی مصیبت جھیلتا
ہے مگر منہ نہیں موڑتا ہے۔ جس کی تصدیق کے لیے حضرت بلالؓ کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ وہی
لوگ شریعت کے احکام کی دل و جان سے اتباع کرتے تھے۔ امین وہ تھے، سچے وہ تھے، جو کہتے
تھے وہ کرتے تھے اور جس امر کا وہ وعدہ کرتے تھے اس کو وفا کرتے تھے۔ رحم دل وہ تھے، محسن وہ
تھے، اعزا اقارب کے حقوق وہ پہچانتے تھے۔ کسی بندہ خدا کے ٹھیس لگتی تھی، اگر کسی کے چوٹ لگتی
تھی تو ان کے دل میں درد ہوتا تھا، کسی کے درد ہوتا تھا ان کے آنسو نکل آتے تھے اور اگر کسی کی
آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھتے تھے تو بے اختیار وہ چیخ اٹھتے تھے، اصل تو یہ ہے کہ وہی سچے مسلمان

تھے اور انہیں کا ایمان تھا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ سے جس قدر دوری ہوتی گئی ویسا ہی اسلام خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ۔کا مصداق بنتا گیا۔اسلام کے ہرے بھرے باغات میں انقلاب ہو چلا اور اُداسی دوڑنے لگی۔موسم بہار کی رت تو تھی پھول کھلے ہوئے بھی تھے مگر وہ ان کا اگلا سا روپ و رنگ نہ تھا۔نہ وہ رنگ میں شوخی تھی اور نہ وہ بھینی بھینی خوشبوئیں ان سے آتی تھیں جو پہلے نکلی تھیں۔غنچے چٹکتے تو تھے مگر چٹکتے میں ورد کی صدا آتی تھی۔شاخیں جھوم تو رہی تھیں مگر ان میں وہ لوچ نہ تھا جس کو دیکھتے ہی بے اختیار حسینوں کی کلائیاں یاد آجاتی ہیں۔

پتے ہرے تو تھے مگر وہ بھی کچھ افسوس سے ہاتھ مل رہے تھے۔رفتہ رفتہ بہار یہاں سے رخصت ہونے لگی اور خزاں کا گذر ہو چلا ، ہرے ہرے پتوں پر زردی دوڑنے لگی، پھول کھلنے لگے اور پھر ہواؤں کے جھونکے بڑے زور شور کے ساتھ چلنے لگے۔یہ اس زمانہ کا تذکرہ ہے جب تبع تابعین کا زمانہ گذر چکا تھا مگر خیر مسلمانوں کا طرز عمل اب تک اسلامی عظمت و جبروت کو کسی قدر سنبھالے ہوئے تھا اور مسلمان کچھ اسلام کے نام کا لحاظ و پاس کرتے تھے۔اس کے بعد پھر جو زمانہ آتا گیا خراب ہی آتا گیا اور اس کے مخالف ہوائیں اسلام کے لیے ناساز آور ہی رہیں اور اب تو کہا ہی نہیں جاتا۔اسلامی صفات یا تو اب کتابوں میں ملیں گی۔یا پہلے مسلمانوں کی قبروں میں،لیکن ان مسلمانوں کو تو زمین کھا گئی اور ان کتابوں کو اب زمانہ کا انقلاب کہا جاتا ہے۔اس زمانہ کے مسلمانوں کا حال نہ پوچھئے صاف صاف کہتے ڈرتا ہوں ۔غیبت تو غیبت ہے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں لائبل کیس نہ ہو جائے۔خیر کسی کو تو ہم کیا کہیں مثال دینے کی خود ایک ہماری ذات کیا کم ہیں۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
ہمہ خیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت ماراہا

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں اسلامی خو بو کہیں نام کو بھی نہیں ملتی۔حسد،بغض، عداوت،فریب،بے رحمی،جھوٹھ،دغابازی،خلف وعد اور بے غیرتی الغرض دنیا میں جس قدر بری باتیں ہیں وہ سب موجود ہیں..........

کیا اس وقت یہ صحیح بات نہیں کہ زمین جل اٹھی تھی اور بالکل سچا نقشہ اس کا ہو رہا تھا ع

ملخ بوستاں خوردو مردم ملخ

تاریکی نے سارے عالم کو اپنے پروں کے نیچے رکھا تھا۔ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس. یعنی امیوں اور علم و کتاب کے مدعیوں دونوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی اور اس فسادِ اخلاق کی وجہ ان کی بدعملیاں اور بدکرداریاں ہیں اور اس بدعملی کا تسلط ہر طرف پورا پورا ہے۔گویا یوں سمجھو کہ ساری زمین پکار رہی تھی کہ ایک منجی کی ضرورت ہے جو اس کی پشت کو فسق و فجور کے ناقابل برداشت بوجھ سے نجات دے۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علماء نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل چھوڑ دیا۔اور وعظ و ناصح یا تو وہ رہ گئے جو بازاروں اور شہروں کے مجمعوں میں طمع فاسد کو ذہن میں رکھ کر کچھ بولتے ہیں یا مساجد نشین ملاجن کا گذارہ محلّہ کی روٹیوں پر موقوف ہوتا ہے۔یہ دونوں قسم کے واعظ حق بول سکیں۔ممکن ہی نہیں۔مجلسوں اور محفلوں میں شراب خوار زانی اور ہر قسم کی خیانت کرنے والے اسی اکرام و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ایک امام المتقین راست بازوں کے حلقہ میں ایسے وقت میں کیا ضروری نہ تھا کہ ایک برگزیدہ دنیا میں آئے ۔وہ آیا اور وقت پر آیا اور پوری قابلیت کے ساتھ آیا۔وہ بحمد الحمد روز بروز ثابت کر رہا ہے کہ وہ حقیقتاً وہی ہے۔جس کے لیے فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم شوق امانت چھوڑ گئے تھے۔اور صدہا صلحاء و اتقیاء امت میں سے اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس سلام کا مورد اپنے تئیں سمجھے۔آخر بصیر مستحق نے دعویٰ کیا اور ٹھیک دعویٰ کیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام کہنا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا منصب تبلیغ بالکل پہلے نمونہ پر ہوگا۔یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت میں باطل کا خوف ناک رد کیا اور مذاہب باطلہ عالم کے چیدہ مذاہب کو مخاطب فرمایا۔اسی طرز پر مسیح موعود کا مشن بھی ہوگا۔سید المرسلین صلعم نے یہود و نصاریٰ سے مباحثات کیے۔ان کی بدکرداریوں اور ناپاک عقیدوں کو ظاہر کیا۔عرب کے برہموؤں اور تناسخیوں کے خبیث خیالات کی بیخ کنی کی۔اس وقت کے عظماء اور رؤسا ، قیصر و کسریٰ کے نام دعوت حق کے خطوط لکھے۔اسی طرح مسیح موعود نے ہند کے برہموؤں اور آریوں اور نصاریٰ اور یہود سے مباحثات کیے اور ان بے باک دشمنوں سے ایک طرف حق کی حمایت

کی اور دوسری طرف ان کے قلعوں پر متواتر حملے کرکے ان کو خاک کے برابر کردیا۔

اور بالآخر چوں کہ ایمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ سے رنگین تھا۔ یوروپ کے کل سلاطین کے نام حقیقت اسلام و بطلان نصرانیت کے خط لکھے اور یہاں ہند و پنجاب میں کوئی ایک فرد حکام سے ایسا نہیں رہا جس کی آنکھ اور ہاتھ نے اس کے تبلیغی نوشہ کے دیکھنے اور چھونے کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔

کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس کی زندگی میں اس جہاد سے جس کے لیے خدا تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ ایک دم غفلت نہ کی۔ قرآن کریم کو جو حامل قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سچی سوانح عمری ہے جو شخص تدبر سے دیکھے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ سب کا سب اِحقاق حق اور اِبطال باطل پر مشتمل ہے۔ پس اتباعِ سنت تو یہ تھا کہ آپؐ کی سیرت کی قدم بقدم پیروی کی جاتی۔ کوئی ان مفتیان تکفیر مسلمانان سے خدا کے لیے پوچھیکہ امر معروف کے ان صیغوں میں سے تم نے کس صیغہ کو پورا کیا۔ حکام اور اہل باطلہ تو ایک طرف، تم نے تو جھوٹے منہ سے کسی پڑوسی کو بھی کلمۃ الحق جرأت سے نہ سنایا۔ سچ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے سارے منہ پھیر دیئے۔ اور ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو سرد کردیا کہ حق دار آئے اور اپنا حق لے۔

کیا ہی سچ ثابت ہوا جو کتاب مجید میں تیرہ سو برس قبل کہا گیا تھا۔ **ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ.** ۱۰۔۲۶۔۲۸۔

خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ کل مفسرین اس آیت کو مسیح موعود کے زمانہ سے مخصوص کرتے ہیں اور فی الواقع حق بھی یہی ہے۔ سو سلام الرسول صلی اللہ علیہ وسلم دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص کس پایہ اور کس کام کا ہوگا۔ بڑے بڑے قطب اور غوث اور مجدد اس امت مرحومہ میں ہوئے اور سب آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے سچے مقتدیٰ اور عاشق۔ لیکن آپ نے سلام کسی کو بھی نہ کہا۔ فکر کے لیے اِس میں آیات ہیں۔

اس تمام بیان میں ہماری جماعت کے لیے امید و رہنمائی دونوں ہیں۔ بشارت تو ہے کہ ہم نے اس امام وقت کو پہچانا اور قبول کیا۔ اللہ کے فضل سے **واخرین منھم** اور ان کے وعدوں کے وارث ہوں گے۔ پہلے بھی اس نے متقیوں سے لگایا اور اب بھی وہ متقیوں سے ہی

دوستی کرے گا۔ ارشاد کیا گیا۔ **فضلتکم علی العلمین** اور صدیوں سے فضل ان کے خاندان میں جاری رہی۔ مگر جب تقویٰ اور نعمتیں سلب ہوگئیں اور آخر انتقال زمین یا...... خارج کے وقت نئی جماعت کی نسبت بھی یہی **نسالبتھا للذین یتقون و یوتون الذ......** ؟

یاد رکھو قرآن کریم کا لانے والا امام المتقین ہے جس کی جماعت تقویٰ و طہارت کے سچے نمونہ ہیں، جس کے لشکر کی ڈراؤنی کثرت کو دیکھ کر مسلمان لشکر کے دل گھبرا گئے تو اس صحابی سپہ سالار نے کیا خوب کہہ دیا کہ ہم آدمیوں کی قوت اور تعداد کے بل پر تو نہیں لڑتے ہیں ہم تو ایمان اور دین کی قوت سے لڑتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کلاب النار کی تعداد اس سے بہت کم ہو۔

ہم کو بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں متقی اور صالح بنائے اور مجھے تو کامل ایمان بنائے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ ضرور ضرور اس جماعت کو ایسی بنائے گا جیسے اس کے وعدے ہیں، کیوں کہ اس طرح اس جماعت کے معلم بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

آخر میں اپنی جماعت کو مبارکباد دیتا ہوں کہ...... سے خدا تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کے حصہ میں حسنۃ الدنیا اور حسنۃ الآخر لکھ دے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

(بحوالہ اخبار الحکم ۲۰؍مارچ ۱۸۹۸ء جلد ۲۔ شمارہ ۴)

ابتدائی مخلص صحابی حضرت سید محمد رضوی ؓ صاحب ایڈووکیٹ

حیدر آباد کی مخلص جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرت نواب سید محمد رضوی ؓ صاحب کو ابتداء میں ہی حضرت مسیح موعودؑ کی آواز پر لبیک کہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ سادات خاندان میں مکرم سید ابو طالب صاحب کے ہاں قریباً ۱۸۶۲ء میں مدراس کے مقام ایلور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اپنے چاروں لڑکوں کو خود تعلیم دیتے تھے۔ آپ بہت ذہین تھے، چنانچہ بارہ چودہ برس کی عمر میں قرآن، احادیث اور فارسی کی تعلیم حاصل کر کے اکیلے ہی حیدر آباد آگئے اور مزید علم عربی وفقہ وحدیث وغیرہ حضرت مولانا محدث حسن الزماں صاحب سے سیکھے۔ وہاں اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں مقیم ہوئے اور اپنے میزبان کے توسط سے ایک رئیس کے لڑکے کو ٹیوشن دینی شروع کی، جس پر پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ پھر آپ نے قانون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور روزانہ کئی میل کا سفر کر کے سکندر آباد سے پیدل حیدر آباد جاتے اور شام کو واپس آتے۔ اس دوران دیوانی و فوجداری کی دونوں کتب قریباً حفظ کر لیں۔ ۱۸۸۴ء میں امتحان وکالت میں کامیابی حاصل کی اور پریکٹس شروع کر دی۔ پھر اس میدان میں بہت کامیابی حاصل کی۔ آپ کے ایک عرب دوست کو کیمیا کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے وکیل صاحب کو بھی ترغیب دی تو آپ نے بھی اس کا تجربہ کیا اور آخر چند ماہ کے بعد ایک چھوٹی کتاب لکھی کہ یہ کام احمقوں کا ہے۔

آپ نے اپنی زندگی میں پانچ شادیاں کیں، سب سے پہلا نکاح ۱۸۸۴ء میں فخر النساء بیگم صاحبہ سے کیا۔ ۱۸۸۹ء میں ظہیر النساء بیگم صاحبہ سے شادی کی۔ یہ دونوں بیویاں ایلور میں رہتی تھیں اور آپ وکالت کے سلسلے میں حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں سید رئیس النساء بیگم سے تیسری شادی کی۔ ۱۹۰۲ء میں ریاست دکن کے اسٹیٹ وکیل مقرر ہوئے۔ نظام دکن نے پائیگاہ اسٹیٹ کا کام اپنی بہن لیاقت النساء بیگم صاحبہ کے سپرد کیا ہوا تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور انہیں اسٹیٹ کی دیکھ بھال کے لیے قابل آدمی کی تلاش تھی۔ بالآخر انہوں نے اپنی والدہ سے

حضرت رضوی صاحب کے ساتھ نکاح کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کا نکاح حضرت میر محمد سعید صاحب نے پڑھایا۔ آپ صدر نشین پائیگاہ وقار الامراء بہادر مقرر کیے گئے۔ اسٹیٹ کے تمام کاروبار آپ نے خوب سنبھالے چنانچہ ۱۹۱۲ء تک اس پائیگاہ اسٹیٹ کی آمدنی گیارہ لاکھ سے کچھ اوپر ہوگئی جو آپ کی قابلیت کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مرہٹہ قوم کی ایک لڑکی جو مسلمان ہوگئی تھی، اس سے آپ نے شادی کی۔ ان خاتون کا نام بعد میں بسم اللہ بیگم رکھا گیا۔

حیدر آباد دکن میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے بزرگ حضرت میر عرفان علی صاحب تھے جنہوں نے ۲۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کو بیعت کی۔ پھر حیدر آباد دکن میں جب حضور کے اشتہارات وغیرہ آنا شروع ہوئے تو حضرت سید محمد رضوی صاحب کو بھی اس کی آگاہی ہوئی اور آپ نے حضور سے کتب منگوائیں اور ان کا مطالعہ کرتے رہے۔ آپ کے دوست حضرت میر محمد سعید صاحب بھی اس تحقیق میں آپ کے ساتھ تھے۔

رضوی صاحب مولوی حسن زماں صاحب کے مرید تھے۔ ان سے اجازت لے کر آپ حضرت میر محمد سعید صاحب کے ہمراہ قادیان تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو استاد نے کہا' کیا لائے ہو؟ آپ نے حضرت مسیح موعود کی کوئی عربی کتاب دی۔ اگلے روز استاد خوشی سے کہنے لگے کہ یہ مصنف تو عربی کا شیر ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ سمجھ گئے کہ حضور کی صداقت کا یہ گواہ ہیں۔

حضرت رضوی صاحب کے مکان پر ہی تمام احمدی جمع ہوتے اور جمعہ کی نمازیں وغیرہ وہاں ہوتیں۔ سالانہ جلسے بھی وہیں ہوتے۔ اخبار الحکم ۱۷ مئی ۱۹۰۱ء میں آپ کے گھر کے بارہ افراد کی بیعت کا اندراج موجود ہے۔

حضرت سید رضوی صاحب کو حضرت مسیح موعودؑ نے ۳۱۳ رفقاء میں شامل فرمایا ہے۔ ''انجام آتھم'' میں دی گئی فہرست میں آپ کا نام ۲۴۴ نمبر پر موجود ہے۔ اسی طرح ''کتاب البریہ'' میں بھی گورنمنٹ کے سامنے اپنے مخلص صحابہ کے اسماء پیش فرماتے ہوئے حضور نے آپ کا نام ۱۳۳ نمبر پر درج فرمایا ہے۔

حضرت سید محمد رضوی صاحب جب قادیان جاتے تو حضور بڑی محبت سے پیش آتے۔

کھانے کے وقت حضور خود بسا اوقات کھانا لاتے اور آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ ایک بار آپ حیدر آباد دکن سے ایک جماعت لے کر آئے تو حضور نے خاص طور پر حکم دیا کہ ان کے لئے مختلف قسم کے کھانے سالن تیار کریں جیسا کہ یہ کھانے کے عادی ہیں۔

حضرت سید محمد رضوی صاحب مالی قربانیوں میں ایک مثالی نمونہ رکھتے تھے۔ اخبار الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء پر رقوم اغراض مدرسہ، فیس، بورڈنگ ہاؤس، عید فنڈ، مساکین کے لئے تینوں مدات میں آپ کا نام شامل ہے۔ جب چندہ منارۃ المسیح کی تحریک ہوئی تو آپ نے یک صد روپے چندہ ادا کیا۔

۱۹۱۴ء میں الحکم کی ضروریات کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی طرف سے چھ ہزار روپے کی اپیل کی گئی تو اس اپیل کا فوری عملی جواب دینے والوں کی فہرست میں دوسرا نام آپ کا تھا۔ حضرت عرفانی صاحب لکھتے ہیں کہ نواب صاحب نے نہ صرف الحکم کی بلکہ سلسلہ کی ہمیشہ بے نظیر قیمتی خدمات کی ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی میں ضروریات سلسلہ کے موقع پر ہمیشہ آپ کو خطاب کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے آپ کو ایک پبلک خط لکھا تھا کہ مدرسہ کے منتظم آپ کے وجود کو خدا کا فضل اور غنیمت سمجھتے ہیں۔ موعود چندہ کو جس پابندی اور خوبی کے ساتھ آپ پہنچا رہے ہیں، بھائیوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ آخر آپ ہی کی ہمت اور جوانمردی امید گاہ نظر آئی۔ غرض نہایت عالی ہمتی سے آپ نے مدد دی ہے اور سلسلہ کی تمام مدات آپ کی فیاضیوں کو یاد گار رکھتی ہے۔ آپ نے اکائیوں اور دہائیوں سے لے کر سینکڑوں اور ہزاروں روپیوں تک اس راہ میں دیدیئے ہیں۔

الفضل ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء پر دعوت الی الخیر فنڈ میں آپ کے ۱۰۰ روپے کے چندہ کا ذکر ہے۔ جماعت حیدر آباد میں بھی آپ نے ذاتی خرچ پر جماعتی نظام کو بہت منظم کیا ہوا تھا اور مقامی جماعت کے اخراجات کا کافی حصہ اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ مقامی جلسہ سالانہ کا بیشتر خرچ آپ اٹھایا کرتے تھے۔ کتب سلسلہ کی اشاعت وغیرہ میں بھی پیچھے نہ رہتے جس کا ذکر صدر انجمن کی ایک سالانہ رپورٹ میں بھی ملتا ہے۔

آپ اپنے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو بھی ذرائع معاش مہیا کرنے میں بھرپور مدد

دیا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحیم صاحب کٹکی نے بیعت کی تو وفات مسیح سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی جس پر انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس پر حضرت رضوی صاحب کی کوشش سے انہیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔ اپنے اسٹیٹ کے صدر نشین مقرر ہوتے ہی آپ نے تمام ملازموں کی رکی ہوئی تنخواہوں کا فوری طور پر انتظام کیا جس کی وجہ سے ملازمین آپ سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتے۔

آپ جب حضرت اقدس کی خدمت میں قادیان حاضر ہوتے تو تحفۃً کچھ چیزیں بھی لے جاتے۔ ایک بار مسجد مبارک اور ساتھ والے کمرہ کے لئے دریاں بھی لے کر گئے۔ ایک بار حضور کی خدمت میں کیوڑہ بھجوانے کا ذکر بھی حضور کی زبان سے ہی محفوظ ہے۔

۱۹۱۱ء میں نواب عثمان علی خان صاحب سلطنت آصفیہ کے تخت شاہی پر متمکن ہوئے تو سلطنت کے بعض اکابر خصوصاً مہاراجہ سر کشن پرشاد حضرت رضوی صاحب سے بہت نالاں تھے۔ چنانچہ نواب صاحب کو آپ کے خلاف بہت ابھارا گیا، تو انہوں نے آپ کے تعلق داروں کو نشانہ بنایا اور مال واسباب ضبط کئے۔ آپ نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی فوج کو لڑائی سے منع کیا اور خود ہجرت کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ۲۵/ اپریل ۱۹۱۲ء کو اسٹیٹ کا کوئی ساز وسامان لئے بغیر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر ممبئی آگئے۔ وکالت کے زمانہ کے کافی روپے بینک میں جمع تھے۔ آپ نے ایک عالی شان بلڈنگ بنوائی اور دو دیگر کوٹھیاں بنوا کر کرایہ پر دیدیں۔

آپ کے ممبئی چلے آنے پر حیدر آباد کی جماعت کو ایک مخلص وجود سے محروم ہونا پڑا، لیکن جماعت احمدیہ ممبئی کی قسمت جاگ اُٹھی۔ یہاں آپ کا مسکن جماعتی مہمانوں کے قیام و طعام کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ نیز حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب جب مصر جارہے تھے تو آپ کے ہاں ہی مقیم ہوئے۔ پھر ۱۹۲۴ء میں جب حضور پہلی مرتبہ اپنے رفقاء کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تو واپسی پر حضرت رضوی صاحب کے گھر ہی تین روز قیام فرمایا۔ اس دوران حضورؓ نے گاندھی جی سے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا آزاد کی موجودگی میں ملاقات بھی فرمائی۔

۱۹۱۳ء میں حضرت نواب محمد علی خاں صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود

احمد صاحبؓ، حضرت سید مولوی سرور شاہ صاحبؓ اور حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ شملہ گئے تو وہاں کی جماعت نے ان بزرگوں کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جلسہ سالانہ کا پروگرام ترتیب دیدیا، لیکن جلسہ کا خرچہ آڑے آگیا۔ اتفاق سے حضرت سید محمد رضوی صاحب بھی وہاں تشریف لے آئے اور آپ نے سب اخراجات اپنے ذمہ لے لئے۔

آپ زندگی بھر خلافت سے چمٹے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں جماعت احمدیہ ممبئی کے دو افراد نے اخبار پیغام صلح میں یہ اعلان شائع کرایا کہ جماعت احمدیہ ممبئی اپنے تعلقات قادیان کی خلافت سے قطع کرتی ہے، اس پر جماعت احمدیہ ممبئی کی طرف سے ایک فوری مراسلہ بھیجا گیا، جس میں وضاحت کی گئی کہ صرف ان دو افراد نے ایسا کیا ہے باقی تمام جماعت حضرت خلیفہ ثانیؓ کی بیعت میں داخل ہے۔ پھر خلافت سے وابستہ افراد میں سرفہرست حضرت نواب صاحب کا اسم گرامی ہے۔

حضرت سید محمد رضوی صاحب نے اگست ۱۹۳۲ء میں ممبئی میں وفات پائی اور ممبئی کے قبرستان ناریل واڑی میں دفن ہوئے۔

(ماخوذ از: مکرم غلام مصباح بلوچ صاحب، الفضل انٹرنیشنل ۱۴؍جولائی ۲۰۰۶ء تا ۲۰ جولائی ۲۰۰۶ء)

نوٹ: تحقیق طلب ہے کہ آیا میر عرفان صاحب پہلے بیعت کنندہ تھے یا حضرت میر محمد سعید صاحب؟

بلند پایہ صحابی حضرت شیخ حسنؓ صاحب احمدی صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام

اگرچہ حضرت شیخ حسن صاحبؓ کا تعلق یادگیر (موجودہ صوبہ کرناٹک) سے ہے لیکن ایک تو اس زمانے میں یہ سارا علاقہ حیدرآباد دکن میں شمار ہوتا تھا دوسرے حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحب کی قبول احمدیت کا حیدرآباد سے براہ راست تعلق ہے۔ اس لئے حیدرآباد کی تاریخ احمدیت نامکمل رہے گی اگر حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحب کا ذکر شامل نہ کیا جائے۔ اس وضاحت کے ساتھ حضرت یعقوب علی صاحب عرفانی کی دلچسپ ایمان افروز تحریر پر مشتمل ذکر خیر درج کیا جارہا ہے۔ (سید جہانگیر علی)

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک بلند پایہ صحابی حضرت شیخ حسن صاحبؓ (یادگیری) رضی اللہ عنہ کے نہایت ایمان افروز سوانح حیات، احمدیت کے نامور اور پہلے صحافی حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ عنہ (عرفانی الکبیر) نے ''حیاتِ حسنؓ'' کے عنوان سے ۲۷۵ صفحات پر مشتمل تصنیف میں ۱۳۷۰ ہجری شائع فرمائے تھے۔ اسی تصنیف سے مندرجہ ذیل حالات ماخوذ ہیں جن میں سے مختصر حالات زندگی پیش ہیں۔

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بڑی دلچسپ اور عبرت بخش ہے اور قرآن مجید نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ سیاسی اور روحانی انقلاب جب دنیا میں ہوتے ہیں تو بڑے چھوٹے ہوجاتے ہیں اور چھوٹے بڑے کردیئے جاتے ہیں۔ یہ اصطلاحیں انسانوں میں مروّج ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے عظمت کا معیار صرف تقویٰ قرار دیا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور تم میں سے واجب الاکرام وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور یہ ایک ایسا اصل ہے کہ ہر انسان کی اُمید کو وسیع کرتا ہے اور اس کے مقام کے حصول کے لئے تحریکِ عمل ہے۔''

پیدائش اور خاندانی حالات:

حضرت شیخ حسن صاحبؒ احمدی کے خاندان کے متعلق جہاں تک میری تحقیقات ہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مدینہ کے انصار قوم کے لوگ ہیں ۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان میں ان کی آمد عربوں کے تجارتی قافلوں یا ابتدائی حملوں کے وقت ہوئی اور پھر یہیں بس گئے اور امتداد زمانہ نے ان کو وطن کی یاد یا تعلقات سے غافل کر دیا ۔ میں یہ اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں حضرت شیخ حسنؒ صاحب کی امتیازی حیثیت مدینہ کے انصار کا ایک سپوت ہونے میں سمجھتا ہوں ۔نسب کے لحاظ سے ہر انسان ایک ہی باپ آدم کا بیٹا ہے ۔ میں نے یہ واقعہ صرف اس مقصد سے بیان کیا ہے کہ یہ بزرگ ہندوستان کے نومسلموں سے نہیں بلکہ ان کے باپ دادا مسلمان تھے اور انصارِ اسلام تھے ۔حضرت شیخ حسنؒ نے ایک غریب خاندان میں جنم لیا ۔ وہ غریب تھے دولت کے لحاظ سے اور اپنے وسائل معاش کے لحاظ سے وہ غریب تھے ۔ بایں ہمہ وہ ممتاز تھے اپنے کردار کے لحاظ سے جو اپنی محنت مزدوری کر کے حلال کی روٹی کھاتے تھے اور اسی میں اپنا فخر سمجھتے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ ۔ان میں اس روح کا عنصر تھا سوال سے بچنے کے لئے محنت مزدوری اور کسب حلال کی سعی بھی عرب خون کی رازدار ہے ۔غرض حضرت شیخ حسن ایک غریب اور نادار خاندان میں ۱۲۵۱ ہجری میں بمقام یادگیر پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان دراصل گلبرگہ میں تھا اور بعض سیاسی حالات کے ماتحت یادگیر منتقل ہوئے ۔اس لئے وہ گلبرگوی کہلاتے ہیں اور اپنے اس خاندانی تعلق کی یادگار کے لئے اپنے کاروبار کو قائم رکھا مگر وہ یادگیر میں پیدا ہوئے کچھ شک نہیں عُسرت اُس وقت آپ کے خاندان کا اوڑھنا بچھونا تھی ۔مگر جب یہ بچہ، شیخ عبداللطیف صاحب مرحوم کے گھر میں پیدا ہوا تو قسمت سرہانے کھڑی تھی کہ غریب کے گھر میں غریبوں کا داتا پیدا ہو گیا۔

غربت کی حالت میں پیدا ہونے اور عسرت کے ایام میں پرورش پانے کی وجہ سے اس مولود نے ایک بہت بڑی اخلاقی دولت کو اپنے ساتھ ہی جمع کر لیا ۔ دوسرے اس کو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے اور وہ خود بھی محسوس نہیں کرتا تھا ۔مگر قدرت الٰہی اس ماحول میں ان کی روحانی تربیت

کے سامان پیدا کر رہی تھی ۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گرد وپیش غریبوں کی دُنیا کو پایا ۔ جن پر متمول طبقہ کے لوگ ہنستے اور ان کو حقارت سے دیکھتے تھے ۔اس نظارہ نے ان کے اندر ایک عزم اور عہد پیدا کر دیا کہ وہ غریبوں کی دُنیا کو آباد کرے گا ۔

یہ عزم اور عہد کسی تقریر یا تحریر میں نہ تھا ۔مگر یہ ایک نقش فطرت تھا جو اس کی روح میں موجود تھا اور متمول طبقہ کی نفرت اور حقارت کے جذبات نے اس کے قلب میں فروتنی، مسکینی اور عاجزی کی بلند پایہ اخلاقی قوتوں کا بیج بو دیا ۔

تعلیم وتربیت:

عرفِ عام میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہونے والے کی تعلیم وتربیت کا کوئی نظام العمل ہو ہی نہیں سکتا ۔ جب تک کہ جہالت کا عام دَور دورہ ہو اور تعلیم کو مرفہ الحال طبقہ اپنی میراث سمجھتا ہو ۔ اور حکومت کی طرف سے معقول انتظام نہ ہو۔ اس لئے کسی قسم کی خاص تعلیم حاصل نہ کر سکے بجز اس کے کہ آپ اپنے گرد وپیش کے حالات کو دیکھتے اور اپنی عقل اور سمجھ کے موافق کچھ نسیان اپنے دماغ میں پیدا کرتے اور سچ تو یہ ہے کہ جس بچہ کو اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنی پڑی وہ اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینے کے لئے کونسا وقت پا سکتا ہے ۔اس لئے شیخ حسن اس رسمی اور مکتبی تعلیم سے محض اُمّی رہے ۔مگر کون جانتا تھا بلکہ وہ خود بھی اس سے ناواقف محض تھا کہ وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محض فضل سے اس اُمّی کو اپنی معرفت کا علم بخش دے گا اور وہ ان لکھے پڑھے اور دستار فضیلت سے مزین معمار سے زیادہ ممتاز ہوگا جن کو قرآن کریم نے یَحْمِلُ اَسْفَارًا کا مصداق قرار دیا ہے ۔اور اس کے وجود میں قرآن کریم کی اس صداقت کو نمایاں کرے گا وَاتَّقُوا اللّٰہَ یُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ کہ تم متقی بن جاؤ اللہ تعالیٰ خود تمہیں علم دے دے گا ۔ شیخ حسنؒ بظاہر عرفی اور رسمی تعلیم سے بے بہرہ رہا اور اس کی زندگی کے وہ سال جو حصولِ تعلیم کے لئے ضروری تھے اسے زندہ رہنے کی جدوجہد میں بسر کرنے پڑے اور وہ کسی قسم کی تعلیم سے حصہ نہ لے سکا ۔

میں جب شیخ حسن صاحبؒ کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو ایک خاص مقصد کے لئے برگزیدہ کر رکھا تھا اور ان کی عسرت اور افلاس کی زندگی اور اس زندگی میں محنت و مزدوری کی عادت اس لئے تھی کہ وہ اس طبقہ کی فلاح کے لئے کوئی عملی کام کریں۔ ان کی جہالت اس مقصد کی رازدار تھی کہ وہ تعلیم کی ضرورت اور جہالت کو دور کرنے کے اسباب و ذرائع کو عمل میں لائیں اور اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کو اُٹھائیں جسے دُنیا کے فرزندوں نے اپنے پاؤں میں کچل ڈالا ہے اور جن کی حیثیت ان کے نزدیک محض چوپایوں کی سی ہے۔

نئی زندگی کا آغاز:

شیخ حسنؒ کی زندگی کا عمل ظاہر کرتا ہے اور واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ اس نے اپنی عملی زندگی کا جو نظام عمل تیار کیا تھا یا فطرت کا جو رجحان تھا اس کا مرکزی نقطہ تجارت نہیں تھا۔ وہ ایک عام مزدور کی زندگی بھی بود و بسر کے لئے اختیار کرسکتا تھا مگر اس کی عقل سلیم نے مزدوروں کی زندگی کو دیکھا تو اس نے نتائج کے لحاظ سے عزت نفس کے خلاف پایا۔ اگرچہ وہ گداگری کے مقابلہ میں ہزار گنا افضل اور بہتر سمجھتا تھا اور وہ خود بھی مزدور رہنا چاہتا تھا لیکن اس نے مزدور کی عام حالت کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا کہ باوجود محنت اور کوشش کے وہ اس عزت سے محروم ہے جس کا وہ مستحق ہے اس لئے اس نے عرفِ عام کا مزدور تو نہیں، ایک تاجر مزدور کے مقام کو اختیار کیا۔

دُوکان بدوش تاجر:

تجارت کی طرف نظر کا رجحان بھی اس کی عربی نژاد فطرت کا خاصہ تھا۔ تجارت کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے لیکن شیخ حسنؒ نے اپنے عمل سے بتایا کہ تجارت کا ایک زرّین اصل تجارت کے لئے سرمایہ سے زیادہ محنت، کوشش اور ایمان داری کی ضرورت ہے۔ کسی قسم کی تجارت کا شروع کرنے سے پہلے سرمایہ اور دوسری ضروریات کے خیال پر اس امر کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ عوام کی ضروریات زندگی کیا ہیں جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ خواص کی ضروریات تعیّشات اور تکلفات کی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے

بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بڑی دکان اور نمائش ضروری ہے۔ اس کا فرنیچر اور ساز و سامان آنکھوں کو خیرہ کرکے کشش اور جذب کا موجب ہوسکتا ہے۔ لیکن عوام کی ضروریات مختصر ہوتی ہیں اور ان کے لئے ابتداء بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔ شیخ حسنؒ نے اگرچہ اس خصوص میں کوئی تربیت حاصل نہ کی تھی مگر اسے اللہ تعالیٰ نے فطرت سلیم دی تھی۔ اس نے غور کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے فی الوقت ایک دوکان بردوش تاجر بننا چاہیے۔

شیخ حسن صاحبؒ کی شادی:

میں یہاں یہ ذکر کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ باوجودیکہ شیخ حسن ایک بے زر اور بے کس نوجوان تھا لیکن اس کا حوصلہ اور خودداری اور غیوری کو اس کی برادری کے افراد خوب جانتے تھے اور اس زمانے میں عام طور پر لوگ ہڈی اور خون کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شیخ حسنؒ غریب بے شک ہے مگر اس کی رگوں میں اپنی برادری کے شریف خاندان کا خون ہے اور یوں اُسے محنت اور جفاکش اور غیور پاتے تھے اس لئے اپنے خاندانی حلقہ میں آپ کی پہلی شادی ہوگئی۔ اس محترمہ کا نام پیرساں بی بی تھا۔ یہ شادی بھی شیخ حسنؒ کے لئے برکات کا موجب ہوگئی۔ اس لئے کہ اس شادی کے بعد ان کے معاشی حالات میں ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوا۔

اہلیہ شیخ حسنؒ کا آبائی خاندان کسی زمانے میں ایک ممتاز خاندان تھا۔ یہ خاندان عرف عام میں فصیل (غلط العام صفیل) کے نام سے مشہور تھا۔ دراصل یہ خاندان قلعہ کے محافظ کہلاتے تھے اور ان کے مکانات قلعہ کی فصیل ہی کے ساتھ تھے۔ اس لئے امتیازی طور پر وہ غلط العام لفظ صفیل کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔

پیرساں بی بی (اللہ کی رحمتیں اس پر ہوں) شیخ حسنؒ کے فرزندِ اکبر عبدالحی سلمہٗ کی والدہ تھیں۔ وہ نہایت نیک خصلت اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ جب شیخ حسنؒ کے نکاح میں آئیں خود اُن کی نیکیوں نے شیخ حسنؒ میں بھی ایک غیر معمولی انقلاب روحانیت پیدا کرنے میں عملاً مدد دی۔ شیخ حسنؒ جب اپنے مستقبل کے نظام عمل کو لے کر حیدرآباد آئے تو وہ شادی شدہ تھے۔

حضرت میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہٗ کو قادیان میں چھ ماہ اقامت کے لئے انہیں

بزرگوں نے اس مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں رہ کر حضرت حکیم الامت کے درس اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے انفاس قدسیہ سے براہِ راست فیض حاصل کر کے جماعت کو مستفید کریں۔

حضرت آزاد کا مضمون حسب ذیل ہے:

''...... یہ علامتیں اس بات پر شاہد ہوتی ہیں کہ وہ مصلح دنیا میں پیدا ہو گیا۔ پھر جس قدر آنے والا عظیم الشان ہو' یہ تحریکات غیبی قوت کے ساتھ مستعد دلوں میں اپنا کام کرتی ہیں۔ ہر ایک سعید الفطرت جاگ اٹھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کو کس نے جگایا اور ہر ایک صحیح الجبلت اپنے اندر ایک تبدیلی پاتا ہے' اور نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی۔

غرض ایک جنبش دلوں میں شروع ہو جاتی ہے اور نادان خیال کرتے ہیں کہ یہ جنبش خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن در پردہ وہ ایک رسول یا مجدد یا محدث کے ساتھ انوار نازل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ القدر میں اس کو بتایا ہے۔

چونکہ حضرت اقدس جری اللہ فی حلل الانبیاء علیہ وعلی صاحبہ تحیۃ والشفاء' منصۂ شہود پر جلوہ فرما چکے تھے اسی سنت اللہ کے بموجب جو اوپر بیان ہوئی' ضروری تھا کہ بلدہ حیدرآباد اور اس کے اضلاع میں بھی اس نورانیت کا انتشار پیدا ہو جو آگے چل کر ہو کر رہا۔ یہ زمانہ تصنیف براہین احمدیہ اور اس کے طبع کے سوال کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں کاتب الحروف اور اخویم سرمردان علی صاحب مرحوم مددگار دفتر صدر محاسب سرکار عالی اور اخویم مولوی ظہور علی صاحب مرحوم وکیل ہائی کورٹ اور مولوی مرزا صادق علی بیگ صاحب مرحوم استاد ملازم نواب سروقار الامراء بہادر مرحوم مدارالمہام سرکارِ عالی ریاست حیدرآباد دکن کی ایک صحبت اخویم مولوی ظہور علی صاحب کے مکان واقع محبوب گنج متصل افضل گنج پر ہوا کرتی تھی۔ اسی زمانے میں طبع براہین احمدیہ کا اشتہار ہم لوگوں کو ملا۔ مگر یہ یاد نہیں کہ کس ذریعہ سے یہ اشتہار ہم تک پہنچا اس اشتہار سے ہم لوگوں میں تحریک پیدا ہوئی کہ اس کتاب کی طباعت میں کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ مرزا صادق علی بیگ صاحب مرحوم نے موقعہ مناسب پا کر اس کا تذکرہ نواب سروقار الامراء بہادر مرحوم سے کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنی جیب خاص سے ایک سو روپے عنایت فرمادیا۔

قبولِ احمدیت:

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ؎

وہ خدا جو ہے میرا جوہر شناس   اک جہاں کو لا رہا ہے میرے پاس

لوائے ما پنہ ہر سعید خواہد بود   ندائے فتح نمایاں بنامِ ما باشد

اور یہ حقیقت جماعت احمدیہ کی تعمیر و تخلیق میں نمایاں ہے کہ سعادت مند روحیں ہر ملک ہر قوم ہر طبقہ سے اس لوائے احمد کے سایہ میں آ رہی ہیں پس شیخ حسنؓ کی فطرت میں وہ سعادت موجود تھی کس طرح پر یہ دور رہ سکتا تھا وہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتا گیا۔ بظاہر نظر آتا تھا کہ وہ شاید منزل سے دور جا رہا ہے لیکن وہ دراصل منزل ہی کی طرف آ رہا تھا۔

اب تک شیخ حسن صاحبؓ ایک سیدھا سادھا رسمی اور اسمی مسلمان تھا اس لئے کہ وہ ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اسرارِ شریعت سے واقفیت تو دور کی بات ہے۔ وہ معمولاتِ اسلام کو صرف رسماً جانتا تھا۔ عملاً ان سے بھی واقف نہ تھا۔ ہاں اس میں ایک بات ضرور تھی اور میں زندگی میں اسے بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں وہ ایسے ملک اور مقام میں اور ایسے ایام میں پیدا ہوا جہاں شرک و بدعت کا زور تھا اور اس کے اردگرد بتوں اور غیر اللہ کی پرستش نہ صرف بُت پرست کرتے تھے بلکہ مسلمان بھی ان آفات میں مبتلا تھے مگر جس کی فطرت ہمیشہ ان باتوں سے نفرت اور بغاوت کرتی تھی اور وہ اپنے اندر ابراہیمی روح رکھتے تھے شرک اور بدعت کے ہر کام سے بیزار تھے اور جہاں تک ان سے ممکن ہوتا وہ دوسروں کی دستگیری اور غرباء کی ہمدردی ہی کو بڑی عبادت سمجھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ اسباب تھے جن کے مدنظر میں کہتا ہوں کہ اسلم بما سلف کے نتیجہ ہی میں اس کی روح کی پیدائش احمدیت کے ذریعہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا کی دولت سے نوازنے کے سامان پیدا کر دیئے اور اس کی شبانہ روز محنت اور دیانت کے درخت کو پھل لگ رہے تھے اور وقت آ گیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانی میں اس مقام کو پھر حاصل کرے جو اُس کے باپ دادا (مدینہ کے انصار رضی اللہ عنہم) نے حضورؐ کی بعثت اولیٰ میں حاصل کیا تھا۔ اس حقیقت کا اظہار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

ان الفاظ میں فرمایا ہے ؎

درانصار نبی بنگر کہ چوں شد کار تاوانی
کہ از تائید دیں سرچشمۂ دولت شود پیدا

جیسا کہ میں نے حیدرآباد میں شیوع احمدیت کی مختصر تاریخ میں بتایا ہے حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد حیدرآباد کے عوام و خواص میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ موصوف ایک عالم باعمل تھے اور درس تدریس کے علاوہ وہ لوگ ان کی عملی زندگی سے متاثر تھے اور ان کا عام طور پر ادب و احترام کیا جاتا تھا لیکن ان کے سلسلہ میں داخل ہونے کی وجہ سے حیدرآباد کے علماء شیوخ کو ایک خطرہ محسوس ہونے لگا اور انہوں نے مختلف انداز سے مخالفت کا سلسلہ آغاز کیا جو یہ بھی ایک دردانگیز داستان ہے۔

اس طرح پر یہ شہرہ عجائبات کے رنگ میں شیخ حسن صاحبؓ کے کانوں میں بھی پہنچا۔ جو یہ سنتے ہی آئے تھے کہ چودھویں صدی بڑی بابرکت ہوگی اور امام مہدی کے ظہور کے منتظر تھے۔ جب یہ آواز انھوں نے سُنی کہ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ نے پنجاب میں مسیح و مہدی کا دعویٰ کیا ہے اور حیدرآباد میں بھی ایک جماعت قائم ہوگئی تو انہوں نے حضرت میر محمد سعید صاحبؓ سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے درس و مواعیظ کی مجلسوں میں آنے لگے۔ شیخ حسنؓ صاحب کی عادت تھی کہ وہ سوال نہ کرتے بعض لوگ پوچھتے اور حضرت میر صاحبؓ جواب دیتے یہ دونوں باتوں کا موازنہ کرتے اس اصل پر کہ قرآن کریم اور عقل صحیح کس کے ساتھ ہے کچھ دنوں آپ اس طرح تحقیقات کرتے رہے اور آخر انہوں نے سمجھ لیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے دعویٰ میں صادق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا یہی ذریعہ ہے اسی راستہ پر چل کر حقیقی اسلام کی روح نشوونما پاتی ہے اس طرح شیخ حسن نے حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے ذریعہ بیعت احمدیت کی۔

افسوس ہے تاریخ بیعت کی صحت نہ ہوسکی لیکن قرائن سے یہ پایا جاتا ہے کہ یہ بیعت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ اس لئے کہ ۲۰؍ مارچ ۱۸۹۸ء کے الحکم میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشاد سے اس عریضہ نیاز کو شائع کیا گیا ہے جو جماعت احمدیہ حیدرآباد نے ارسال کیا اور میں اس

کتاب میں شیوع احمدیت کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرآیا ہوں اور اس پر صرف دس احباب کے نام تھے اور اس وقت تک خود حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کو بھی یہ سعادت نہیں ملی تھی اور خود شیخ حسن صاحبؓ دوسری مرتبہ حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کے ہمراہ ۱۹۰۰ء میں قادیان تشریف لے گئے۔ جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۹۹ء میں قادیان گئے اور دستی بیعت کی جو پہلے بذریعہ خط کی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

''میں حضور کی زندگی میں تین مرتبہ قادیان گیا ہوں پہلی مرتبہ جانے کا سن صحیح طور پر یاد نہیں ۱۹۰۰ء سے ایک سال پہلے یا ایک سال بعد ہوگا میں مولوی میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم حیدرآبادی کے ساتھ قادیان گیا تھا اس وقت حضور ایک حجرہ میں تشریف رکھتے تھے جو مسجد مبارک کے ساتھ ملا ہوا تھا بہت تھوڑے آدمی اس میں بیٹھ سکتے تھے جس مقام پر بالعموم حضور بیٹھا کرتے تھے وہاں جاکر میں بیٹھ گیا لوگوں نے مجھے نہیں اُٹھایا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ حضور کے بیٹھنے کی جگہ ہے پھر جب حضورؑ تشریف لائے اور لوگوں نے مصافحہ شروع کیا تو میں بھی اُٹھا حضورؑ نے اپنے ہاتھوں کے اشارے سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ پھر حضور مجلس میں تشریف فرما ہوئے اس طرح کہ حضور والا کی مانڈی (ران) میری مانڈی (ران) پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ یہیں بیٹھے رہئے مجلس میں تیس آدمی ہوں گے یہ موسم بہار کے دن تھے ظہر کی نماز کی بات ہے تین روز وہاں قیام رہا حضور کے ساتھ دوسرے روز سیر کو گئے ...... مغرب سے پہلے ہم (مردان علی صاحب حیدرآبادی) اور دوسرے لوگ دس بیس آدمی تھے۔ حضرتؑ صاحب کے مکان میں ہی کھانا کھائے، ہم حیدرآبادیوں کے متعلق حضور اندر سے کہلوا بھیجے کہ حیدرآبادیوں کو ابھی کھانا نہ کھلوایا جائے۔ اس کے بعد بعدِ مغرب حضورؑ خود تشریف لائے اور دسترخوان بچھوایا گیا۔ مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے سوال پر حضورؑ نے فرمایا کہ آپ کو میں نے اس لئے روک لیا تھا کہ آپ لوگ حیدرآبادی ہیں جو چاول کھانے کے عادی ہیں اس لئے میں نے چاولوں کے پکوانے کا بندوبست کیا۔''

الحکم سے ہمیں ذیل کا اقتباس ملتا ہے:

''حیدرآباد دکن سے پانچ آدمی اس وقت دارالامان میں حضرت اقدسؑ کی پاک صحبت سے فیض اُٹھا رہے ہیں جن میں حصرت مولانا سید محمد سعید صاحبؓ اور مولانا سید محمد رضویؓ

صاحب دو بڑے سرگرم اور پُر جوش اور غیور ارادتمند ہیں جن کی سعی اور کوشش سے حیدر آباد دکن میں ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی ہے۔''الحمدللہ۔

دوبارہ قادیان کا سفر:

چونکہ قادیان کے سفر کی سعادت (حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا عہد) کا ذکر آ گیا ہے اس لئے دوبارہ قادیان کا ذکر بھی یہاں ہی درج کر دیتا ہوں۔

''اس کے بعد دوسری مرتبہ میں قادیان پھر دو سال بعد گیا ہوں سن یاد نہیں تین چار روز ٹھہرے ادب کی وجہ سے کوئی گفتگو نہیں کرتا۔ صرف حضورؑ کا چہرہ دیکھ لیتا اور حضورؑ کی باتیں سنتا اس کے بعد تیسری مرتبہ قادیان گیا تو اس وقت بھی یہی کیا' مصافحہ کرتا اور حضورؑ کی صورت دیکھ لیتا اور حضورؑ کی باتیں سنتا ہر مرتبہ جب ہم واپس ہوتے تو باوجود تانگوں کی موجودگی کے اپنے خدام کو چھوڑنے کے لئے حضورؑ نہر تک پیدل تشریف لاتے باوجود اصرار کے بھی تانگوں پر نہ بیٹھتے رخصت کرتے وقت دُعا کے بعد ہمیشہ فرماتے مجھ سے ہمیشہ ملا کرو اور بار بار قادیان آیا کرو ہم کو اس قدر تڑپ ہوتی تھی کہ کسی طرح اس مبارک چہرہ کو دیکھیں اور حضور کی باتیں سنیں۔ حضور اس ناچیز خادم کو ''سیٹھ صاحب'' کے لقب سے یاد فرماتے چنانچہ حضور کی دعاؤں کے طفیل خدا نے عاجز کو فی الواقع مالا مال کر دیا اور سیٹھ بنا دیا۔

حضرت شیخ حسن صاحبؓ یہ یقین رکھتے تھے کہ حضرت اقدسؑ کی زبان مبارک سے سیٹھ کا لفظ نکلا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فی الحقیقت سیٹھ بنا دیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قسم کے نشانات بہت سے ہیں کہ آپ نے ایک بات فرمائی وہ اُسی طرح پوری ہوگئی۔

قبول احمدیت کے ثمرات:

جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں یہ شیخ حسن صاحبؓ کی روحانی پیدائش تھی اور اس خصوص میں اس نے بہت جلد ترقی کی اور روحانی نشو و نما پایا وہ احمدیت سے پہلے صوم و صلوٰۃ کے پابند نہ تھے نماز کی اہمیت اور برکات سے ناواقف محض تھے۔ ان کی فطرت سعید ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ احمدیت کو ایک سوسائٹی کی حیثیت سے نہ دیکھتے تھے جیسے مختلف قسم کی برادریاں ہوتی ہیں بلکہ اس

نے اس جماعت کو ایک خدا تعالیٰ کی قائم کردہ اور مخصوص جماعت سمجھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے بیعت کے بعد حضرت میر محمد سعید صاحبؓ سے دریافت کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وہ اتنا تو عام طور پر جانتے تھے کہ لوگ جب زمانہ حال کے مشائخ یا پیروں کی بیعت کرتے ہیں تو وہ کچھ وظیفے یا اوراد بتاتے ہیں اس سوال سے شیخ حسنؓ کا مطلب صاف تھا کہ جماعت میں داخل ہو کر کسی عمل کی ضرورت ہے اُنہوں نے فرمایا کہ ''پانچ وقت باجماعت نماز ادا کریں قرآن مجید پڑھیں اور تہجد کی نماز سے بھلائی کریں'' آخری بات پر تو ان کا پہلے سے عمل تھا مگر پہلی دو باتوں کے ساتھ کچھ تعلق نہ تھا چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ:

''پہلے مجھے نماز کی عادت نہ تھی نہ ہی تہجد اور قرآن شریف سے شناسا تھا۔ کوشش سے تہجد میں باقاعدگی ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے نماز میں ایک ذوق اور شوق پیدا ہوگیا۔''

ایک بشارت:

میں شیخ حسن صاحبؓ کے قبول احمدیت کے ثمرات بیان کر رہا تھا ان برکات و ثمرات میں سب سے بڑی اُم البرکات تو یہ نصیب ہوئی کہ جس شخص نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی وہ نہ صرف حقیقی معنوں میں پابند صلوٰۃ ہوگیا اور فرض نمازوں کے علاوہ تہجد گذاری کی نہ صرف توفیق ملی بلکہ اس پر التزام نصیب ہوا۔ **ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء** اس ابتدائی انقلاب ہی میں آپ پر اللہ تعالیٰ نے الہام کا دروازہ کھول دیا شیخ حسنؓ فرماتے ہیں۔ ''کئی دن بعد ایک روز تہجد سے فارغ ہوا تو میری زبان پر بار بار **واللّٰہ یعصمک من الناس** کے الفاظ جاری ہوئے اور زبان انہیں بار بار دہرانے لگی اور خود بخود ہی گریہ و بکا شروع ہوگیا۔ میری بی بی پیرساں بی بی نے رونے کا سبب دریافت کیا میں نے یہ بات سُنائی لیکن عربی نہ انہیں آتی تھی اور نہ مجھے۔''

احمدیت سے محبت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ آپ اس نام کی تشہیر کو پسند کرتے تھے تا کہ اس طرف بھی توجہ ہو اس غرض کے لئے انہوں نے مختلف تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کئے اور ان کے نام کے ساتھ لفظ احمدیہ کو شامل کیا۔ مثلاً احمدیہ مدرسہ (۲) احمدیہ مدرسہ حفاظ قرآن

صاحب دو بڑے سرگرم اور پُر جوش اور غیور ارادتمند ہیں جن کی سعی اور کوشش سے حیدرآباد دکن میں ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی ہے۔" الحمدللہ۔

دوبارہ قادیان کا سفر:

چونکہ قادیان کے سفر کی سعادت (حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا عہد) کا ذکر آ گیا ہے اس لئے دوبارہ قادیان کا ذکر بھی یہاں ہی درج کر دیتا ہوں۔

"اس کے بعد دوسری مرتبہ میں قادیان پھر دوسال بعد گیا ہوں سن یادنہیں تین چار روز ٹھہرے ادب کی وجہ سے کوئی گفتگو نہیں کرتا۔ صرف حضورؑ کا چہرہ دیکھ لیتا اور حضورؑ کی باتیں سنتا اس کے بعد تیسری مرتبہ قادیان گیا تو اس وقت بھی یہی کیا' مصافحہ کرتا اور حضورؑ کی صورت دیکھ لیتا اور حضورؑ کی باتیں سنتا ہر مرتبہ جب ہم واپس ہوتے تو باوجود تانگوں کی موجودگی کے اپنے خدام کو چھوڑنے کے لئے حضورؑ نہر تک پیدل تشریف لاتے باوجود اصرار کے بھی تانگوں پر نہ بیٹھتے رخصت کرتے وقت دُعا کے بعد ہمیشہ فرماتے مجھ سے ہمیشہ ملا کرو اور بار بار قادیان آیا کرو ہم کو اس قدر تڑپ ہوتی تھی کہ کسی طرح اس مبارک چہرہ کو دیکھیں اور حضور کی باتیں سنیں۔ حضور اس ناچیز خادم کو "سیٹھ صاحب" کے لقب سے یاد فرماتے چنانچہ حضور کی دعاؤں کے طفیل خدا نے عاجز کو فی الواقع مالا مال کردیا اور سیٹھ بنادیا۔

حضرت شیخ حسن صاحبؓ یہ یقین رکھتے تھے کہ حضرت اقدسؑ کی زبان مبارک سے سیٹھ کا لفظ نکلا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فی الحقیقت سیٹھ بنادیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قسم کے نشانات بہت سے ہیں کہ آپ نے ایک بات فرمائی وہ اُسی طرح پوری ہوگئی۔

قبول احمدیت کے ثمرات:

جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں یہ شیخ حسن صاحبؓ کی روحانی پیدائش تھی اور اس خصوص میں اس نے بہت جلد ترقی کی اور روحانی نشوونما پایا وہ احمدیت سے پہلے صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ تھے نماز کی اہمیت اور برکات سے ناواقف محض تھے۔ ان کی فطرت سعید ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ احمدیت کو ایک سوسائٹی کی حیثیت سے نہ دیکھتے تھے جیسے مختلف قسم کی برادریاں ہوتی ہیں بلکہ اس

نے اس جماعت کو ایک خدا تعالیٰ کی قائم کردہ اور مخصوص جماعت سمجھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے بیعت کے بعد حضرت میر محمد سعید صاحبؓ سے دریافت کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وہ اتنا تو عام طور پر جانتے تھے کہ لوگ جب زمانہ حال کے مشائخ یا پیروں کی بیعت کرتے ہیں تو وہ کچھ وظیفے یا اوراد بتاتے ہیں اس سوال سے شیخ حسنؓ کا مطلب صاف تھا کہ جماعت میں داخل ہوکر کسی عمل کی ضرورت ہے اُنہوں نے فرمایا کہ "پانچ وقت باجماعت نماز ادا کریں قرآن مجید پڑھیں اور تہجد کی نماز سے بھلائی کریں" آخری بات پر تو ان کا پہلے سے عمل تھا مگر پہلی دو باتوں کے ساتھ کچھ تعلق نہ تھا چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ:

"پہلے مجھے نماز کی عادت نہ تھی نہ ہی تہجد اور قرآن شریف سے شناسا تھا۔ کوشش سے تہجد میں باقاعدگی ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے نماز میں ایک ذوق اور شوق پیدا ہوگیا۔"

ایک بشارت:

میں شیخ حسن صاحبؓ کے قبول احمدیت کے ثمرات بیان کر رہا تھا ان برکات وثمرات میں سب سے بڑی اُم البرکات تو یہ نصیب ہوئی کہ جس شخص نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی وہ نہ صرف حقیقی معنوں میں پابند صلوٰۃ ہوگیا اور فرض نمازوں کے علاوہ تہجد گذاری کی نہ صرف توفیق ملی بلکہ اس پر التزام نصیب ہوا۔ **ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء** اس ابتدائی انقلاب ہی میں آپ پر اللہ تعالیٰ نے الہام کا دروازہ کھول دیا شیخ حسنؓ فرماتے ہیں۔ "کئی دن بعد ایک روز تہجد سے فارغ ہوا تو میری زبان پر بار بار **واللّٰہ یعصمک من الناس** کے الفاظ جاری ہوئے اور زبان انہیں بار بار دہرانے لگی اور خود بخود ہی گریہ و بکا شروع ہوگیا۔ میری بی بی پیرساں بی بی نے رونے کا سبب دریافت کیا میں نے یہ بات سُنائی لیکن عربی نہ انہیں آتی تھی اور نہ مجھے۔"

احمدیت سے محبت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ آپ اس نام کی تشہیر کو پسند کرتے تھے تاکہ اس طرف بھی توجہ ہو اس غرض کے لئے انہوں نے مختلف تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کئے اور ان کے نام کے ساتھ لفظ احمدیہ کو شامل کیا۔ مثلاً احمدیہ مدرسہ (۲) احمدیہ مدرسہ حفاظ قرآن

کریم (۳) احمدیہ دواخانہ انگریزی (۴) احمدیہ دواخانہ یونانی (۵) احمدیہ مطبع (۶) احمدیہ قبرستان (۷) احمدیہ نسواں (۸) احمدیہ لائبریری (۹) احمدیہ مسجد (۱۰) اپنا نام ہمیشہ شیخ حسن احمدی لکھتے اور اپنی مصنوعات کے نام کے ساتھ بھی احمدیہ کا اضافہ کیا۔ (۱) احمدی بیڑی (۲) احمدی چاند تارا بیڑی۔ احمدیہ محلہ۔ احمدیہ کارخانہ۔

غرض اس طرح پر احمدی اور احمدیہ کے نام اور کاروبار کے ساتھ جزولاینفک بنا کر احمدیت کی تبلیغ کو ہر گوشہ میں پہنچانے کا اہتمام کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مقصد میں کامیاب کیا اور متعدد جماعتیں اور سینکڑوں انسانوں کو سلسلہ میں داخل کرنے کا موجب ہوئے اور یہ سلسلہ اب ان کے ذریعہ سے بڑھتا چلا جارہا ہے اور اس طرح **الدال علی الخیر کفاعلہ**۔

اس کا اجر بھی حضرت شیخ حسن صاحبؓ کے نامہ اعمال میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ آج آپ کی اولاد، نسل اور رشتہ داروں میں بھی خدمت سلسلہ کا بے بہا جذبہ موجود ہے الحمدللہ۔ (ناقل)

دینی برکات:

احمدیت کی برکات روحانیہ اور انوار سماویہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں بھی ایک خاص برکت رکھ دی میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ کاروبار انہوں نے دو روپے سے شروع کیا تھا اور احمدیت کے بعد اس کی ساکھ لاکھوں روپے تک پہنچ گئی اور مختلف مقامات پر اس کی شاخیں اور عمارتیں تیار ہوگئیں۔

اور آمدنی کا یہ حال تھا کہ گنتی نہیں کرتے بلکہ ترازو سے روپیہ تلتا تھا اور چار ہزار کے قریب کاریگر مختلف کارخانوں میں کام کرتے تھے مدراس۔ بنگال۔ ممبئی اور دکن کے علاقوں میں چالیس کے قریب ایسی دکانیں تھیں جہاں ذاتی نگرانی میں براہ راست آپ کا مال فروخت ہوتا تھا اور مختلف مقامات پر ایجنسیاں تھیں۔

اور نو دس مقامات پر آٹے تیل نکالنے اور کپاس بیلنے کی گرنیاں تھیں مگر اس کثرت مال اور وسعت کاروبار نے آپ کو کبھی اپنا گرویدہ نہ کیا بلکہ انہوں نے اس خدا داد نعمت کا عملاً شکریہ ادا کیا غریبوں کی مدد کی اور اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت پر اسے خرچ کیا اپنے لئے کوئی خاص سامان آسائش و آرائش پیدا نہ کیا۔

ایک عبد شکور کی طرح خدا تعالیٰ کی اس دی ہوئی امانت کو خرچ کرتے رہے اموال کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اولاد میں بھی کثرت عطا کی اور سب سے بڑا فضل یہ کیا کہ صالح اور سعادت مند دیندار اولاد عطا کی جو ان کے اعمال صالح کے لئے ایک صدقہ جاریہ ہے۔

کاروبار کی وسعت:

کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں ۲۹ کارخانے ۱۶ دکانیں اور اس کے علاوہ بہت سے ایجنٹ کام کرتے تھے اور اوسطاً چار ہزار کاریگر کام کرتے تھے۔ اور ان دوکانوں اور کارخانوں کے نظم ونسق نگرانی اور تنقیح کے لئے جو عملہ مقرر تھا اس کی ماہانہ تنخواہ کی برآورد چند ہزار تھی اور روزانہ اوسط تیار شدہ بیڑی کی تعداد ۱۶ لاکھ تھی جو ایک سوا روپے فی ہزار فروخت ہوتی تھی اس طرح گویا ایک ہزار روپے کم از کم روزانہ کی آمدنی باوجود ہر قسم کی فیاضی اور فراخ دلی سے خرچ کرنے کے۔ اسٹیٹ کی مالیت بیس بائیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ آپ لکھے پڑھے نہ تھے مگر کارخانہ کے حساب کتاب کو شروع سے باقاعدہ رکھا اور ایسے طور پر حساب کتاب رکھا جاتا کہ ایک ماہر مالیات ہی اس کی قدر کرسکتا ہے یہ سلسلہ ۱۹۳۰ء تک رہا یعنی کاروبار میں ترقی کا دور ۱۹۳۰ء میں اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گیا تھا۔

اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا اور جس نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ ایک عبد شکور ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی جگہ بیان کیا ہے کہ مال و دولت اور کثرت اولاد انسان کے لئے ایک امتحان ہوتا ہے۔ مومن اس میں کامیاب نکلتا ہے لیکن یہ چیزیں ہر انسان کے لئے مختلف رنگوں میں ذریعہ امتحان ہوتی ہیں۔

آغاز نقصان:

نقصان کے اسباب پیدا ہونے لگے اور نقصان شروع ہوگیا۔ ابتداء اس طرح ہوئی کہ پربھنی کے لئے کارخانہ میں ایک لاکھ روپے مالیت کی بیڑی تیار کی گئی اور اسکیم یہ تھی کہ اگر یہ بیڑی وہاں پسند کی جاوے تو اس کو ترقی دی جاوے مگر چونکہ مشیت ایزدی میں شیخ حسن کے امتحان نقص

من الاموال کا پہلا پرچہ یہی تھا اس لئے یہ چھ سات کروڑ بیڑی گویا ضائع ہوگئی اور کارخانہ ایک لاکھ کا زیر بار آ گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت میں ایک رخنہ پیدا ہوگیا اور بیڑی کی چال بھی رُک گئی دوسرا دھکا اس سلسلے میں یہ لگا کہ پینتیس ہزار کی بیڑی تیار کرکے رنگون بھیجی گئی وہاں مال تیار نہ ہوسکا اور مقبول نہ ہوا اور اس طرح یہ رقم بھی ڈوب گئی۔

اس قسم کے نقصانات نے تجارت میں خطرناک موڑ پیدا کیا اور ادھر اس نقصان کی شہرت اور کاروبار کی کساد بازاری نے آپ کی ساکھ پر بھی اثر ڈالا حالانکہ معاملہ دار لوگ ان کے حسن معاملہ اور کھرے پن سے واقف تھے لیکن دُنیا داروں کو تو اس چیز کی پرواہ نہیں ہوتی انہوں نے سمجھا کہ کاروبار اور آمدنی کی صورت بگڑ رہی ہے۔ اس لئے وہ جو کبھی مطالبہ نہ کرتے تھے اور باہمی لین دین میں کسی قسم کی ضمانت اور کفالت کا بھی مطالبہ نہ کرتے تھے ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ یہ معاملت بڑھتی جاوے نقصانات کے حالت کو دیکھ کر مطالبے اور تقاضے کرنے لگے مگر شیخ حسن صاحبؓ کے چہرے پر ان حالات میں بھی کوئی آثار ملال وفکر ظاہر نہ ہوئے وہ ایک خوش حال اور مطمئن قلب کے ساتھ ہمیشہ پُرسکون اور بشاش نظر آتے اور دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی کہ یہ کس بلند حوصلہ کا انسان ہے۔ میں نے ان کو ان ایام ابتلا میں بلکہ یوں کہو کہ آغاز ابتلا سے دیکھا اور جب تک اس اِبتلا سے وہ کامیاب اور بامراد نہ نکل گئے مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور جن لوگوں نے ان حالات میں ان کو دیکھا ہے وہ اس امر میں متفق ہیں۔

ان نقصانات نے شیخ حسنؓ صاحب کو اپنے مقام صبر و رضا اور قیام فی ما اقام اللہ سے ذرا نہیں ہٹایا۔ ایسے موقعوں پر بعض لوگ خودکشی کر لیتے یا غم وفکر میں حرکت قلب بند ہوجاتی ہے یا وہ ایسے ذرائع اختیار کرتے ہیں جو تقویٰ کے خلاف ہوں اور یا بعض قانونی حیل کے ذریعہ نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ دیوالیہ ہونے کی درخواست دیتے ہیں۔ مگر شیخ حسن صاحبؓ نے نہ تو کبھی اس قسم کے مشوروں کو سُنا اور نہ بےصبری کا اظہار کیا بلکہ آپ یقین واثق کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ حالات بدل جائیں گے۔ ایسے موقعہ پر بعض خام طبع اور کمزور طبیعت کے مومن بھی سوءِ ظن علی اللہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا سے کامل صلح کے بجائے نعوذ باللہ شکوہ کرتے ہیں اور بعض حالتوں میں تو دہریہ ہوجاتے ہیں اور بجائے اپنی

کمزوریوں کا اعتراف کرنے کے اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کو منسوب کرتے ہیں اور کامل مایوسی ان پر طاری ہوجاتی ہے۔ برخلاف اس کے شیخ حسنؓ پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ وہ اس قسم کی ابتلا میں اپنے مولیٰ کا فرمانبردار اور اپنی کمزوریوں کا معترف تھا اور ان کے لئے استغفار کرتا۔ فرمایا کرتے:

''کہ ہماری کچھ غلطیاں ہمارے نامہ اعمال میں ہوں گی اس لئے یہ آزمائش پیش آئی۔''

کاروبار میں وسعت ہوئی اور مال و دولت بے حساب آنے لگی تو اس نے ان اموال کو غرباء کی دستگیری اور حاجتمندوں کی مشکل کُشائی میں صرف کیا اور جب کاروبار میں نقصان ہوا تو اُس نے اپنے اعمال سے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا اسے ذریعہ سمجھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مومن اس چیز کو طلب نہیں کرتا اور طلب کرنا بھی نہیں چاہئے۔ انسان کی روحانی ترقیات کے لئے جس قدر زیادہ مفید اور مؤثر ابتلاء ہوتا ہے دوسرا نہیں۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے:

''اے ہووے گی کیمیا جے دِن تھوڑے ہو'' کہ یہ عہد ابتلا کا حال ایک کیمیا کا ہوتا ہے بشرطیکہ کم دنوں تک قائم رہے۔

اس خصوص میں خود شیخ حسن صاحبؓ کا بیان اپنے اندر ان کی ایمانی کیفیت ظاہر کرتا ہے جسے میں یہاں ظاہر کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ جب آپ رنگون تجارت کے لئے چلے گئے اور یکدم تجارت میں لاکھوں روپے کا خسارہ ہوا۔ گھر کے لوگ اور ملازمین پریشان تھے۔ ان ڈیڑھ لاکھ روپے کی مالیت کے بارہ دیوانی مقدمات آپ پر دائر ہوچکے تھے۔ گھر سے فوری واپسی کے لئے تار آیا۔ آپ دُعائیں کرتے ہوئے واپس ہوئے۔ جب جہاز مدراس کی گودی میں لنگر ڈال رہا تھا تو آپ کی زبان پر بار بار لاغلبنّ لِأمری لأغلبنّ علٰی امری کے الفاظ جاری ہوئے چنانچہ آپ کو کامل اطمینان ہوگیا اور جب آپ کے بیٹے شیخ عبدالحی صاحب نے پریشان کن حالات سنائے تو آپ نے اپنا الہام سنا کر تسلی دی۔

مخالفین سلسلہ نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ چونکہ سیٹھ صاحب نے جھوٹے سلسلہ کی خاطر مال و دولت خرچ کی۔ اس لئے ان کا گھر برباد ہوگیا۔ شیخ حسن اب ختم ہوا۔ اب اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ جمعہ کے بعد آپ نے مسجد احمدیہ یادگیر میں کہا کہ میں

دوستوں کو کچھ سنانا چاہتا ہوں۔ لوگ میرے خسارہ کو دیکھ کر ایسی باتیں کرتے ہیں میں مسجد میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بار بار بتایا کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک تجارت کی حالت پہلے جیسی نہ ہو جائے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ پر حد درجہ یقین تھا فرماتے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کیا ہی عمدہ ہے کہ الدُّنیا جیفۃٌ و طلا بھا کلابٌ کہ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔ دنیادار مال و متاع اور حشمت و جاہ کے طالب، ان کے حصول کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز روا نہیں رکھتے اور اس وجہ سے کتے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ معمولی فائدہ کی خاطر جھوٹ بول لینے اور معاہدہ توڑ دینے کو شیر مادر کی طرح حلال سمجھتے ہیں۔ اس ابتلاء میں آپ کے یہ اوصاف بھی اُجاگر ہوئے کہ باوجود وکلاء کی تلقین کے آپ نے جھوٹ بولنے سے انکار کیا اور راستبازی و راست گفتاری کا دامن نہ چھوڑا جن صبر آزما حالات میں سے آپ کو گزرنا پڑا اس میں صداقت شعاری اور ایمان کی حفاظت بہت ہی مشکل امر تھا۔ آپ کی وصیت کے ریکارڈ میں مکرم سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ حیدرآباد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں سیٹھ صاحب نے خسارہ کی وجہ سے دو لاکھ روپے قرض حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۴ء میں سیٹھ صاحب نے تحریر کیا کہ گزشتہ تین سال میں میرا تین لاکھ کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اور اتنا ہی میرے ذمہ قرض ہے اور ۱۹۳۶ء میں تحریر کیا کہ اب آمد دوصد روپے ماہوار بھی نہیں رہی۔ ۱۹۴۰ء میں آپ پر نوّے ہزار روپے کے مقدمات دائر تھے۔ وکلاء کا خرچ علیحدہ۔ صرف ساٹھ روپے آپ گھر کے اخراجات کے لئے لیتے تھے۔ کیونکہ گزشتہ سال کے کاروبار میں صرف دس ہزار روپے کی بچت ہوئی تھی۔ جو رقوم مقدمات وغیرہ کے بالمقابل کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کے اس عہد ابتلاء کو عہد اصطفاء بنا دیا اور وہ تمام مصائب کے بادل یکے بعد دیگرے اُڑ گئے اور بارانِ رحمت کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔ الحمد للہ اوّلاً و آخراً و ظاہراً و باطناً.

طرزِ تبلیغ کی ایک مثال:

شیخ حسنؓ صاحب سادہ لوح انسان تھے اُن کے کلام میں بھی سادگی مگر پختگی ہوتی تھی۔ ان کے کلام میں انسانی فطرت کو گویا اُبھارا جاتا تھا۔ میں اس سلسلہ میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

مکرم مولوی مومن حسین صاحب ایک مخلص اور سرگرم احمدی ہیں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد خلافتِ ثانیہ کی بیعت میں انہیں تامل ہوا۔ اس وقت ان پر دوسرے فریق کا اثر تھا وہ محض اخلاص سے تھا۔ کسی قسم کی ہٹ دھرمی نہ تھی۔ شیخ حسن صاحبؓ کو ان کے ساتھ عزیزداری کے تعلقات بھی تھے اور ان کو یہ بہت ناگوار اور تکلیف دہ امر تھا کہ وہ بیعت نہ کریں۔ دوسرے دوستوں نے بھی ان کو تبلیغ کی اور مختلف مسائل پر بحثیں کیں۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر شیخ حسن صاحبؓ نے ان کو خطاب کیا۔ اس طرح ان کو شرح صدر ہوا اور بڑے خلوص کے ساتھ خلافت سے وابستہ ہو گئے۔

دُوسری شادی کا ذکر:

شیخ حسن صاحبؓ نے شرعی ضرورت کے تحت پہلی بی بی کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کی۔ اس شادی کا مقصد جیسا کہ عمل سے معلوم ہوتا ہے یہی دین اور تقویٰ کے طریق پر قدم مارنے کے لئے قرآن کریم کی ہدایات اور رعایاتِ عدل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سے زیادہ شادیاں، چار کی حد تک بھی جائز ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کرتا ہوں اس شادی میں اشاعتِ احمدیت کا بھی خیال تھا۔

سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے قریباً گیارہ سال گزر رہے تھے کہ شیخ حسن صاحبؓ نے دوسری شادی ۱۹۱۰ء میں محترمہ رسول بی صاحبہ بنت شیخ محی الدین صاحب ساکن چنتہ کنٹہ ضلع محبوب نگر سے کی۔ میں نے بیان کیا ہے کہ شرعی ضرورت کے علاوہ اصل مقصد تبلیغ سلسلہ بھی تھا۔ چنانچہ اس رشتہ کا مبارک نتیجہ یہی ہوا کہ چنتہ کنٹہ میں ایک فعال جماعت احمدیہ قائم ہو گئی اور اس جماعت کے سردار سیٹھ محمد حسین صاحب احمدی، محترمہ رسول بی کے حقیقی بھائی ہیں۔ وہ بالکل شیخ حسن صاحبؓ کے نقشِ قدم پر ہیں۔ ان میں تبلیغ سلسلہ کے لئے ایسا جوش ہے کہ دوسرے ان کو

مجنون کہتے ہیں ۔ حقیقت میں سلسلہ کو ایسے مجنونوں کی ضرورت ہے ۔ تبلیغ حق ایک جنون ہی کو چاہتی ہے اور اس لئے انبیاء علیہم السلام کو منکرین نے مجنون کہا ہے سیٹھ محمد حسین احمدی کا خاندان بالکل اسی رنگ میں رنگین ہے جو شیخ حسنؓ کا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی دنیوی عزت و دولت سے نوازا اور اس کے ساتھ ہی اشاعت سلسلہ کا خاص جوش عطا کیا ۔ اس راہ میں وہ ہر قربانی کو آسان سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی سعادت مند اولاد دی ہے ۔ چنانچہ ان کے فرزند اکبر محمد معین الدین احمدی بھی بڑے سرگرم مبلغ ہیں اور ماہانہ ایک مخصوص رقم مختلف قسم کے ٹریکٹ وغیرہ شائع کرنے میں صرف کرتے ہیں اور بغیر کسی قسم کی نمود و نمائش کے خاموشی کے ساتھ کام کر رہے ہیں ۔ میں سیٹھ محمد حسین احمدی کے متعلق ذاتی علم رکھتا ہوں کہ میرے ادارہ حقائق و معارف قرآنیہ کی اشاعت میں انہوں نے ہر طرح مجھے مدد دی ۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول کرے ۔

غرض شیخ حسن صاحبؓ نے محترمہ رسول بی سے شادی کی اور اس کے برکات اور ثمرات میں چڈتہ کنٹہ ایک مخلص اور حقیقی معنوں میں احمدیہ جماعت کا ایک مرکز ہے اس خاندان کے ساتھ ہی حضرت سیٹھ محمد غوث کے بھی گہرے تعلقات تھے مکرم سیٹھ محمد حسین احمدی کی دوسری بہن کی شادی حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب سے ہوئی ۔ میں جب دونوں خاندانوں کے تعلقات پر غور کرتا ہوں تو قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت پر ایک نیا ایمان پیدا ہوتا ہے ۔ سورۂ نور آیت ۲۷ ۔ "الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ والطَّیِّبُوْنَ للطَّیِّبٰتِ . تاعرصہ حیات شیخ حسنؓ کی پہلی اور دوسری بی بی نے باہم مل کر گزارا ۔ اور اس عرصہ میں کبھی کسی قسم کا کوئی واقعہ نہ پیدا ہوا جو حسن معاشرت کے خلاف ہو ۔ یہ دوسری بی بی محترمہ رسول بی اب تک بقید حیات ہیں اور وہ سٹھانی ماں کی کنیت کے موافق ان کی اولاد کو اپنی ہی اولاد سمجھتی ہیں اور اولاد تو "برالوالدین" ہی ہے ۔ وہ ان سے اسی رنگ میں برتاؤ کرتی ہے جیسے ایک سعادت مند اولاد اپنی ماں سے کرتی ہے ۔

سٹھانی ماں کی وفات پر تعزیت :

سٹھانی ماں یعنی شیخ حسنؓ کی پہلی اہلیہ مکرمہ کا انتقال ۱۴ر ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ کو ہوا ۔ مرحومہ موصیہ تھیں کسی وجہ سے ان کا جنازہ قادیان نہ جاسکا ۔ مگر ان کا کتبہ مقبرہ بہشتی میں لگایا گیا ۔

شیخ حسن نے یادگیر میں ایک احمدیہ قبرستان بھی مخصوص کر دیا تھا ۔ اس لئے مرحومہ کو اس مقبرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا ۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز (حضرت مصلح موعودؓ) کو جب مرحومہ کی وفات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ۲ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو مندرجہ ذیل تعزیت کا خط لکھا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم قادیان ۲/۱۰/۲۸

مکرمی سیٹھ صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

والدہ عزیز عبدالحی کی وفات کی اطلاع آپ کے خط مؤرخہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۲۸ء سے ہوئی ۔ معلوم کر کے افسوس ہوا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے والسلام

خاکسار

مرزا بشیر الدین محمود احمد

تیسری شادی :

دوسری شادی کے تقریباً پندرہ برس بعد ۱۹۲۵ء میں شیخ حسن صاحبؓ نے تیسری شادی کی ۔ اس بی بی کا نام محترمہ خواجہ بی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بطن سے حضرت شیخ حسن صاحبؓ کو تین بچے عطا فرمائے ۔ دو لڑکیاں امۃ الحفیظ و امۃ المنیر اور ایک لڑکا محمد الیاس ہے ۔ محترمہ رسول بی سفرِ حج میں شیخ حسن صاحبؓ کے ساتھ تھیں ۔ انہیں نہ صرف سعادت حج نصیب ہوئی بلکہ شیخ حسن صاحب کی آخری خدمت کا بھی انہیں کافی موقعہ ملا ۔

شیخ حسن صاحبؓ کی شادیوں کے درمیانی وقفہ پر اگر غور کیا جاوے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے آپ کا مقصد اس تعدد ازدواج سے محض حصولِ تقویٰ اور اشاعت سلسلہ تھا تاکہ بیگمات کے ذریعے مستورات میں سلسلہ تبلیغ قائم کیا جاوے اور اس طرح ان بدعات و رسوم بد اور مشرکانہ اعمال سے ان کو بچایا جاوے ۔ اپنی جوانی کا زمانہ تو آپ نے ایک ہی بی بی کے ساتھ بسر کیا اور جب عہد پیری کا آغاز ہو چکا تو دوسری شادی کی ۔ اور تیسری شادی تو بڑھاپے کے شباب یعنی شیخ شباب کی حالت میں ۔ چونکہ زندگی متقیانہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام قویٰ کو آخر تک صحیح سلامت رکھا ۔

دوسری شادی کے سلسلہ میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اُس وقت تک چنتہ کنٹہ میں کوئی کارخانہ آپ نے قائم نہ کیا تھا بلکہ یہ شادی کرنول میں کارخانہ قائم کرنے کے بعد کی تھی۔ لیکن جب شیخ حسن صاحبؓ نے دیکھا کہ (مکرم محمد حسین جن کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی) کنبہ بہت بڑا ہے اور اخراجات بہت زیادہ ہیں اس لئے اخراجات کی پابجائی اور خاندان کی پرورش کے خیال سے (تاکہ اس ذریعہ سے وہاں عملاً مستقل جماعت بھی قائم ہو) چنتہ کنٹہ میں کارخانہ جاری کیا۔ یہ شیخ حسن صاحبؓ کے حُسنِ سلوک کی ایک مثال ہے جو وہ اپنے رشتہ داروں سے کرتے تھے اور ان کی بہتری اور ترقی کی تدابیر سوچتے تھے۔ آج چنتہ کنٹہ کا کارخانہ بڑے اچھے پیمانہ پر چل رہا ہے۔ اور خاندان آسودہ حال اور فارغ البال ہے اور وہ اس فارغ البالی کے شکریہ میں خدمتِ دین کے لئے اپنے دل میں جوش اور اخلاص رکھتے ہیں بلکہ بالکل شیخ حسن صاحبؓ کے رنگ میں رنگین ہیں اور سلسلہ احمدیہ کی اشاعت کے لئے ان کے اموال اور نفوس ہر طرح آگے آگے ہیں۔

بعد میں محترم سیٹھ محمد الیاس صاحب لمبے عرصہ تک یادگیر کے امیر جماعت کے فرائض ادا کرتے رہے اور محترمہ امۃ الحفیظ صاحبہ کی شادی محترم سیٹھ محمد اسمٰعیل صاحب صدر جماعت احمدیہ چنتہ کنٹہ سے اور محترمہ امۃ المنیر صاحبہ کی شادی محترم سیٹھ رشید احمد صاحب مرحوم سے ہوئی۔ ان کی اولادیں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے سلسلہ سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں۔ اور محترم حضرت سیٹھ محمد حسین صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے الحاج سیٹھ محمد معین الدین صاحب ایک لمبے عرصہ سے جماعت احمدیہ حیدرآباد کے امیر ہیں۔ (ناقل)

شیخ حسن صاحبؓ کی زندگی کا مقصد انسانیت کی خدمت تھا۔ اور چونکہ قرابت داروں کا حق مقدم ہے اس لئے شیخ حسنؓ نے اپنی ترقی کے ساتھ خاندان کے تمام افراد کو اسی شاہراہ ترقی پر ڈال دیا۔ اور نہ صرف دنیوی طور پر بلکہ روحانی رنگ میں بھی انہیں اٹھایا اور ایسے رنگ میں ان کی تربیت کی کہ وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے وفادار اور ایثار پیشہ افراد ہو گئے۔ شیخ حسنؓ کے حقیقی بھائی محمد خواجہ مرحوم احمدی تھے اور ان کا سارا خاندان احمدی ہے اور چچازاد بھائی حضرت سیٹھ محمد غوث تھے اور شیخ حسنؓ نے اپنے حقیقی بھائی کی طرح ان سے سلوک کیا۔ میں نے الفضل جلد ۳۵ نمبر ۸۵ میں حضرت محمد غوث کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور اس میں ذکر کیا ہے کہ شیخ حسنؓ کے عملی انقلاب نے انہیں

احمدیت کی طرف متوجہ کیا اور پھر وہ اس رستہ میں ایک شہید کا مقام رکھتے تھے۔ آبائی خاندان احمدیت میں داخل ہو گیا اور رشتہ داروں میں حضرت مولوی مومن حسین اور سیٹھ محمد حسین صاحب ساکن چنتہ کنٹہ اور ان کا خاندان احمدی ہوا اور سب کے سب خاندان احمدیت کے فدائی ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اگر مختصر سا تذکرہ بھی کروں تو یہ کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی۔ میں نے جب حضرت محمد غوث کا تذکرہ اخبار میں شائع کیا تو شیخ حسنؓ کا حیات نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی توفیق پاتا ہوں اور میں امید رکھتا ہوں کہ اس مردِ باخدا کے ذکرِ خیر کی توفیق دے کر اللہ تعالیٰ مجھے بھی اپنے دامنِ رحمت میں چھپالے گا۔ میں تو ایک کمزور اور خطا کار انسان ہوں مگر ہاں حبّ الصالحین کی رُوح ضرور رکھتا ہوں۔"

(ان دنوں حضرت سیٹھ شیخ حسنؓ صاحب کے پوتے محترم سیٹھ محمد عبدالصمد صاحب احمدی، امیر جماعت احمدیہ یادگیر ہیں اور یہ جماعت بڑی شان کے ساتھ شاہراہ غلبہ اسلام پر گامزن ہے۔

(ہفت روزہ بدر قادیان، ۲۴ رفبروری اور ۸ر مارچ ۱۹۹۰ء)

احمدیہ لائبریری یادگیر

حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ جماعت احمدیہ یادگیر کے روحِ رواں اور بہت مخیّر اور بلند پایہ بزرگ تھے۔ آپ نے اپنی ذاتی کوشش سے یادگیر میں ایک شاندار احمدیہ لائبریری قائم کی اور اس کا افتتاح ۱۹۴۳ء کو عمل میں آیا۔ اور مولوی محمد اسماعیل صاحب فاضل وکیل اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے[1]

حضرت شیخ یعقوب علی صاحبؓ (عرفانی الکبیر) نے "حیاتِ حسنؓ" میں اس لائبریری کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"سلسلہ کی اشاعت اور عوام میں مذہبی اور علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے حضرت حسنؓ نے ۶ر مہر ۱۳۴۳ف کو یادگیر بازار میں احمدیہ لائبریری کو قائم کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص جو

(۱) "الفضل" ۲۸ رظہور ۱۳۲۲ ہش/۱۹۴۳ء۔ صفحہ ۴۔

بذاتِ خودعرفی دولتِ علم سے آشنا نہیں وہ اشاعتِ علم کا کس قدر جوش اپنے دل میں رکھتا ہے اور نہ صرف جوش بلکہ وہ خوب سمجھتا ہے کہ لوگوں کے معلومات میں کس طرح اضافہ کیا جاسکتا ہے اور کس طرح ان میں علمی مذاق پیدا ہوسکتا ہے۔ غرض ایک نیک مقصد کے پیش نظر یہ لائبریری قائم کی گئی۔ اور ایک فرد واحد کی طرف سے یہ پہلی لائبریری تھی۔ اس لائبریری کے قیام اور اس کے ابتدائی اخراجات تو خود حسن اور اس کے خاندان کے افراد نے اپنے ذمہ لئے۔ پھر حضرت سیٹھ عبداللہ بھائی نے گرانقدر امداد دی اور اس کے جاریہ اخراجات کے لئے سالانہ اعانت مقرر کی تھی۔ وہ لائبریری جو چند کتابوں سے شروع ہوئی۔ آج اس میں چار ہزار کتابیں موجود ہیں جو تفسیر' حدیث' فقہ' سیرۃ وسوانح' تاریخ' کتب سلسلہ احمدیہ جو خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفاء سلسلہ کے علاوہ علمائے سلسلہ کی تصانیف پر مشتمل ہیں۔ اور ان کے علاوہ مذاہب مختلفہ' ہر قسم کی اخلاقی کہانیاں' اخلاقی ناول (انگریزی' اُردو) گویا ہر مذاق کے لوگوں کے لئے ایک ذخیرہ جمع کردیا گیا۔ اور عام ملکی اور غیر ملکی اخبارات کے علاوہ سلسلہ کے اخبارات ورسائل موجود رہتے ہیں۔ ماہانہ اوسطاً ۶۰۰ افراد اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ گویا ۸ ہزار کے قریب افراد دارالمطالعہ میں آتے ہیں۔ ایک ہزار روپے سالانہ اس پر خرچ ہوتا ہے۔ اور خرید کتب واخبارات ملاکر تین ہزار سالانہ خرچ ہے۔

اس لائبریری سے ہر طبقہ کے شوقین اور علم دوست لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا باقاعدہ انتظام سکریٹری بیت المال جماعت احمدیہ یادگیر کے سپرد ہے۔ مستقل ممبروں کے لئے قواعد وضوابط ہیں۔ غرض یہ لائبریری اپنی طرز کی تعلقہ یادگیر میں ایک ہی ہے اور ہر روز ترقی کرتی جاتی ہے' کیا کتابوں کے ذخیرہ کی وجہ سے اور کیا دارالمطالعہ میں آکر استفادہ کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے۔

یہ محترم حسنؓ صاحب کی ان مساعی جمیلہ میں سے ایک ہے جو انھوں نے اشاعت علوم اور مذہب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کی ہیں۔ اس قسم کی لائبریری ہر شخص قائم نہیں کرسکتا۔ یہ حکومت کا کام ہے مگر محترم حسنؓ جس کے دل میں ملک اور قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا اور جو چاہتا تھا کہ گرے ہوئے انسانوں کو اٹھائے' اُن میں علمی شوق پیدا ہو' اُن کی معاشی حالت

درست ہو اور اُن کے اندر اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوں۔ اس نے اس ضرورت کو اپنی ضرورتوں پر مقدم کرلیا۔ اپنی ضروریاتِ زندگی میں کفایت اور سادگی پیدا کرکے دوسروں کو جو اُٹھ نہ سکتے تھے اپنے اموال کو اُن کے اُٹھانے پر خرچ کردیا اور آج اس کے وفات پاجانے پر بھی یہ سلسلہ بدستور قائم ہے۔ الحمدللہ علی ذالک۔''

بہ حوالہ تاریخ احمدیت جلد(   )

مکرم ابوالحمید آزاد صاحبؓ ایڈوکیٹ

دوسرے امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن

مکرم ابوالحمید آزاد صاحبؓ 313 صحابہ حضرت مسیح موعودؑ کی فہرست میں شامل ہیں ۔ یہ کب اور کس کی تبلیغ سے احمدی ہوئے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی میر محمد سعید صاحبؓ کی تبلیغ سے احمدی ہوئے ہوں گے' حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کے انتقال کے بعد بالاتفاق رائے بلا مقابلہ امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد منتخب ہوئے ۔ ان کا مقام جماعت اور غیر از جماعت کے معززین میں بہت اونچا تھا۔ انہوں نے ناظم عدالت اور کئی اضلاع دکن کی عدالتوں میں جج کی خدمات انجام دیں ۔ وظیفے کے بعد وہ اپنے دفتر وکالت واقع نیا پل پر تبلیغی مصروفیات میں منہمک رہتے ۔ ان کا شمار ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور ذہین لوگوں میں ہوتا تھا۔

مکرم سیٹھ محمد اعظم صاحب بیان کرتے تھے کہ 1930 ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے جلسے مدراس کی صدارت کے لئے اُن کو مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف نہ صرف قانون دان تھے بلکہ ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے اور آزادؔ تخلص فرماتے تھے ۔ افسوس کہ ان کا کلام اور ادبی کاوشیں مفقود ہیں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔

ایک دفعہ مولانا سخت بیمار ہوگئے ۔ مکرم سید بشارت احمد صاحب نے اُن سے کہا کہ مولانا خدانخواستہ اگر آپ کی وفات ہوجائے تو آپ کی تدفین کہاں پر عمل میں لائی جائے ۔ اس پر مولانا نے سکوت اختیار فرمائی ۔ چند دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا کو صحت عطا فرمائی ۔ جب مولانا سے ذکر کیا گیا کہ آپ کی بیماری کے دوران یہ سوال اُٹھا تھا تو آپ نے خاموشی اختیار کی تھی اس پر مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری تدفین حنفی طریق کے مطابق کی جائے ۔ جو احمدیوں میں مروج ہے ۔ اور احمدیہ قبرستان میں تدفین عمل میں لائی جائے ۔ افسوس کہ جب مولانا کی وفات ہوئی اس وقت حیدرآباد میں ہندو مسلم فساد برپا تھا اور محلہ فتح دروازہ جہاں احمدیہ

مکرم ابوالحمید آزاد صاحب رضی اللہ عنہ ایڈوکیٹ دوسرے امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن

قبرستان واقع تھا۔ وہاں پہنچانا بے حد مشکل تھا اور اگر وہاں پہنچ بھی جاتے تو قبر کھودنے والے مزدور وہاں آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ واقعہ 1931 کا ہوگا۔ یہ فساد بہادر یار جنگ کے دو بھانجوں کو لودھوں نے شہید کر دیا تھا اور شہر میں کرفیو کا عالم تھا۔ اُس وقت ایک احمدی دوست انعام اللہ صاحب نے امیر پیٹ کے قبرستان میں ایک تیار قبر کی نشان دہی کی۔ چنانچہ اس وقت کے کوتوالِ شہر رحمت یار جنگ بہادر کی مدد اور تعاون سے ان کی نعش بذریعہ لاری امیر پیٹ لے جائی گئی اور چند احمدی احباب کی شمولیت سے مولانا کی تدفین عمل میں آئی۔

مرحوم کے جو کچھ مختصر حالات ہمیں حاصل ہوئے اس کو تاریخ احمدیت حیدرآباد میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے بزرگوں کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عدم دستیابی تحریری تفصیلی حالات یہاں پر اختصار اختیار کیا گیا۔

اُڑیسہ کے پہلے صحابی سید عبدالرحیم صاحب کٹکی کا ذکر خیر

اگرچہ کہ ان کا تعلق ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ سے ہے لیکن احمدیت کی تاریخ سے ان کا پہلا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے یہیں سے یہ خوشبو اٹھا کر اڑیسہ میں بھی پھیلائی گئی اس لحاظ سے ان بزرگوں کا ذکر خیر حیدرآباد دکن کی تاریخ احمدیت میں ضروری تھا۔ (سید جہانگیر علی)

حضرت مولوی سید عبدالرحیم صاحب کٹکیؓ سونگڑہ کے بارہ اصحابِ رضوان اللہ میں پہلے صحابی ہیں۔ ان کی پیدائش ایک قصبہ دریاپور میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید غلام حیدر ہے۔ ابتدائی تعلیم سونگڑہ کے ہی مختلف جید علماء سے حاصل کی۔ جن میں سید حفیظ الدین صاحب احمدی ایک زبردست عالم دین تھے یہ بزرگ حضرت مولوی سید فیاض الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس و سابق صوبائی امیر کے والد ماجد تھے جن کی قابلیت کا اعتراف حضرت مولوی حسن علی صاحب اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب بھاگلپوری نے کیا ہے۔ حضرت مولوی عبدالرحیم صاحبؓ کی ابتدائی تعلیم انہیں مولوی صاحب کے پاس ہوئی جو رشتہ میں ان کے ماموں بھی تھے۔ ان سے فارسی کی تکمیل کے ساتھ عربی کے صرف ونحو اور فقہ کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں لیکن

تحصیل علم کا شوق اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کرنے کا خیال اور ادھر اپنے استاد کی پیرانہ سالی نے کچھ ایسی اضطراری کیفیت پیدا کردی کہ حضرت مولوی سید عبدالرحیمؓ عین عالم جوانی میں جب کہ ابھی شادی کیئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور ان کی بوڑھی ماں ان سے ایک دن بھی جدائی گوارہ نہیں کرتی تھیں یہ سن کر کہ حیدرآباد دکن اس وقت علماء کرام کا مرجع بنا ہوا ہے اپنے دو رفیقوں مولوی سید عبدالصمد صاحب اور مولوی عبدالاحد کے ساتھ پاپیادہ حیدرآباد دکن کی طرف چل پڑے ۔ اس وقت حیدرآباد اور اڑیسہ کے درمیان کوئی ریل نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو اتنے دور دراز سفر کے لئے ان کے پاس سرمایہ بھی نہیں تھا ۔ اس خیال سے کہ ماں کی طرف سے اجازت نہیں ملے گی بغیر اطلاع دیئے چھپ کر نکل گئے صرف بیوی سے کہہ دیا تھا کہ تین دن بعد اس بات کا اظہار کردیں ۔ اس طرح کے لمبے سفر کے پُرخطر راستے طے کرنا ۔ اور دشوار گذار سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا، محض طلب علم کی خاطر اُن ہی لوگوں کا کام ہے جن سے خدا کچھ کام لینا چاہتا ہے ان کے رفیقان سفر جو آخری دم تک غیر احمدی رہے یہ گواہی دیتے رہے کہ زمانہ سفر میں تھکاوٹ کی وجہ سے ہماری نمازیں اکثر قضاء ہوجایا کرتی تھیں لیکن مولوی عبدالرحیم صاحبؓ نے کبھی نماز قضا نہیں کی (مختصر تاریخ جماعت احمدیہ سونگھڑہ از مکرم سید محمد زکریا صاحب صدر جماعت احمدیہ بھدرک بحوالہ ہفت روزہ بدر قادیان یکم اپریل ۱۹۷۱ء)

آپ کے بڑے صاحبزادے جناب سید عبدالحلیم صاحب، رضی اللہ عنہ کے چشم دید حالات دوران قیام حیدرآباد یوں بیان فرماتے ہیں ۔

میرے والد مولوی سید عبدالرحیم صاحب اڑیسہ کے ایک ضلع کٹک کے ایک قصبہ کے رہنے والے تھے ۔ حیدرآباد دکن کا شہرہ سن کر تکمیل تحصیل علم کے لئے پاپیادہ اپنی ماں سے چھپ کر بھری جوانی میں گھر سے نکلے جب کہ ان کی شادی کیئے پورا برس بھی نہیں گذرا تھا چل پڑے اور کئی مہینوں کے سفر کے بعد حیدرآباد پہنچے ۔ اس وقت ریل کلکتہ اور مدراس کے درمیان نہیں تھی ۔

حیدرآباد دکن پہنچ کر مدرسہ محبوبیہ میں داخل ہوئے ۔ جو طلباء کی رہائش اور خوردونوش کا کفیل تھا ۔ یہیں ان کی شناسائی حضرت مولانا میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہ سے ہوئی ۔ جوان سے اونچی جماعت میں پڑھتے تھے ۔ رفتہ رفتہ حضرت میر صاحب کا مکان پر آنا جانا ہوتا رہا ۔

وہاں حضرت میر صاحب کے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالعزیز قدس سرہ العزیز سے ان کو بیحد عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی ۔ اور جب کبھی فرصت ملتی آپ مولانا عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کی صحبت میں جا پہنچتے ۔ حضرت کے متعلق مختلف باتیں مشہور تھیں ۔ آپ سلسلہ سہروردیہ میں بیعت لیتے تھے مریدوں کی تعداد بھی کافی تھی ۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ سرکار انگریزی کے جاسوس ہیں ۔ بہرحال کچھ تو ہم مکتبی اور کچھ باپ کے ساتھ محبت وعقیدت رکھنے کی وجہ سے اور کچھ بار بار آنے جانے کی وجہ سے حضرت مولوی عبدالرحیم صاحبؓ اور حضرت میر محمد سعید صاحبؓ میں اخلاص اور یکجہتی پیدا ہوگئی ۔ اور حضرت مولانا کے میرے والد پر بے شمار احسانات ہیں ۔ اگرچہ کہ میرے والد کی غیور طبیعت نے مالی احسان سے حتی الامکان پہلوتہی کی ہے لیکن غریب الوطن مفلس کے ساتھ شہر کا رہنے والا فیاض انسان ہی بہتر سلوک اور ہمدردی کرسکتا ہے ۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء ۔

یہ ساری باتیں میں نے اپنے والد مرحوم سے سنی ہیں ۔ اب چشم دید حالات بیان کرتا ہوں اور اسی قدر جن کا تعلق براہ راست احمدیت سے ہے ۔

والد مرحوم مدرسہ محبوبیہ سے دستار بندی کے بعد وطن کو واپس آنے کے لئے سرمایہ کی فکر میں پڑے اور ادھر اُدھر ٹیوشن کرنے لگے ۔ فارسی کی تکمیل تو انہوں نے وطن ہی میں کرلی تھی ۔ وہی اُن کے کام آئی ۔ ڈاکٹر رگھوناتھ جو بنگال کے رہنے والے تھے ۔ اور ریاست حیدرآباد میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے ۔ اُن سے فارسی پڑھتے تھے اور چونکہ یہ غریب الوطن تھے اپنی ہی کوٹھی میں ان کو جگہ دی تھی ۔ (ڈاکٹر رگھوناتھ کے متعلق ایک دوست نے سنایا کہ یہی مسز سروجنی نائیڈو کے باپ ہیں)

کچھ عرصہ بعد والد مرحوم کی ملازمت سرآسمانجاہ کے پائے گاہ میں ہوگئی ۔ پہلے چنگوپہ کے صدر مدرس ہوئے ۔ اور پھر اکھیلی کو تبادلہ ہوگیا ۔ کیونکہ چنگوپہ کے لوگوں نے تعزیہ اور مولود خوانی اور دوسری بدعات کے خلاف آواز اٹھانے پر والد صاحب کے خلاف درخواستیں دی تھیں ۔ اکھیلی آکر بھی وہی شورش ساتھ رہی حکام کی شہ پاکر عوام نے اتہامات اور الزامات کا طوفان برپا کیا ۔ مولوی حسین عطاء اللہ صاحب نے جو سرآسمانجاہ کی پائگاہ میں مجلس معتمدین کے میر مجلس تھے والد مرحوم سے واقف تھے اور ان پر نیک گمان رکھتے تھے ان کو جب رپورٹ پہنچی کہ لوگ درپئے ایذاء ہیں اور شورش بڑھ گئی ہے تو تحقیقات کے بہانے ان کو حیدرآباد بلالیا ۔

ایک عجیب لطیفہ ہوا جب والد مرحوم مجھے بخاری پڑھا رہے تھے (صرف ترجمہ کروایا کرتے تھے) کہ ایک ملاقاتی رحمت اللہ نامی نے اُن سے کہا کہ کلیانی میں ایک افسر ہیں وہ کہتے ہیں کہ پنجاب میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ۔ والد مرحوم نے ہنس کر کہا کہ بالکل فضول بات ہے ۔ انہوں نے زیادہ زور دیا تو والد صاحب مرحوم نے کہا کہ اچھا میں حیدرآباد سے آ جاؤں اس کے متعلق ایک مضمون لکھ دوں گا ۔ ادھر ہدایت اور مشیت دونوں کی دونوں ہنستی تھیں ۔ کہ تم کو بلدہ کو بلایا جاتا ہے اسی لئے کہ اسی پنجابی کا بندۂ بے دام بنا کر راحت دوام سے سرفراز کیا جائے ۔ یہ ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے ۔

آپ جب حضرت مولانا میر محمد سعید صاحب رضی اللہ عنہ کے گھر فروکش ہوئے ۔ رمضان المبارک کے دن تھے ۔ دن بھر والد صاحب کچہری میں رہتے اور رات کو حضرت میر صاحب سے صحبت رہتی ۔ ایک دن حضرت میر صاحبؓ نے فرمایا کہ پنجاب میں ایک فقیر صفت آدمی پیدا ہوا ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ۔ والد صاحب نے کہا کہ بالکل فضول اور بیکار بات ہے ۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ حیات مسیح کا ہے ۔ یہ وفات کہاں سے نکالتے ہیں ۔ ان گمراہوں کی بات سننا ہی نہیں چاہئے ۔ والد مرحوم دینی معاملات میں نہایت سخت گیر اور جلد مشتعل ہونے والے تھے لیکن دنیاوی امور میں ان سے بڑھ کر سادہ لوح شاید ہی کوئی ہو ۔ اس کے برخلاف حضرت قبلہ میر صاحب نہایت حلیم الطبع ، باوقار اور نہایت سنجیدہ اور زیرک تھے ۔ دینی امور میں اُن کے علم اور خاموشی کو کبھی کبھی والد مرحوم مداہنت پر محمول کرتے تھے ۔

حضرت میر صاحب قبلہ نے مجھے سنایا کہ جب تمہارے والد سے میں نے اس بات کا ذکر کیا ۔ تو وہ نہایت حقارت اور انکار کے ساتھ ان باتوں کو سننا بھی نہیں چاہتے تھے ۔ میں نے بمشکل ان کو اس بات پر راضی کیا کہ کہنے والا جو کہتا ہے اُسے پہلے دیکھ تو لو ۔ پھر پیچھے جو چاہو سو کہنا ۔ والد مرحوم راضی ہو گئے ۔ اور کہا اچھا چلو ۔ جس مضمون کا وعدہ میں نے رحمت اللہ صاحب سے کیا ہے اس کے لئے مواد مل جائے گا ۔ فریق مخالف کے خیالات اور دلائل معلوم ہو جائیں گے ۔

رات کو نماز عشاء کے بعد حضرت مولوی محمد سعید صاحبؓ نے ازالہ اوہام پڑھ کر سنانا شروع کیا ۔ (والد مرحوم کو بھی دوران سر اور کثرت بول کی شکایت تھی اس لئے رات کو پڑھ نہیں سکتے تھے)

حضرت میر صاحب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ "ازالہ اوہام کے شروع میں تو مولوی صاحب (میرے والد مرحوم) کچھ کچھ لڑتے جھگڑتے رہے جلد اول کے ختم ہوتے ہوئے بالکل چپ ہو گئے" اور جب ؎ جائیکہ از مسیح و نزولش سخن رود" شروع ہوا تو پھر زار زار رونے لگے ۔ خصوصاً اس شعر پر ؎

بعد از خدا بعشق محمد مخمرم   گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

حضرت میر صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ ازالہ اوہام ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ مولوی صاحب لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھے اور مجھے کہتے کہ مولوی صاحب اب دیر کیا ہے ۔ حق ظاہر ہو گیا ۔ میں کہتا کہ جلدی ٹھیک نہیں اور کتابیں دیکھنی چاہئیں ۔ غور کرنا چاہئے ۔ دعا کرنی چاہئے ۔ چنانچہ دوسری کتابوں کی تلاش ہوئی ۔ حضرت میر صاحب رضی اللہ عنہ نے پتہ بتلایا کہ آپ کے والد مرحوم کے ایک پیر بھائی سید محمد صاحب رضوی (میرے والد اور رضوی صاحب دونوں مولوی حسین زمان صاحب کے مرید تھے) ان کے پاس کچھ کتابیں ہیں ۔ آپ اُن سے مل کر کتابیں حاصل کریں ۔ چنانچہ والد مرحوم کے بے انتہا شوق نے ان کو رضوی صاحب کے گھر پہنچایا ۔ پہلے سے کچھ جان پہچان نہیں تھی ۔ رسمی تعارف کے بعد بغیر کسی توطیہ وتمہید کے کتابیں مانگیں ۔ رضوی صاحب حیران ہو گئے کہ آپ کو کیسے پتہ لگا ۔ مختصر یہ کہ رازداری کا پختہ وعدہ لے کر توضیح المرام و فتح الاسلام کتابیں چھپا کر دیں ۔ رضوی صاحب روشن خیال آدمی ہیں ۔ اور ہر قسم کی کتابیں اُن کے کتب خانہ میں تھیں کہیں اشتہار دیکھ کر وہ کتابیں منگوالی ہوں گی ۔ توضیح المرام اور فتح الاسلام کے بعد حضرت مولوی عبدالرحیم رضی اللہ عنہ اب آتش بدامن تھے ۔ وہ کسی کی سننے والے نہ تھے حضرت میر صاحب اور مولوی رضوی صاحب تو ان کے ہم خیال تھے انہوں نے مولوی سید امین اللہ کا انتخاب کیا ۔

مولوی سید امین اللہ مرحوم میرے رشتہ کے چچا تھے حیدرآباد میں محکمہ پولیس میں منشی تھے اور حافظ لطف اللہ وکیل کے گھر ٹیوشن پڑھاتے تھے ۔ نہایت ذکی اور ذہین اور فن مناظرہ میں طاق تھے اور فارسی اور عربی کی استعداد خاصی تھی ۔

حضرت میر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ دونوں بھائی (میرے والد اور مولوی امین اللہ مرحومین) مرغوں کی طرح لڑا کرتے تھے ۔ بالآخر مولوی امین اللہ مرحوم بھی ہم خیال ہوئے ۔ اور اس طرح حضرت میر صاحب اور مولوی سید محمد رضوی صاحب کے عقیدہ کی دبی ہوئی چنگاری

بھڑک اُٹھی۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ حضرات قائل ہو چکے تھے لیکن اظہار کی جرأت نہیں تھی۔

اسی اثناء میں والد مرحوم کے مقدمہ کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ اور ان کو باعزت اپنی جگہ پر پانچ روپیہ کی ترقی کے ساتھ بحال کر دیا گیا۔ حضرت میر صاحبؓ نے والد مرحوم کے پاس لکھا کہ سترہ یا ستر (مجھے یاد نہیں رہا) لوگوں کی بیعت کا خط حضرت مسیح موعود کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ والد مرحوم نے اپنے ساتھ میرا نام بھی لکھا دیا تھا۔ واضح ہو کہ اس وقت تک حیدرآباد میں جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔ نہ حضرت میر صاحب اور نہ رضوی صاحب کسی نے بیعت کی تھی۔ وہ لوگ تحقیقات میں لگے تھے۔ اس وقت میرے خیال اور اندازہ میں حیدرآباد دکن بلکہ ساری ریاست میں یہی صرف احمدی تھا۔

جن کا نام نامی حضرت میر مردان علی صاحب رضی اللہ عنہ تھا یہ بزرگ ۳۱۳ صحابی میں شامل ہیں۔ میں ان کو احمدیت سے بے تعلق سمجھتا تھا۔ کبھی نماز جمعہ و جماعت کے جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایک دو بار والد مرحوم کے ساتھ میں اُن کے مکان پر گیا ہوں۔ چنچل گوڑہ یا چادر گھاٹ میں تھا۔ جس دن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کی خبر آئی ہے اور سارے احباب حضرت میر صاحب کے مکان میں (جو پرانے پل کے نیچے والے محلہ میں تھا۔ اور جو طغیانی میں بھر گیا تھا) جمع ہوئے حضرت میر مردان علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تھے۔ اس دن دیکھا کہ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کس قدر عشق ہے میں نے کسی باپ کو اپنے اکلوتے جوان بیٹے کے مرنے پر بھی اتنا روتے نہیں دیکھا۔ حضرت مولوی ابوالحمید صاحب مرحوم بھی زار قطار روتے تھے چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

اب ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مولوی عبدالرحیم کٹکی رضی اللہ عنہ کا مقام حیدرآباد کی اشاعت احمدیت میں کیا ہے ہم تو ان کو جماعت اڑیسہ اور جماعت دکن کے بانی کہتے ہیں۔

حیدرآباد سے اپنے مستقر پر جا کر والد مرحوم نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام الدلیل المحکم علیٰ وفات المسیح ابن مریم۔ اس کا مسودہ حضرت میر صاحب قبلہ کے پاس حیدرآباد بھیجا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کن وجوہ کی بناء پر اُسے بجائے حیدرآباد کے مطبع کے الحکم کے مطبع میں چھپوایا گیا۔ اور یہ پہلا مضمون تھا احمدیت کا جو دکن سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ اور رسالے

مرحوم کے قلم سے نکلتے رہے۔ ایک رسالہ "صدریہ" لکھا جس میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے دلائل دیئے۔

الدلیل المحکم کا شائع ہونا تھا کہ مخالفین کے کیمپ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے فوراً ایک کاپی مولوی حسین عطاء اللہ صاحب میر مجلس کے پاس بھیج دی۔ اور بتلایا کہ جسے آپ عالم باعمل سمجھتے تھے وہ یہ ہے مولوی حسین عطاء اللہ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کیفیت طلب کی نہ کچھ تحقیقات کی۔ ایک دم سے معزولی کا حکم صادر فرما دیا والد مرحوم کو پھر حیدرآباد آنا پڑا۔ مہینہ بھر کے بعد مجھے بھی بلدہ میں بلا لیا۔ ہمارے محسن رضوی صاحب کی کوشش سے والد مرحوم کو وکیل سلطان محمود صاحب کے پاس ٹیوشن مل گئی۔ ہم دونوں باپ بیٹوں کی رہائش اور خورد و نوش کے علاوہ دس روپے کلدار ملا کرتے تھے۔ وہ روپے وطن کو بھیج دئے جاتے تھے پورا ایک سال سخت تکلیف کا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ میری والدہ ان دس روپوں میں اپنا اور چھ بچوں کا خرچ کس طرح چلاتی ہوں گی۔ ایک برس تگ و دو کے بعد ان کی بحالی ہوئی اور پانچ روپے کی تخفیف کے ساتھ بلدہ کے دفتر میں مجاریہ نویس مقرر ہوئے اور مجھے دارالعلوم میں داخل کر دیا گیا۔ چھ سات سال بلدہ کی جماعت کے سرگرم کارکن اور گرم جوش مناظر رہے۔ طغیانی کے بعد گھر آئے اور واپسی کا نام نہیں لیا۔ حیدرآباد میں احمدیت کی ابتدائی تاریخ حضرت مولوی سید عبدالرحیم صاحب کٹکی رضی اللہ عنہ سے ہوتی۔ (از جناب سید عبدالحلیم صاحب کٹکی الحکم جلد ۴۲۔ ۲۸ رجون و ۷ رجولائی ۱۹۳۹ بحوالہ الحکم قادیان ۲۸ رجون و ۷ رجولائی ۱۹۳۹ء)

شائد مولوی سید عبدالرحیم صاحبؓ کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا ہوگا کہ اب اس نور سے جو مجھے ملا ہے اپنے ہم وطنوں کو بھی منور کرنا چاہئے آپ غالباً ۱۸۹۹ء کے آخر میں یا ۱۹۰۰ء کے شروع میں اپنے وطن سونگڑہ تشریف لے گئے۔ اور ۳ر رمضان المبارک ۱۳۱۷ ہجری جمعہ کے دن جو اس رمضان کا پہلا جمعہ تھا ایک تقریر کی آپ کی نیکی تقویٰ و طہارت اور تبحر علمی کا اتنا اثر ہوا کہ اس تقریر کو سنتے ہی پانچ سو سے زائد افراد بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہو گئے۔ اور اس طرح ۳ رمضان المبارک ۱۳۱۷ ہجری مطابق ۷ جنوری ۱۹۰۰ء اڑیسہ میں احمدیت کا قیام عمل میں آیا۔ الحمدللہ۔ اس کی تصدیق حضرت مولوی صاحبؓ کے اس خط سے ہوتی ہے جس کو آپ نے احباب سونگڑھ کے اقرار نامہ بیعت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں

''گذارش'' کے عنوان کے ساتھ لکھا تھا۔ وہ خط ذیل میں من وعن درج کیا جاتا ہے۔

حاضر الوقت بندہ اثیم سید عبدالرحیم کٹکی نزیل حیدرآباد حضرت اقدس امام الزمان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بابرکت خدمت میں بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ عرض ہے کہ رمضان اولی میں ان لوگوں نے بطیب نفس اس عاجز کی تقریر پر بیعت کے لئے آمادگی ظاہر کی اگرچہ اس عاجز کی تحریک پر اہل چٹگو پہ ضلع حیدرآباد دکن کے ۷۱ مسلمان شرف بیعت سے مشرف ہوئے مگر یہاں لوگوں کے دلی جذبات ومسرت کا اظہار احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ اکثر احوال حضرت اقدس کے سن کر زار زار روتے ہیں اور ملاقات کے لئے ایک تڑپ ان میں پائی جاتی ہے۔ غالباً چند آدمی عرصہ قریب میں شرف ملازمت ومکالمت سے بہرہ اندوز ہوں گے یقیناً یہ جوش حضرت اقدس کی توجہ ودعا کا ثمرہ ہے۔ آئندہ جمعہ میں دوسرے محلوں کے لوگ جس قدر بیعت کے لئے مستعد ہوں گے اس کی ایک علیحدہ فہرست پیش خدمت ہوگی۔ ان لوگوں کی کمال آرزو ہے کہ قبول بیعت کا مژدہ زبان مبارک سے سنیں حضرت کی بندہ نوازی وکریمانہ اوصاف سے یہی امید قوی ہے۔ حضرت کا خادم الاثیم سید عبدالرحیم (ضلع کٹک بنگال پوسٹ آفس صالح پور موضع کوہمبی) منقول از الحکم نمبر ۴ جلد ۴۔ ۳۱ جنوری ۱۹۰۰۔ بحوالہ بدر یکم اپریل ۱۹۷۱ء مختصر تاریخ جماعت احمدیہ سونگھڑہ)

۱۹۰۰ کے اہم واقعات کے سلسلہ میں مؤرخ احمدیت شیخ یعقوب علی صاحب المعروف بہ عرفانی الکبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''آغاز سال کے ساتھ ہی سلسلہ بیعت میں غیر معمولی ترقی کا آغاز ہوا۔ رمضان المبارک میں ضلع کٹک سے حضرت مولوی سید عبدالرحیم صاحب کٹکی کی تبلیغ سے ۵۰۰ آدمیوں نے ایک ہی دن میں بیعت کا معروضہ حضرت اقدس کی خدمت میں حضرت مولوی سید عبدالرحیم کے ذریعہ ارسال کیا اور حضرت اقدس نے شرف قبولیت بخشا۔ اڑیسہ کی جماعت اس وقت سے برابر ترقی کر رہی ہے اور اس جماعت میں شروع ہی سے گریجویٹ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی شامل ہوتے آئے ہیں اور اس جماعت کے افراد نے قادیان جا کر دینی تعلیم حاصل کی۔ (حیات احمد جلد پنجم صفحہ ۱۸۸ طباعت ۱۹۵۴ء)

بیعت کر لینے کے بعد احباب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کی تڑپ پیدا

ہوئی اور اسی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں چند احباب پر مشتمل ایک قافلہ روانہ ہوا جو اڑیسہ سے قادیان جانے والا اولین قافلہ تھا یہ قافلہ قادیان پہنچا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کا شرف حاصل کر کے کچھ دن صحبت اقدس سے فیضیاب ہو کر حضور کے صحابہ کرام میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی (الحمد للہ) وہ جملہ بزرگ جنہوں نے اس قافلہ میں شامل ہو کر صحابہ کا شرف حاصل کیا ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولوی سید عبدالرحیم صاحبؓ ۲۔ حضرت مولوی سید سعید الدین صاحبؓ
۳۔ حضرت مولوی سید احمد حسین صاحبؓ ۴۔ حضرت منشی سید نیاز الدین صاحبؓ
۵۔ حضرت مولوی سید عبدالستار صاحبؓ ۶۔ حضرت منشی سید تفضل حسین صاحبؓ
۷۔ حضرت منشی سید شفیق الدین صاحبؓ

بعد ازاں پھر ایک قافلہ ۱۹۰۲ء میں روانہ ہوا جو تین احباب پر مشتمل تھا۔

۱۔ حضرت خاں صاحب مولوی سید ضیاء الحق صاحبؓ بی اے بی ٹی ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز۔
۲۔ حضرت مولوی سید اکرم الدین صاحبؓ ۳۔ حضرت منشی سید نیاز حسین صاحبؓ

اس کے بعد تیسرا قافلہ جو ۱۹۰۳ء میں روانہ ہوا جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔ حضرت مولوی سید احمد حسین صاحبؓ ان کو سب سے پہلے قافلے میں شمولیت اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا تھا پھر دوبارہ تشریف لے گئے تھے۔
۲۔ حضرت الحاج سید احمد علی صاحبؓ ۳۔ حضرت مولوی سید اختر الدین صاحبؓ

اس طرح یہ بارہ بزرگ تھے جن کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ سے ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (از مختصر تاریخ جماعت احمدیہ سونگھڑہ)

حضرت مصلح موعودؓ نے ۱۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کو ایک خطبۂ نکاح کے دوران فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے حیدرآباد میں ایک جماعت قائم کر دی اور اس میں ایسے مخلص احباب پیدا ہوئے جنہوں نے احمدیت کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں اور ایثار سے کام کیا اور یہ جماعت مولوی محمد سعید صاحب کے ذریعہ قائم ہوئی اس کے علاوہ اڑیسہ میں ایک گاؤں سونگڑہ سارے کا سارا احمدی ہے وہ بھی دراصل حیدرآباد کی ہی پیدا شدہ جماعت ہے سید عبدالرحیم صاحب وہاں

کے رہنے والے حیدر آباد گئے تھے وہاں وہ مولوی محمد سعید صاحب سے ملے مولوی صاحب نے انہیں تبلیغ کی اور بعض کتابیں بھی دیں جن کے مطالعہ سے وہ احمدی ہو گئے اور پھر ان کے اثر کی وجہ سے یہ گاؤں سارے کا سارا احمدی ہو گیا۔ (الفضل ۵؍نومبر ۱۹۴۱ء خطبات محمود جلد سوم صفحہ ۵۳۲ تاریخ احمدیت جلد نہم صفحہ ۲۴۳)

حضرت مولوی سید عبدالرحیم کٹکی ؓ سونگھڑہ میں جماعت کے قیام کے بعد ایک مرتبہ اسی زمانہ میں جب کہ ابھی خدا کا مسیح بقید حیات موجود تھا کیرنگ ضلع پوری تشریف لے گئے اور گاؤں والوں کو تبلیغ کی احباب کیرنگ کے مطالبہ پر آپ نے حلفیہ بیان دے کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا اظہار کیا جس کے نتیجہ میں بارہ بزرگ اسی وقت بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہو گئے بعد میں عبدالرحمٰن صاحب کشمیری کی تبلیغ اور مساعی جمیلہ سے باقی ماندہ سارے لوگ احمدیت میں داخل ہو گئے۔ حضرت مولوی سید عبدالرحیم صاحب ؓ کے صاحبزادوں میں بڑے حضرت علامہ حکیم سید عبدالحلیم صاحب مرحوم تھے ان کی تاریخ ولادت یکم اپریل ۱۸۸۹ء اور تاریخ وفات ۲؍جون ۱۹۴۶ء ہے سلسلہ کے جید علماء و فضلا میں ان کا شمار تھا۔ یہ ادیب و شاعر تھے۔ ان کے مضامین و اشعار ریویو آف ریلیجنز اخبار ’’الحکم‘‘ اخبار ’’بدر‘‘ میں چھپتے رہے ہیں مارچ ۱۹۲۲ء کے ریویو آف ریلیجنز میں ایڈیٹر صاحب نے جن ادیبوں کے نام و اسماء گرامی کا تذکرہ کیا ہے ان میں مولانا عبدالحلیم صاحب کٹکی بھی شامل ہیں۔ سبھی ان کی علمی قابلیت کے معترف و مداح تھے۔ جب کہ سونگھڑہ میں مخالفت کا زور تھا اور احمدیوں کو سخت اذیت پہنچائی جاتی تھی ایسے وقت میں بھی غیر احمدی انہیں پالکی بھیج کر اپنی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بلاتے۔ آپ نے غیر احمدی علماء سے مناظرے بھی کئے۔

آپ کے ایک صاحبزادے مولوی سید عبدالسلام صاحب مرحوم تھے ایک عرصہ تک قادیان دارالامان میں تعلیم پانے کے بعد ۱۹۱۹ء میں مولانا جلال الدین صاحب شمس مبلغ بلاد عربیہ ولندن کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں مولوی فاضل کا امتحان دیا۔ کچھ عرصہ تعلیم الاسلام ہائی اسکول قادیان میں معلم بھی رہے۔ جب آپ اپنے وطن سونگھڑہ لوٹے تو گورنمنٹ ہائی اسکول میں بطور صدر مولوی مقرر ہوئے اچھے مناظر اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ مرحوم کو سیدنا حضرت

امیر المومنین سے بیحد عشق و محبت تھی چنانچہ ایک دفعہ آپ نے مدرسہ احمدیہ قادیان میں اپنے زمانۂ طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے نہایت رقت آمیز لہجہ میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور کے پاؤں دبانے کی سعادت حاصل کرنے کا واقعہ بیان کیا اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ یہ محض میرے مولیٰ کا ہی فضل تھا کہ اس نے ایسا موقع فراہم کیا ورنہ عبدالسلام کہاں اور مصلح موعود کہاں آپ کی تاریخ وفات ۱۹۵۷ء ہے۔ (’’سید عبدالسلام صاحب مرحوم آف اڑیسہ کا ذکر خیر از مکرم سید موسیٰ صاحب مرحوم مبلغ سلسلہ)

آپ کے ایک صاحبزادے مولوی سید محمد احمد صاحب نے مدرسہ احمدیہ قادیان میں کچھ سال تک تعلیم حاصل کی علالت کے باعث تعلیم چھوڑ کر واپس وطن آنا پڑا سرکاری اسکولس میں مولوی مقرر ہوئے لمبی عمر پائی۔ لمبے عرصے تک صوبائی امیر اڑیسہ رہے۔ نہایت منکسر المزاج عبادت گذار صاحب کشف والہام تھے۔ آپ نے اڑیہ زبان میں چھوٹی چھوٹی تبلیغی کتب لکھی ہیں۔ آپ کے تینوں صاحبزادے اپنے والد کے ساتھ محلّہ کوٹھی میں مدفون ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۱۹۷۲-۱-۹ ہے
سید عبدالحلیم صاحب کے نواسے سید محمد سرور شاہ صاحب حضور کے منشا سے مرکز احمدیت قادیان میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مولوی سید عبدالسلام صاحب مرحوم کے دو پوتے مکرم سید تنویر احمد صاحب اور مکرم سید داؤد احمد صاحب بھی قادیان میں خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔
(ماخوذ از منصور احمد، نائب ایڈیٹر ہفت روزہ بدر قادیان، ستمبر۔ ۱۹۹۸ء)

حضرت مولوی سید بشارت احمد صاحب. تیسرے امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد

طویل المدت امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد

مولوی سید بشارت احمد صاحب کی خودنوشت سوانح عمری

یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ محترمی سید بشارتؓ احمد صاحب آخری ایام میں اپنی سوانح عمری سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب ایم اے (ایڈمبرا) کو بٹھا کر لکھوائی ۔ اس کام کے لئے سیٹھ صاحب سکندرآباد سے امیر صاحب کے مکان قاضی پورہ مسلسل آتے رہے۔ چونکہ اصل مسودہ پنسل سے لکھا گیا تھا جس کو بعد میں صاف لکھنے کے لئے مکرم خواجہ عبدالوحید انصاری صاحب مسودہ کو پڑھتے اور مکرم میر احمد صادق صاحب ایم اے اس مسودہ کو صاف اور خوش خط لکھتے جاتے تھے ۔ میں نے اصل مسودہ مکرم احمد عبدالحمید صاحب حال مقیم واشنگٹن سے رابطہ قائم کر کے حاصل کیا۔

اس مضمون میں جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن کے چالیس سالہ تنظیمی اور تبلیغی حالات درج ہیں جس کے لئے ہم ان سبھی معاونین کے حق میں دعا گو ہیں۔

(سید جہانگیر علی)

میں میر بشارت علی المعروف بہ سید بشارت احمد کے حالات زندگی کی ابتداء اپنے حافظہ پر زور ڈال کر بیان کرتا ہوں کہ میرے خاندان کی روایت کے مطابق میری پیدائش یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ ہجری ہے۔ کیوں کہ میرے خاندان میں میری تاریخ ولادت ''نمودار بخت'' ہے۔

ہمارے خاندان کی ابتدائی تاریخ برہان پور سے شروع ہوتی ہے۔ میرے مورثان اعلیٰ جاگیردار ہوا کرتے تھے۔ جب نواب نظام علی خاں بہادر فوج لے کر برہان پور پہنچے تو اُنہوں نے شرفا اور معززین کو اپنے ساتھ جنگ پر چلنے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ ہمارے خاندان کے پانچ حقیقی بھائی جو ''پنچ بھیے'' کہلائے وہ برہان پور کے ایک معزز تیغ علی خاں المخاطب بہ تیغ جنگ کو ساتھ لے کر کھنڈوا گئے اور کھنڈوا کی لڑائی میں نظام علی خاں کی کسی حکمت عملی سے فوج جنگ سے ہٹنے پر مجبور ہوگئی تو ہمارے مورثان اعلیٰ نے ان کو میدان جنگ سے ہٹ جانے سے روکا' لیکن

نظام علی خاں نے میدان جنگ سے ہٹ جانے کو پسند کیا اور نظام علی خاں نے جنگ سے فارغ ہوکر ہمارے مورثان اعلیٰ یعنی پنج بھیوں اور تیغ علی خاں صاحب کو حیدرآباد لاکر پانچ لاکھ روپے کی جاگیر اور پانچ سو فوج اور پانچ عماری ہودج معہ ہاتھیوں کے دئے اور خطاب ''خان بہادری'' سے سرفراز فرمایا۔

ہمارے مورثان اعلیٰ میں سب سے بڑے بھائی میر مراد علی خان بہادر کو نظام علی خاں اپنی بہن دینا چاہتے تھے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہمارا خاندان طرفین سے صحیح المنسب سید ہے ہم غیر سید سے شادی نہیں کرسکتے اس پر مجبوراً نظام علی خاں نے ہمارے مورثان اعلیٰ کے ساتھ تیغ علی خاں کو بھی جاگیر منصب اور خطاب دے کر مثل ہمارے مورثان اعلیٰ کے کیا۔ اور ان سے رشتہ کی بات شروع کی تو وہ بخوشی تیار ہوگئے چنانچہ نظام علی خاں کی بہن کی شادی تیغ جنگ کے ساتھ ہوگئی۔

الغرض ہمارا تعلق حیدرآباد کے امرائے کبار کے مماثل رہا۔ چونکہ ہمارے خاندان کے پانچ ممبر تھے اور پانچوں کی اولاد کثیر ہوگئی اور آپس میں جاگیر و مناصب کے لئے مقدمہ بازی کی نوبت آگئی تب تیغ جنگ جو نظام علی خاں کے بہنوئی ہونے کے باعث امیر کبیر اور باا ثر ہوگئے تھے اور ان کو ہمارے افراد خاندان چچا جان کہا کرتے تھے ان کو تیغ جنگ نے بلاکر کہا کہ تم لوگ اپنی جاگیرات کو میری نگرانی میں دے دو' میں اپنی جاگیر و مناصب کے ساتھ تمہاری جاگیر و مناصب کا انتظام کرکے تم سب کو برابر تقسیم کردیا کروں گا' جس پر ہمارے خاندان والے بخوشی رضامند ہوگئے اور تمام جاگیرات وغیرہ ان کے سپرد کردیئے۔

تیغ جنگ کو ہمارے ساتھ جاگیرات دی گئی تھیں بلحاظ شاہی رشتہ دار ہوجانے کے ان کو تقریباً پانچ لاکھ کی جاگیرات دے کر ان کے اسٹیٹ کو پائیگاہ قرار دیا گیا۔

ہمارے ماموں کے مکانات قاضی پورہ کے محلے میں تھے اور فرحت محل نام سے موسوم تھے جہاں بادشاہان و حضور نظام آیا کرتے تھے۔ اب وہ محلات سب منہدم ہوگئے البتہ صرف ہمارے رہائشی دو تین مکانات ''بشارت منزل'' میرے نام سے اور ''سعادت منزل'' میرے بھائی حکیم میر سعادت علی صاحب کے نام سے جو کہ لاولد فوت ہوجانے کے باعث وہ مکانات میرے ہی قبضہ میں ہیں۔ اور اسی طرح ایک بہت بڑا مقبرہ ''گل باغ'' نامی ایک لاکھ روپے کا مالیتی جس

میں ہمارے تمام افراد خاندان مدفون ہیں میرے حالیہ باغ ''احمد یہ گلشن'' واقع غازی بنڈہ سے ایک فرلانگ پر واقع ہے۔

تیغ جنگ کے خاندان والے بلحاظ رشتہ دار شاہی ہونے کے چونکہ وقتاً فوقتاً باثر ہوتے گئے اور ہمارے افراد خاندان ان کے ہاتھوں کٹ پتلی بن کر رہ گئے اُس کا نتیجہ اب یہ ہوگیا کہ لاکھوں روپے کی جاگیرات کے دستاویزات شاہی میرے قبضے میں ہیں' لیکن جاگیرات اب پائیگاہ کے علاقے میں شامل کرلیے گئے ہیں اس لئے اب ہمارے افراد خاندان بجائے جاگیر کے بطور گذارہ ماہوار منصبِ حق لیا کرتے ہیں اور اسی پر صبر وشکر کرتے ہوئے قناعت کرتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے خاندانی حالات کا مختصر خاکہ جو حیدرآباد سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارے ان متذکرہ حالات کا علم ہندوستان اور حیدرآباد کی تواریخ سے بھی مل جاتا ہے۔ اب پنچ بھیہ یعنی پانچ مورثان اعلیٰ کے جملہ ورثاء فوت ہوچکے ہیں صرف ایک میر شیر علی خاں بہادر جو ان پانچ بھائیوں میں سے ایک بھائی تھے' انہی کا سلسلہ آگے چلا' انہی کی ساتویں پشت میں' میں ایک ہوں۔ میرے دادا مرحوم میر شجاعت خاں المعروف بہ حاجی میاں ایک ''مشہور مخیر'' مہمان نواز اور غرباء کے لئے سفارش کرنے والے تھے۔ ان کی والدہ عالی بیگم صاحبہ نواب عزت یار جنگ شہید مرحوم المخاطب بہ محی الدولہ کی بڑی لڑکی تھیں۔ جن کا خاندان بڑا وسیع اور نوابی تھا۔

میرے دادا مرحوم کے دولڑکے تھے ایک میرے والد مرحوم میر احمد علی اور میرے چچا میر محمد علی۔ چونکہ میرے دادا مرحوم حافظ قرآن تھے اس لئے اپنے دونوں لڑکوں کو بھی حافظ قرآن بنایا۔ ہمارا خاندانی مکان فرحت منزل قاضی پورہ میں واقع ہے۔ اس سے قریب ایک محلّہ ہے جو فتح دروازہ کہلاتا ہے جہاں ایک مشہور ومعروف امیر محمد شکور جمعدار مرحوم کے محلات تھے جو پائیگاہ کے انچارج تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کروڑہا روپے کی دولت دی تھی اور وہ لاکھوں روپے خیرات و برات میں خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جب وہ حج کو گئے تو اپنے ساتھ قرابت دار اور معززین وغیرہ کو ساتھ لے گئے جن کی تعداد دوسو پچاس تھی۔ سفر حج اور وہاں ایک سال کے قیام میں بیس لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ ان کے حسابی کاغذات میں یہ بھی درج ہے کہ انہوں نے اپنے مکلّف سالمیہ کو ایک لاکھ روپے دیا۔

محمد شکور جمعدار اور میرے دادا حاجی میاں کے تعلقات اس وجہ سے بھی تھے کہ ہمارے جاگیرات وگذارے کا تعلق چونکہ تیغ جنگ کی پائیگاہ سے ہوگیا تھا اور محمد شکور جمعدار کی پوزیشن قائم مقام امیر پائیگاہ کی تھی اور وہ اسٹیٹ پائیگاہ کے نظم ونسق کے انچارج تھے۔ جمعدار مرحوم نہایت متقی اور باشرع انسان تھے اور انہوں نے اپنی زندگی میں بیسیوں مساجد تیار کروائیں اور صدہا حفاظ کو مدد دے کر حفظ کروایا تھا۔ میرے والد مرحوم جب صرف ۹ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے تو میرے دادا اور میرے نانا کے دوستانہ تعلقات کے مدنظر میرے نانا نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ میرے والد کو وہ ضرور اپنا داماد بنالیں گے۔ چنانچہ جب میرے والد جوان ہوئے تو اس وقت انہوں نے اپنی لڑکی سردار بیگم میری والدہ سے ان کی شادی کردی۔

والدہ محترمہ اور میرے والد مرحوم ہردو غیر معمولی متقی اور پرہیزگار تھے۔ والد کا انتقال ۳۸ سال کے سن میں بعارضہ کارتیکل تقریباً ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں ہوگیا۔ والد کے انتقال کے وقت میری ہمشیرہ غریب النساء بیگم عرف حاجی بیگم کی عمر گیارہ سال تھی اور وہ ہم سب میں بڑی تھیں۔ میری عمر تقریباً ساڑھے سات سال' میرے منجھلے بھائی میر فضل علی عرف فضل احمد کی عمر ۵ سال اور چھوٹے بھائی حکیم میر سعادت علی عرف سید علی احمد کی عمر صرف ڈھائی سال کی تھی۔

ہمارے والد مرحوم تہجد گذار اور روزانہ ایک منزل تلاوت قرآن پاک کی نماز تہجد میں کیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ میں تادم زیست نہیں بھولوں گا کہ والد مرحوم کے انتقال سے دوروز قبل ظاہر ہوا وہ یہ کہ شہر حیدرآباد سے چھ میل دور یعنی قلعہ گولکنڈہ سے ایک میل آگے حسین شاہ ولی کی درگاہ سے متصل ایک گاؤں آباد ہے اس میں میرے والد مرحوم نے باغ اور مکان بنا کر حیدرآباد سے دور بطور خلوت گزین کے انتقال سے پانچ چھ سال قبل وہیں پر بود وباش اختیار کرلی تھی۔ جب ان کی حالت نہایت نازک ہوگئی تو سارے خاندان کے افراد جن میں نواب محبوب نواز الدولہ مفتی بلدہ حیدرآباد جو قریبی رشتے میں میرے نانا ہوتے تھے' نواب ضیاء الدین خاں بہادر اور سکندر نواز جنگ بہادر، نواب غوث الدین صاحب ونواب سراج الدین صاحب اور دیگر ہمارے خاندانی مشائخین میں سے بہت سارے جمع تھے۔ اس وقت میرے پھوپھا مولوی فتح اللہ خاں صاحب جو حیدرآباد کے سب سے پہلے چیف جسٹس کے فرزند تھے انہوں نے والد سے مخاطب ہوکر کہا کہ

بھائی صاحب اب وقت نازک ہے آپ کے سارے قرابت دار موجود ہیں آپ کچھ وصیت فرمادیں۔ میں اس وقت اپنے والد مرحوم کے عقب میں کھڑا ہوا تھا۔ جوں ہی میرے پھوپھا نے یہ بات کہی۔ والد مرحوم کی داڑھی جو بڑی گھنی اور دراز تھی اس کے سارے بال کھڑے ہوگئے اور ان کا سرخ وسپید چہرہ چمکنے لگا۔ بے اختیار آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرکے جو الفاظ فرمائے وہ میرے دل میں آج تک نقش ہیں۔ فرمایا ''میں اپنی جوان جورو اور کم سن بچوں کو کس کے حوالے کرسکتا ہوں سوائے میاں کے۔''

والد صاحب ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو میاں کہہ کے مخاطب کیا کرتے تھے۔ ان الفاظ کو بلند آواز سے کہا اس کے بعد بہت دیر تک آہستگی سے دُعا میں مشغول ہوگئے اور دعا ختم کرتے ہی تمام مجلس کو برخواست کرنے کے لئے کہا۔ جب سب جانے لگے تو صرف میرے ایک چھوٹے ماموں نواب سراج الدین صاحب سے اتنا کہا کہ میاں تم ٹھہر جاؤ۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد میری والدہ کو بلایا اور کہا کہ مجھے اٹھا کر صحن میں لے چلو۔ جب ان کو صحن میں لے جایا جارہا تھا تو میں بھی ان کو تھامتا ہوا جارہا تھا۔ صحن میں کھڑے ہونے کے بعد میری پھوپی اور دوسری قرابت کی عورتوں سے کہا کہ وہ ان کو تھامے رہیں اور میری والدہ سے کہا کہ تم میرے پیچھے کھڑی ہوجاو اور جو دعا میں کرتا جاوں تم آمین کہتی جاو۔ مجھے اس دعا کے صرف دو جملے یاد ہیں باقی مجھے یادنہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ کہا تھا:

''میاں میرے بال بچوں کو دوسروں کا دست نگر نہ بنانا بلکہ ان کا ہاتھ سب پر غالب رہے۔ میاں ہر مومن و مسلمان کا خاتمہ بالخیر کرنا' اس کے بعد بڑی دیر تک خاموشی سے دعا کرتے رہے اور میری والدہ آمین کہتی رہیں۔ اسی شب چار بجے جب کہ وہ نماز تہجد اور دعاؤں سے فارغ ہو چکے تھے۔ نزع کی حالت طاری ہوگئی اور صبح کی اذان ہورہی تھی انہوں نے آواز سن کر رکعت باندھی اور روح پرواز ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ والد محترم نے ہمارا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہ دیا بلکہ خدا کے ہاتھ میں دیا۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ آج میری عمر تقریباً ۶۵ سال سے زیادہ ہوگئی ہے ہر وقت میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنوں کی محتاجی اور دست گیری سے محفوظ رکھا بلکہ ہمارے

خاندان کے بڑے بڑے لکھ پتی اور جاگیرداروں کی اولاد کو ایسی مجبوریوں میں میرے پاس لایا کہ بجز میری مدد کے ان کا کوئی چارہ کار ہو نہیں سکتا تھا۔ جس کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا ہر وقت شکر بجالاتا رہتا ہوں۔ میرے والد مرحوم نے ایام علالت میں میری والدہ مرحومہ کو جن باتوں کی وصیت کی تھی وہ یہ ہیں پہلی وصیت یہ تھی کہ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی کتب جو تقریباً تیس سے زیادہ تعداد میں تھے اور میں نے اپنی والدہ سے سنا تھا کہ ہر ایک کتاب کو لکھنے کے بعد اس کو روپیوں میں تول کر وہ روپے خیرات کردیتے تھے' اور پھر فرمایا ان کتب کی حفاظت کرنا۔ دوسری وصیت یہ تھی کہ میرے بچوں کو انگریزی سے پہلے عربی پڑھانا تاکہ یہ دیندار رہیں۔ تیسری وصیت یہ تھی کہ میری لڑکی کا کسی مسافر سے پانچ سیر کا میٹھا کھانا پکاکر سادگی سے نکاح کرنا۔ میرے والد کے انتقال کے بعد میرے خاندان کے بزرگوں نے ہر چند کوشش کی کہ ہم کو انگریزی مدرسوں میں تعلیم دلائیں لیکن میری والدہ نے تقریباً پانچ سال تک بیرون شہر رہ کر عربی اور دینیات کی تعلیم دلوائی۔

والد مرحوم کے انتقال کے وقت میری عمر ساڑھے آٹھ سال کی تھی مجھے انہوں نے خوشنویس بنادیا تھا اور میں اس وقت فارسی میں ''گلستان'' اور دینیات میں '' '' جو فقہی مسائل کی کتاب تھی اور ''صراط اسلام'' نامی ایک دینیات کے مسائل کی کتاب اور ''مفید الانشاء'' نامی ایک کتاب تھی جواب مجھے یاد نہیں کہ کس موضوع پر تھی' الغرض میں یہ کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ میری والدہ نے میرے والد کے انتقال کے بعد پانچ سال تک اسی مقام پر رہ کر خانگی مدرسین کو رکھ کر مجھے اور میرے بھائیوں کو تعلیم دلوائی اس کے بعد شہر کے خاندانی مکانات میں آکر مقیم ہوگئیں اور مجھے دارالعلوم کالج جو عربی اور فارسی کا بہترین مرکز تھا اس میں شریک کروادیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پھوپھا مولوی فتح اللہ صاحب مرحوم جب کبھی ہمارے گھر آتے اور اپنے بال بچوں کو بھی لاتے تو میری والدہ مرحومہ کو بطور خاص کہتے کہ دیکھو ہمارے بچے تو انگریزی پڑھ رہے ہیں اور آپ اپنے بچوں کو عربی پڑھارہے ہیں' ہمارے بچے تو عہدہ دار بن جائیں گے لیکن آپ کے بچے عربی پڑھ کر تانگے چلائیں گے لیکن میری والدہ ارادہ کی بڑی پکی تھیں وہ یہی کہا کرتی تھیں کہ ان کے والد کی وصیت کو میں پورا کررہی ہوں۔ اللہ ہی ان کا حافظ ہے۔

جب بلدہ میں ہمارا قیام ہوگیا تو شہر حیدرآباد کے ددھیال اور ننھیال کے مشائخین و امراء سے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہمارے محلے میں جو دو چار قریبی رشتوں کے چچا تھے وہ حیدرآباد کے مشہور مرشد اور پیران طریقت کہلاتے تھے جن کے نام:

محمد صدیق خواجہ میاں صاحب، میر احمد علی شاہ صاحب، جو ہمارے تایا مفتی شہر نواب محبوب نواز الدولہ کے داماد ہوتے تھے۔ مکی میاں صاحب اور مولوی عمر علی شاہ صاحب جن کے ہزار ہا مرید تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ہمارا تعلق بلحاظ طالب علمی کے مولوی عمر علی شاہ صاحب سے تھا۔ چونکہ وہ واعظ مکہ مسجد بھی تھے اور بہت بڑے دینی عالم بھی تھے اور مجھ کو اپنی گود میں بٹھا کر عربی پڑھایا کرتے تھے اور مجھے بہت چاہتے تھے۔

میں نے جب دارالعلوم کالج سے مولوی اور مولوی عالم تک تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی کے امتحانات دیئے اور بعض امتحانات کی تیاری میں مصروف تھا ان دنوں انگریزی بھی ایک گھنٹہ خانگی میں تعلیم حاصل کرتا تھا اس زمانے میں نواب اظہر جنگ جو میرے خاندانی عزیز تھے وہ اور میں باہم افسانہ و ناول و تواریخ دیکھا کرتے تھے۔ ہم نے صدہا کتب مثلاً طلسم ہوشربا کی ضخیم جلدیں اور فسانۂ آزاد کی متعدد جلدیں اور لکھنو کے ناولٹ کی جملہ ناولیں اور ''افسانۂ وطن'' کے ایڈیٹر کے قریباً بہتر تاریخ جو غالباً جنگ ترکی کے متعلق ہے پڑھنے میں آئے۔

ان ہی ایام میں ایک ہم جماعت دوست نے میرے گھر آکر یہ ذکر کیا کہ ایک مسلمان مولوی، عبدالغفور دھرمپال نے ایک کتاب لکھی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے اور جس کا نام ''ترک اسلام'' ہے اور اس میں صدہا اعتراضات اسلام پر کئے گئے ہیں جن میں سے چند اعتراضات مجھے سنائے تو میں سخت مضطرب ہوگیا اور اس دوست سے کہا کہ آخر اس کے جوابات بھی کسی نے لکھے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ میرے چچا ایک عالم ہیں اور وہ لکھ رہے ہیں، طبع ہونے کے بعد وہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ تب میں نے ان سے خواہش کی کہ مجھے وہ مسودہ ہی لاکر بتلائیں تا کہ میری بے قراری دور ہو، تو انہوں نے کہا کہ جب تک کہ وہ کتاب چھپ نہ جائے میں آپ کو بتلا نہیں سکتا۔

اس وقت کی میرے اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر مولوی بہاؤالدین خاں صاحب

مرحوم جو ہمارے ہم درس اور احمدی تھے، باوجود احمدی ہونے کے کبھی ہم سے احمدیت کا ذکر نہ کیا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ہماری جماعت کے ایک بڑے مولوی مولانا نور الدین صاحبؓ نے اس کتاب ''ترک اسلام'' کا جواب ''نور الدین'' نامی کتاب میں لکھا ہے، جس کے دیکھنے کے بعد عبدالغفور دھرم پال نے پھر مسلمان ہو کر اپنا نام غازی محمود رکھ لیا ہے۔ تب مجھے انتہائی شوق ''نور الدین'' نامی کتاب دیکھنے کا ہوا اور میں نے اپنے دوست مولوی بہاؤالدین خاں صاحب سے شکوہ کیا کہ آپ بڑی مدت سے میرے ہاں آتے ہیں، لیکن کبھی احمدیت کا ذکر نہ کیا تو انہوں نے کہا کہ طالب علمی میں، میں مذہبی مباحثے اور مناظرے سے بچنا چاہتا ہوں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ کہیں آپ کے اور میرے درمیان مذہبی مخالفت نہ ہو جائے اور پھر میں تو احمدی ہوگیا ہوں اور اس وقت دلائل وغیرہ سے بوجہ طالب علمی زیادہ واقف بھی نہیں ہوں۔ میرے والد مختار احمد خاں صاحب نے ایک گانجے کی چلم پینے والے کو اپنا مرشد مان لیا ہے۔ تو میں نے اپنے استاد مولوی میر محمد سعید صاحب کے کہنے پر یقین کر کے مرزا صاحب کی بیعت کر لی ہے۔ تب میں نے ان سے کہا کہ آپ مہربانی فرما کر خدا کے لئے وہ کتاب جو آپ کے فرقے کے مولانا نور الدین صاحب نے ''نور الدین'' نامی لکھی ہے وہ مجھے دیں۔

اس سے قبل میں نے اپنے ایک عزیز مولوی عبدالمقتدر صاحب صدیقی جو مولوی فاضل اور نائب پروفیسر دینیات جامعہ عثمانیہ جو کہ میرے استاد بھی تھے اور میرے والد صاحب کے مرشد بھی تھے ان کے ذریعہ سے میں نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؑ کا نام اور قادیان کا ذکر سنا ہوا تھا اور مولوی عبدالمقتدر صاحب ایک سخت متعصب انسان تھے اور دہلی کے ''کرزن گزٹ'' اخبار کے خریدار بھی تھے اس لئے حضرت مرزا صاحب اور احمدیت سے واقفیت تھی اسی بنا پر میں نے مولوی بہاؤالدین خاں صاحب سے شکوہ کیا تھا کہ آپ بڑی مدت سے ہمارے یہاں آتے جاتے ہیں لیکن کبھی احمدیت کا ذکر نہیں کیا۔

چونکہ مولوی بہاؤالدین خاں صاحب ہر آٹھویں روز جمعرات کو آکر جمعہ کے دن میرے ہاں رہ کر ہفتے کی شام چلے جایا کرتے تھے میں نے یہ خیال کیا کہ اب یہ ایک ہفتے بعد وہ کتاب لائیں گے۔ میں اپنے ہی مکان کے قریب خاندانی مکانات کو چھوڑ کر تبدیلی آب و ہوا کی

غرض سے بیرون بلدہ محلّہ چادر گھاٹ میں اپنے عزیز نواب اظہر جنگ بہادر کے مکان واقع علاقہ ریذیڈنسی میں مقیم تھا تو وہاں ایک مشہور احمدی مولوی میر مردان علی صاحب مددگار صدر محاسب کے گھر جا کر ان سے ملاقات کر کے ''نورالدین'' نامی کتاب طلب کی تو انہوں نے میرے خاندانی حالات دریافت کئے اور جب میں نے مولوی عمر علی شاہ صاحب کا ذکر کیا کہ وہ میرے قریبی چچا ہوتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ معاذ اللہ! آپ ابھی صاجزادے ہیں کم عمر ہیں ان جھگڑوں میں کیوں پڑتے ہیں آپ کے چچا ہمارے سخت مخالف ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ان کا دست نگر اور محتاج نہیں ہوں۔ خدا نے مجھے اپنے گھر کا بڑا بنایا ہے۔ جیسے منصب کی تنخواہ دوسروں کو ملتی ہے ویسے ہی مجھے بھی ملتی ہے۔ براہ کرم آپ مجھے کتاب دے دیں۔ انہوں نے عمداً نیک نیتی کے تحت ہی مجھے کتاب نہ دی اور عذر کر دیا کہ میں ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہو کر آیا ہوں اور سامان ابھی تک بندھا ہوا ہے سامان کھولنے کے بعد میں کتاب دوں گا تو میں نے کہا کہ ان بستوں کو کھولنے پر آمادہ ہوں آپ بتلا دیں۔ تب وہ میری ضد اور اصرار پر اپنے کمرے میں لے گئے اور میں نے دیکھا کہ درحقیقت الماریوں پر اور کچھ نیچے بہت ساری کتابیں بندھی ہوئی تھیں اور اس کمرہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ سادہ تصویر تھی۔ ایک لکڑی کی تہہ ہونے والی معمولی کرسی پر ہاتھ رکھے ہوئے بحالت استغناء کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ تصویر دیکھتے ہی میرے قلب پر ایک خاص اثر ہوا جو یہ تھا کہ یہ شخص بناوٹی نہیں ہے ورنہ ایک معمولی دو تین روپے قیمت والی کرسی پر ہاتھ رکھ کر اپنا فوٹو کیوں کھنچواتا اور خاص کر چہرے اور آپ کی آسودگی کی کیفیت اور بالخصوص آنکھوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک استغراق اور محویت کی حالت میں کھڑے ہیں۔

اب تو مجھے اس کتاب کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ چنانچہ میں نے اس اضطراری حالت میں اپنے چچا عمر علی شاہ صاحب سے جو میرے مکان سے تین چار میل کے فاصلے پر تھے جا کر کہا کہ چچا اس قسم کے اعتراضات ہو رہے ہیں' ان کے کیا جوابات ہیں تو انہوں نے مجھے خشمگیں لہجے میں کہا کہ تم ایسی باتیں سنتے ہی کیوں ہو؟ میں نے سنا بھی اور دیکھا بھی ہے کہ تمہاری صحبت میں قادیانی' شیعہ اور مہدوی لوگ رہتے ہیں تم ہرگز ان لوگوں سے نہ ملو اور نہ ان کی باتیں سنو۔ اس

پر میں نے عرض کیا کہ یہ بات آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں' لیکن یہ بات تم نے سنی ہی ان لوگوں سے ہے جو میرے ہاں بہت کم آتے ہیں یعنی میرے ایک دوست فیض المبین سرکل انسپکٹر پولیس ہیں جو گھوڑے کی سواری کا ہنر جانتے ہیں اور مجھے بھی گھڑ سواری کا شوق ہے اس لئے وہ میرے جگری دوست ہیں اور ان کے والد خیر المبین صاحب مہتمم پولیس ہیں ان سے بھی میں نے یہ بات سنی ہے۔ بہرصورت ہرچند کوشش کی کہ اپنے چچا سے اس کے جوابات سنوں' مگر انہوں نے ایک بات کا بھی جواب نہ دیا بلکہ منع کیا کہ تم آئندہ ان جھگڑوں میں نہ پڑو تب میں نے دل برداشتہ و شکستہ خاطر ہو کر مولوی بہاؤ الدین خاں صاحب کے مکان پر اس کتاب کا تقاضہ شروع کر دیا خدا کے فضل سے ایک ہفتے کے اندر ہی مولوی بہاؤالدین خاں صاحب مرحوم نے کتاب ''نورالدین'' دارالعلوم کالج سے فارغ ہو کر مغرب سے قبل مجھے لا کر دے دی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے حسب عادت اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اگرچہ کہ میری عادت ناول اور افسانوں کی کتابوں کے مطالعہ سے اتنی قوی ہو چکی تھی کہ میں ایک رات میں نو سو صفحات کی کتاب پڑھنے کا عادی تھا۔ لیکن کتاب ''نورالدین'' جو بمشکل دو تین سو صفحے کی ہے اس کو ختم کرنے تک رات کے تین بج گئے۔ اس بات کا میرے قلب پر اثر یہ ہوا کہ میں نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی خدمت میں صبح تک تقریباً سات ورق فل سکیپ سائز کے کاغذات پر اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے تمام حالات لکھے اور حضور سے اپنے دامن کو باندھتے ہوئے استدعا کی کہ حضور میرے لئے دعا فرمائیں۔ ''یہ ہے میرے احمدی ہونے کی تاریخ''

سب سے پہلے میں نے اپنے گھر میں باضابطہ احمدی ہونے کا اعلان کیا اور پھر خاندان کے چند مولویوں اور مشائخین سے مناظروں اور مباحثوں کے لئے تیار ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد مولوی عبدالمقتدر صاحب سے میرے ہی گھر میں مناظرہ ہو گیا اور وہ لاجواب ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے آنکھ میں آنکھ ملاؤ۔ میں ابھی تم کو پندرہ منٹ میں بے ہوش کر کے پوری حقیقت تم پر ظاہر کر سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ ان پندرہ منٹوں میں پلک نہ جھپکاؤ تو۔ میں اس کے لئے تیار ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری والدہ صاحبہ' ہمشیرہ صاحبہ اور دوسرے پردہ نشین متعلقین جو گھر میں تھیں سخت پریشان و مضطرب ہو گئیں اور میرے ہر دو چھوٹے بھائی جو

میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی حیرت زدہ ہوکر میری طرف دیکھ رہے تھے کہ آخر ہوتا کیا ہے دیکھیں' میں اس مرشد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل میں دعائیں کرنے میں مشغول ہوگیا بجائے پندرہ منٹ کے پانچ' سات منٹ زیادہ ہوگئے اور میرے منجھلے بھائی نے جب یہ اطلاع دی کہ مقررہ وقت سے اب وقت زیادہ ہوگیا ہے تو مولوی عبدالمقتدر صاحب نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے بڑی شدت سے اپنے سر کو جھٹکا دے کر میری والدہ کو پکار کر کہا کہ اب ان کا دل پتھر سے زیادہ سخت ہوگیا ہے۔ اس پر میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نیک بندوں کے متعلق " اشداء" ہی کہا ہے اس سے وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔

تب میں نے ان سے کہا کہ آپ کو اس وقت تقریباً سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ میں آپ کو دین و دنیا دونوں کے فائدے کی بات بتلاتا ہوں اور ان کے سامنے تحریر لکھ کر پیش کردی کہ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تصنیف "کتاب البریہ" میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی میرے ان عقاید کو غلط ثابت کردے تو بیس ہزار روپیہ بطور تاوان دینے کے علاوہ اپنی ساری کتب جلادوں گا اور پھر توبہ بھی کرلوں گا۔

یہ تحریر دے کر میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ ایک سال بھی ملازمت سے رخصت لے کر اس کی تردید میں لگ جائیں تو آپ کو بیس ہزار روپیہ مل جائیں گے۔ بجائے ہر ماہ ایک سو کے ایک ہزار روپے۔ اس طرح بارہ ہزار روپیہ بارہ ماہ کے آپ بچالیں گے۔ اور ان کے انکار کے باوجود جیب میں یہ کاغذ یہ کہتے ہوئے رکھ دیا کہ میری طرف سے باؤنڈ BOND ہے۔

پس اس واقعہ کے بعد مولوی عبدالمقتدر صاحب تادم حیات ہمارے گھر نہ آئے اور میری والدہ اور میرے منجھلے بھائی پر اس کا خاص اثر ہوا اور میرے تمام گھر والے یہ سمجھ گئے کہ احمدیت کیا چیز ہے۔ یہاں سے میری کامیابی اپنے خاندان میں شروع ہوگئی۔

باوجود یہ کہ حیدرآباد میں سالہا سال سے جماعت قائم تھی لیکن مولوی بہاؤ الدین خاں صاحب کی خاموشی کے باعث مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ حیدرآباد میں بھی جماعت ہے۔ چونکہ دارالعلوم کالج میں میں بچپن سے تعلیم پارہا تھا تب ہی سے مجھے انجمن میں کام کرنے کا شوق تھا اور اسی طرح میرے منجھلے بھائی میر فضل علی صاحب کو بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ دارالعلوم میں ایک انجمن

"ثمرۃ الادب" قائم تھی جس سے ہمیں بہت دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ شہر حیدرآباد کے ایک معزز ہندو خاندان راجہ شیوراج کے عزیزوں نے "عثمانیہ ریڈنگ روم اینڈ لائبریری" وسط شہر میں چارمینار کے قریب قائم کی تھی اس کے بھی ہم ممبر تھے۔ اس زمانے میں ظفر علی خاں جو کہ اب اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر ہیں وہ حیدرآباد میں فینانس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے' ان کی تقاریر سننے' میں اور میرے بھائی عثمانیہ ریڈنگ روم جایا کرتے تھے۔

چنانچہ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی حیدرآباد میں انجمن احمدیہ قائم کروں۔ میرے منجھلے بھائی اگرچہ کہ بیعت نہیں کئے تھے لیکن وہ ہم خیال ہوگئے تھے اور انہوں نے بھی کہا کہ ایک انجمن قائم کریں گے۔ چنانچہ جب میں نے مولوی بہاؤ الدین خاں صاحب سے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے کہ یہاں انجمن قائم ہے۔ تب میں نے ان سے کہا کہ افسوس! اتنی مدت ہوگئی لیکن آپ نے مجھے نہیں بتلایا۔ انہوں نے کہا کہ میں جب تک مولوی فاضل نہ ہوجاؤں ان مذہبی دلچسپیوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے انجمن کے ممبروں سے ملادیں تب مولوی بہاؤ الدین خاں صاحب نے ایک دن مجھ کو حضرت قبلہ گاہی مولانا محمد سعید صاحب کے پاس مستعد پورہ کے محلّہ میں جو بیرون شہر اور دریائے موسیٰ کے قریب واقع ہے لے گئے۔

جب مولوی میر محمد سعید صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو مولوی صاحب نے جماعتی روایات کے پیش نظر نہ جانے کس وجہ سے انہوں نے میری پوری تعظیم نہ کی۔ چونکہ میں اپنے چار مرشد چچاؤں کے ہاں چند مجالس میں جاتا تو وہ محبت سے کھڑے ہوکر لپٹا لیتے ہیں اور ان کے مریدین عزت کیا کرتے ہیں اور میرے دل میں یہ ظاہری اور رسمی تعظیم بیٹھی ہوئی تھی مجھے مولوی صاحب کے انداز ملاقات سے تکلیف محسوس ہوئی۔

اس کے بعد چند ہی منٹ میں مولوی صاحب کے منہ سے نکلا کہ "مرزا صاحب بہت ہی نیک آدمی ہیں" تو میرے قلب کی یہ حالت ہوئی کہ وہ پھٹ جائے گا اس لئے کہ مرزا صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نیک ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ہستی ان عام باتوں سے اتنی بالا ہے کہ ان کو "نیک" کہنا بھی گویا ان کی مذمت کرنا ہے۔

جب میں نے اپنی ملاقات کے تاثرات مولوی بہاؤالدین خاں صاحب پر ظاہر کئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آپ کے مولوی صاحب صرف نیک سمجھتے ہیں ۔ انہوں نے جب مولوی صاحب سے اس بات کا ذکر کیا تو مولوی صاحب نے کہا کہ درحقیقت آپ کے دوست میر بشارت علی صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو دلائل اور براہین سے نہیں مانا بلکہ عاشقانہ رنگ میں مانا ہے ۔

اس کے بعد محض قیام انجمن کی خاطر مولوی صاحب مرحوم سے بار بار ملتا رہا اور اس خواہش کا اظہار کرتا رہا کہ ہماری ایک باضابطہ انجمن اور لائبریری ہونی چاہئے تو مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ’’انجمن اتحاد اسلامی‘‘ کے نام سے کچھ عرصہ قبل انجمن قائم کرلی ہے جس کے ممبر: ا۔ مولوی میر مردان علی صاحب مددگار صدر محاسب ۲۔ مولوی ابوالحمید صاحب آزاد وکیل ہائیکورٹ ۳۔ مولوی سید محمد رضوی صاحب وکیل ہائیکورٹ ۴۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کٹکی اور ۵۔ مولوی قاضی غلام رسول صاحب ہیں ۔ اور یہ اراکین ہر جمعہ کو نماز اسی دیوان خانے میں پڑھا کرتے ہیں اور ان سے چندہ بھی لیا جاتا ہے ۔ اس انجمن کے انتظامات اور لائبریری کے مقام کے متعلق میری خواہش کو دیکھ کر مولوی صاحب نے اپنے پاس کی جملہ کتب متفرق و کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور اخبار ’’الحکم‘‘ اور ’’البدر‘‘ اور ریویو آف ریلیجنز کے نمبر جو منتشر اور پراگندہ تھے وہ سب بتلا کر کہا کہ اگر آپ اس کو ترتیب دیں تو اس کمرے کے تابدانوں میں یہ تمام کتب جما کر رکھ دیئے جائیں گے اور یہ لائبریری بھی ہو جائے گی ۔ اس بات پر میں بہت خوش ہوا اور مولوی صاحب کے پاس ہر روز اور بعض دفعہ دو تین روز کے بعد جا کر کتابیں درست کرتا اور نماز جمعہ بھی وہیں پڑھنے لگا ۔

اس زمانے میں میرے ہاں اپنی ذاتی سواری کا صرف ایک تانگہ تھا اور اس میں تمام پراگندہ اخبارات ، رسائل و کتب اور تبلیغی لٹریچر وغیرہ اپنے مکان لا کر شب و روز محنت کر کے ’باترتیب‘ نمبر ڈال کر گویا لائبریری کا ڈھانچہ قائم کر دیا اور تمام پھٹے پرانے کتب و اخبارات و رسائل کو جوڑ کر مولوی صاحب کے مکان پہنچا دیتا تھا ۔ میری ہمشیرہ محترمہ اس وقت ناکتخدا تھیں ۔ شب و روز بڑے اخلاص سے اور نہایت نفاست کے ساتھ سب کتب کو جوڑتی تھیں ۔ اللہ تعالیٰ

ان کے درجات کو بلند کرے ۔ آمین ۔

اس زمانے میں میرے چچا مولوی عمر علی صاحب ’’تفسیر حسینی‘‘ نامی ایک تفسیر کا رسالہ نکالا کرتے تھے ۔ میری بیعت احمدیت نے ان کو اس قدر مغموم کر دیا کہ بعض دفعہ اپنے وعظوں میں یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ میرے بھتیجے کو احمدیوں نے جو احمدی بنالیا ہے تو گویا میرے جسم میں سے دل کو نکال لیا ہے ۔ اور میرے چچا کا خیال تھا کہ میں مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کی تبلیغ سے احمدی ہوا ہوں چنانچہ میرے چچا نے اپنی تفسیر حسینی کے رسالے میں احمدیت کے خلاف مضمون لکھ دیا جس کے جواب میں مولوی میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم نے ایک رسالہ لکھا پھر اس کے جواب میں انہوں نے اسی نام کا رسالہ لکھا ۔ پھر مولوی میر محمد سعید صاحبؓ نے لکھا ۔ اس طرح سے تین چار رسالے سوال و جواب کے نکلے اور اپنے مذہبی جذبات کی شدت کی وجہ سے مولوی صاحب کے ان رسالوں کو لے کر دست بدست اپنے چچا مولوی عمر علی شاہ کو دے آتا ۔ لیکن وہ اپنی بزرگانہ شفقت اور میری کم عمری کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش ہوجاتے ۔ میں تادم زیست ان کی شفقت و محبت اور جو کچھ تعلیم انہوں نے مجھے دی وہ یاد رکھوں گا ۔

ان رسالہ بازیوں کے بعد جب حیدرآباد میں میرا نام مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے ساتھ لیا جاتا تھا تو دور دور تک اس کی شہرت ہوجاتی اس لئے کہ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کا وطن تو حیدرآباد نہ تھا لیکن میں سات پشتوں سے یہاں کا باشندہ اور میرا خاندان حیدرآباد میں اَمارت ، دین دارانہ رنگ اور مرشدی گھرانہ ہونے کی وجہ سے بہت مشہور و معروف تھا اور میرے چچاؤں کے مریدین و معتقدین کی تعداد ہزاروں میں تھی ۔ اس لئے بہت جلد حیدرآباد اور اضلاع میں چرچا ہوگیا یہاں تک کہ میرے چچا کے بعض عرب مریدین جو میرے مکان بشارت منزل کے اردگرد ہزاروں کی تعداد میں رہتے تھے مجھ کو خائف کرنے کے لئے بعض دفعہ جب میں راتوں کو ٹہلنے کے لئے مکان سے باہر نکلتا تو وہ میرے پیچھے بھاگتے ہوئے آ کر حملہ آور ہونے کی شکل میں ڈراتے تھے ۔

انہی دنوں مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک خواب کے ذریعہ ایسی تفہیم کردی کہ اس تاریخ سے آج تک بفضلہ تعالیٰ میرا دل مضبوط اور لوہے کی سلاخ کی مانند ہوگیا ۔ موسم گرما میں مکان کے

صحن میں سو رہا تھا تو دیکھا کہ ایک عرب میرے سامنے جمبیہ (چاقو) لے کر کہتا ہے کہ میں تمھیں ماروں گا۔ اور میں بجائے بھاگ جانے یا خوف زدہ ہونے کے سینہ تان کر کھڑے ہو کر آنکھ بند کر لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ''مار''۔ تب مجھے خیال آیا کہ اب تو مرنا ہے ہی تو کلمہ شریف پڑھ لوں۔ تو معاً خیال آیا کہ کلمہ تو ہمارے سر سے لے کر پیر تک رچ بس گیا ہے' لیکن یہ ایک رسم ہے کہ مرتے وقت کلمہ پڑھنا چاہئے تو پھر مجھے خیال آیا کہ جب آسانی سے پڑھ سکتا ہوں تو کیوں نہ پڑھ لوں چنانچہ کلمہ پڑھ کر آنکھ کھولا اور پوچھا کہ مارا تو اس نے کہا کہ ہاں مار دیا۔ جب میں نے پیٹ کو دیکھا تو جمبیہ پیٹ کے اندر گھس گیا ہے اور اس کا مٹھ میری ناف کو لگا ہوا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ پیٹھ سے نوک بھی نکل گئی ہے۔ جب میں نے اپنی پیٹھ کو ٹٹولا تو جمبیہ کی نوک ہاتھ کو لگی۔ اب مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن دیکھا کہ وہ عرب پچھڑا ہوا ہے۔ نیچے پڑا ہے اور میں اس کا جمبیہ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے سینے میں مارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو وہ عاجزی سے منہ کھول کر دانت نکالتا ہے۔ تب میں اسے بجائے مارنے کے اٹھاتا ہوں اور جمبیہ پھینک دیتا ہوں۔ معاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دل میں ڈالا گیا کہ ایک ڈاکٹر جو انسان ہوتا ہے انسانی ہمدردی کے لئے جب کلوروفام جیسی دوا ایجاد کر سکتا ہے کہ جس کے استعمال کے بعد اگر جسم کے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو بھی اس کو تکلیف نہیں ہوتی تو کیا اللہ تعالیٰ کو اتنی قدرت نہیں کہ اس کی راہ میں مرنے والے' قتل ہو جانے والے اور ٹکڑے ہو جانے کی تکلیف کو دور کر سکے؟ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے بعد تائید و تبلیغ احمدیت کے بڑے بڑے مواقع مجھ کو میسر آئے اور میں ہزاروں کے مجمع میں گھس گیا لیکن کبھی مجھے اپنی موت اور اس کی تکلیف کا خیال تک نہ آیا۔

اب اس کے بعد میرے جوش اور مذہبی جنون کا یہ حال تھا کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے جتنے الہامات' کشف اور خواب ریویو آف ریلیجنز کے ٹائٹل پیج پر شائع ہوئے ان کو اپنے بعض چچا اور ان کے مریدوں اور قرابت داروں کو بتلا کر یہ کہا کرتا کہ دیکھو اب یہ باتیں پوری ہو کر رہیں گی۔ چنانچہ آج باوجود چالیس سال ہو جانے کے مجھے خوب یاد ہے کہ ریویو آف ریلی جینز کے ایک ٹائٹل پیج پر یہ دونوں الہامات ایک ساتھ شائع ہوئے تھے

۱۔ وبدیہ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی نگند اور

۲۔ تزلزل در ایوان کسری فتاد تو میرے ذہن میں آیا کہ پہلا الہام ریاست حیدر آباد کے متعلق ہے اور دوسرا الہام شہنشاہی ایران کے بارے میں ہے۔ جس میں یہ بھی تھا کہ:

۳۔ صحنوں میں ندیاں چلیں گی۔

۴۔ صبح کی نماز پڑھو اور خدا کی قدرت کا نظارہ دیکھو اور غالباً یہ بھی الہام اس میں تھا کہ:

۵۔ وہ مارنے کو آئیں گے ۶۔ کشتیاں چلتی ہیں تا ہوں کشتیاں

ان الہامات کا اتنا چرچا کیا اور مجھے یقین تھا کہ اب حیدر آباد پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

اس اثناء میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے ہمراہ قادیان جانے کی تیاری کی لیکن میری والدہ مرحومہ نے جو مجھے ایک سکنڈ کے لئے بھی جدا نہ کرتی تھیں' ان کی انتہائی گریہ وزاری کے باعث' یہاں تک کہ توشہ بھی تیار ہو چکا تھا میں اپنی بدنصیبی سے آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھنے سے محروم رہ گیا اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اپنی ماں کی اطاعت کے مدنظر جس طرح سے حضرت اویس قرنیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم رہے' میں بھی محروم رہا۔ میں نے اپنے عریضہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو جو خط لکھا تھا حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

میں میر بشارت علی خاں ہاشمی ولد میر احمد علی خاں صاحب منصب دار علاقہ حضور نظام میر محبوب علی خاں شاہ وقت ریاست حیدر آباد لکھ رہا ہوں۔ مدت سے یہ آرزو تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور اقدس مسیح موعود و مہدی مسعود حضرت اقدس و عالی مرتبت مرزا غلام احمد صاحب ساکن قادیان سے جو کہ برحق مسیح تھے جن کے لئے تیرہ سو سال انتظار تھا شرف قدم بوسی حاصل کروں لیکن بوجہ عسرت و امور خانگی تا قیامت حضور اقدس کی دیدار و قدم بوسی سے محروم رہا......!

واقعہ یہ ہے کہ مولوی میر احمد سعید صاحب احمدی کشمیری جو کہ میرے استاد و بزرگ تھے وہ ماہ مئی ۱۹۰۸ء میں حضور اقدسؑ کی خدمت میں جب کہ آپ دار السلطنت لاہور میں بغرض تبدیل آب و ہوا برائے ام المومنین رونق افروز تھے جانے کا قصد ظاہر فرمائے۔ گو کہ میں عام سفر

خرچ روانگی بہم پہنچایا اور جانے کے لئے ایک روز باقی تھا کہ حضرت قبلہ والدہ ماجدہ محترمہ سردار بیگم صاحبہ جو کہ میری مشفق اور چہیتی ماں ہیں انہوں نے بوجہ جدائی و سفر دور دراز سخت مضطرب و بدحال ہوگئے تھے اور وہ بھی مانع ہوئے۔ پس بہ ایں نصیحت حضرت اقدسؑ کہ جو شخص اپنے ماں باپ کی اطاعت نہ کرے وہ میری مریدی سے خارج ہے (دیکھو کشتی نوح) جانے سے باز رہا۔

اور کچھ نذرانہ خدمت اقدس میں بذریعہ مولوی صاحب موصوف معہ یک عریضہ شوق و نیز یک عریضہ یہ بیان کہ میری ہمشیرہ غریب النساء بیگم عرف حاجی بیگم حضرت کی بیعت میں داخل ہوئے ہیں لہٰذا حضور شریک فرما کر اپنے دستخط خاص سے کچھ نصیحت تحریر فرما کر غلام کو سرفراز فرمادیں معہ نذر روانہ خدمت کیا تھا۔ چنانچہ جب کہ مولوی صاحب موصوف لاہور پہنچ گئے تو میرا اور میری ہمشیرہ صاحبہ کا عریضہ بمعہ نذر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضورؑ نے نذر قبول فرما کر خاص اپنے دست مبارک سے بتاریخ ۱۸؍ مئی ۱۹۰۸ء اپنی وفات سے نو روز قبل بمقام لاہور عزیز منزل یہ ہدایت تحریر فرمائی ہے:

میں نے ۱۹۰۶ء میں اپنے گھر میں پہلے بیعت کی اور حضورؑ کی زندگی تک بے حساب عرایض دعا کے لئے لکھتا رہا اور اپنے پتہ سے پوری طرح اطلاع نہ دے سکا تو میرے خطوط کے جواب میں جو خطوط حضور اقدسؑ بھجواتے تھے۔ بعض خط واپس ہوجاتے جسے بعد میں اخبار میں میرے تسلی دینے کے لئے چھپوادیا جاتا رہا کہ دعائیہ خطوط پہنچتے ہیں اور دعا کی جاتی ہے۔ بوجہ طفولیت میں اپنا پتہ خطوط میں نہیں لکھتا تھا اور نہ جوابات مجھے وصول ہوتے۔

میری ہمشیرہ نے ایک خواب یہ دیکھا تھا کہ ایک بزرگ جن کا رتبہ آنحضرت صلعم کے بعد ہے میرے گھر تشریف لا کر چنبیلی کے پھول کے منڈوے کے پاس جو کہ میرے صحن میں تھا کھڑے تھے کہ میری ہمشیرہ نے ان کی بیعت کے لئے بڑے کمرہ میں سے ایک مخمل کی شیروانی پہن کر باہر آئیں اور بیعت کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب اس لحاظ سے پورا ہوا کہ میں نے اپنے خط میں ہمشیرہ کا جو ذکر کیا تو اس کے جواب میں ان کی بیعت میری بیعت کا بھی ذکر فرمادیا گیا، میں دوسال ان سے قبل بیعت کیا تھا۔

نقل تحریر حضرت میر محمد سعید صاحبؓ احمدی جو میرے اور میری ہمشیرہ کے عریضہ بیعت

پر تحریر فرما کر حضور اقدسؑ کی خدمت میں پیش کی گئی۔

اس کے بعد میری شادی کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ میرے نانا محمد شکور جمعدار مرحوم اپنے جانشین نواب جمال الدین خاں جاگیردار کی لڑکی مومن بیگم کی نسبت میری پیدائش کے ساتھ ہی کردی تھی حالانکہ یہ لڑکی مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ میری بیعت سے قبل ہی اس لڑکی سے رخصتانہ کا تقاضہ ہورہا تھا۔ اگرچہ کہ اس وقت غیر احمدی لڑکی سے نکاح ہمارے سلسلہ میں ناجائز نہ تھا مگر میں احمدیت کے خیال سے اس رشتہ سے متنفر ہوگیا تھا۔ باوجود یہ کہ میرے ماموں نواب جمال الدین خان صاحب نے خود مجھے سامنے بٹھلا کر کہا کہ میں گیارہ ہزار کا زیور اور سات ہزار کا مکان اور پچاس روپے ماہانہ خرچ پاندان اپنی لڑکی کے لئے جاگیر سے مقرر کردیتا ہوں، لیکن میں خاموش رہا اور وہ رنجیدہ ہوکر چلے گئے اور اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ کردی۔

اس کے بعد ہی ان کی چھوٹی لڑکی سکینہ بیگم جب بالغ ہوگئی تو پھر میرے اسی ماموں نے بڑا دل کرتے ہوئے یہ خیال کر کے کہ میری اس لڑکی کی عمر تو اس سے کم ہے وہ منظور کرلے گا اور سابقہ رنجش کو دور کرتے ہوئے اچانک وہ ہمارے گھر آکر مجھے بلایا اور اپنی گود میں بٹھلا کر دبایا اور کہا کہ جب تک تم اپنے منہ سے یہ اقرار نہ کروگے کہ سکینہ بیگم سے شادی پر راضی ہو، میں تمھیں نہ چھوڑوں گا میرے ماموں کی اس حرکت سے اور ان کے رعب اور شرمندگی سے میری حالت قریب بیہوشی کے ہوگئی اور پسینہ چھوٹنے لگا۔ تب وہ میری حالت کو دیکھ کر ہاتھ ڈھیلا کئے اور میں بے تحاشہ بھاگ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا اور انہوں نے میری والدہ صاحبہ سے کہا کہ بچہ اس وقت پریشان ہوگیا ہے، تم سمجھا کر مجھے اطلاع کرو۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

میری والدہ نے اس رشتے کے متعلق بے حد اصرار کیا۔ یہاں تک فرمایا کہ اس لڑکی کی شکل و شباہت میری دادی سے ملتی ہوئی ہے۔ دادی کے چہرہ پر جہاں مسّہ تھا اس کو بھی مسّہ وہیں ہے اور ہماری دادی بڑی بختاور تھیں تم اس لڑکی سے شادی ضرور کرلو۔ اب تک میں اپنی والدہ کی کسی بات کو ٹالا نہیں تھا لیکن اس رشتے کے معاملے میں، میں نے نہایت عاجزی سے معافی چاہی اور کہا کہ اب ہم احمدی ہوگئے ہیں اور اب یہ امارت کے رشتے ہمارے لئے مصیبت کا موجب ہوجائیں گے تو میری والدہ نے کہا کہ تمھارے ددھیالی خاندان میں تو مذہبی تعصب بہت ہے اور

ہمارے خاندان میں مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور جب کہ امارت کے تعلق سے تمھارے ماموں تمام امور کی ذمہ داری لے رہے ہیں تو پھر تم کو انکار نہیں کرنا چاہئے' لیکن میں نے کہا کہ اب میں درویش ہوگیا ہوں اور اب امارت سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں ہے آپ انہیں جواب دے دیں۔

اس رشتے کے انکاری جواب کے بعد میرے ماموں مرحوم تادم تحریر ہمارے ہاں نہ آئے اور نہ ہمیں بلوایا۔ اللہ تعالیٰ اس ہمدردی کا ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ میں اب تک ان کی اولاد کے ساتھ اچھا برتاو کرتا ہوں اور دعائے خیر کرتا ہوں۔

جب میری دادی صاحبہ اور پھوپی کو ہمارے ننھیالی رشتے ٹوٹ جانے کا علم ہوا تو اب وہ اپنے خاندان کی لڑکیوں کے پیغام لانے شروع کردیئے۔ چنانچہ ایک لڑکی جو اچھی پڑھی لکھی اور ہمارے خاندان میں ایک بڑے گھرانے کی تھی' جس کے ماموں محمد نواز جنگ انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے اور دو بھائی نواب اظہر جنگ بہادر نظام کے پرائیوٹ سکریٹری اور نواب صدیق یار جنگ جج ہائیکورٹ تھے اس لڑکی کے چچا ہوتے تھے' اس لڑکی سے میری منگنی قرار پائی۔ باوجود یہ کہ میں نے انکار کیا' لیکن میری والدہ' میری دادی اور میری پھوپھی اور میرے سارے خاندان والوں نے اس قدر مجبور کردیا کہ بجز خاموشی کے کوئی چارہ نہ رہا۔ تب میں نے اپنی دادی سے یہ کہا کہ میں اسم نویسی میں یہ لکھوں گا کہ میں احمدی ہوں تو میری دادی نے مجھ کو غصہ سے کہا کہ بجائے حکم ماننے کے لکھ بھیجو' ان سب کو معلوم ہے۔ تب میں نے بانس کے چھلے ہوئے موٹے بدّے سے اپنے نام کے آگے ''احمدی'' لکھ کر بھیجا جس پر تمام خاندان میں اس وقت ہنسی ہوئی اور کئی لوگوں نے بُرا مانا۔ لیکن بڑے کروفر سے منگنی ہوگئی۔

اس کے بعد مجھے اپنے ددھیالی خاندان میں تبلیغی سلسلہ شروع کرنے کا موقع مل گیا۔ میری منگیتر لڑکی جس گھر میں رہتی تھی وہ ہمارے خاندان میں ایک عالی شان محل کہلاتا تھا اور شہر کے بیچ میں واقع تھا اس میں تقریباً ایک ہی خاندان کے دس بارہ گھرانے کے لوگ آباد ہیں اور وہ ایک ہی دروازہ سے آتے جاتے ہیں۔ اس مکان میں نواب اظہر جنگ بہادر نواب صدیق یار جنگ بہادر اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی انوار اللہ صاحب اور میری منسوب شدہ لڑکی کے

حقیقی بھائی اور مولوی عبدالمقتدر صاحب جو میری والدہ کے مرشد ہوا کرتے تھے' جنہیں میں نے قبل ازیں بانڈ BOND لکھ کر دیا تھا۔ ان کے حقیقی بھائی مولوی عبدالقدیر صاحب مولوی فاضل اور مولوی احمد حسین صاحب صدیقی جو ناظم محکمہ امور مذہبی تھے۔ یہ سب حضرات اور میں مل کر مغرب سے عشاء تک GEM کے اکسر سائز کی ایک کمیٹی قائم تھی اور ہم سب اس میں جا کر حصہ لیا کرتے تھے اس سے میری غرض صرف تبلیغ تھی۔ مہینہ بھر کے اندر یہ نتیجہ نکلا کہ ایک نوجوان انوار اللہ نامی جو اظہر جنگ اور صدیق یار جنگ کا چھوٹا بھائی تھا وہ میری تبلیغ کا اثر لے لیا اور اس نے بھی بیعت کرلی۔ اس پر سارے خاندان میں میری شدید مخالفت شروع ہوگئی اور پھر میرے چچا مولوی عمر علی شاہ صاحب نے اس لڑکی کے حقیقی تایا مولوی شمس الدین صاحب ناظم عدالت ضلع پربھنی کو ایک خط لکھا کہ میرے بھتیجے میر بشارت علی کو آپ کے بھائی مولوی ضیاء الدین صاحب مہتمم اسٹیٹ پائیگاہ آسمان جاہی نے اپنی لڑکی کیوں دی وہ تو اسلام سے مرتد ہوگئے ہیں۔ اس پر انہوں نے اپنے چچا مولوی فتح اللہ خاں صاحب جو میرے حقیقی پھوپھا بھی ہوتے تھے ان کو سات صفحے کا خط لکھا کہ مولوی عمر علی شاہ صاحب نے یہ اعتراضات لکھ بھیجے ہیں' ان کے کیا جوابات ہیں۔

میرے پھوپھا فتح اللہ صاحب کو یہ خط ملا تو انہوں نے مجھے اور میری والدہ کو بتلایا اور مولوی عمر علی شاہ پر سخت برافروختہ ہوئے میں نے کہا کہ یہ خط آپ میرے حوالے کریں میں اس کا مدلل جواب نرمی سے لکھ کر آپ کے پاس بھجواتا ہوں۔ آپ اسے اپنے بھتیجے مولوی شمس الدین صاحب کے پاس بھجوادیں چنانچہ میں نے غالباً چودہ ورق کا خط لکھ کر اپنے پھوپھا کے پاس بھجوادیا جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ پہلے لڑکی کے والد کو بتلایا پھر خاندان کے دوسرے ممبروں کو دکھلایا اور بالآخر مولوی شمس الدین صاحب ناظم عدالت ضلع پربھنی کے پاس بھجوادیا۔

مجھے معلوم کرایا گیا کہ میرے جواب سے وہ سب مطمئن ہوگئے ہیں کہ میں عقاید کے لحاظ سے مسلمان ہوں۔ لیکن تمام خاندان کی مخالفت کے مدنظر لڑکی کے والد اور اس کے چچاوں کا یہ خیال تھا کہ میں اور میرے خاندان والے آ کر لڑکی کے گھر پر بیٹھ جائیں تو گویا بحالت مجبوری وہ عقد کر کے لڑکی کو ساتھ کردیں گے۔ مگر میں نے اس چیز کو پسند نہ کیا۔

اس کے بعد پھر اسی خاندان اور اسی گھرانہ میں نواب اظہر جنگ کی بعض بہنوں کی

نسبت میری دادی اور پھوپھی نے لگائی تو پھر خاندان والوں نے مخالفت کی ۔ مجھے خوب یاد ہے
کہ مولوی انوار اللہ جو اس لڑکی کا بھائی تھا وہ احمدی ہوگیا تھا ۔ اس نے بیان کیا کہ نواب اظہر
جنگ بہادر نے ایک تقریب میں اپنے خاندان والوں سے کہا کہ تم لوگ تو میر بشارت علی اور ان
کے بھائیوں کو کافر سمجھتے ہو لیکن میں ان لوگوں کو فرشتے سمجھتا ہوں ۔

جب غیر احمدی رشتہ داروں میں میری شادی کی نسبتیں ٹوٹ گئیں تو ہمارے خاندان
کے بزرگوں نے طنزاً میری والدہ کو یہ کہا تھا کہ اب تمھاری اولاد کو مکہ والوں کی لڑکیاں کرنی پڑیں
گی ۔ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کی مجلس درس میں یہ معلوم کرکے کہ ان کی ایک جوان لڑکی
ہے میرے بھائی سید فضل احمد صاحب مولوی صاحب نے اس نہج سے گفتگو کی کہ آپ تین بھائی
ہیں اور احمدی ہیں اور جب کہ یہ غیر احمدی رشتہ داروں میں شادی کرنا نہیں چاہتے تو پھر احمدیوں
میں کیوں پیغام نہیں دیتے ۔ اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ مولوی صاحب کو ہم سے رشتہ کرنا
منظور ہے ۔ پھر میرے منجھلے بھائی کے ذریعہ سے والدہ نے تحریک کی اور بات قرار پاگئی ۔ تب
میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی خدمت میں حصول اجازت کے لئے عریضہ لکھا ۔ چونکہ
میرے خط کی روانگی کے بعد ہی حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ گھوڑی پر سے گر کر سخت بیمار ہوگئے اور
اس کا سلسلہ بہت طویل ہوگیا ۔

میرے اس رشتہ کی خبر جوں ہی جماعت میں مشہور ہوئی تو حضرت نواب سید محمد رضوی
صاحب جو کثیر العیال تھے' انہوں نے اپنی دو بیویوں کی دو لڑکیاں میرے دو بھائیوں سے منسوب
کرنے کے لئے حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے ذریعہ پیغام بھجوایا ۔ اس زمانے میں نواب
سید محمد رضوی صاحب کی وکالت بہت کامیاب وکالت تھی ۔ چار بگھیاں اور کئی مکانات دو منزلہ و
سہ منزلہ کے تھے ۔ ماسوا وکالت کے پائیگاہ سروقار الامراء کے اسٹیٹ کے میر مجلس تھے اور لیڈی
میر وقار الامراء کی صاحبزادی سے انھوں نے عقد ثانی بھی کرلیا تھا چنانچہ میرے دونوں بھائی میر
فضل احمد اور حکیم میر سعادت علی صاحب کے ساتھ نسبتیں قرار پاگئیں ۔

اس زمانہ میں ایک قابل ذکر یہ واقعہ پیش آیا کہ اسٹیٹ کے ایک معاملہ کے متعلق لیڈی
وقار الامراء کو جو کہ حضور نظام کی بہن تھیں حضور نظام کو عمدگی سے سمجھانے کی ضرورت تھی تو انہوں

نے یہ معلوم کرکے کہ مولوی غیاث الدین صاحب جن کو اظہر جنگ کا خطاب تھا اور وہ حضور نظام
کی پیشی میں شب و روز رہتے تھے ان سے کام لینے کے لئے نواب سید محمد صاحب رضوی کے
ذریعہ بگھی میں چالیس ہزار روپیہ کی تھیلیاں رکھوا کر بھجوائے کہ میں اس رقم کو لے لوں اور اپنے
عزیز نواب اظہر جنگ کے ذریعہ معروضہ کرکے ان کے اسٹیٹ کی کارروائی جاری کرواؤں ۔ میں
نے قطعاً انکار کر دیا اور رقم واپس کر دی ۔

اس کے بعد حضرت میر ناصر نواب صاحب قبلہ جو کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے
خسر محترم تھے بسلسلہ دورہ عید الفطر کے روز حیدرآباد تشریف لائے اور حضرت مولوی میر محمد سعید
صاحبؓ کے مکان میں مقیم رہے ۔ عید کی نماز کے بعد حضرت مولوی صاحب سے اجازت لے
کر اپنے گھر ''بشارت منزل'' چوک اسپان میں لاکر مقیم کیا جہاں حضرت میر صاحب اٹھارہ یوم
قیام پذیر رہے ۔ اس مدت میں' میں تمام حیدرآباد اور اضلاع کے احمدیوں سے مل کر تقریباً چار سو
روپے چندہ بغرض تعمیر ہسپتال قادیان اور مسجد نور حضرت میر ناصر نواب صاحب کے حوالے کیا ۔

حضرت میر صاحب قبلہ کی موجودگی ہی میں حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا فرمان دربارۂ
شادی یہ وصول ہوا ''اب بہت جلد ہی شادی کرلیں انتظار نہ فرماویں ۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۰ء حضور کا یہ
خط مجھے غالباً ۱۳/ یا ۱۴/اکتوبر کی صبح ۹ بجے وصول ہوا اور اسی روز حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کے
مکان پر حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ کی رخصتی کی دعوت تھی ۔ اسی دعوت کے اختتام پر حضرت
میر صاحب نے میرا نکاح پڑھا جس کا تفصیلی ذکر ''سفر نامہ ناصر'' میں درج ہے ۔

میری شادی میں ایک مشکل یہ پیش آئی کہ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم
حضرت ام المومنینؓ کا مہر ''گیارہ سو روپے'' ہی اپنی بیٹی کا مہر مقرر کرنا چاہتے تھے' لیکن میری والدہ
محترمہ کم از کم گیارہ ہزار روپے مہر باندھنا چاہتی تھیں ۔ اس لئے کہ ہمارے خاندان کا مہر
سالہا سال سے پچپن ہزار روپے چلا آتا تھا ۔ میری والدہ صاحبہ کا اصرار اس نیک نیتی پر مبنی تھا کہ
کہیں مہر سے مولوی صاحب کی لڑکی کو جو کہ غیر خاندان سے بیاہ کر لائی جارہی تھیں ان کی اس
سے ہمارے غیر احمدی خاندان میں بے وقعتی محسوس نہ ہو ۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ زمانہ
ایک لحاظ سے میری طالب علمی ہی کا تھا اور بجز شاہی منصب کے اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور جو

کثیر المالیت کے چار خاندانی مکانات ہمارے تھے وہ مشترک تھے اور تقسیم نہ ہوئے تھے اس لئے
یہ گیارہ ہزار کا مہر مجھے بالکل رسمی نظر آتا تھا اور زیادہ تھا اور میں اپنی والدۂ محترمہ کی نیک نیتی اور
دوراندیشی کے مدنظر ان کے خلاف مرضی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں اپنی اہلیہ سے پہلی
خلوت ہی میں یہ بات کہہ دیا کہ شریعت کے لحاظ سے یہ مہر جواب باندھا گیا ہے میری اس وقت
کی حیثیت سے زیادہ ہے جس سے مجھے شرح صدر بھی نہیں ہورہا ہے اس پر میری اہلیہ خاموش
رہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں معافی بھی نہیں چاہتا اور نہ اس قدر اس وقت دینے کے قابل
ہوں اور اب یہ وقت شریعت کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنے کا ہے۔ آپ خدا سے ڈر کر اپنی
رضامندی کے ساتھ ایک ایسا فیصلہ کریں جو مفید بھی ہو اور جائز بھی۔ تب میری اہلیہ نے کہا کہ مہر
کی نسبت میرا یہ اقرار ہے کہ میری زندگی تک جس قدر رقم مجھے وصول ہوجائے گی وہ میرا مہر ہے
اور میرے مرنے کے بعد جس قدر رقم میرے مہر کی باقی رہ جائے گی میں اس کو بخوشی خاطر بنظر
ثواب معاف کردیتی ہوں۔ اس کی بابت بعد میں کوئی مطالبہ نہ ہوگا۔ چنانچہ یہی الفاظ میری اہلیہ
نے اپنے فارم وصیت مورخہ ۴/اکتوبر ۱۹۱۲ء میں درج کئے ہیں۔

میری اہلیہ کے اس تصفیہ نے میرے قلب کو مطمئن کردیا اور میں ان کی اس فراخ
حوصلگی اور عقلمندی کا عمر بھر معترف رہوں گا۔ میری شادی میں جہاں یہ ایک بات اچنبھے والی ہوئی
وہاں اور امور بھی عام حیدرآباد میں جرأت اور تعجب کے ساتھ اور میرے کثیر خاندان اور عوام میں
مشہور ہوئے۔

۱۔ میں نے اپنی والدہ سے یہ طے کرلیا تھا کہ اگر میری شادی کرنی ہو تو مجھ کو علیحدہ
مکان دیا جائے گا۔ ۲۔ میں شرعی گوشہ پردہ کراؤں گا حتیٰ کہ میرے حقیقی بھائیوں سے بھی جو
بڑے نیک اور فرشتہ خصلت تھے اور مجھ سے چھوٹے تھے ان سے بھی پردہ کراؤں گا۔ میری والدہ
نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ ان باتوں پر میں نے عمل کیا۔

میری شادی کے بعد میرے دونوں بھائیوں کی بھی شادی ہوئی۔ منجھلے بھائی کی شادی
مولوی سید محمد رضوی صاحب کی لڑکی امۃ السلام بیگم سے ہوئی۔ اور میرے چھوٹے بھائی زبدۃ
الحکما حکیم میر سعادت علی صاحب سے جو محترم رضوی صاحب کی دوسری بیوی کی لڑکی سے نسبت

تھی۔ محترم رضوی صاحب کے ممبئی منتقل ہوجانے کے بعد ہی اس لڑکی کا دوسری جگہ عقد کردیا گیا
۔ اس لئے میرے ماموں نواب سراج الدین خاں صاحب کی منجھلی لڑکی شریف النساء بیگم صاحبہ
کے ساتھ عقد ہوا۔ الغرض میرے دونوں بھائیوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔

میری ہمشیرہ مرحومہ غریب النساء بیگم عرف حاجی بیگم کے متعلق نواب اکبر یار جنگ
سابق ہوم سکریٹری حکومت حیدرآباد نے پیغام دیا تھا۔ میری والدہ مرحومہ کو نواب صاحب
موصوف کے پیغام سے چند وجوہ کے باعث اختلاف تھا۔

۱۔ یہ کہ نواب صاحب پٹھان ہیں اور ہم سید ہیں۔ ۲۔ نواب صاحب کا اصل فرخ
آباد (یو۔پی) ہے تو اندیشہ تھا کہ بعد ختم ملازمت کہیں وہ اپنے وطن فرخ آباد میں میری ہمشیرہ کو
نہ لے جائیں۔ تب میں نے حضرت ام المومنین مدظلہا کی خدمت میں یہ سارے واقعات لکھے
تو جواباً حضرت ام المومنین نے یہ تاکیدی فرمان روانہ فرمایا کہ یہ رشتہ مناسب ہے کردیا جائے۔
تب میری والدہ نے فوراً تعمیل کردی۔

ہمارے ان رشتوں کی وجہ سے ہمارے تمام خاندان میں احمدیت کی ایک زبردست فتح
نمودار ہوئی اور ہمیں ان کو زور دار تبلیغ کرنے کا موقع مل گیا۔ ہمارے عزیزوں میں سے بہت
سارے غیر احمدی احمدیت کی حقیقی فتح سمجھنے پر مجبور ہوگئے۔ اس لئے کہ جو رشتے دار تھے وہ
حیدرآباد کے مشہور و ممتاز گھرانے تھے۔

حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ احمدی جو میرے خسر تھے ان کے والد بزرگوار مولانا
عبدالعزیز صاحب امرائے پائیگاہ کے مرشد تھے اور حیدرآباد میں ان کی بڑی مقبولیت تھی' ہزاروں
ان کے مرید تھے اور روزانہ صبح کشمیری چائے اور ایک کلچہ صدہا کی تعداد میں لوگ آکر نوش فرماتے
تھے۔ ایسے مشہور خاندان میں میرا رشتہ ہوا۔

دوسرے مولوی سید محمد رضوی صاحب پیشہ وکالت میں اس زمانے کے وکلا میں سب
سے چوٹی کے وکیل مانے جاتے تھے اور انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں ہزار ہا روپے کا زیور اور
جہیز دیا تھا اور ان کی لڑکی کی شادی میرے منجھلے بھائی سے ہوئی۔ میرے چھوٹے بھائی سے
نواب سراج الدین خاں صاحب میرے ماموں کی لڑکی منسوب ہوئی تو یہ رشتہ بھی سارے

خاندان اور شہر میں مشہور و معروف خاندان میں ہوا اور میری ہمشیرہ کا رشتہ نواب اکبر یار جنگ سے ہوا تو اس وقت وہ باوجود طبقہ وکلاء کے ممتاز اور سر برآوردہ وکیل ہونے کے ہوم سکریٹری کے معزز عہدہ پر فائز تھے۔

ہمارے خاندانی بزرگ مردوں اور عورتوں نے یہ جو خیال ظاہر کیا تھا کہ احمدیت قبول کرنے کے باعث ہمیں نہ کوئی بیٹی دے گا اور نہ کوئی ہماری بیٹی لے گا یہ سب خیالات اللہ تعالیٰ کے فضل سے غلط ثابت ہوئے۔

حضرت مرزا صاحبؓ کے انتقال کے بعد مجھے اور جن کو میں نے حیدرآباد کے متعلق حضور اقدسؑ کے الہامات سنائے تھے سب ہی کو انتظار تھا کہ وہ باتیں کب پوری ہوں گی کہ چند ہی مہینوں کے بعد حیدرآباد میں بارش کے آخری موسم میں جب کہ بارش بالکل ختم ہو جاتی ہے مسلسل ایک ہفتہ بارش کا سلسلہ جاری رہا' جس کے بعد ۳/رمضان سنہ ہجری مطابق ۲۸/ستمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طوفان آیا جس کی نظیر تاریخ حیدرآباد میں نہیں ملتی۔ ہزاروں مکانات اور ہزاروں نفوس ڈوب گئے اور مر گئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ صحنوں میں ندی بہہ رہی تھی۔ چنانچہ میرے چچا مولوی میر علی شاہ صاحب ایک معزز احمدی نواب سید عمر رضوی صاحب کے مکان کے پاس جو ماما جمیلہ کی دیوڑھی کے محلے میں واقع ہے طغیانی کے پانی کو دیکھنے کھڑے ہوئے تھے اور میں ان احمدی بھائی کی خبر گیری کے لئے گیا تو دیکھا کہ طغیانی کا پانی ان کی دہلیز سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک گیا ہے اور ان کا تین منزلہ مکان صحیح و سالم تھا اور قریب کے تمام مکانات منہدم ہو چکے تھے۔ جوں ہی میرے چچا کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیش گوئی اب پوری ہوگئی۔ انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے چلے گئے۔

ہم نماز جمعہ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم کے مکان پر پڑھا کرتے تھے۔ اس مکان سے دریا کی دھار بہہ رہی تھی چوں کہ شہر اور محلہ مستعد پورہ کے درمیان پرانا پل بنا ہوا ہے جو شکستہ ہو گیا تھا اور شہر کے دوسرے پل تو بہت ہی شکستہ ہو گئے تھے اس لئے میں فوراً ایک صاحب جو ہر وقت منہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے وہ بھی خود حیدرآباد آئے اور مولوی رضوی

صاحب کے مکان پر ایک دن رہ کر ان سے لڑائی کر کے میرے ہاں آ گئے۔ یہ شخص خود کو احمدی کہتا تھا اور احمدیت سے اور قادیان کے حالات سے بھی واقف تھا۔ اس لئے میں نے اس کو بطور مہمان کے رکھ لیا لیکن بعد میں مولانا بہاؤالدین خاں صاحب سے جو طغیانی کے بعد میرے ہاں مقیم تھے ان سے لڑ کر چلا گیا۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں' لیکن ان کا عرف ''کل ازوانی'' مشہور تھا۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ پوچھا کہ قادیان میں آپ جب تھے نقاب کی حالت میں تھے تو حضرت خلیفۃ المسیح نے آپ کو کچھ فرمایا تھا تو اس بیچارے نے صداقت کے ساتھ یہ بات کہہ دی تھی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اس نقاب کے اندر ''کھوتی کی لونڈ'' ہے۔ پنجابی زبان میں اس کے معنی ''گدہی کی مقعد'' ہے۔

طغیانی رود موسیٰ کے بعد حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ محلہ مستعد پورہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر محلہ میں' کاروان ساہو' کے آگے ایک مکان پہاڑ پر کرائے سے لے کر مقیم ہو گئے تھے اور وہیں نماز جمعہ بھی پڑھی جانے لگی۔ میرا حافظہ کہتا ہے کہ اسی مکان میں سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی یادگیری کی سب سے بڑی دختر رابعہ بی مرحومہ کی شادی میاں عبدالکریم صاحبؓ مرحوم جن کو قادیان میں سگ دیوانہ نے کاٹا تھا اور جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعا سے معجزانہ رنگ میں بچ گئے تھے اور جو سیٹھ شیخ حسن صاحب یادگیری کے بھانجے بھی تھے ان کے ساتھ شادی کرنے کے لئے سیٹھ صاحب موصوف معہ زنانہ آ کر دو تین ہفتے اسی مکان میں قیام کر کے نہایت سادگی کے ساتھ شادی کر دیئے تھے۔ اور اس محفل عقد میں معمولی ملبوسات دلہن کو دیئے گئے۔ البتہ پانچ سو روپے دلہن کے نام سے کارخانے میں جمع کروا دیئے گئے۔

تقریباً ایک سال تک نمازیں وہیں ہوتی رہی۔ میں اور میرے منجھلے بھائی میر فضل علی اور میرے رشتے کے ماموں زاد بھائی میر دلاور علی ہاشمی نے مولوی صاحب سے کہہ کر کہ یہ مقام شہر سے بہت دور ہے اگر آپ پسند کریں تو ہم وسط شہر میں آپ کی رہائش کے لئے کرایہ یا رہن کا مکان تلاش کرتے ہیں اس سے جماعت کو بھی آرام رہے گا اور تبلیغ کے لئے بھی سہولت رہے گی۔ مولوی صاحب نے اس کو پسند کیا' جس پر میرے بھائی میر دلاور علی ہاشمی اور میر فضل علی نے تلاش شروع کر دی اور چند ہی دنوں میں ناف شہر میں یعنی چار مینار سے قریب محلہ بی بی بازار میں ایک

شاہی قرابت دار صاحبزادے کا مکان جو بہت خوشنما تھا کرایہ پر حاصل کرلیا اور مولوی صاحب مرحوم نے اس میں سکونت اختیار کرلی ۔ اور اسی مکان کے قریب لب سڑک شاہی محلات کے علاقے کا ایک بڑا بنگلہ بہت کم کرایہ پر مل گیا اور نماز جمعہ اسی بنگلے پر پڑھی جانے لگی ۔

چندمہینوں کے بعد میں اپنے ایک عزیز مولوی سلیمان صاحب کے ہاں جو ایک سرکاری عہدہ دار اور حیدرآباد کے مشہور عالم منشی عبدالکلام کے فرزند تھے ۔ جب ان کے باغ میں گیا تو دیکھا کہ بہت بڑا کتب خانہ ان کے ہاں ہے مگر دیمک سے وہ بہت پریشان تھے ۔ تب میں نے ان سے کہا کہ اگر ہمارے بنگلے پر جو دومنزلہ ہے آپ کا کتب خانہ منتقل کردیا جائے تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری میں لوں گا ۔ انہوں نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا ہزارہا روپیہ کا کتب خانہ حوالے کردیا ۔ تب میں نے حضرت مولوی صاحب سے یہ استدعا کی کہ نماز کے بنگلے پر ''کتب خانہ احمدیہ'' قائم کرکے بورڈ لگادیا جائے تو اس میں لوگ آئیں گے اور تبلیغ بھی ہوسکے گی ۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت پسند فرمایا پھر مولوی صاحب کے تمام کتب کو صاف ستھرا کرکے میرے مندرجہ بالا عزیز کے کتب خانے کے ساتھ ملا کر رکھ دیا گیا ۔ اس کتب خانے کی افتتاحی تقریب ہونے لگی تو مجھے خیال آیا کہ اس کی کوئی تاریخ نکالی جائے تو اس کتب خانے کی یہ تاریخ نکلی کہ : ''یہ کتب خانۂ انجمن احمدیہ ہے''

جب افتتاحی کام ہونے لگا تو مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اس موقع پر انجمن کی جانب سے ایک پبلک جلسہ بھی کرنا چاہئے ۔ جب اس جلسے کے لئے جماعت سے چندہ کیا گیا تو نہایت قلیل یعنی صرف مبلغ چھ روپے چار آنے جمع ہوئے اور اخراجات جلسہ کے لئے زیادہ چندہ کی ضرورت تھی تو میں نے اپنے بھائی میر فضل علی صاحب کو نواب سید محمد رضوی صاحب کے پاس روانہ کیا اس لئے کہ ان کی لڑکی امۃ السلام بیگم مرحومہ سے ان کی نسبت قرار پارہی تھی اور اس وقت نواب صاحب مرحوم اسٹیٹ پائیگاہ سہ وقار الامراء کے تعلقدار اور وقار آباد کے مقام پر ان دنوں مقیم تھے ۔ جب میرے منجھلے بھائی وہاں گئے تو نواب صاحب مرحوم نے کافی چندہ دیا ۔ جس کی مقدار اب مجھے یاد نہیں ' لیکن اس چندے سے کتب خانے کی ضروریات پوری ہوکر جلسہ کے لئے رقم کافی ہوگئی ۔ جماعت احمدیہ کا یہ پہلا پبلک جلسہ تھا اس کی تاریخ اور سن یہ ہے :

اس کے بعد شروع میں چار آنے کا مقوہ (کارڈبورڈ) لے کر اس پر انجمن احمدیہ کا نام لکھ کر بنگلہ کی دیوار پر لٹکادیا ۔ چند ہی دنوں میں مخالفین نے اس مقوہ کے بورڈ کو سنگباری' کیچڑ اور گوبر وغیرہ پھینک کر خراب کردیا ۔ تب میں نے روغن گیاس کے پیپے (بیارل) کے چار حصے کرواکر اس پر انجمن کا بورڈ تحریر کرواکر متواتر دیوار پر لٹکاتا رہا اور ان تمام بورڈوں کا وہی حشر ہوا ۔ انہی دنوں اتفاق سے مکرم سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی یادگیری جب مولوی میر محمد سعید صاحبؓ احمدی سے ملنے تشریف لائے تو میں نے سیٹھ صاحب کو کتب خانہ وغیرہ بتلا کر کہا کہ اگر ایک بڑا بورڈ لوہے کا بنوا کر لگوایا جائے تو بہت مناسب ہوگا ۔ تب سیٹھ صاحب نے دس روپے اس کام کے لئے دیئے اور میں نے چار فٹ اور تین فٹ (4'x3') کا ایک بورڈ بنوا کر اس پر لکھوادیا ''انجمن احمدیہ'' اور ''کتب خانہ احمدیہ'' اور ان دونوں کے درمیان میں میں نے "العظمة لله'' عربی سے لکھوا کر اس کے نیچے اعلیٰ حضرت نظام کا تاج بنوایا اور اس بورڈ کو مضبوطی کے ساتھ نسب کرواکر پولیس اسٹیشن کے ''امین'' صاحب (سب انسپکٹر پولیس) کو جن کا تھانہ انجمن کے بنگلہ کے سامنے ہی تھا ۔ اطلاع کردی کہ اگر مثل سابق اس بورڈ پر بھی سنگباری یا کیچڑ یا گوبر پھینکا گیا تو اللہ تعالیٰ کے نام کی بے ادبی اور تاج شاہی کی تذلیل ہوگی اور اس کے متعلق کوتوال بلدہ کو مجبوراً اطلاع دینا ہوگا ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل تھا کہ اس نے میرے ذہن میں یہ تجویز ڈالی ۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس بورڈ کو کسی نے خراب کرنے کی ہمت نہ کی اور سالہا سال تک وہیں لگا رہا اور اس بورڈ کی اور جماعت کی شہرت تمام شہر میں ہوگئی ۔

حیدرآباد میں سب سے پہلا طاعون اسی سال آیا ۔ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم کو الہاماً یہ بتایا گیا تھا کہ میرے چچا میر علی شاہ صاحب' مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ اور بعض شدید مخالفین جن کی تعداد چھ یا سات تھی وہ اس طاعون میں یا اس کے بعد ہی یقیناً فوت ہوجائیں گے ۔ چنانچہ حیدرآباد میں طاعون کی شدت بکثرت ہوئی روزانہ سات آٹھ سو تک اموات کی تعداد ہوگئی تھی ۔ مولوی میر محمد سعید صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ اپنے چچا کے محلے میں رہا کرتے ہیں اور جب تک کہ آپ تخلیہ نہ کریں گے اس محلے میں طاعون کی شدت نہیں ہوگی ۔ چنانچہ میں بمقام پٹن چرو جو حیدرآباد سے 9 میل پر واقع ہے اور اس زمانے میں کمشنر مال

Revenue Commissioner کا ہیڈ کوارٹر تھا' وہاں منتقل ہوگیا اور مولوی میر محمد سعید صاحب اپنے زنانے کو یادگیر لے جاکر چھوڑ آئے۔ کبھی وہ یادگیر میں رہتے اور کبھی حیدرآباد آجاتے۔

میرے حیدرآباد سے منتقل ہوجانے کے بعد ہمارے محلّہ میں بہت ساری اموات ہوئیں اور میرے چچا عمر علی شاہ صاحب بھی اسی مرض طاعون میں مبتلا ہوکر فوت ہوگئے۔ اور زیادہ تر لوگ وہ بھی جن کے متعلق حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کو بتلایا گیا تھا جیسے:

ا۔ نواب مظفر جنگ بہادر رصدر المہام امور مذہبی ۲۔ نواب عبدالباقر خاں باقر جنگ بہادر ۳۔ مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ بانی جامعہ نظامیہ وغیرہ کا طاعون سے' بعض فالج سے اور بعض ہارٹ اٹیک سے فوت ہوگئے۔

سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی مرحوم کے مکان میں اس زمانے میں حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ یادگیر میں تقریباً دو مہینے قیام فرما رہے۔ مولوی مومن حسین صاحب جو کہ حاجی محمد ترکی ٹوپی والے کے ہاں بطور منیجر کے ملازم تھے اور جن سے میری محبت ہوگئی تھی کیونکہ ان دنوں طاعون سے قبل میری ہمشیرہ مرحومہ کو وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں کرایے کا ایک بڑا وارڈ لے کر رکھا تھا۔ اور میں خود بھی ہسپتال کے باہر ایک کمرہ کرایے پر لے کر مقیم ہوگیا تھا۔ میری ہمشیرہ کی شدید علالت کے باعث دعاؤں میں شب و روز لگا ہوا تھا اور فرصت کے وقت میں ترکی ٹوپی کی شاپ میں آکر بیٹھتا اور مولوی مومن حسین صاحب سے تبلیغی گفتگو کرتا۔ چونکہ وہ اپنے نام کے لحاظ سے حقیقتاً ایک مومن انسان ہیں اور میں اپنے سلسلے کے حالات جب سناتا تو وہ سن کر بہت خوش ہوتے تھے' جس سے میں سمجھتا تھا کہ ان کی سلیم الفطرتی ایک دن ان کو یقیناً احمدی بنادے گی۔

ان ہی طاعون کے ایام میں ایک روز مجھے یادگیر سے' پٹن چرو میری قیام گاہ پر مومن حسین صاحب کا خط آیا کہ ''میں بفضلہ تعالیٰ بیعت کرکے احمدی ہوگیا ہوں اور میں خود آپ سے ملنے پٹن چرو آرہا ہوں۔'' چنانچہ صاحب موصوف اپنی بیعت اور اس تعلق کے مدنظر کہ میں انہیں جو تبلیغ کیا کرتا تھا مجھ سے قصبۂ پٹن چرو میں ملے اور کہا کہ اب آپ کی محنت رنگ لائی۔ اور میں احمدی ہوگیا ہوں اور انہوں نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ جب سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی مرحوم کے اور عزیزوں سے پہلے یہ بیعت کرنے کے لئے آگے بڑھے تو مولوی میر محمد سعید صاحبؓ نے

پوچھا کہ آپ اس قدر جلد کیوں بیعت کر رہے ہیں تو اس وقت انہوں نے میرا ذکر کرکے کہا کہ میں ان سے کئی مہینوں قبل سے سلسلہ کے حالات سنتا آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے سلسلے سے واقفیت ہوچکی ہے اس لئے اب بیعت کر رہا ہوں۔

اسی طرح سیٹھ محمد غوث صاحب کی بیعت کے بعد میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ سیٹھ محمد غوث صاحب جو سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ کے چچا زاد بھائی ہوتے تھے حضرت مولوی صاحب کے زیر تبلیغ تھے ایک روز کسی وجہ سے بیہوش ہوگئے۔ اور اس وقت حضرت مولوی صاحب منہ دھونے کے لئے صحن میں ٹہل رہے تھے کہ عین اسی وقت سیٹھ صاحب کے بیہوش ہوجانے کی وجہ سے مکان میں روم راٹ (کہرام) شروع ہوگئی تو مولوی صاحب اندر گئے اور جاتے ہی ہاتھ میں پانی لے کر ان کے چہرہ پر مارا اور دعا کی اور ان کو پکارا تب سیٹھ صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ مولوی صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کا اس وقت آنکھ کا کھولنا ایسا ہوا کہ گویا ان کی ظاہری اور دل کی دونوں آنکھیں کھل گئیں۔

مولوی مومن حسین صاحب' سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی کی بھانجی۔ کے شوہر اور سیٹھ محمد غوث صاحب سیٹھ صاحب کے چچا زاد برادر اور سیٹھ محمد خواجہ صاحب سیٹھ صاحب کے برادر ہیں جو سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ کے عزیز و اقارب ہیں جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔

جیسے جیسے جماعت ترقی کرتی گئی اور تبلیغی سرگرمیوں' جلسوں وغیرہ میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے جماعت کی مخالفت بھی بڑھتی گئی اور خصوصاً محکمہ امور مذہبی کے صدر المہام چونکہ نواب مظفر جنگ اعلیٰ حضرت نظام کے بہنوئی اور قریبی رشتہ دار تھے اور مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ بانی جامعہ نظامیہ کے استاد تھے اور مولوی عمر علی شاہ خطیب مکہ مسجد اور حیدرآباد کے مشائخین کبار میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ہزاروں لوگ جن کا ہر شعبۂ حیات سے تعلق تھا ان کو اپنا مرشد اور رہنما مانتے تھے' اس کے علاوہ جماعت کے بے شمار مخالفین ہر طبقے میں یعنی شہر کے عہدہ دار' جاگیردار' پڑھے لکھے افراد اور تجارت پیشہ اور ملازم سرکار اور عوام الناس بلکہ بدمعاش اور غنڈوں میں سے بھی رہتے تھے اور جماعت کے جلسے خصوصاً پولیس اور سی' ای' ڈی کے لئے درد سر بنے ہوئے تھے۔ جلسوں کے پوسٹر اور اعلانات دیواروں پر چسپاں کرتے ہی پھاڑ ڈالے

جاتے اور اگر چسپاں کرنے کے لئے احمدی دوست جاتے تو سارے پوسٹر، لئی اور برتن اور سیڑھی وغیرہ سب غنڈے کھینچ لیتے اور موقعہ بے موقعہ جماعت کے احباب کو مارتے اور ستایا کرتے اور جلسوں میں گڑ بڑ پیدا کرتے، پتھر وغیرہ بھی مارتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مولوی عبدالعزیز صاحب تلاپوری جو کہ پستہ قد اور کمزور جسم کے دوست تھے جب پوسٹر لگانے گئے تو محلہ سلطان شاہی میں ان سے پوسٹروں کا بنڈل، سیڑھی اور لئی کی دیگچی غنڈے کھینچ لئے اور ان کو وہاں سے بھگا دیئے، جس پر جماعت کے دو طاقتور احباب میں میر احمد سعید صاحب جو حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ احمدی کے فرزند ہیں ان کو اور مولوی سید حسین صاحب ذوقی کو کہ دونوں نہایت تنومند اور فن کشتی و بنوٹ (لاٹھی) سے اچھی طرح واقف تھے دوبارہ پوسٹر دے کر روانہ کیا گیا۔ ان دونوں نے اپنی حکمت عملی اور اچھی صحت اور اچھی شہرت کی بناء پر غنڈوں سے سابقہ پوسٹر اور سامان بھی واپس حاصل کر لئے۔

یہ حالت تو عوام کی تھی۔ اب سرکاری سطح پر بھی محکمۂ پولیس امور مذہبی سے اجازت لینے اور ذمہ دار افراد سے مچلکے لینے کے بعد ہی جلسوں کی اجازت دی جانے لگی اور پولیس اور سی آئی ڈی ہر طرح تنگ کرنے لگی تو میں نے باقاعدہ درخواستیں دے کر حکومتی سطح پر پیروی شروع کر دی اور ایک عرصہ دراز تک یہ مقدمہ چلتا رہا اور رات دن اس کی پیروی میں صرف ہونے لگے۔

بالآخر یہ مقدمہ صدر المہام (وزیر) کے اجلاس پر پیش ہوا جن کا نام سر اکبر حیدری تھا۔ میں نے ان کے اجلاس پر متعدد مرتبہ پیروی کی اور بالآخر ان کے آگے جماعت کے اصول اور جماعت کی تبلیغی اور امن پسند مساعی نہایت کامیابی سے بالتفصیل پیش کیں، جس پر انہوں نے فیصلہ کے لئے ایک دن مقرر کیا۔ جب دوسرے دن مجھے صدر المہام بہادر کے دفتر جانے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ دیر سے پہنچا تو ان کے پرائیوٹ سکریٹری نے مجھے بتلایا کہ فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور اس فیصلہ میں لکھا ہوا تھا کہ بغیر کسی اقرار نامہ یا مچلکہ کے جماعت کو جلسوں کی اجازت دی جاتی ہے۔ البتہ مسجد بنانے کے لئے اگر درخواست دی جائے تو اس کا بھی مناسب لحاظ کیا جائے گا۔

سترہ ماہ کی انتہائی فکر و پریشانی اور جدوجہد اور ہمہ اقسام کے حالات کا استقلال سے مقابلہ کے بعد اس تجویز کا خلاف امید حکم صادر ہونا اور خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر اکبر

حیدری نے مجھے اپنے موقف کی وضاحت کا موقعہ دیا مگر میں دوسرے دن وقت پر نہ جا سکا اور میرے جانے سے قبل ہی تجویز صادر ہوگئی تو دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم معلوم ہوتا ہے۔

سر اکبر حیدری پر میری سابقہ ملاقاتوں کا بہت خاص اثر تھا اور دوسرے روز وہ دفتر جاتے ہی از خود مسل منگوا کر اور میرا انتظار کئے بغیر تجویز لکھ کر تحت میں روانہ کر دی۔ اس فیصلے کو لے کر میں مارے خوشی کے سیدھے حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کی خدمت میں پہنچا اور وہ اس فیصلے کو دیکھ کر خوش ہوئے اور آخر میں یہ کہا کہ ابھی مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ آپ کی بھاوج کا انتقال تھوڑی دیر قبل ہو گیا ہے۔ آپ جلد جا کر ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیجئے۔

یہ دو متضاد واقعات متذکرہ میری عمر میں پہلی مرتبہ پیش آئے یعنی میری سیدھی آنکھ سلسلے کی کامیابی پر ہنس رہی تھی اور بائیں آنکھ سلسلہ کے ایک قدیم بزرگ جن کا نام تین سو تیرہ صحابہ کرام میں داخل ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی متعدد کتب میں حضرت مولوی سید محمد رضوی صاحب کے اخلاص و ایثار کی تعریف فرمائی ہے اور ایک کتاب میں یہاں تک کہا ہے کہ انہوں نے ایک ہزار روپیہ کی مشک بطور نذرانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی تھی۔ چونکہ یہ مرحومہ میری بھاوج ان کی صاحبزادی تھی خصوصاً مجھے اور تمام جماعت کو اس کا سخت صدمہ تھا اور یہ واقعہ وفات، حضرت نواب سید محمد رضوی صاحب کے حیدرآباد سے ممبئی کو منتقلی سے پہلے کا ہے۔

الغرض میری بھاوج کی تدفین کے بعد پھر میں سلسلہ کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ چوں کہ تقریباً دو سال سے زیادہ عرصہ میں انجمن کے مقدمے کی پیروی میں شب و روز گذار چکا تھا اور اس سارے عرصے میں اپنا کوئی ذاتی کام نہ کر سکا تھا۔

مجھے ابتداء سے انجمن کے کاموں اور بالخصوص تبلیغ سے خاص لگاؤ تھا اور اغیار کی خدمت گذاری اور اسی طرح تبلیغ اور تالیف قلوب کے اکثر کام کرتا رہتا تھا تو حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ نے میرے اس ذوق مزاج کو دیکھ کر یہ سوچا کہ کوئی تجارتی کام پر مجھے لگا دیا جائے جس سے بہت سارے احمدی اور غیر احمدی اور زیر تبلیغ احباب کو فائدہ پہنچے اور میرا تبلیغی انہماک بھی جاری رہے۔

حضرت مولوی میر محمد سعید صاحب مرحومؓ کے ہاں ایک عبدالغفور نامی کنٹراکٹر آتے تھے جو زیر تبلیغ بھی تھے ۔ چونکہ اس زمانے میں حیدرآباد میں کسی قدر قحط سالی ہوگئی اور چاول بجواڑہ اور مچھلی بندر وغیرہ کی طرف سے آرہا تھا تو مولوی عبدالغفور صاحب نے مولوی صاحبؓ کو یہ باور کرایا کہ اگر اس وقت چاول بجواڑہ سے خرید کر حیدرآباد لایا جائے تو واگن پوری قیمت معہ منافع دے کر ساہوکار خرید لیتے ہیں ۔ تب مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ یہ بہت ہی آسان کام ہے میں رقم دیتا ہوں آپ عبدالغفور صاحب کے ساتھ جاکر چاول خرید کر لائیں ۔ میں اپنے حسب عادت انکار تو نہ کرسکا لیکن سخت تردد ہوگیا کہ عبدالغفور صاحب کو صرف تلگو آتی ہے اور مجھے بالکل یہ بات کرنی نہیں آتی اور معاملہ بھی تلگو علاقہ میں کرنا ہے نہ معلوم کہ تلنگی سے میری ناواقفیت کے باعث جماعت کو کوئی نقصان ہوجائے اس لئے میں تقریباً ہفتہ عشرہ تک سوچتا رہا تب ایک روز مولوی صاحب نے تشدد کے رنگ میں یہ حکم دیا کہ میں فوراً کام پر چلے جاؤں' جب میں عبدالغفور صاحب کو ساتھ لے کر بجواڑہ روانہ ہوا ۔ بوقت روانگی مولوی صاحبؓ تین ہزار کی رقم میرے حوالے کردیئے تھے مگر میں نے رقم ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ مال کی خریدی کے بعد میں بذریعہ تار اطلاع دوں گا' تب آپ رقم بھجوادیں ۔ اس کے بعد میں بجواڑہ روانہ ہوگیا اور تقریباً اٹھارہ یوم بجواڑہ' تنالی' گڑی واڑہ' کوٹ دارم اور مچھلی بندر وغیرہ تمام فیکٹریز کو دیکھ کر آخر میں کوتّوورم کی سبرانیم کی فیکٹری سے پرانے چاول خرید کر میں نے حضرت مولوی صاحب کو اطلاع کی تو حضرت موصوف نے مولوی عبدالرزاق صاحب احمدی مرحوم جو کہ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی مرحوم کے بڑے بھائی تھے ۔ ان کے ذریعہ تین ہزار روپے کلدار کے کرنسی نوٹ بھجوائے ۔ الغرض یہ کہ ایک ماہ میں یہ خریدی کا معاملہ طے کرکے میں واپس لوٹا ۔ اس ایک ماہ کی میری اور عبدالغفور صاحب پر کی سنگت اور شب و روز کی ملاقات اور وقفہ وقفہ سے تبلیغی مسائل پر گفتگو کرتے رہنے اور میری پنجگانہ نمازوں اور نماز تہجد و دعاؤں کے دیکھنے سے اور میرے تمام حالات اور معاملات کا جائزہ لیتے رہنے کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ واپسی بجواڑہ کے چند روز بعد ہی بیعت کرکے سلسلہ میں داخل ہوگئے ۔

چند یوم کے بعد مال کے حیدرآباد پہنچتے ہی میں عبدالغفور صاحب کو لے کر جب اسٹیشن

پہنچا تو معلوم ہوا کہ اسٹیشن کے یارڈ Yard site پر مال فروخت نہیں ہوگا اور ضرورت اس بات کی ہے کہ مال بنڈی یا کاروں کے ذریعہ کسی گنج کی شاپ منتقل کردیں تو وہاں عام خریدار اور دکان دار مال خرید لیتے ہیں ۔ تب حضرت مولوی صاحب سے یہ بات کہہ کر ہم دوکان کی تلاش میں لگ گئے چنانچہ عثمان گنج میں ایک شاپ تیس روپیہ کرایے کی لی گئی اور اس پر "احمدیہ اسٹور ۔ سپلائی کمپنی" کا بورڈ لگایا گیا اور مال ہنڈی کار کے ذریعہ وہاں منگوالیا گیا ۔ اب مال کے نکالنے کے لئے دشواری ہوگئی کہ تمام گنج کے ساہوکاروں نے یہ طئے کرلیا کہ بزمانہ پلیگ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف دوکانیں بند کرکے اپنے دیس چلے گئے تھے' جس سے پبلک اور گورنمنٹ کو سخت تکلیف پہنچی تو اب گورنمنٹ نے یہ کمپنی اس نام سے قائم کی ہے ۔ اس پروپیگنڈہ کی وجہ سے ہماری شاپ میں کوئی گاہک یا بیوپاری داخل نہیں ہوتا تھا ۔

تقریباً دو ماہ گذر گئے اور اسٹاف کی تنخواہیں جن میں مولوی عبدالوہاب صاحب صدیقی برادر مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی تھے اور خواجہ عبدالوحید صاحب انصاری مینیجر شاپ تھے اور ایک نومسلم دھڑیہ بھی تولنے والا جو میرے چچا حضرت مکی میاں صاحب کا مرید جس کا نام غلام خواجہ تھا اور جو بعد میں میری تبلیغ سے احمدی ہوگیا تھا ۔ ان کی تنخواہوں کے علاوہ ساٹھ روپے کرایہ کا بار بھی عاید ہوگیا تھا اور جماعت احمدیہ بیجاپور کے ایک تاجر غلام رسول احمدی کو بھی میں نے مقرر کیا ہوا تھا ۔ چونکہ ہماری یہ شاپ گنج میں جہاں ٹھوک فروشی کی جاتی ہے وہاں قائم تھی اور وہاں چلر فروشی نہیں ہوسکتی تھی اور چلر خریدار چاہتے تھے کہ ان کو مال مل جائے تب میں نے چلر فروشی کی ایک دوکان عثمان گنج کے باہر قائم کی اور پھر اس کے بعد مختلف محلوں میں مثلاً چوک کی مسجد' شاہ علی بنڈہ' شبلی گنج' کاچی گوڑہ اور یاقوت پورہ وغیرہ میں دس دوکانیں قائم کردیں ۔ اس انتظام میں میرے پیش نظر تبلیغی معاملہ بھی رہا چنانچہ ان دس دوکانوں میں دو جگہ تو احمدی مقرر تھے اور آٹھ دوکانوں پر غیر احمدی متدین ملازمین کو رکھا گیا تھا ۔ مال کی خریدی کے لئے اکثر مسلم احباب آتے تو ان کو بھی تبلیغ کی جاتی اور بالخصوص ملازمین کو تبلیغ کی جاتی ۔ اس سے غیروں پر احمدیت اور احمدیوں کی نیک معاملت کا اثر ہوتا ماسوا ان دس دوکانوں کے بعض لوگوں کو میں نے ان کی خواہش پر جن سے ۱۰۰ روپے اپنے ہاں ڈپازٹ رکھ کر ایک دوکان اپنے پرانے چاول کی

قائم کروادی جس سے وہ لوگ زیادہ روپے کمانے لگ گئے۔ انور میاں نامی ایک شیعہ دوست جو اب تک زندہ ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں اور اظہار تشکر کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح ماسوا مسلمان احباب متعدد دوستوں کی بھی میں نے مدد کی جن میں سے ایک مانکیم کومٹی جو شریف اور غریب تھا اس نے دودھ باولی کے دروازہ کے اندر اپنی دوکان قائم کرلی۔ الغرض اس تجارت سے میں حسب عادت تبلیغی سلسلہ اور اسلامی ہمدردی اور مخلوق خدا کی خدمت کے جذبہ کو مدنظر رکھ کر کام کرتا رہا جس کے باعث شہر کے تمام دفاتر اور کارخانہ جات میں ہر ماہ کے اوائل میں ''پرانے چاول سستے دام کے عنوان سے اشتہار چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں ''احمدیہ کمپنی'' کی جانب سے ملازمین سرکار کو تنخواہ تقسیم سے قبل چاول تقسیم کروایا جاتا تھا اور مال کی عمدگی اور ناپ تول کے اطمینان پر ہماری احمدیہ کمپنی کی نیک نامی اور خصوصیت سے میری شہرت شہر میں بہت ہوگئی۔ چند دنوں بعد علاوہ چاول کے ہر قسم کے اناج کا بھی میں نے اسی طرح انتظام کیا کہ عثمان گنج میں جس قدر مال روزانہ آتا تھا وہ بڑے تاجروں کو بیس یوم کی مہلت پر ادھار دیا جاتا تھا اور میں اپنے علاقے کے دوکانداروں کو پندرہ دن کی مہلت پر اُدھار دیا کرتا تھا تو ماسوا پرانے چاولوں کے جملہ قسم کے اجناس ہماری دکان سے فروخت ہونے لگے۔

اس کمپنی کی زیادہ تر شہرت کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ میں تمام بیوپاریوں سے فی تھیلہ چار آنے کم پر بیچ دیا کرتا تھا حتیٰ کہ میری شاپ کے متصل سیٹھ رام گوپال مالک گرنی کے بھائی گنگا بشن کی بھی غلہ کی دوکان تھی۔ ان کا منیم میرے سے کہتا تھا آپ اس قدر سستا کیسے دے سکتے ہیں چنانچہ وہ اپنی بل بک بتلا کر کہتا تھا اگر آپ کی قیمت پر ہم بیچیں تو ہم کو گھاٹا ہے۔ اصل میں یہ واقعہ یہ تھا کہ میں سبرامنیم باکڑی سے مال منگوالیا کرتا تھا کسی اور کو مجھے کمیشن دینی نہیں پڑتی تھی' جس قدر دوسرے لوگ کمیشن دیتے تو کمیشن میں بھی لیتا تھا اور دوسرے دوکان داروں سے کم کر کے بیچتا تھا۔ چنانچہ خدا کے فضل سے دو تین مہینوں میں میری دونوں دوکانوں کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔ لیکن گنج کی شاپ سے کوئی ساہوکار مال نہیں خریدتا تھا۔ یکا یک ایک روز میں اپنی شاپ ایک بجے (جب کہ عثمان گنج کے بیوپار کا وقت ۹ بجے ہوتا تھا) بند کر کے اپنی گاڑی میں سوار ہو رہا تھا تو سیٹھ ہری رام بخش نامی ایک لکھ پتی ساہوکار جس کا بیوپار عثمان گنج میں سب سے زیادہ ہوتا

تھا اور اس ساہوکار کے اثر کے ماتحت میری شاپ میں کوئی بیوپاری نہیں آتا تھا کہ اس کا لڑکا جو ابھی تک زندہ ہے اور مجھ سے ملتا رہتا ہے۔ وہ دوڑ کر آ کر مجھ سے کہا کہ میرے والد آپ سے ملنے آرہے ہیں آپ گاڑی نہ بڑھائے۔ تھوڑی دیر میں ہری رام آ کر بڑی تشدد کے ساتھ میری شاپ کھلوا کر مجھے لے کر شاپ میں داخل ہوا اور عاجزی اور منت سے کہنے لگا کہ خدا کے لیے میری عزت رکھ لو اور ساٹھ تھیلے پرانے چاول میرے کو دے دو ورنہ مجھے آج شام چار بجے مہتمم صاحب جیل میں داخل کردیں گے اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ میں جیل کے قیدیوں کے لئے ماہانہ ساٹھ تھیلے پرانا چاول دینے کا کنٹراکٹ کیا ہوا ہوں۔ تب میں نے کہا کہ یہ وہی چاول جس کو تم آج خراب چاول کہہ کر بیوپاریوں کو میرے ہاں آنے سے روکتے آرہے ہیں میں اس شرط کے ساتھ دوں گا کہ سب سے نیچے کے تھیلے تم کو دوں گا' سوے اتفاق سے جس روز اسٹیشن سے بنڈی کے ہمارے چاول شاپ میں لائے گئے تو حمالوں نے مال رکھنے کی جگہ لیپ دیا تھا اور وہ جگہ گیلی تھی جس جگہ پر وہ تھیلے ڈال دیئے گئے تو سردی سے تھیلے گل کر اندر سے جو چاول نکلے وہ چاول سردی سے نم ہو گئے تھے۔ اس لئے کہا کہ جو تمہارے گیلے چاول ہیں وہ کل میں لے لوں گا چوں کہ یہ مجھے سزا مل گئی ہے۔ تب میں نے ساٹھ تھیلے چاول اس کو دے دیا' جس کی وجہ سے تمام گنج میں ایک تعجب کی لہر دوڑ گئی اور جب کہ ہری رام بخش اپنی دوکان کو لوٹ گیا اور میں یہاں مال کو تلوانے میں مصروف تھا تو تمام ساہوکار میرے ہاں آ گئے اور کہا کہ جب کہ آپ نے ہری رام بخش کو مال دیا ہے جو شخص ہم کو آپ کی شاپ سے مال کی خریدی سے روکتا تھا' اس کو جب آپ دیئے ہیں تو ہمیں بھی دیجئے تو میں نے کہا کہ ایک تو میں فی تھیلہ چار روپیہ بطور جرمانہ اس سے وصول کیا ہے اور پھر اس وجہ سے میں تم کو اس وقت بھی دے سکتا لیکن ورنگل کے آگے ایک پل کے ٹوٹ جانے کے باعث تین دن سے درآمد برآمد بند ہے اور میرے ہاں پرانے چاول کا ہی اشتہار دیا جاتا ہے اس لئے میں اس وقت نہیں دوں گا۔ خدا کی شان کہ جب ہماری شاپ قائم ہوئی ہم پر بیوپاری ہنستے تھے اور خاص کر جب سے کہ گلے ہوئے تھیلے کے سبز چاول نمودار ہوئے تو ساہوکار دوسرے گاہکوں کو لا کر بتلاتے اور کہتے کہ اس میں ایسے سوکھے چاول فروخت ہو رہے ہیں۔

خواجہ عبدالوحید صاحب مینیجر تقریباً روزانہ مجھ سے لڑتے کہ ان گلے ہوئے چاولوں کو ہٹادیا جائے اور اس طرح میرے ملنے جلنے والے دوست احباب آتے وہ بھی یہی کہا کرتے تو میں اس کا یہ جواب دیتا کہ اب تو یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ اس کو رہنے دو۔ بیوپار تو ہمارا بیرونی دوکانوں سے چالو ہو چکا ہے۔ ایک وقت انشاء اللہ ایسا آئے گا کہ اس چاول کو کوئی خرید لے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا اور یہ امر میرے اور میری دوکان کے احمدیوں کے لئے ازدیاد ایمان کا موجب ہوا۔ خدا کے فضل سے اس کے دوسرے روز ہی ساہوکار خریدی مال کے لئے دوکان پر آنے لگے اور میں نے ان کو مال دینا شروع کردیا۔ چند ہی مہینوں میں ہماری ساکھ ایسی قائم ہوگئی کہ بغیر رقم کے میں ہزاروں روپیہ کا مال لیتا اور دیتا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی تین ہزار کی رقم میں نے واپس کردی اور اب صرف ساکھ پر بیوپار چلتا رہا۔ ماسوا ہم تمام کام کرنے والوں کے مکانات کا پورا غلہ مفت دینے کے تین سو روپے ماہانہ نقد نفع بھی ہوتا رہا اور روزانہ تقریباً پندرہ سیر اناج مزدوروں کو خیرات بھی کیا جاتا تھا۔ وہ اس طرح کہ صبح سات سے لے کر نو بجے عثمان گنج میں جو مال مونڈھا منڈی دیہاتوں سے آتا تو اس کی فروخت کے لئے بطور نمونہ دھرم ویر تمام اس مال سے ایک مٹھی لے کر میری شاپ میں رکھتا اور جب میں نو بجے آتا تو ان نمونوں کو دیکھ کر پسند کرتا اس کی خریدی کا حکم دیتا اور بقیہ مونڈھا منڈی نمونوں کو ایک گیس کے تیل کے خالی ڈبہ میں رکھوا دیتا اور وہ مزدوروں میں تقسیم ہوتا۔

تقریباً ایک سال تک یہ بیوپار بڑے شد و مد کے ساتھ چلتا رہا اور کوئی بڑے سے بڑا بیوپاری میرا مقابلہ نہ کرسکا۔ یہاں ایک واقعہ بھی بیان کردیتا ہوں جس زمانے میں کہ یہ احمدیہ کمپنی قائم کی گئی تو ایک موٹر انجینئر جو نواب برق جنگ کے ہاں ملازم تھا' چودھری نواب علی صاحب مرحوم احمدی جو میرے گھر میں رہتے تھے اور نواب صاحب کے خسر تھے تو ان کی تبلیغ سے وہ مسلمان ہونے کے قریب ہوگئے پھر میں نے ایک تازہ کتاب جس کو ڈاکٹر مفتی محمد صادق صاحب نے امریکہ سے چند نسخے منگوا کر میرے ہاں بھی بھیج دیئے تھے جس کا نام ''واقعہ صلیب کی چشم دید شہادت'' ہے میں نے اس موٹر انجینئر مسٹر ایچ H کو دی۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد وہ میرے ہاں روتا ہوا آیا اور میں نے بیعت کروادی اور اس کا نام عبداللہ رکھا اور وہ عبداللہ انجینئر کے نام سے مشہور ہوگیا۔

عثمان گنج میں کئی ہزار روپے پر چور کانٹا سالانہ نیلام ہوا کرتا تھا جس کو تلوائی کی ضرورت ہوتی تو وہ اس چور کانٹے پر فی تھیلا دو پیسے اجرت دے کر تلوایا کرتا' مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ میں نے چھ چھاپ کا کانٹا سو روپے کا خرید لیا تھا اور اس کو لگانے کے لئے کھمبا بھی نصب کروالیا تھا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ چور کانٹے کے باعث میں اپنی شاپ میں کانٹا نہیں لگا سکتا تاوقتِ کہ سرکار سے اجازت نہ مل جائے۔ ایک مرتبہ مسٹر عبداللہ H میری شاپ دیکھنے کے لئے نواب برق جنگ کی موٹر لے کر آگئے۔ میں نے ان کی اچھی خاطر تواضع کی۔ تمام گنج میں یہ مشہور ہوگیا کہ یہ سرکاری افسر ہیں کمپنی دیکھنے آئے ہیں۔ مسٹر عبداللہ H نے اس کانٹے کو بیکار رکھا ہوا دیکھا اور کہا کہ اس کو کیوں نصب نہیں کیا جاتا تو میں نے کہا کہ آپ کی اگر خواہش ہے تو اپنے ہاتھ سے لگادیں تو انھوں نے اسے کانٹے سے جوڑ دیا۔ اس وقت تقریباً گنج کے اکثر سیٹھ ساہوکار عبداللہ H کو دیکھنے کھڑے ہوئے اور کچھ مودبانہ ایستادہ تھے۔ تنصیب کانٹہ کے بعد میں اور عبداللہ H شاپ سے اترے۔ وہ موٹر میں سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو تمام حاضر الوقت سیٹھ صاحبان نے انھیں مودبانہ سلام سے رخصت کیا۔

دو تین روز میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ چور کانٹا کے کنٹراکٹر چودھری اور دوسرے خریدار کے درمیان ناپ تول پر کچھ جھگڑا چل پڑا تو وہ دونوں یہ کہتے ہوئے میرے یہاں آگئے کہ یہ سرکاری کمپنی کا کانٹا ہے اس پر تلوالو۔ اس کے بعد سے بلا اختلاف اور بغیر شکایت کے میری شاپ کا کانٹا چالو ہوگیا۔ اور آخر تک برقرار رہا۔ الغرض احمدیہ کمپنی کے ساتھ یہ بہت بڑا فضل ہوا۔ پبلک میں اور تجارتی حلقے میں ہر موقع پر اللہ تعالیٰ نے تائید فرمائی۔

تقریباً ایک سال تک ہماری دوکان اور یہ شاپ کا کام بڑی عمدگی سے چلتا رہا۔ اس اثناء میں قادیان سے میری خواہش پر سیٹھ ابوبکر یوسف جمال احمدی جو جدہ کے ملک التجار ہیں وہ رنگون جاتے ہوئے حیدر آباد تشریف لائے اور میرے اس اناج کے کاروبار کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ میں بھی سالانہ ایک لاکھ روپے کی سفید جوار ممبئی سے جدہ میں منگوا کر مدینہ منورہ کے بدوؤں کو فروخت کیا کرتا ہوں۔ اگر آپ مجھ کو جوار دیں اور ڈبل تھیلے میں مال بھروادیں تو

میں آپ سے سودا کرنے کو تیار ہوں ۔ چنانچہ ان کے اور میرے درمیان یہ بات طئے ہوگئی تو میں جوار کے سب سے بڑے تاجر دگی محبوب صاحب ساکن سیڑم کے پاس جا کر چوبیس گھنٹے میں ایک لاکھ روپے کا معاملہ طئے کر کے حیدرآباد واپس آ کر ممبئی میں سیٹھ ابوبکر صاحب کو تار دے کر دریافت کیا کہ کس تاریخ کو مال روانہ کیا جائے ۔ فوراً جواب آیا کہ ابھی مال نہ بھجوائیں چونکہ تمام جہازوں کو گورنمنٹ دنے روک لیا ہے جرمن وار شروع ہوچکی ہے۔ تا اطلاع ثانی مال نہ بھجوائیں ۔

اسی سال حیدرآباد میں بارش بروقت ہوئی اور نہایت اچھی ہوئی جس کے نتیجے میں مکئی' اور چاول کی پیداوار بہت ہوگئی جس کے نتیجے میں مکئی اور چاول دیہات سے آ کر فروخت ہونے لگا ۔ چونکہ بیرونی مال پھیکا ہوتا ہے اور دیسی مال کسی قدر شیریں ہوتا ہے تو لوگ پردیسی چاول کو پسند نہ کرنے لگے اور بعد میں یہ مال منگوانا بند کر کے کمپنی کی شاپ کو برخاست کرنے پر اس لئے مجبور ہوگیا کہ اب میں ان سے مال خرید کر مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اس لئے کہ جب دیہات کے آئے ہوئے مال کو اپنی شاپ کے ذریعہ فروخت کرنے کے لئے تاجروں کو کہا تو انہوں نے یہ کہا کہ ہم سود سے ان ساہوکاروں سے رقم لے کر کاشت کیا کرتے ہیں ۔ جب فصل تیار ہوتی ہے تو ان کے ملازمین کو اپنے سامنے فصل کٹوا کر اور صاف ستھرا کر کے دوکان پر لا کر ہراج کرتے ہیں اس لئے ہم آپ کی دوکان پر اپنا مال نہیں دے سکتے ۔ تب مجھے اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اگر یہ دوکانیں قائم رکھی جائیں تو سودی لین دین کرنا ہوگا ۔ شخصی' سودی معاملے سے بچنے کے لئے سوا سال کی یہ تجارتی جدوجہد کو برخاست کر دینا پڑا اور میں بھی چوبیس گھنٹے کے کاروبار سے تنگ آ گیا تھا اور مجھے اپنی تبلیغی جدوجہد کا موقع کم ملتا تھا ۔ اس لئے کہ میرا پروگرام سوا سال سے یہ تھا کہ روزانہ ان دوکانوں کی جھڑتی کرنا اور نگرانی کرنا اور آٹھ بجے رات سے لے کر دو بجے رات تک تمام دوکانوں کے حساب کتاب کی جانچ کرنا ۔ بمشکل چار گھنٹے آرام ملتا تھا ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہزار کی خرید و فروخت کا معاملہ میرے ہاتھوں سے ہوا ہے ۔ بفضلہٖ تعالیٰ نقصان کچھ نہ ہوا لیکن صدہا روپے ہمارے دوکان داروں پر باقی رہ گئے ۔ اور سینکڑوں روپے کا سامان بھی باردان اور کانٹے اور باٹ وغیرہ مفت میں مل گئے ۔ جس کی قیمت تقریباً

بارہ سو روپے تھی جو میں نے مولوی صاحب کے حوالے کر دی ۔

اس کام سے فراغتی کے بعد مولوی صاحب نے ایک اور کام کا آغاز کیا وہ یہ کہ ہمارے احمدی احباب کو وقتاً فوقتاً قرضہ اور مالی مدد کی ضرورت پڑتی تھی تو مولوی صاحب نے ایک انجمن ''اخوان الصفاء'' کے نام سے قائم کر کے مجھے اس کا معتمد بنا دیا ۔ اس کے اصول یہ تھے کہ جو شخص ماہانہ پانچ قسط ادا کرتا رہے تو اس کو قرعہ اندازی پر تین سو روپے بطور قرضہ حسنہ مل جاتا تھا جس سے بعض لوگ شادی کر لئے اور بعضوں نے مکانات خرید لئے اور بعضوں نے تجارت شروع کر دی اور پانچ سال میں اس کی ادائی بہ آسانی ہوسکتی تھی ۔ اس کے جملہ سات شیرز رکھے گئے تھے ۔ بعض احمدی ایک حصہ Share لیتے اور بعض دو سے پانچ تک ۔ چنانچہ میرے خود پانچ حصے تھے اور بعض غیر احمدی احباب کو بھی ہم نے شریک کر لیا تھا ۔

اس انجمن ''اخوان الصفاء'' کے قیام سے ہمارے رقمی معاملات کے لین دین اور مذہبی اور اخلاقی ہمدردی کے دیکھنے کا اغیار کو موقعہ ملتا تھا' چنانچہ اس اخوان الصفاء کے بعض حصہ داروں نے تسلی اور اطمینان کے بعد بیعت کر لی ۔ ہر ماہ پانچ افراد کو بوقت شب حضرت مولوی صاحب کے روبرو حاضر الوقت حصہ داروں کی موجودگی میں قرعہ اندازی کی جاتی تھی جس کا نام نکلتا تھا تین سو روپے کی رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ۔ محض اطمینان قلب اور غرباء کی امداد اور ضرورت کے لئے بعض متمول احمدی مثلاً مولوی غلام اکبر خاں صاحب اور میرے بھائی حکیم میر سعادت علی صاحب اور محترم سیٹھ عبداللہ صاحب اور سیٹھ الہ دین صاحب مرحوم کے نام اگر رقم نکل جاتی تو ان کی اجازت سے وہ رقم کسی شدید حاجت مند احمدی یا غیر احمدی ارکان کو دے دی جاتی ۔ یہ سلسلہ برابر پانچ سال تک چلتا رہا ۔ اس میں مجھے آٹھ سو روپے کا نقصان اٹھانا پڑا اس لئے کہ جن اصحاب نے رقومات حاصل کیں ان میں سے بعض کی تکمیل ضمانت نہ ہوسکی اس لئے کہ میں حضرت نواب محمد علی خاں صاحب آف مالیر کوٹلہ کے کام کے لئے چند ماہ ممبئی میں مقیم تھا ۔ میرے غیاب میں جو رقمیں بعض احباب نے حاصل کیں وہ بے ضابطہ حاصل کیں ۔ نواب صاحب کے کام سے فراغت کے بعد جب میں ممبئی سے واپس ہوا تو حضرت مولانا میر محمد سعید صاحب نے جدید مکان انجمن کی تعمیر کا کام مجھ سے لینے لگے جو کہ لیکچر ہال کے نام سے موسوم ہے ۔ اس لیکچر

ہال کو پبلک مسجد احمدیہ کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ تعمیر کے وقت بھی کئی ماہ محکمہ صفائی بلدہ اور محکمہ کوتوالی بلدہ میں پیروی کرنی پڑی اس لئے کہ سررشتہ امور مذہبی نے محکمہ کوتوالی بلدہ کو مطلع کردیا تھا کہ اس مکان کی تعمیر فی الوقت روک دی جائے۔ تب موجودالوقت کوتوال بلدہ وینکٹ رام ریڈی اور مولوی محبوب علی نائب کوتوال بلدہ نے اپنے اجلاس پر مجھ کو بلاکر بہت دیر تک تمام حالات دریافت کرتے رہے اور آخر میں انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ جس طرح ایک ہندو اپنے گھر میں عبادات مذہبی بجالاسکتا ہے۔ نہ وہ مکان مندر کہلاسکتا ہے اور نہ یہ مکان مسجد کی تعریف میں آسکتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہ کہا گیا کہ بڑے مولوی صاحب کا ایک اقرار نامہ اس بات کا بھیج دیا جائے کہ اس مکان کا نام ''سعید منزل'' ہے' لیکن اس میں نماز جمعہ وعیدین نماز پنجگانہ باجماعت پڑھا کروں گا اور جلسہ بھی کیا کروں گا۔ اس اقرار نامہ کے دینے کے بعد اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ جماعت کے مخلصین نے دامے، درمے، سخنے اس کارخیر میں حسب استعداد حصہ لیا۔

حضرت مولوی صاحب شب و روز اس تعمیر میں سخت مصروف تھے اور اس قدر عجلت فرماتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ اگر کبھی کسی تعمیری کام میں مصلحت کے لحاظ سے دیری کی جاتی تو وہ کہتے تھے کہ میرے مرنے کے بعد جو چاہو کرو لیکن اس وقت تعمیر مکمل کرلی جائے۔

اس تعمیر کے لئے بیمز Beams گارڈز اور سمنٹ' چونا وغیرہ کی خریدی اور فراہمی کے لئے قابل ذکر سیٹھ محمد غوث صاحب مرحوم ہیں جن کو مولوی صاحب سے بطور خاص خلوص و عقیدت تھی اس کے بعد قاضی غلام رسول صاحب مرحوم' بعد اوقاتِ ملازمت اس کام میں مولوی صاحب کے ساتھ جٹے رہے۔ قاضی صاحب مرحوم صحابی تھے۔ حضرت بڑے مولوی صاحب کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق رکھتے تھے کہ جب تک مولوی صاحب مستعد پورہ میں رہے وہ بھی ان ہی کے محلے میں رہے' جب مولوی صاحب بی بی بازار تشریف لائے اور انجمن کا مکان خرید لیا تو ان ہی کے مکان کے قریب انہوں نے بھی ایک مکان خرید لیا اور سکونت پذیر ہوگئے۔ الغرض وہ اور ان کا خاندان ہروقت بڑے مولوی صاحب کے ساتھ وابستہ رہے۔ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی انھیں کے داماد ہیں۔

تعمیر مکان کے ساتھ حضرت بڑے مولوی صاحب نے جماعت احمدیہ حیدرآباد کا جلسہ

سالانہ اسی نوتعمیر شدہ انجمن میں منعقد فرماکر اس مکان کا افتتاح فرمایا۔

سنگ سیلو کا جو فرش کیا گیا تھا تو اس کی سردی ہنوز باقی تھی کہ حضرت بڑے مولوی صاحب مرحوم دن میں دو بجے سے مغرب تک یعنی اختتام خطبہ تک اس ٹھنڈے فرش پر تشریف رکھے تھے جس سے انھیں اعصابی تکلیف شروع ہوگئی اور اسی شب انھیں بخار آگیا اور دو تین روز میں یہ بخار ڈبل نمونیہ کی شکل اختیار کرگیا بالآخر چوتھے روز اسی مرض سے مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

انتقال کے دو گھنٹے قبل بحالت ہوش فرمایا کہ قاضی غلام رسول صاحب کو بلایا جائے اور پھر انھیں حکم دیا کہ مسجد میں اذاں کہی جائے اس لئے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لارہے ہیں۔ پرانا مکان انجمن جو منہدم کرکے صحن مکان بنادیا گیا ہے اتفاقاً ان دنوں بغرض تعمیر مکان انجمن بی بی کے مکان سے مبارک الدولہ کی گلی کے قریب جو مکان تھا اس میں مقیم تھے۔ اس مکان انجمن کے دالان میں ایک برآمدہ تھا۔ اس کے کواڑ کھول دینے سے انجمن کا مکان جہاں اب نماز پڑھی جاتی ہے وہ پوری طرح نظر آتا تھا۔ انتقال سے تھوڑی دیر قبل حضرت مولوی صاحب نے ہمیں کہا کہ اس برآمدے کے دروازے کھول دیئے جائیں اس لئے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لارہے ہیں تاکہ میں ان کو دیکھ سکوں' اس کے بعد دعا مسنون جو وہ بوقت نماز تہجد پڑھا کرتے تھے پڑھنا شروع کیا۔ زبان میں کسی قدر لکنت محسوس ہورہی تھی۔ اس کے بعد غالباً دو بجے دن کا وقت ہوگا کہ حالتِ نزع شروع ہوئی۔ ڈاکٹر سید ظہور اللہ احمد صاحب جو کہ وہ بھی صحابی تھے میں نے انھیں بلوایا۔ انہوں نے ہرچند کوشش کی اور متعدد انجکشن دیئے کہ نبض کی حالت درست ہو لیکن بہتر نہ ہوسکی اور بالآخر مولوی صاحب فوت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ابھی ہم حضرت ممدوح کو قبلہ رُخ لٹانے ہی میں مصروف تھے کہ خان بہادر احمد نواز جنگ جو اکثر مولوی صاحب کے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور ان کی علالت کے زمانے میں ایک دو مرتبہ آچکے تھے وہ بھی پہنچ گئے۔ میں نے ان کو اندر بلایا۔ اس وقت مولوی صاحب پر چادر اوڑھائی جاچکی تھی۔ خان بہادر نے مجھ سے خواہش کی کہ میں مولوی صاحب کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیسا ہے میں نے ان کو اجازت دی۔ انہوں نے چادر اٹھائی اور مرحوم کا نورانی چہرہ

دیکھ کر دُعا دی اور آبدیدہ ہو گئے اور بہت تعریف کی۔

یہ حیدرآباد کی تاریخ احمدیت کا نہایت صبر آزما دن تھا۔ تمام جماعت میں یہ خبر فوری پھیل گئی چونکہ مولوی صاحب موصی تھے لہٰذا سیٹھ محمد غوث صاحب نے لکڑی کا صندوق تیار کروایا بعد تجہیز و تکفین بغرض نماز جنازہ مولوی صاحب کی نعش مکان انجمن میں لائی گئی تو جماعت کے احباب کے علاوہ مولوی صاحب ممدوح کے بہت سارے غیر احمدی شاگرد بھی جمع ہو گئے تھے جن میں وکلاء' آزاد پیشہ' طلبا اور ملازمین بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کو بھی نماز جنازہ پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ جماعت کے احباب نماز جنازہ پڑھ چکے تو میں نے غیر احمدی احباب کو اجازت دی کہ وہ شوق سے نماز جنازہ پڑھیں۔ سبھی نے گریہ وزاری کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی۔ اس کے بعد مقبرہ احمدیہ واقع بیرون فتح دروازہ میں مولوی صاحب کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

جنازہ سے قبل انتخاب امارت کا مسئلہ پیش آیا کہ جو شخص مولوی صاحب کا قائم مقام ہوگا وہ نماز جنازہ پڑھائے گا۔ تمام جماعت نے میرا انتخاب کیا۔ تب میں نے تمام جماعت کے احباب کو یہ بات بتلائی کہ اس وقت قدیم بزرگ ہماری جماعت میں موجود ہیں پہلے مولوی ابوالحمید صاحب آزاد وکیل ہائیکورٹ کو جو صحابی نہیں ہیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں جماعت حیدرآباد میں سب سے پہلے بیعت کی اور تین سو تیرہ صحابہ میں ان کا نام شامل ہے۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر سید ظہور اللہ احمدی صاحبؓ صحابی ہیں ان کی بھی بیعت کا زمانہ آزاد صاحب کے ساتھ کا ہے۔ پھر قاضی غلام رسول صاحب ان میں سے آپ کسی کو منتخب کریں۔ اور میں ان کی اطاعت کرنے کے لئے تیار ہوں' لیکن ان تینوں نے پھر اصرار کیا کہ ہم کام نہیں کر سکتے لہٰذا آپ ہی کو ہم قائم مقام بنانا چاہتے ہیں۔ تب میں نے مولوی ابوالحمید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر امامت کے لئے کھڑا کیا اور خود ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور تمام جماعت بھی کھڑی ہو گئی۔

اس کے بعد بارگاہ خلافت میں وفات حضرت مولوی صاحب اور انتخاب کی جملہ کاروائی لکھ کر لندن روانہ کی گئی۔ اور اس کے بعد مولانا ابوالحمید آزاد ہی امیر جماعت رہے۔ اس کے بعد دو مرتبہ بھی بوقت انتخاب امارت جب کہ موجودہ قوانین کے تحت انتخابات نہیں ہوتے

تھے بلکہ موجود الوقت مجلس سے امیر کا انتخاب کر لیا جاتا تھا۔ میں ہر مرتبہ ووٹنگ سے قبل مولانا ابوالحمید صاحب سے ان کی بزرگی اور تقدس کا خیال رکھنے کے تعلق سے کہا کرتا تھا' چنانچہ ایک مرتبہ مولانا عبدالرحیم صاحب نیّر نے میرے انتخاب امارت کے متعلق جماعت کے عام خیال کے مدنظر مجھے روکا کہ میں مولانا ابوالحمید صاحب آزاد کے متعلق کچھ نہ کہوں۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ کام اِمارت کا تو آپ کرتے ہیں پھر کیوں امیر منتخب نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ بے شک کام تو میں کروں گا' لیکن مولانا ابوالحمید صاحب کی بزرگی کے سائے میں۔ کیونکہ میں ان کی برکات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جس طرح مولانا میر محمد سعید صاحبؓ مرحوم کی زندگی میں' میں کام کرتا رہا' اسی طرح مولوی ابوالحمید صاحب کی زندگی میں کام کرتا رہوں گا۔

غلے کے تجارتی کاروبار برخاست کر دینے کے بعد میں کافی دل برداشتہ ہو گیا تھا کیونکہ چوبیس گھنٹے کا میرا انہماک یکلخت جاتا رہا۔ میں بیکار رہ نہیں سکتا تھا۔ انہی دنوں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے محمد حسین صاحب قریشی کو بطور سفیر ایک خط دے کر موسومہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر والی ریاست حیدرآباد روانہ فرمایا۔ ان کی آمد کی اطلاع یوں ہی مجھے ملی تو میں نے مولوی غلام اکبر خاں صاحب کے کرایے کے مکان واقع جام باغ کو چہ ترپ بازار میں ان کو ٹھیرایا۔ اس زمانے میں نواب فریدوں جنگ بہادر پولیٹیکل سکریٹری حضور نظام تھے۔ حکیم محمد حسین صاحب قریشی کو لے کر میں پولیٹیکل سکریٹری صاحب کے پاس بمقام سیف آباد پہنچا اور حکیم صاحب کا تعارف کرانے کے بعد ان کی آمد کا مقصد بیان کیا تو پولیٹیکل سکریٹری صاحب نے حکیم صاحب کے بند خط موسومہ اعلیٰ حضرت بہت ہی عزت کے ساتھ کھڑے ہو کر لیا اور آنکھوں تک لے گئے اور بہت ہی معذرت کرتے ہوئے خط واپس کیا اور فرمایا کہ میں برٹش گورنمنٹ اور نظام گورنمنٹ کے درمیان واسطہ بنا ہوا ہوں' جب تک کہ خط کھلا نہ ہو میں اعلیٰ حضرت کے پاس پیش کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس پر خط کھول دیا گیا۔ جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ میں ایک وفد آپ کے پاس روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہمیں اپنے فرصت کے اوقات سے مطلع فرمائیں چنانچہ اس درمیان ایک دو مرتبہ پھر حکیم صاحب میرے ہمراہ فریدوں جنگ کے پاس گئے اور جواب کے

متعلق دریافت فرمایا تو کہا کہ ہنوز جواب نہیں آیا۔

فریدوں جنگ کی بے لوثی کا ایک واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حکیم صاحب اپنے حسب عادت بطور تحفہ اپنی مفرح عنبری کی ڈبیہ فریدوں جنگ کو پیش کی تو فریدوں جنگ نے کھڑے ہوکر پہلے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ میری ڈیوٹی نہایت اہم ہے۔ میں کسی تحفے کے قبول کرنے کے قابل نہیں ہوں اس لئے مجھے معاف کیا جائے۔ فریدوں جنگ کی اس طرز واپسی اور ان کی بے لوثی کا حکیم صاحب کے دل پر بہت ہی گہرا اثر پڑا کہ میں ان دنوں سخت عدیم الفرصت ہوں اس لئے وفد کی باریابی کا موقعہ نہیں دے سکتا۔ اس جواب کو دیکھ کر حکیم صاحب کو بے حد تکلیف ہوئی کہ یہ ادب اور اعلیٰ شاہانہ اخلاق کے بالکل مغائر ہے۔ تب مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ حکیم صاحب کے یہ تاثرات اگر حضرت خلیفۃ المسیح کے ہاں ظاہر فرمادیں تو میں اپنی ایمانی نگاہ سے حضور نظام اور ریاست کے لئے ایک تباہ کن چیز سمجھتا ہوں کہ ایک موجودہ امام الوقت کی طبیعت پر کوئی گرانی نہ ہو تب میں نے حکیم صاحب سے یہ کہا کہ یہ تحریر جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ حضور نظام کی نہیں ہے بلکہ حضور نظام کی اصل تحریر تو بصیغہ راز محفوظ رہتی ہے اس کے مفہوم کو لے کر پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ شاہانہ وقار کو مدنظر رکھ کر ان الفاظ میں جواب دیا ہے۔ حضور نظام کے الفاظ تو نہایت اور صاف ہوتے ہیں۔ لیکن حکیم صاحب نے ان باتوں کو نہ مانا اور وہ کبیدہ خاطر ہی رہے۔ تب میں نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں جاکر اس امر کی کوشش کی کہ کسی طرح حضور نظام کی اصلی تحریر جو حضور کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرمائی ہے وہ دیکھ سکوں۔ مولوی عبدالعزیز نامی ایک نیک انسان پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں غالباً مددگاری پر فائز تھے اور غالباً وہ اہل حدیث تھے چونکہ متشرع تھے۔ جب میں نے ان سے یہ حقیقت حال بیان کی تو اُنہوں نے صاف دلی سے حضور نظام کی اصل تحریر مجھے دکھلائی۔ تب میں نے بہ منت ان سے عرض کیا کل میں حکیم صاحب کو اپنے ہمراہ بلا لاتا ہوں آپ انھیں اگر یہ دکھلادیں تو یہ مہمان نوازی ہوگی۔ پہلے وہ بہت متامل رہے لیکن بعد میں آمادہ ہوگئے۔ تب میں نے حکیم صاحب سے یہ سب واقعہ بیان کیا اور انھیں دوسرے دن پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ لے گیا اور اصل تحریر حضور نظام کی دکھادی گئی جس میں لکھا تھا کہ ’’عالی جناب مرزا

صاحب میں ان دنوں بے حد مصروف ہوں اس لئے وفد کو وقت نہیں دے سکتا۔ میں معافی چاہتا ہوں‘‘ اور دستخط نیچے ’’یا عثمان‘‘ کی تھی۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب کے دل سے وہ غبار دور ہوگیا اور نہایت ہی خوشی سے عمدہ تاثرات لے کر یہاں سے روانہ ہوئے۔

ان ہی دنوں میں حیدرآباد کے ایک طالب علم مولوی عبدالقادر صدیقی جو تعلیم الاسلام ہائی اسکول کے بورڈر تھے ان کے ذریعہ سے ہمیں یہ اطلاعات موصول ہوئی تھیں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ایک خواب کی بناء پر ایک کتاب تصنیف فرما کر جس کا نام تحفۃ الملوک رکھا تھا۔ اس کتاب کا اصل مسودہ مسجد اقصیٰ میں حضرت خلیفۃ المسیح نے جماعت کے اکثر احباب کو سنایا تھا ہم حیدرآبادیوں کو اس کتاب کا سخت انتظار تھا۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح نے تحفۃ الملوک کتاب بطور تحفہ مولانا سرور شاہ صاحب و مفتی محمد صادق صاحب کے ہمراہ روانہ کی کہ یہ حضور نظام کو پہنچادی جائے۔

ان دونوں حضرات کو بھی میں نے نواب اکبر یار جنگ بہادر کے مکان میں ٹھہرایا۔ اس زمانے میں بفضلہٖ تعالیٰ نواب صاحب کی بہت کامیاب وکالت تھی۔ حکیم صاحب موصوف جو پہلے تشریف لائے تھے ان کی سواری وغیرہ کے انتظامات نواب صاحب نے اپنی ذات سے برداشت کئے۔ اسی طرح ان حضرات کی آمد پر بھی ذاتی سواری کے علاوہ کرائے کی بگھیوں وغیرہ کے اخراجات خود برداشت کئے۔ یہاں ایک عجیب اتفاق کی بات ہوئی کہ اس کتاب کو پیش کرنے کے لئے فریدوں جنگ کے پاس لے جانے کی جو تاریخ مقرر کی تھی میں اس تاریخ کو بھول گیا تو ایک روز قبل حضرت مفتی صاحب اور مولانا سرور شاہ صاحب خود کتاب لے جاکر پیش کردیئے۔ جب میں دوسرے دن وقت مقررہ پر مفتی صاحب سے ملا اور کہا کہ اب چلے چلیں تو انہوں نے کہا کہ کل ہم آپ کا انتظار کئے اور آپ نہ آئے تو ہم خود جاکر دے آئے ہیں۔ مجھے ازحد تکلیف ہوئی کہ میں کیوں اس دینی خدمت سے محروم رہ گیا۔ میرے غم زدہ چہرے کو دیکھ کر حضرت مفتی صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا آپ ہمارے ساتھ آئیں یا نہ آئیں لیکن ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ ’’ولی اللہ‘‘ ہیں۔ تو میں نے یہ خیال کیا کہ غالباً میری ناسمجھی اور کم فہمی کی وجہ سے مجھے ولی اللہ کہہ رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے

بتلایا ہے کہ آپ ولی اللہ صاحب۔ تب میں نے ان سے کہا کہ یہ محض آپ بزرگوں کا حسن ظن ہے ورنہ میں ایک گنہگار انسان ہوں اس کے بعد سے آج تک حضرت مفتی صاحب جب کبھی خط لکھتے تو میرے نام کے ساتھ حضرت ولی اللہ لکھتے ہیں' لیکن میں نے بوجہ شرمندگی کے آج تک مفتی صاحب سے دریافت نہیں کیا کہ وہ کس بنیاد پر مجھے ولی اللہ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ امریکہ سے مجھے خطوط لکھے تو ان ہی الفاظ سے خطاب کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے ہمراہ لئے بغیر کبھی کسی افسر کے پاس نہیں گئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں بھی مثل دیگر مقامات کے جماعت کے بعض احباب پیغامی خیالات کے حامی ہوگئے تھے۔ ترپ بازار میں ایک انجمن قائم کرکے جمعہ اور جماعت کا علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ غالباً بمشکل اس انجمن کے افراد کی تعداد پانچ یا چھ تھی۔ بعض احباب جماعت نے بھی خلافت ثانیہ کی بیعت نہیں کی مگر انہوں نے ہماری جماعت کے ساتھ جمعہ و جماعت و چندوں کا اشتراک عمل رکھا اور پھر توفیق الٰہی سے تھوڑی مدت کے بعد ہی خلافت ثانیہ کی بیعت بھی کرلی۔ جن اصحاب نے علیحدہ انجمن بنائی تھی ان کے صدر مولوی حافظ عبدالعلی صاحب وکیل کو میں نے بتائید الٰہی اپنی جماعت میں شامل کرلیا جس سے وہ انجمن ٹوٹ گئی اور بعض احباب جو حیدرآباد سے بغرض تجارت ممبئی چلے گئے اور وہاں ایک مدت گذار کر بفضلہٖ تعالیٰ حیدرآباد واپس آئے اور پھر ہماری جماعت میں شامل ہوگئے۔ جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ ان کا اخلاص اور ایمان آخر ہمیں واپس ملے گا۔ انہی میں سے میرے ایک عزیز رشتے کے ماموں زاد بھائی میر دلاور علی ہاشمی بھی تھے۔ مجھے اور میرے سارے خاندان کو شدید تکلیف پہنچی کیونکہ وہ ہمارے گودوں میں پلے تھے اور ہمارے زیر پرورش تھے۔ وہ اس زمانے میں ٹی سنڈیکیٹ میں بحیثیت کلرک اور بعد میں بحیثیت مینیجر ملازم تھے۔ اس کے بعد وہ خدا کے فضل سے خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی بیعت میں داخل ہوگئے۔ کیونکہ میرے عزیز کی کوشش سے مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کو رہائشی مکان وسط شہر میں مل گیا چونکہ انھوں نے منشی کی تعلیم بھی پائی تھی اور ان کی ہی تحریک پر مولوی صاحب نے تعلیم منشی کا ادارہ کھولا تھا اور اس ادارہ کے معتمد میر دلاور علی ہاشمی تھے اور یہ کمیٹی انجمن کے بنگلے پر تھی۔ یہ کمیٹی بہت کامیاب رہی

اور تبلیغی رنگ میں اس کا بہت اچھا اثر ہوا کیونکہ سوائے دو چار کے باقی تمام طلباء غیر احمدی تھے اور مولوی صاحب کی طرز تعلیم اور اخلاق کے بہت مداح تھے۔ دلاور علی صاحب کسی وجہ سے ٹی سنڈیکیٹ سے جب علیحدہ ہوئے تو انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ انہیں ٹی سنڈیکیٹ کی دوکان کا کافی تجربہ ہے اس لئے اگر کوئی ایسی دوکان ان کے زیر اہتمام کھولی جائے تو بڑی کامیابی سے چلاسکیں گے۔ مولوی صاحب نے اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کہ ہماری تجارت محض تبلیغ کے لئے ہوگی۔ اب جب کہ اناج کی احمدیہ کمپنی برخاست کردی گئی تو اس میں کے بہت سارے احمدی بے روزگار ہوچکے ہیں۔ اگر کمپنی قائم کردی جائے تو اس سے بہتوں کو فائدہ ہوگا اور اس لڑکے کی بھی دلجوئی ہوگی' جس نے خلافت ثانیہ کی اب بیعت کی ہے۔

غلہ کی دوکانوں کو برخاست کرنے کے بعد ایک شاپ ''احمدیہ ٹریڈنگ اینڈ سنٹرل ٹی ایجنسی'' قائم کی گئی جس میں میری جانب سے تین ہزار روپے اور مولوی صاحب کی جانب سے تین ہزار اور عبداللہ بھائی کی جانب سے تین ہزار روپے جملہ نو ہزار روپے کی رقم سے ابتدائی کام شروع کیا گیا اور اس کی مینیجری پر میرے رشتے کے ماموں زاد بھائی سید دلاور علی ہاشمی کو رکھا گیا۔ اس شاپ کے قیام کے چند ماہ تک مجھے ذاتی طور پر شب و روز مصروفیت رہی اور میں شاپ میں نہیں بیٹھ سکتا تھا البتہ پرائیویٹ کمرے میں رہ کر سب کام کرواتا۔ اس کے بعد جب کاروبار جم گیا تو اپنے منجھلے بھائی میر فضل احمد صاحب سے ہی مشورہ کرتا رہا کہ اب تم اور میں کیا کام کریں گے۔ تب ہمارا یہ خیال ہوا کہ ہم سکندرآباد کنٹونمنٹ کے سب میں بڑے آکشن ہال شیخ عمر کے ہال جاکر یوروپی فرنیچر وغیرہ خرید کر حیدرآباد کے امراء وغیرہ میں فروخت کا انتظام کریں۔ چونکہ ہمارے مکانات وسیع تھے وہاں اسٹور روم بہ آسانی بن سکتا تھا۔ میں اور میرے منجھلے بھائی ہر ہفتے جو انسپکشن ڈے ہوتا' سکندرآباد جاتے۔ اور وہاں سکندرباد کی مارکٹ کے سامنے جہاں اہل حدیث کی ایک چھوٹی مسجد تھی اس کے دروازے سے متصل ایک احمدی کی کرائے کی مختصر سی دوکان تھی۔

سکندرآباد میں صرف دو احمدی اس زمانے میں رہتے تھے۔ ایک احمد مدنی صاحب نامی متوکل اور مقدس صورت ضعیف العمر انسان تھا اور دوسرے جن کا مجھے نام یاد نہیں لیکن گمان ہے کہ

ان کا نام محمد ابراہیم صاحب تھا۔ مجھے احمد مدنی صاحب کی قیام گاہ سے واقفیت نہ تھی لیکن محمد ابراھیم صاحب کی دوکان پر ہر دفعہ جاتا اور ان کو لے کر آکسفورڈ اسٹریٹ کلاک ٹاور گارڈن میں ہم تینوں بیٹھتے اور وہیں جا کر نماز ظہر اور عصر پڑھتے اور دعائیں کرتے کہ سکندرآباد میں ایک بڑی جماعت بن جائے جس طرح شیخ عمر کے آکشن ہال میں ہم مال خریدتے فیروز آکشن ہال سے بھی مال خریدتے ان دونوں جگہ ہم نے کھاتہ کھول لیا تھا اور معائنہ کے لئے ایک دن اور ہراج کے روز اس طرح ہفتے میں دو دن بالالتزام سکندرآباد جاتے رہے اور جب کبھی ہم سکندرآباد جاتے تو دوپہر کا کھانا ساتھ لے جاتے اور ہم تینوں میں' دونوں بھائی اور محمد ابراھیم کلاک ٹاور گارڈن میں کھانا کھاتے اور شدت سے دعاؤں میں مصروف رہتے۔ یہ تجارتی سلسلہ تقریباً سال ڈیڑھ سال تک جاری رہا' اس کے بعد جب کہ حکیم محمد حسین صاحب قریشی اور مفتی محمد صادقؓ صاحب اور مولانا سرور شاہ صاحبؓ کی آمد ہوئی تو میرے دل میں زبردست تحریک ہوئی کہ میں ان کے ساتھ قادیان کے جلسہ سالانہ پر چلا جاؤں اور وہ خلافت ثانیہ کا پہلا جلسہ تھا تو میں ان کے ہمراہ جلسہ سالانہ پر چلا گیا اور حضور ایدہ اللہ سے متعدد مرتبہ ملاقات کیا۔ اور عزت بھی حاصل ہوتی رہی۔ حضور نے مجھے حیدرآباد میں ترقی اسلام کی انجمن کے قائم کرنے اور فی روپیہ ایک پیسہ چندہ وصول کر کے بجائے صدر انجمن احمدیہ کے مولوی شیر علی صاحب معتمد انجمن ترقی اسلام قادیان کی خدمت میں وہ رقم روانہ کرنے کا ارشاد فرمایا تو میرے دل میں شدت سے یہ تحریک ہوئی کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں عرض کروں کہ تحفۃ الملوک کی تصنیف کے مبادیات بھی حکیم محمد حسین صاحب قریشی کی آمد اور خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کا خط موسومہ' حضور نظام کا جواب اور اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تصنیف تحفۃ الملوک اور مفتی محمد صادق صاحبؓ صاحب مولوی سرور شاہ صاحبؓ کی ان کتب کو ساتھ لے کر حیدرآباد کو آمد اور حضور نظام کے ہاں اس کی پیشکشی اس کی جملہ تفاصیل کو جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی خدمت میں عرض کرنے کے بعد یہ گزارش پیش کی کہ اگر حضور حضرت مفتی محمد صادقؓ و حضرت سرور شاہ صاحبؓ کو چھ ماہ کے لئے تحفۃ الملوک کے پانچ سو نسخوں کے ساتھ حیدرآباد روانہ فرمائیں تو سول لسٹ کے مندرجہ پانچ سو عہدہ داروں کو ان علماء کرام کو ساتھ لے کر میں تقسیم کروں گا اور اس کا اثر

تبلیغی لحاظ سے اچھا رہے گا۔ حضور اقدس نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا اور تین ماہ کے لئے وفد بھیجا جانا منظور فرمایا۔

ختم جلسہ سالانہ کے بعد میں ٹھیرا رہا تا کہ بصراحت تجویز صدر علماء کرام کو ساتھ لے کر حیدرآباد آؤں۔ چونکہ ان دنوں پیغامی فتنہ زوروں پر تھا اور بحث و مباحثہ اور مسائل مختلف فیہ کی نسبت اخبارات اور رسائل میں دھڑا دھڑ مضامین شائع کر رہے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے حضرت مفتی صاحب کو پیغامیوں کی تردید میں ایک جوابی رسالہ تصنیف کر کے شائع کرنے کی ہدایت کی تھی اور اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب مصروف تھے' لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کے مدنظر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے خود بنفس نفیس غالباً بیس یا ۲۵ ر جنوری ۱۹۳۵ء کو ایک ہی رات میں ایک مبسوط و مفصل رسالہ "العقول الفیصل" تصنیف فرما کر صبح ہوتے ہوتے مسجد مبارک میں اس کا مسودہ سنا دیا۔ اور یوں مفتی صاحب کے ذمے کا کام تکمیل پا گیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

میں نے حضور اقدسؓ سے عرض کی کہ اب چونکہ حضرت مفتی صاحبؓ فارغ ہیں انھیں اور مولوی سرور شاہ صاحبؓ کو حیدرآباد جانے کی ہدایت فرمادیں تو حضور اقدسؓ نے فرمایا آپ بجائے مولوی سرور شاہ صاحبؓ کے مولوی حافظ روشن علی صاحبؓ کو لے جائیں چونکہ مولوی سرور شاہ صاحبؓ سے مجھے تفسیر القرآن کے سلسلہ میں کام لینا ہے جس پر میں نے کہا حضور' مولوی سرور شاہ صاحبؓ پہلے حیدرآباد آ چکے ہیں اور وہاں کی پبلک اُن سے متعارف ہے انھیں روانہ فرمایا جائے تو مناسب ہے اور مولوی حافظ روشن علی صاحبؓ جو شیلے ہیں نہ معلوم کہ وہ کیسے ثابت ہوں۔ اس پر حضور اقدس نے فرمایا کہ مولوی حافظ روشن علی صاحبؓ مشائخانہ خاندان کے ہیں اور وہ حیدرآباد میں کافی مقبول ہوں گے اور وہ بہت بردبار اور زبردست علامہ ہیں آپ انھیں لے جائیں۔ آپ ان سے بہت خوش ہوں گے۔ حافظ روشن علی صاحبؓ سے میرا سرسری تعارف تھا۔ میری ان سے' زیادہ واقفیت نہ تھی جس کی وجہ سے میں نے حضور اقدسؓ کی خدمت میں اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور حقیقت میں حضور اقدسؓ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بہ حرف بعد میں صحیح نکلا جیسا کہ واقعات نے اس کی سچائی پر مہر کردی علامہ موصوف حیدرآباد میں بے حد ہردلعزیز اور علامہ

تبحر عالم مانے گئے اور علمی طبقہ میں ان کی وہ منزلت ہوئی کہ باید وشاید۔

غرض کہ حضور اقدسؓ نے قبل از وداع میری ایک دعوت فرمائی اور ازراہ شفقت فرمایا کہ آپ تمام حیدرآبادیوں سمیت دعوت میں آجائیں۔ حضور اقدسؓ کی اس ذرہ نوازی پر خاکسار اور تمام حیدرآبادی احباب بعد نماز مغرب مسجد مبارک میں شریک دعوت رہے۔ دعوت میں حضور نے حیدرآباد میں تبلیغ کے متعلق زرین ہدایات ارشاد فرمائیں اور یہ بات خصوصیت سے فرمائی تھی کہ ان زیر تبلیغ اصحاب کے ہاں مبلغین کے درس قرآن کا ضرور انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ سے یہ عرض کیا تھا کہ ان مبلغین کو میرے مکان پر ٹھیرنے کی اجازت دی جائے تو حضور اقدسؓ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے اخراجات حساب آمد ورفت بھیج کر مرکز سے منگوالئے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ میں نے اس ضمن میں مبلغین کے لئے چند ہدایات حضور اقدس کی خدمت میں عرض کئے تھے جو چودہ امور پر مشتمل تھے ان میں سے ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ مبلغ کو مقامی ذمہ دار عہدہ داران جماعت کے منشاء کے تحت کام کرنا چاہئے۔ حضور اقدس نے اس کو بہت پسند فرماتے ہوئے مجھے ہدایت فرمادی کہ میں ہدایات لکھ کر مولوی شیر علی صاحبؓ کو دے دوں۔ چنانچہ یہ ہدایات مولوی شیر علی صاحب کو لکھ کر دیئے گئے اور وہ سب ہدایات مبلغین کے دستور العمل میں شامل بھی کر لئے گئے اور مجھے مولوی شیر علی صاحبؓ نے فرمایا کہ انھیں اس سے اتفاق ہے۔

میں مبلغین کو لے کر بذریعہ ٹرین بمقام منماڑ پہنچا۔ جہاں ایک رات گذارنی پڑی۔ وہاں رات میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ میرے مکان میں دو بھینسیں ہیں جو موٹی تازی اور نہایت سیاہ رنگ کی ہیں اور جب میں مکان میں داخل ہوا تو وہ بھینسیں مجھے دیکھنے لگیں۔ جب میں بیدار ہوا تو بہت گھبرایا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ بھینسوں سے مراد بلائیں ہوتی ہیں۔ اس خواب کا ذکر میرے ہمراہی دو بزرگوں سے کیا تو حضرت حافظ روشن علی صاحب نے فرمایا کہ خواب نہایت سچا ہے وہ دو بھینسیں تو ہم دونوں ہی ہیں جن کو آپ لے جارہے ہیں۔ ہم وہاں پر پہنچ کر دودھ دیں گے اور روحانیت کا درس دے کر سیراب کریں گے اور جب ہم مکان پہنچے اور اپنے بزرگوں

سے عرض کی کہ آپ اپنی رہائش کا مقام منتخب فرمالیں تو خدا کی قدرت کہ جن مقامات کو ان حضرات نے منتخب فرمایا وہ وہی مقامات تھے جن کو میں بعینہٖ خواب میں دیکھ چکا تھا۔

مبلغین کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد میں نے یہاں کے عمائدین سلطنت و امرائے دولت کے ہاں ہمارے معزز مبلغین کا تعارف کروایا اور ایک ایک نسخہ "تحفۃ الملوک" کا دیا جانے لگا اور جماعت کی تربیت اور تبلیغ کو وسیع کرنے کی خاطر مقامی سربرآوردہ احمدیوں کے محلوں میں جلسے کروائے گئے۔ جس میں فضائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر اسلامی مسائل اور جماعت کے معتقدات کو کھول کھول کر بیان کیا جاتا رہا۔

ہمارے علماء کی تقاریر اور انکی تبحر علمی کا چرچا عوام الناس میں ہونے لگا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میلاد النبیؐ کے جلسوں میں ہمارے علماء کرام مدعو ہونے لگے اور اِن کی تقریروں نے بہت ساروں کا دل موہ لیا اور ان کا اثر ونفوذ علمی طبقوں میں بڑھتا گیا۔ جہاں ایک طرف ہماری تبلیغی لہر بڑی تیزی وسرعت کے ساتھ عوام کو سیراب کررہی تھی وہاں اس کی ایک شاخ امراء وحکام کی ضروریات دین کو سکینت بخش رہی تھی۔ مقتدر وذی اثر اصحاب میں نمایاں طور پر قابل ذکر کرنل افسر الملک کمانڈر اِن چیف حیدرآباد کا خاندان ہے۔ ان کے بڑے داماد میجر نواب ممتاز یار الدولہ بہادر نے نہایت عقیدت سے جناب حافظ روشن علی صاحب ومفتی محمد صادق صاحب کا روزانہ درس قرآن مجید اپنے بنگلے میں مقرر کروایا۔ اس درس میں گھر کی بڑی چھوٹی لڑکیاں، بیگمات و دیگر عزیز واقارب شریک ہوتے اور بڑے انہماک سے قرآنی تعلیمات سنتے رہے۔ نواب ممتاز یار الدولہ کو سلسلے سے اس قدر عقیدت ہوگئی کہ میرے کہنے پر وہ قادیان بھی تشریف لے گئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ سے ملاقات کرکے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

کرنل سر افسر الملک نے اپنے بنگلے پر ایک مخصوص جلسہ منعقد کیا جس میں حیدرآباد کے اکثر عمایدین وامرائے عظام شریک تھے۔ جس میں ہمارے مبلغین مدعو تھے۔ حافظ روشن علی صاحب کی قرآن فہمی اور دیگر امور شریعت کی باریکیوں کے بیان سے وہ متاثر ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ حافظ صاحب نے کیسے سارا قرآن ازبر کرلیا اور کیونکر وہ اتنے گہرے معلومات پر حاوی ہوئے۔ اس پر مزاحاً میں نے کہا ہمیں حیرت ہے کہ فوج کے اتنے بہت سے قوانین پر آپ

متبحر عالم مانے گئے اور علمی طبقہ میں ان کی وہ منزلت ہوئی کہ باید وشاید۔

غرض کہ حضور اقدسؓ نے قبل از وداع میری ایک دعوت فرمائی اور ازراہ شفقت فرمایا کہ آپ تمام حیدرآبادیوں سمیت دعوت میں آجائیں۔ حضور اقدسؓ کی اس ذرہ نوازی پر خاکسار اور تمام حیدرآبادی احباب بعد نماز مغرب مسجد مبارک میں شریک دعوت رہے۔ دعوت میں حضور نے حیدرآباد میں تبلیغ کے متعلق زرین ہدایات ارشاد فرمائیں اور یہ بات خصوصیت سے فرمائی تھی کہ ان زیر تبلیغ اصحاب کے ہاں مبلغین کے درس قرآن کا ضرور انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ سے یہ عرض کیا تھا کہ ان مبلغین کو میرے مکان پر ٹھیرنے کی اجازت دی جائے تو حضور اقدسؓ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے اخراجات حساب آمد و رفت بھیج کر مرکز سے منگوالئے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ میں نے اس ضمن میں مبلغین کے لئے چند ہدایات حضور اقدس کی خدمت میں عرض کئے تھے جو چودہ امور پر مشتمل تھے ان میں سے ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ مبلغ کو مقامی ذمہ دار عہدہ داران جماعت کے منشاء کے تحت کام کرنا چاہئے۔ حضور اقدس نے اس کو بہت پسند فرماتے ہوئے مجھے ہدایت فرمادی کہ میں ہدایات لکھ کر مولوی شیر علی صاحبؓ کو دے دوں۔ چنانچہ یہ ہدایات مولوی شیر علی صاحب کو لکھ کر دیئے گئے اور وہ سب ہدایات مبلغین کے دستور العمل میں شامل بھی کر لئے گئے اور مجھے مولوی شیر علی صاحبؓ نے فرمایا کہ انھیں اس سے اتفاق ہے۔

میں مبلغین کو لے کر بذریعہ ٹرین بمقام منماڑ پہنچا۔ جہاں ایک رات گذارنی پڑی۔ وہاں رات میں‘ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میرے مکان میں دو بھینسیں ہیں جو موٹی تازی اور نہایت سیاہ رنگ کی ہیں اور جب میں مکان میں داخل ہوا تو وہ بھینسیں مجھے دیکھنے لگیں۔ جب میں بیدار ہوا تو بہت گھبرایا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ بھینسوں سے مراد بلائیں ہوتی ہیں۔ اس خواب کا ذکر میرے ہمراہی دو بزرگوں سے کیا تو حضرت حافظ روشن علی صاحب نے فرمایا کہ خواب نہایت سچا ہے وہ دو بھینسیں تو ہم دونوں ہی ہیں جن کو آپ لے جارہے ہیں۔ ہم وہاں پر پہنچ کر دودھ دیں گے اور روحانیت کا درس دے کر سیراب کریں گے اور جب ہم مکان پہنچے اور اپنے بزرگوں

سے عرض کی کہ آپ اپنی رہائش کا مقام منتخب فرمالیں تو خدا کی قدرت کہ جن مقامات کو ان حضرات نے منتخب فرمایا وہ وہی مقامات تھے جن کو میں بعینہٖ خواب میں دیکھ چکا تھا۔

مبلغین کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد میں نے یہاں کے عمائدین سلطنت و امرائے دولت کے ہاں ہمارے معزز مبلغین کا تعارف کروایا اور ایک ایک نسخہ ”تحفۃ الملوک“ کا دیا جانے لگا اور جماعت کی تربیت اور تبلیغ کو وسیع کرنے کی خاطر مقامی سربرآوردہ احمدیوں کے محلوں میں جلسے کروائے گئے۔ جس میں فضائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر اسلامی مسائل اور جماعت کے معتقدات کو کھول کھول کر بیان کیا جاتا رہا۔

ہمارے علماء کی تقاریر اور انکی تبحر علمی کا چرچا عوام الناس میں ہونے لگا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میلاد النبیؐ کے جلسوں میں ہمارے علماء کرام مدعو ہونے لگے اور اِن کی تقریروں نے بہت ساروں کا دل موہ لیا اور ان کا اثر و نفوذ علمی طبقوں میں بڑھتا گیا۔ جہاں ایک طرف ہماری تبلیغی لہر بڑی تیزی و سرعت کے ساتھ عوام کو سیراب کر رہی تھی وہاں اس کی ایک شاخ امراء و حکام کی ضروریات دین کو سکینت بخش رہی تھی۔ مقتدر و ذی اثر اصحاب میں نمایاں طور پر قابل ذکر کرنل افسر الملک کمانڈر ان چیف حیدرآباد کا خاندان ہے۔ ان کے بڑے داماد میجر نواب ممتاز یار الدولہ بہادر نے نہایت عقیدت سے جناب حافظ روشن علی صاحب و مفتی محمد صادق صاحب کا روزانہ درس قرآن مجید اپنے بنگلے میں مقرر کروایا۔ اس درس میں گھر کی بڑی چھوٹی لڑکیاں‘ بیگمات و دیگر عزیز و اقارب شریک ہوتے اور بڑے انہماک سے قرآنی تعلیمات سنتے رہے۔ نواب ممتاز یار الدولہ کو سلسلے سے اس قدر عقیدت ہوگئی کہ میرے کہنے پر وہ قادیان بھی تشریف لے گئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ سے ملاقات کرکے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

کرنل سر افسر الملک نے اپنے بنگلے پر ایک مخصوص جلسہ منعقد کیا جس میں حیدرآباد کے اکثر عمائدین و امرائے عظام شریک تھے۔ جس میں ہمارے مبلغین مدعو تھے۔ حافظ روشن علی صاحب کی قرآن فہمی اور دیگر امور شریعت کی باریکیوں کے بیان سے وہ متاثر ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ حافظ صاحب نے کیسے سارا قرآن ازبر کرلیا اور کیونکر وہ اتنے گہرے معلومات پر حاوی ہوئے۔ اس پر مزاحاً میں نے کہا ہمیں حیرت ہے کہ فوج کے اتنے بہت سے قوانین پر آپ

کیسے حاوی ہوئے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آپ کو ان قوانین پر عمل کرتے ہوئے اتنا عبور ہو گیا ہے اسی طرح ہمارے بزرگوں کو رات دن کام کرتے ہوئے قرآن فہمی پر عبور حاصل ہو گیا ہے۔ آپ بھی اس کی تقلید کریں تو آپ بھی ایسے بن سکتے ہیں۔ اس پر وہ خوش ہوئے اور محظوظ بھی۔

عوام میں ہماری تبلیغ کا کافی اثر تھا۔ جہاں حق ہوتا ہے وہاں مخالفت کا ہونا لازمی ہے بعض شر پسندوں نے ہماری مقبولیت کو متاثر کرنے کے لئے یہ مکروہ کام کرنا شروع کیا کہ جن محلوں میں ہمارے وعظ ہوتے وہاں یہ لوگ باہر سے پتھر برساتے' جوتے پھینکتے اور برا بھلا کہتے جس کے لئے پولیس کو قیام امن کے لئے ضروری کارروائی کرنی پڑتی تھی۔ پولیس بھی ہم سے پوچھ بیٹھتی کہ آپ لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے اس طرح ہم پولیس کے کارکنوں کو اچھی خاصی تبلیغ کر دیتے اور اہم اعتقادات بیان کرتے اور خود ان ہی سے انصاف چاہتے چنانچہ اس قسم کے واقعات سے مستعد پورہ' چنچل گوڑہ اور سکندرآباد اور مشیرآباد کے درمیان ایک دفعہ پبلک جلسہ ہوا جس میں علاوہ دیگر مقررین کے ہمارے مبلغین کی بھی تقریریں ہوئیں۔ خاص طور پر محمد صادق صاحب کی تقریر نے سامعین پر جادو کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس پر حافظ روشن علی صاحب کی پر حکمت و پر معرفت تقریر نے مصفیٰ آئینہ پر پارہ چڑھا دیا تھا۔

اس جلسے میں سیٹھ عبداللہ الہ دین بھی ایک طرف بیٹھ کر غور سے حافظ صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ ختم جلسہ پر ہم نے سیٹھ صاحب سے ملاقات کی۔ اور تھوڑی دیر تبادلہ خیال پر معلوم ہوا کہ انھیں خدا اور رسول کی باتوں سے بہت دلچسپی ہے اور وہ چاہتے تھے کہ انہیں دین کی باتیں سنائی جائیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ ہمارے مبلغین کسی وقت ان کے بنگلے پر آ کر کچھ وعظ کر سکتے ہیں؟ ہم نے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ انہوں نے ایک موقعہ پر ہمیں بلایا۔ ہمارے مبلغین نے جو باتیں کیں ان سے ان کا اشتیاق اور بڑھا اس پر میں نے کہا کہ جو وعظ آپ نے سنا ہے اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ آپ ان حضرات سے قرآن کریم کا درس سنیں گے تو آپ کو صحیح حقائق الٰہیہ کا علم ہوگا۔ چونکہ قرآن کریم سے عبداللہ بھائی صاحب کو خاص شغف تھا انہوں نے کافی اثر لیا اور دریافت کیا کہ آپ لوگ بہت دور رہتے ہیں کیسے آئیں گے؟ اس پر میں نے کہا کہ ہم ضرور آئیں گے اور اپنی گاڑی میں آئیں گے۔ اس طرح سکندرآباد میں درس قرآن

شروع کر دیا گیا۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر آ چکا ہے قادیان کے علمائے کرام روشن علی صاحب و مفتی محمد صادق صاحب کا درس القرآن کا سلسلہ بموجب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ حیدرآباد میں مختلف جگہوں میں جاری کر دیا گیا ایک تو میجر ممتاز یارالدولہ کے بنگلے میں دوسرا حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ کا درس القرآن جاری تھا اس کے بعد سکندرآباد میں الہ دین بلڈنگ میں درس القرآن جاری کر دیا گیا۔ سکندرآباد میں صبح ۸ تا ۹ ہوتا اور ۱۰ بجے تا ۱۱ بجے تک میجر ممتاز یارالدولہ کے بنگلے میں درس ہوا کرتا تھا۔ سکندرآباد کے درس میں الہ دین فیملی کے حسب ذیل اصحاب شریک ہوا کرتے تھے۔

۱۔ سیٹھ عبداللہ الہ دین بھائی ۲۔ خان بہادر احمد الہ دین ۳۔ غلام حسین بھائی ۴۔ قاسم علی بھائی ۵۔ رحمت اللہ صاحب ۶۔ جے۔ ایم۔ ابراہیم بھائی ۷۔ الہ دین بھائی ۸۔ والدہ عبداللہ بھائی صاحب ۹۔ بیگم جناب عبداللہ بھائی صاحب ۱۰۔ بیگم خان بہادر احمد الدین صاحب

احمد الہ دین صاحب حنفی المذہب اور اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔ قاسم علی بھائی کسی خاص جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے ان کے ایک بھائی مسلمان تھے۔ مگر بعد میں وہ ہمارے مقابلے میں جماعت اہل حدیث میں داخل ہو گئے تھے۔ رحمت اللہ صاحب جو بعد میں عبداللہ بھائی کے بہنوئی ہوئے شیعہ تھے۔ بعد میں وہ اہل سنت والجماعت میں داخل ہوئے۔ جی' ایم' ابراہیم صاحب جو عبداللہ بھائی کے قریبی ماموں اور جناب علی محمد صاحب ایم۔ اے کے نانا ہوتے تھے کٹر شیعہ تھے انگریزی کے بڑے فاضل اور بائیس سال امریکہ میں گذار کر کے سکندرآباد لوٹے تھے۔ علاؤالدین بھائی مذہب سے دور اور نیچری تھے۔ عبداللہ بھائی صاحب کی والدہ بھی نیچری تھیں۔ عبداللہ بھائی صاحب اور احمد علاؤالدین صاحب کی بیویاں پردہ میں بالالتزام درس قرآن سنا کرتی تھیں۔

حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ قرآن کے حقایق و معارف کے دریا بہا رہے ہوتے اور سامعین کافی دلچسپی سے سن رہے ہوتے' لیکن بسا اوقات ہوتا یہ تھا کہ اس ملک کے مزاج اور یہاں کے ماحول و روایات و طرز تمدن سے ناواقفیت کی وجہ سے ایک مقرر کا اپنے سامعین سے جو گہرا تعلق ہونا چاہئے وہ بات پیدا نہ ہو رہی تھی اور خیالات کی روش بار بار ٹوٹ جایا کرتی تھی اور

ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا جس کو یہ خاکسار محسوس کرتا اور اس خلا کو پُر کرنے کے لئے علماء کرام کی ہدایات کی روشنی میں ملکی مزاج و روایات کے پیش نظر ایسی باتیں پیش کرتا رہتا جن کی بناء پر ایک ایمان افروز فضا پیدا ہو جاتی تھی اور خیالات و معتقدات کے اختلاف میں تطبیق و توثیق کی ہر ممکن کوشش کی جاتی اور الحمدللہ میری اس قسم کی کوشش صد فیصد کامیاب رہتی۔

قرآن کریم کے درس و تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں ماحول ترقی کرتا گیا اس کو روکنے کے لئے جی' ایم' ابراہیم صاحب جو کٹر شیعہ تھے اپنے ایک شیعہ قبلہ محمد علی شیرازی لیکچرر جامعہ عثمانیہ کو ہمارے مقابل پر تیار کیا۔ اور ہم سے خواہش کی کہ مناظرہ کر لیا جائے۔ چنانچہ شرائط مناظرہ طے ہوئے۔ مقام مناظرہ الہ دین بلڈنگ میں اور ہماری جانب سے حافظ روشن علی صاحب مناظر اور شیعوں کی جانب سے محمد علی صاحب شیرازی مناظر مقرر ہوئے۔ احمدیوں کی طرف سے یہ خاکسار اور شیعہ اصحاب کی طرف سے جی' ایم' ابراہیم صاحب جَس مقرر ہوئے۔ اور طے پایا کہ ایک ایک گھنٹے تک جانبین کی تقریریں ہوا کریں گی۔ مباحثہ اس بات پر قرار پایا تھا کہ آیا اسلامی تاریخ پر اسلامی مسائل کا دارومدار ہے یا اسلامی تاریخ مسائل اسلامی کی تحقیق و تطبیق کے لئے بطور شواہد کے شاہد ہے۔ ہم کہتے تھے کہ اسلامی تاریخ پر اسلامی مسائل کا دارومدار نہیں رکھا جاسکتا۔ البتہ اسے دیگر ذرائع کے ساتھ تائید میں لیا جاسکتا ہے۔ لیکن شیعہ مناظر کا اصرار تھا کہ تاریخ ہی اسلام کی جان ہے اور بغیر اس کے کوئی اسلامی مسئلہ حل ہو نہیں سکتا۔ مناظرہ تین روز تک بڑے اطمینان سے جاری رہا۔ حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ کے دلائل عالمانہ اور حقایق پر مشتمل ہوتے تھے اور محمد علی شیرازی صاحب ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور عوام الناس پر اپنا اثر جمانے کی خاطر بڑی ڈینگیں مارا کرتے تھے۔ عوام عالمانہ باتوں کو بخوبی نہ سمجھ سکتے تھے اور وہ زیادہ تر شیرازی صاحب کی باتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ مگر صاحبان علم و عقل پر ہماری علمیت کا سکہ بیٹھتا گیا۔ حضرت حافظ صاحب کی علمی اور تحقیقی دلائل کا یہ حال تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک علامہ الدہر تھے پھر بھی وہ مجھے کتب خانہ آصفیہ لے جاتے جہاں پر علوم و فنون کی ہزاروں کتابیں حکومت حیدرآباد کی جانب سے جمع کی گئی ہیں اور یہ ریاست حیدرآباد دکن کا مرکزی کتب خانہ ہے۔ جن کتابوں کے لئے حضرت حافظ صاحب فرماتے وہ میں نکلواتا اور ضروری حصوں کو

انھیں پڑھ کر سناتا اس طرح وہ بحث کے لئے تیاری کرتے تھے۔ تین دن کے مباحثے کے اختتام پر جب ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو کمرے میں جہاں پر مباحثے کی مجلس ہوا کرتی تھی آ گئے تو وہاں اخبار بلیٹن کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا جس میں لکھا تھا کہ لندن میں جنگ جرمن جو جاری تھی اس کی ۶۰ تاریخیں لکھی گئی ہیں اور اسی طرح جرمنی میں بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ حاضرین مجلس میں اس خبر پر یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ابھی تو جنگ جاری ہے اور تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں۔ حاضرین مجلس میں اس خبر پر کہ ابھی تو جنگ جاری ہے اور تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں خدا جانے اس میں کتنی جھوٹی سچی باتیں ہوں گی۔ اس پر یکا یک خیال آیا کہ اس موقعہ پر مجھے ایک چھوٹی سی تقریر کرنی چاہئے چنانچہ میں نے حاضرین سے اجازت لے کر ایک مختصر سی تقریر کی اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتلایا کہ تاریخ کا جو حال ہے اس کی ایک تازہ مثال اخبار بلیٹن امروزہ سے مل سکتی ہے۔ آج جب کہ جنگ جاری ہے۔ بہت سے لوگ عینی شاہد ہیں حالات جانتے ہیں۔ ان میں تمیز ہے ان تاریخوں سے وہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان میں کونسے واقعات صحیح ہیں اور کونسے غلط لیکن آج سے سو سال بعد جب کہ جاننے والے لوگ نہیں رہیں گے اور بعد کی نسلیں ان تاریخوں کو پڑھیں گی تو وہ کیا نتیجہ نکالیں گی' لندن کی تاریخوں میں لکھا ہوگا کہ انگریز قوم نے فلاں فلاں محاذ پر فلاں روز شاندار کامیابی حاصل کی اور دشمن کی فوجیں پسپا ہونے پر مجبور ہوئیں۔ اس کے برخلاف جرمن کی تاریخوں میں لکھا ہوگا کہ انگریز قوم ہمارے مقابلے میں بھاگتی رہی اور شکست فاش کھاتی رہی۔ ایسے میں کیا صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے؟ جب کہ علم تاریخ ظنی ہے اور اس کا مصنف کسی نہ کسی خیال کی جانب جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو کس طرح صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بات منجانب اللہ پیدا ہوئی اور سبھی نے جان لیا کہ تاریخ کی علمی مسائل میں کیا حقیقت ہے۔ مباحثہ دس بجے دن سے مغرب تک جاری رہتا تھا۔ ساٹھ ستر آدمیوں کا دوپہر کا کھانا تین دن تک الہ دین بلڈنگ میں صاحب خانہ کی جانب سے ہوا کرتا تھا اور آخری دن دوپہر اور شام کا کھانا ہم نے بھی کھایا۔ حاضرین مجلس میں عام طور پر نواب' جاگیردار' حکام عدالت و بیرسٹر صاحبان و شیعہ اصحاب ہوا کرتے تھے شیعہ اصحاب کے ساتھ الہ دین بلڈنگ میں جو مباحثہ ہوا وہ ہماری تبلیغی سرگرمیوں کی آخری کڑی تھی جو شہر سکندرآباد میں

انصرام پائی۔

اس مباحثے کے بعد ایک دن سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب نے مجھے علیحدگی میں کہا کہ آپ حضرات کی آمد و رفت پر کافی عرصہ گذر چکا ہے اور اس دوران میں جو کچھ درس القرآن و تقریریں مختلف مقامات پر ہو چکی ہیں ان سے میں اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں اور جان گیا ہوں کہ یہ سلسلہ حق پر ہے۔ میرے دوسرے بھائی اور دیگر افراد خاندان کہتے ہیں کہ اب سلسلہ درس قرآن کریم بند کر دیا جائے کیونکہ اس سے کاروبار تجارتی میں ہرج ہو رہا ہے اور باہمی اختلافات کا بھی اندیشہ ہے لہٰذا آپ لوگ آئندہ یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت حافظ روشن علی صاحب و حضرت مفتی محمد صادق صاحب کے لئے ایک ایک روپے کا نوٹ بطور نذرانہ دیا جسے میں نے ان حضرات کے روبرو پیش کیا۔ انہوں نے اس نذرانہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جب ان سے کہا کہ جو چیز بلا طلب ملتی ہے تو اُسے خدا کی دین سمجھنا چاہئے تب حافظ روشن علی صاحب نے فرمایا کہ مبلغ کا کام یہ ہے کہ ہر شخص کے حسن و قبح بیان کرے۔ حضرت خلیفۃ المسیح نے ہمیں نذرانہ لینے سے اس لئے منع کیا ہے کہ ہمارا منہ اس شخص کے خلاف کہنے کی جراءت نہیں کر سکتا اور لحاظ و مروت میں کام خراب ہوتے ہیں۔ جب یہ رقم عبداللہ بھائی کو واپس کی گئی تو انہوں نے بہ اصرار فرمایا کہ آپ مرکز سے اجازت لے لیں کہ مبلغ صاحبان میرا نذرانہ قبول فرماویں۔ اس پر میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں سیٹھ صاحب کے اخلاص اور مبلغ صاحبان کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس نذرانہ کو قبول کرنے کی اجازت سے سرفراز فرماویں تو مناسب ہوگا اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے نذرانہ لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

میں نے بیعت کا مفہوم اور اس کی اہمیت واضح کی تھی لیکن عبداللہ بھائی یہی کہتے رہے کہ میں نے دل سے سلسلہ کی حقانیت کو قبول کیا ہے۔ ظاہری بیعت کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ہم ان کی یہ بات سن کر اپنے گھر لوٹے۔ میں نے ہمارے مبلغ صاحبان کو سنایا کہ کل سے ہماری سکندرآباد کی ڈیوٹی ختم ہو چکی' تو انہوں نے کہا کہ ہمیں آئے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گذر رہا ہے اور یہ ہمارے سابقہ اندازے سے بہت بڑھ کر ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے تو شروع

میں ہمارے لئے تین ماہ کے قیام کی اجازت دی تھی۔ لیکن یہ مدت بڑھتے بڑھتے چھ ماہ تک ہو گئی۔ اب ہم اپنے مرکز لوٹتے ہیں۔ آپ ہمیں بخوشی رخصت کر دیں۔

میرے دل پر رنج و الم کے بادل چھائے ہوئے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ میں مرکز کو برابر رپورٹیں بھجواتا رہا تھا کہ ہم سکندرآباد میں کامیاب تبلیغ کر رہے ہیں اور توقع تھی کہ ایک خاندان والے بیعت کر لیں گے۔ اس کی کوئی عملی صورت نہیں بن رہی تھی اور دوسری طرف خود ہماری جماعت کے لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ بشارت احمد صاحب علمائے کرام کو لے کر بڑے گھرانوں کو جا رہے ہیں۔ کیک پیسٹری' میوہ اور ایٹ ہوم کے مزے اڑا رہے ہیں اور کام کچھ نہیں کرتے۔ ایک طرف اپنے دوستوں کی شکایت اور دوسری طرف مرکز کے سامنے شرمندگی کی وجہ سے میری حالت بہت دگرگوں ہو رہی تھی۔ میں نے بہت دعا کی تب مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ بے شک ہم نے ان کے گھر پہنچ کر تبلیغ کی۔ ان کے ہاں دعوتیں کھائیں' لیکن سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ پر عمل نہیں کیا کہ انھیں کبھی اپنے گھر بلا کر دعوت دیتے اور تبلیغ کرتے۔ اس خیال کے بعد میں نے عبداللہ بھائی والہ دین بھائی کو کہا کہ بھائی صاحب آپ کے ارشاد کے بموجب ہم نہیں آئیں گے۔ اب تک ہم آپ کے پاس آتے رہے' دعوتیں کھاتے رہے اور خدا اور رسول کی باتیں سناتے رہے اب میری خواہش یہ ہے کہ آپ بھی ایک مرتبہ ہمارے پاس تشریف لائیں۔ کھانا تناول فرماویں اور ہماری نماز جمعہ کیسی ہوتی ہے بچشم خود ملاحظہ فرماویں۔ آپ ہمارے جماعتی احباب سے واقف نہیں ہیں' ان سے آپ واقف ہو جائیں اور وہ آپ سے واقف ہو جائیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم آپ کے ہاں اس عرصہ میں تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بطیب خاطر میری اس دعوت کو قبول کیا اور وہ تشریف لائے کھانے کے بعد انھیں لے کر حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کے ہاں گیا کیونکہ ان کی قیام گاہ پر ہی نماز جمعہ کا انتظام تھا۔ حافظ روشن علی صاحبؓ نے خطبہ جمعہ پڑھا اور نماز ہوئی۔ میں نے مولوی میر محمد سعید صاحبؓ سے عبداللہ بھائی کا تعارف کرایا اور عبداللہ بھائی سے کہا کہ یہ وہی مولوی صاحب ہیں جن کو ہمارے مرکز سے بیعت لینے کی اجازت ہے۔ بیعت کس طرح لیتے ہیں کن الفاظ میں ہوا کرتی ہے اس کو بھی آپ معلوم کر لیں تو بہتر ہوگا۔

اس پر عبداللہ بھائی آگے بڑھے ہاتھ بڑھایا اور مولوی صاحب نے ہاتھ ملا کر بیعت
کے الفاظ دہرانے شروع کئے اس طرح ان کی بیعت ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے الہ دین ابراھیم
بھائی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی آگے بڑھے اور بیعت کرلی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جس
مہم کو ہم نے اپنے سر لیا تھا بالآخر بخیر وخوبی اختتام تک پہنچی۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ تاریخ بیعت
۱۹/اپریل ۱۹۱۵ء یوم جمعہ۔

اب مبلغین کے مرکز کو واپسی کا سوال بہت شدت سے میرے سامنے تھا۔ میں نے
سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ مملکت نظام کے تین صوبوں یعنی ورنگل' گلبرگہ' میدک کا دورہ اب تک
مبلغین صاحبان کو کروایا گیا ایک صوبہ جو اورنگ آباد کا باقی رہ گیا ہے اور مبلغ صاحبین کی واپسی
کے راستے میں واقع ہے اور بوقت واپسی اس کا دورہ کروالیا جائے۔ اب وقت آ گیا کہ یہ دورہ
شروع کروایا جائے۔ چنانچہ چھوٹی ریلوے لائن پر واقع شدہ اضلاع نظام آباد' نانڈیڑ' پربھنی'
جالنہ اور اورنگ آباد پر کیمپ کیا اور وہاں کے گزیٹیڈ عہدہ داروں کو تحفۃ الملوک کا ایک ایک نسخہ بطور
تحفہ دے کر تبلیغ کی گئی اور مرکزی علماء کا تعارف کروایا گیا۔ نانڈیڑ پر میرے ایک رشتہ دار نواب
رحیم یار جنگ بہادر اول تعلقدار تھے۔ ان کو میں نے کتاب تحفۃ الملوک دی اور ہمارے علماء کو بھی
بلایا' گمراہوں نے بے اعتنائی برتی۔ وہ ہمارے سلسلے کے مخالف تھے اور بوجہ رشتہ دار ہونے کے
بزعم خود میری گمراہی کو بنظر نفرت دیکھتے تھے۔ شام میں انھوں نے ڈاک بنگلے میں میرے ہاں
اپنی پیشی کے اہلکار کو روانہ کیا اور کہلوایا کہ میاں کو کہو کہ وہ آج شام میرے ہاں کھانا کھائیں۔
میں نے جواباً کہلا بھیجا کہ چونکہ آپ نے میرے علماء کرام سے اچھا برتاؤ نہیں کیا اس لئے میں
دعوت قبول کرنے سے مجبور ہوں۔ اس کے بعد پھر وہ اہلکار آیا اور کہنے لگا کہ آپ اور آپ کے
علماء کھانے پر آجائیں تو میں نے کہا کہ اب ممکن نہیں ہے کیونکہ آپ کے مخالف جذبات کا انھیں
علم ہوچکا ہے۔

اس کے بعد جو واقعہ قابل ذکر ہے وہ اورنگ آباد میں تبلیغ کا سبب بنا۔ اورنگ آباد میں
مولوی ابوالحمید صاحب آزاد ایڈیشنل جج تھے وہاں شیعہ جماعت کے لوگ اکثر مالدار و جاگیردار
صاحب اقتدار تھے۔ چنانچہ ایک شیعہ جاگیردار کے مکان پر تبلیغی جلسہ بصدارت مولوی ابوالحمید

صاحب آزاد ہوا۔ جس میں مولوی حافظ روشن علی صاحب نے ایک موثر تبلیغی تقریر فرمائی۔ یہ
تقریر بہت طویل اور حقایق سے لبریز تھی۔ وقت بہت ہوچکا تھا۔ ان کی تقریر کے بعد میری تقریر
کا وقت تھا لیکن میں رات کی زیادتی کی وجہ سے کوئی تقریر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں حاضرین
میں سے اورنگ آباد کی شاہی جامع مسجد کے ایک خطیب جو مدرسہ نظامیہ کے مولوی فاضل اور
مولوی انوار اللہ خاں صاحب کے شاگرد رشید تھے انہوں نے ختم جلسہ پر ایک اعتراضی تقریر کردی
جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جتنی باتیں مرزا غلام احمد صاحب کی صداقت کے بارے میں کی گئی ہیں وہ
سب غلط ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ مسیح موعود کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی ماں کا نام میری ماں
کا نام ہوگا۔ اُن کے باپ کا نام میرے باپ کا نام ہوگا اور وہ میری قبر میں دفن ہوگا۔ یہاں وہ
بات نہیں ہے بلکہ یہ تو مغل ہیں' مرزا ہیں' ان کا نام محمد نہیں بلکہ مرزا غلام احمد ہے ان کے باپ کا
نام مرزا غلام مرتضیٰ ہے عبداللہ نہیں اور ماں کا نام آمنہ نہیں بلکہ چراغ بی بی ہے اور یہ قادیان میں
دفن ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں دفن نہیں ہوئے۔ اس تقریر نے عوام پر یہ
تاثر پیدا کیا کہ جو کچھ اچھا اثر پیدا ہوا تھا وہ سب زائل ہونے لگا۔ اس پر میں کھڑا ہوگیا اور اپنی
تقریر شروع کی۔ میں نے کہا کہ ہمارے نوجوان دوست نے جو بات بیان کی ہے وہ انتہائی
حیرت انگیز ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں حدیثوں کے پرکھنے کے اصول پر کہاں تک عبور
ہے۔ اگر یہی بات صحیح ہے جو ہمارے نکتہ چیں نے بیان فرمائی ہے تو پھر اس سے الزام آتا ہے کہ
حضرت علی و فاطمۃ الزہرہ کے درمیان رشتہ مناکحت قائم نہیں ہوا۔ حضرت امام حسینؓ پیدا ہوئے
اور نہ سیدنا امام حسینؓ کا وجود تھا۔ ان کی شہادت کا واقعہ سرتاپا بے بنیاد ہے کیوں کہ حضرت محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

یاعلی دمک دمی ولحمک لحمی یعنی اے علی تیرا خون میرا خون ہے اور تیرا
گوشت میرا گوشت ہے۔ ان ہی الفاظ کو ہمارے معترض صاحب کے قول کے مطابق ظاہر پر
محمول کیا جائے تو سارے مضمون کا بیڑہ ہی غرق ہوجاتا ہے۔ جب بیان کی تاویل ہوسکتی ہے تو
کیوں اس میں بھی تاویل نہ کی جائے۔ اسم سے مراد اسم صفت ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ
مرزا غلام احمد صاحب اوصاف محمدی سے موصوف تھے اور معناً ان کا نام محمد ہی تھا۔ میری اس تقریر

سے حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا اور مخالف شرمندہ ہوئے۔ مولوی حافظ روشن علی صاحب نے
مکان پہنچ کر مجھ سے فرمایا کہ قلم دوات لاؤ۔ میں لکھ دیتا ہوں کہ تم اس وقت دس ہزار آدمیوں میں
ایک ہو۔ اس کے بعد میں ہمارے علماء صاحبان کو منماڑ تک پہنچایا اور دعاؤں کے بعد قادیان
رخصت کر کے میں حیدر آباد لوٹا۔

جس زمانے میں، میں حضرت مولانا حافظ روشن علی صاحب اور ڈاکٹر مفتی محمد صادق
صاحب کو لے کر تبلیغی معاملات میں مصروف تھا تو ان دنوں بعض اوقات حضرت مولانا میر محمد سعید
صاحب کے قرآن مجید مترجم معہ تفسیر اور طبع القرآن کے لئے بھی حضرت مولوی صاحب کے
حسب الارشاد خدمت کر دیا کرتا تھا لیکن میں نے اپنی طرف سے اپنے منجھلے بھائی میر فضل علی
صاحب کو اس کام پر لگایا تھا اور وہ خود بھی مجھ سے پہلے شب و روز حضرت مولوی صاحب کی اس
تفسیر احمدی کی خدمات انجام دے رہے تھے یہاں تک کہ اس کی طباعت کے لئے کئی ماہ آگرہ
میں مولوی صاحب کے ہمراہ وہ ہم سفر رہے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے ترجمۃ القرآن و
تفسیر میں ان کے متعلق یہ لکھا کہ تفسیر اور طبع القرآن معہ تفسیر احمدی حسب ضرورت بعجلت ممکنہ
دو ماہ کے اندر"

(بسعی جمیل صالح نبیل اخی الشریف العزیز المنیف سید فضل احمد)

وعداللہ زد القدر احسن الیہ فی الدنیا والآخر خیرا کثیرا ۱۳۲۳ ہجری میں شائع ہوئی جس کی تاریخ
"کتاب الحکمت آیات" ہے۔ اس قرآن کے ترجمہ و تفسیر کو روزانہ سید فضل احمد حضرت حافظ
روشن علی صاحب کو سنا کر آخر میں حافظ صاحب کی دستخط حاصل کی۔ جو طبع ہو گئی۔

میرے بھائی سید فضل احمد کے متعلق بریکٹ میں جو عربی الفاظ بوقت طباعت قرآن
مجید لکھے گئے ہیں وہ الفاظ مولوی صاحب کے الہامی ہیں۔

میری شادی کے بعد غالباً ۱۹۱۳ء[1] میں خواجہ کمال الدین صاحب نے بہ اجازت
حضرت خلیفۃ المسیح الاول حضور نظام کے نام ایک تبلیغی رسالہ "صحیفہ آصفیہ" کے نام سے لکھا۔ اور وہ
اس معاملے میں بنگلور سے ممبئی روانہ ہوئے اور حضرت مولوی صاحب سے مشورہ کرنے کے لئے

میں واڑی اسٹیشن پر پہنچا ہم نے بجائے واڑی پر ملاقات کرنے کے مناسب یہ سمجھا کہ ممبئی میں

رضوی صاحب کے مکان میں ٹھہرنے والے تھے تو ہم سیدھے ممبئی چلے گئے اور نواب رضوی
صاحب کی بلڈنگ پر خواجہ کمال الدین صاحب اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب سے ملاقات
کی اور صحیفہ آصفیہ کے متعلق ضروری گفت و شنید ہوئی۔ اس کے بعد ہماری موجودگی میں ہی خواجہ

[1] یہ رسالہ ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا۔ اصل رسالہ خاکسار کی لائبریری میں موجود ہے۔ (مولف)

کمال الدین صاحب نے نواب رضوی صاحب سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ تبلیغ احمدیت و اسلام
کے لئے لندن جانا پسند کرتے ہیں۔ تب رضوی صاحب نے کہا کہ کیا اخراجات ہوں گے۔
انہوں نے کہا کہ دس ہزار روپیہ ہوں گے۔ تو رضوی صاحب نے کہا کہ میں دس ہزار روپے دیتا
ہوں کہ آپ تبلیغ اسلام کے لئے جائیں، لیکن وہاں میرے کچھ ذاتی معاملات زیر تصفیہ ہیں تو
آپ اس میں میری مدد کریں۔ اس زمانے میں حضور نظام اور لیڈی وقار الامراء کے درمیان کچھ
ایسے معاملات تھے کہ جس کے لئے لندن میں پیروی کی ضرورت تھی تو یہ اس امر کی طرف اشارہ
تھا اور ہماری موجودگی میں ہی خواجہ صاحب کو رضوی صاحب نے دس ہزار روپے دیئے[1]

انھیں دنوں میں یہ بھی ہوا کہ مکرم سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب جو قدیم سے ممبئی کی جماعت
کے مخلص احمدی ہیں۔ ان کی مختصر دکان چھتریوں کی محلہ مسجد کے پاس تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ
بمشکل دو گز چوڑی اور چھ سات گز لمبی دکان تھی۔ متعدد مرتبہ سیٹھ صاحب کی دوکان پر جانے اور
ان سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ اس زمانے میں سیٹھ صاحب سے میں نے یہ کہا تھا کہ آپ کی
چھتریوں کی دکان بہت ہی چھوٹی ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑی کر دے۔ تو سیٹھ صاحب نے مجھ سے
یہ ذکر کیا کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے دعا کے لئے یہ عرض کئے تھے کہ کہیں سے مجھے دس
ہزار روپیہ مجھے مل جائیں تو میں اس تجارت کو وسیع کر سکتا ہوں۔ خدا کی شان کہ جب رضوی
صاحب حیدر آباد سے ممبئی منتقل ہوئے تو ان کو وہاں کے کسی مخیّر احمدی سے واقفیت کی ضرورت تھی
تا کہ تمام کام وہ آپ کے مشورہ سے کرسکیں۔ تو حضرت مولوی صاحب کے اور سیٹھ اسمٰعیل
صاحب کے مجھ سے بھی تعلقات تھے۔ چنانچہ سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب شہر حیدر آباد میں جب
ایک مرتبہ تشریف لائے تھے تو میرے ہی مکان میں کئی ماہ مقیم تھے۔ حضرت مولوی صاحب نے

[1] اس واقعہ کی تصدیق حیات قدسی جلد چہارم صفحہ ( ) کی عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

رضوی صاحب سے کہہ کر جب کہ خواجہ کمال الدین صاحب کو دس ہزار روپیہ دیئے گئے تھے تو سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب کو بطور قرض حسنہ دس ہزار روپیہ دلوائے تھے۔ غالباً اس دستاویز پر میری شہادتی دستخط ہوئی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب پر ایسا فضل فرمایا کہ انہوں نے بجائے اس چھوٹی سی دوکان کے پرنس اسٹریٹ میں بڑی شاپ قائم کرلی جس میں انہیں لاکھوں روپے کا بزنس کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ الحمد للہ۔

جس زمانے میں حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ اور حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ کو لے کر میں تبلیغ کرتا تھا تو اس زمانے میں محکمہ امور مذہبی سے ہمارے مقدمات چل رہے تھے اس لئے میں سِوائے حیدرآباد میں کسی مقام پر پبلک لیکچر یا پبلک لائبریری کا کام نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے علاقہ ریذیڈنسی میں۔ ہسپتال کے قریب کلاک ٹاور گارڈن کے سامنے بنگلہ لب سڑک کرائے پر لے کر وہاں انجمن کا بورڈ لگادیا اور چار بجے سے مغرب تک بیٹھ کر آنے جانے والوں سے تبلیغی گفتگو کرتا اور درس القرآن کا سلسلہ بھی جاری کردیا۔

جب ہم چودھری نواب علی صاحب احمدی سب انسپکٹر' پولیس ٹریننگ اسکول کی تعلیم کے لئے ریذیڈنسی میں ایک مکان لے کر مقیم ہوگئے تو انھوں نے ایک حکیم صاحب سے علماء کی ملاقات کروائی اور پھر ایک روز مقرر کرکے ہمیں اطلاع دی کہ ورنگل کے ایک نواب جو کاچی گوڑہ میں رہتے ہیں' پانچ دس اصحاب کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے ہیں تو ہم (یعنی خاکسار' چودھری نواب علی صاحبؓ' حافظ روشن علی صاحبؓ اور مفتی محمد صادق صاحبؓ) بعد نماز جمعہ اس مقام پر پہنچے۔ ابھی ہم اس مقررہ مقام تک پہنچنے ہی والے تھے کہ ہماری بگھی کو دیکھ کر لوگوں نے شور مچانا شروع کیا۔ جب ہم اس مکان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ تقریباً تین چار سو افراد کا مجمع تھا اور زیادہ تر مخالف تھے۔ صدر دالان میں حیدرآباد کے منتخب مشہور مخالف علماء اور شیخ سعید عرب اور مولوی نثار احمد اور دیگر علماء وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے ہمارا نہ استقبال کیا نہ تعظیم کی۔ لیکن ہمارے بیٹھتے ہی علماء نے شور مچانا شروع کیا کہ اب مناظرہ شروع کردو۔ تب میں کھڑا ہوا اور تمام حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی آمد کی روئیداد سنا کر یہ بات بتلائی کہ قانون حیدرآباد کے لحاظ سے کسی فرقے کو مناظرہ یا مباحثہ کی اجازت نہیں۔ اور بالخصوص جماعت احمدیہ کے

ساتھ ان دنوں محکمہ امور مذہبی و محکمہ کوتوالی سے شدید اختلافات ہوگئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس مجلس میں دفتر کوتوالی کے ایک منتظم صاحب جو ہمارے سخت مخالف تھے وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ میں جو یہ کہہ رہا ہوں اس کی تصدیق منتظم صاحب موصوف کرسکتے ہیں تب منتظم صاحب کو خدائے تعالیٰ نے توفیق دی کہ انہوں نے میرے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مناظرہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد پبلک کے جذبات تیز ہوگئے اور اُنہوں نے کہا کہ یہ مکان محفوظ ہے۔ ہم اس میں جو چاہے کرسکتے ہیں۔ تب میں نے مکان دار نواب ورنگل کو اور ان حکیم صاحب کو جنھوں نے ہمیں بلوایا تھا مجلس میں ان کو بلوا کر بٹھایا اور یہ تحریر لکھوانا شروع کی کہ میں اپنی ذمہ داری پر یہاں اپنے مکان میں مناظرہ و مباحثہ کرواتا ہوں۔ اگر کوئی نقص امن برپا ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔

اس کے بعد میں نے اس تحریر پر نواب صاحب کو دستخط کرنے کے لئے کہا تو وہ سخت پریشان ہوگئے اور کہا کہ میں دستخط نہیں کرسکتا۔ تب تمام حاضرین مجلس نالاں ہوگئے کیونکہ انہوں نے صاف انکار کردیا اور محفل کو برخاست کرنے کی تاکید کی۔ تب مجلس کی مایوسی کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ اگر یہ سب لوگ اس وقت ہمارے سلسلے کی باتیں سن لیں تو کافی تبلیغ ہوسکتی ہے۔ میں نے ان تمام سے یہ کہا کہ علاقہ انگریزی میں یہ مجبوریاں نہیں ہیں۔ ریذیڈنسی میں ہمارا ایک مکان ہے۔ اگر آپ تمام احباب یہاں سے پیدل ہی چلیں جو دو فرلانگ سے زیادہ نہیں ہے وہاں آپ ہم سے تبادلہ خیالات کرسکتے ہیں۔ تب سب کے سب بخوشی اس پر آمادہ ہوگئے۔ میں نے چودھری نواب علی صاحب کے ساتھ اپنے علماء کو تیار کردیا اور کہا کہ آپ ان تمام کو اپنے مکان لے جائیں میں ریذیڈنسی کے کوتوال سے مل کر آپ کے گھر آتا ہوں۔ چنانچہ فوری اپنی بگھی کو کوتوال صاحب کے گھر لے جاکر سارے واقعات سنا کر وہاں سے ایک پولیس کے جوان کو اپنے ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچا اور دروازے پر جوان متعین کرکے تمام پبلک کو چودھری نواب علی صاحب کے مکان میں داخل کرکے بٹھادیا اور اس کے بعد مولانا حافظ روشن علی صاحب سے یہ عرض کیا کہ درس القرآن آپ روزانہ ریذیڈنسی کلاک ٹاور کے مکان میں دیا کرتے ہیں۔ پہلے آپ وہ درس القرآن یہاں دے دیں۔ اس کے بعد باہمی گفتگو شروع کی جائے۔ اس پر حافظ

روشن علی صاحب نے کہا کہ آپ نے پبلک کو درس القرآن کے لئے ہی بلایا ہے ۔ کہیں یہ
بدعہدی نہ ہو۔ اگر آپ بحیثیت سکریٹری کے حکم دیں تب تو میں مان لوں گا ورنہ نہیں ۔ تب میں نے
ان کو حکم دیا اور کھڑے ہوکر پبلک سے کہا کہ ہم جب تک قرآن شریف کا درس نہ دے لیں کوئی
کام نہیں کرسکتے ۔ ہم دس منٹ میں درس دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کردیتے ہیں ۔ پھر
آپ جو بات دریافت کرنا چاہیں کرسکتے ہیں ۔ میں نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں باہر جانا چاہوں
گا۔ تمہارے درس کے بعد آوں گا۔ اس وقت مولانا روشن علی صاحب نے تلاوت قرآن شروع
کردی تھی ۔ تب میں نے محبت آمیز لہجے میں ان سے کہا کہ ''بیٹھ جائیں'' تب میں بیٹھ گیا
تو جوان کے ساتھ جانے والے تھے ان میں اکثر کھڑے ہوگئے تھے وہ بھی بیٹھ گئے ۔ دس منٹ
کے بعد میری صدارت میں مجلس مناظرہ شروع ہوا۔ وفات مسیح کی اس آیت پر والـــــذیـــن
یـدعون...... الخ'' پر مناظرہ باضابطہ شروع ہوگیا۔ مولوی حافظ روشن علی صاحب کے مقابلے میں
مولوی نثار احمد صاحب جو حیدرآباد کے مشہور مقرر تھے وہ بحث کررہے تھے ۔ مغرب کے بعد بحث
ختم ہوگئی ۔ پھر دوسرے روز چار بجے رکھی گئی ۔ اس طرح سے تقریباً ایک ہفتہ بحث کا سلسلہ جاری
رہا۔ چونکہ صحن مکان وسیع تھا ۔ بہت سارے اصحاب جمع ہوتے اور مستفید ہوتے تھے ۔ اختتام
جلسہ پر کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی اس اثناء میں' میں نے جملہ علماء کو اپنے ساتھ ایک حد تک اخلاقی
رنگ میں متفق کرلیا تھا' جس کے باعث جلسہ بخیر وخوبی ختم ہوا۔ ان علمائے کرام کے پورے دور
تبلیغ میں یہ مجلس مناظرہ ایک تاریخی حیثیت سے کامیاب رہا ۔ اس مناظرے کی کیفیت جب
حیدرآباد کے محکمہ کوتوالی اور محکمہ امور مذہبی کو پہنچی تو انہوں نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ جماعت
احمدیہ کو ہم نے اپنے یہاں پبلک جلسے وغیرہ سے روک دیا ہے لہٰذا آپ بھی اپنے طور پر نگرانی
رکھیں تب اسسٹنٹ ریزیڈنٹ نے مجھ کو بلایا اور جب میں نے جماعت احمدیہ کی پالیسی اور تمام
حالات ہندوستان کی جماعتوں کو سنا کر کہا کہ ہم نے جو مکان کلاک ٹاور کے سامنے لیا ہے اس
میں تبلیغ کرنے کی عام اجازت دی جائے ۔ انہوں نے کہا کہ میں تحریری حکم آپ کے پاس
بھجواؤں گا۔ آپ دستخط کریں۔ دوسرے دن جب کہ وہ حکم آیا تو میں موجود نہ تھا' جس نے پڑھا
اس نے یہ بتلایا کہ جماعت احمدیہ کو پبلک جلسے کرنے کی یا پبلک مقام پر لائبریری رکھنے اور گفتگو

کی اس وقت تک اجازت نہیں دے سکتے جب تک کہ حیدرآباد کے محکمہ امور مذہبی سے اجازت نہ
مل جائے ۔ میں خود اس مقام پر نہیں گیا بلکہ سامان اٹھوالیا اور مکان خالی کرکے مکان دار کے
حوالے کردیا اور اسسٹنٹ رزیڈنٹ کے پاس جاکر میں نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ نے محکمہ امور
مذہبی کی ماتحتی قبول کرلی ہے اس لئے میں نے اب آپ کی ماتحتی میں رہنا پسند نہ کرتے ہوئے مکان
خالی کردیا ہے ۔ چونکہ میں آپ کے حکم کو انصاف کے خلاف سمجھتا ہوں اس لئے میں اس پر دستخط
کرنا بھی پسند نہیں کرتا ۔ اسسٹنٹ رزیڈنٹ نہایت شرمندہ ہوئے اور میں وہاں سے لوٹ گیا۔
تقریباً چھ ماہ (فبروری تا جولائی ۱۹۱۵ء) میں پانچ سو تحفۃ الملوک کی کاپیاں اولاً شہر
حیدرآباد کے جملہ وزراء امراء وحکام و دیگر معززین اور سربرآوردہ حضرات میں تقسیم کرتے ہوئے
ان سے تفصیلی گفتگو بھی کی جاتی رہی ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمام نے نہایت خندہ پیشانی اور جس
اخلاقی مظاہرے سے اس کتاب کو لیا اور پڑھا ۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً حیدرآباد کے چار صوبوں
اورنگ آباد' ورنگل' گلبرگہ اور میدک کے جملہ اضلاع و تعلقہ جات میں بھی بمعہ وفد علمائے کرام
نے جاکر اس کتاب کو تقسیم کیا ۔ بعض امراء اور حکام نے عقیدت' اخلاص و محبت کا اظہار کرتے
ہوئے ہمیں متعدد دفعہ اپنے یہاں بلوایا اور چند ایک نے دعوتیں دیں ان سب میں قابل ذکر
نواب ضیاء یار جنگ بہادر سابق جج ہائیکورٹ جو اس وقت ہائیکورٹ جج تھے انھوں نے محض تبادلہ
خیالات کے لئے کئی شب اپنے ہاں مہمان رکھا اور چونکہ حیدرآباد کے علماء اور مشائخین میں وہ
دینی عالم ہونے کے بوجہ فقہ و حدیث سے زیادہ واقف ہونے کے وہ مفتی بلدہ بھی سمجھے جاتے تھے'
انہوں نے بعد تبادلہ خیالات ہمارے علماء کو بہت سراہا۔

نواب غوث الدین صاحب جاگیردار کے حالات :

ہمارے ننھیال میں چار ماموں' نواب جمال الدین صاحب بخشی فوج و جاگیردار ۔
نواب غوث الدین صاحب بخشی فوج و جاگیردار ۔ نواب نصیر صاحب جاگیردار اور نواب سراج
الدین صاحب تھے ۔ ان میں نواب غوث الدین صاحب کو ہمارے نانا محمد شکور صاحب جمعدار
مرحوم نے اپنا جانشین بنایا ۔ ان کا اسٹیٹ تقریباً ساٹھ ہزار سالانہ آمدنی کا تھا ۔ ان کو کوئی نرینہ
اولاد نہ تھی اور دو لڑکیاں تھیں ہمارے خاندان میں یہ مشہور تھا کہ نواب غوث الدین صاحب

بعض عوارض کی وجہ سے نا قابل ولادت ہو چکے تھے ۔ ان کے بعض رشتہ دار اس امر کی شکایت رکھتے تھے کہ وہ اپنے بھائی بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیتے ۔ چنانچہ میری والدہ مرحومہ اور میرے حقیقی ماموں نواب سراج الدین صاحب احمدی کو بھی اس کی شکایت تھی۔

میرے ماموں نواب سراج الدین صاحب مرحوم:

نواب سراج الدین صاحب جو میرے سب سے چھوٹے ماموں تھے جو لاکھوں روپیوں کی جائیداد اور زر و جواہر کو تباہ و برباد کرنے کے بعد خدا کے فضل اور میری تبلیغ سے احمدی ہو کر حضرت میر محمد سعید صاحب کے مکان پر والہانہ رنگ میں دھونی رما کر نماز و دعا و قرآن شریف و حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں میں شب و روز مصروف رہے اور وقتاً فوقتاً حضرت مولوی صاحب کو دعا کے لئے توجہ دلاتے رہتے ۔ خود بھی دردمند دل سے دعائیں کرتے اور تمام جماعت ان کی گریہ وزاری سے متاثر ہو جاتی ۔ ایک روز بعد نماز فجر حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ نے درس القرآن کے بعد ہم سے اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے کہ ''غوث الدین کے سر پر میں ماروں یا تم مارتے ہو'' تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ''آپ ماریں'' اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''سراج الدین اور اس کی اولاد اگر تقویٰ پر رہے تو سات پشت تک وہ خوش حال رہے گی ورنہ موت پر موت اور تباہی دیکھیں گے'' یہ سنتے ہی میرے ماموں سراج الدین صاحب بہت رونے لگے اور ہم پر بھی اس کا بہت اثر ہوا۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ ہمارے ماموں نواب غوث الدین صاحب چار روز سے بیہوش ہیں اور حالت نازک ہے ۔ نواب سراج الدین صاحب اور ان کے بیوی بچے ان دنوں ہمارے علاقے کے مکان میں رہتے تھے ۔ سب سے پہلے اپنے ماموں کو جن کو میں بارہ پندرہ سال کے بعد ان کے گھر جا کر دیکھا۔ بعد دریافت یہ معلوم ہوا کہ وہ قاضی پیٹھ اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے زنانہ فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں بغیر دروازہ بند کئے کے کھڑے ہوئے تھے کہ Shunting کے دھکے سے سر کے بل پلیٹ فارم پر گر پڑے اور بیہوش ہو گئے اور یہ بے ہوشی مرتے دم تک نہ گئی۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے یقین کرلیا کہ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ کا وہ کشف اب پورا ہو رہا ہے ۔ تب میں نے اپنے ماموں سراج الدین صاحب کو یہ کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ

ان کے محلات میں جا کر قیام پذیر ہو جائیں ورنہ سب زر جواہرات غائب ہو جائیں گے ۔ چونکہ اس زمانے میں میرے ماموں نواب سراج الدین صاحب کی مالی حالت بہت کمزور تھی اور انہوں نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ مجھ سے کوئی انتظام نہیں ہوسکتا ۔ میرا چونے کا کاروبار بہت بڑے پیمانے پر جاری تھا اور تین سو ساٹھ ماہوار کے ملازمین میرے ہاں نوکر تھے ۔ میں نے اپنے ملازمین کے علاوہ سیٹھ محمد علی صاحب احمدی کے بیڑی کے کارخانے کے لودھوں کو روزانہ آٹھ آنے کی اجرت مقرر کر کے اپنے ماموں نواب غوث الدین صاحب کے مردانہ و زنانہ دیوڑھی اور دیگر متعلقہ مکانات پر متعین کر دیا ہے ۔ اور ہم اپنے ماموں سراج الدین صاحب اور میری والدہ صاحبہ کو معہ متعلقین کے غوث الدین صاحب کے مکان میں جا کر اتر گئے ۔ ہمارے ننھیال میں میرے اس اقدام سے سخت ہلچل مچ گئی ۔ مجھے حضرت مولوی صاحب کے کشف و دعا پر یقین تھا اس لئے میں کچھ خائف نہ ہوا ۔ اسی ہفتے میں غوث الدین صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میرے ماموں نواب سراج الدین صاحب کسی اور کے مشورہ کے تحت اپنے بھائی نواب غوث الدین صاحب کے غسل کو رکوا کر اسسٹنٹ سرجن کو بلانے چلے گئے جوں ہی مجھے اطلاع ملی میں خود اپنی ڈاک کارٹ کو تیزی سے ہانکتے ہوئے رزیڈنسی کے قریب اپنے ماموں کی سواری کو روک کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر انہیں واپس لے آیا اور غسل و تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے ہمارے نانا مولوی محمد شکور کی مسجد میں نماز پڑھوا کر شاہ راجو قتالؒ کی درگاہ بیرون فتح دروازہ کے مقبرے میں دفن کر کے جب ہم نواب غوث الدین صاحب کے گھر لوٹے تو وہاں کثرت سے پولیس کھڑی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ بعض وکلاء بھی تھے ۔ جنھوں نے ہم کو کوتوال صاحب کا مراسلہ بتلایا کہ ایک مسماۃ نواب صاحب کی بیوی ہے اور اس کے ساتھ ایک پانچ سالہ لڑکی بھی ہے ۔ ان کو دیوڑھی میں داخل کیا جائے ورنہ تمام مکانات پر قفل او رمہر توڑ کر دیا جائے گا ۔ میرے ماموں سراج الدین صاحب اور ان کے خاندانی رفقاء کا یہ خیال ہوا کہ جب کہ یہ لڑکی غوث الدین صاحب کی ''سگی'' بہن ہے تو پھر ہم کیسے اس کو داخل کرلیں ۔ تو میں نے کہا کہ اس طرح کی ایک اور لڑکی بعمر گیارہ سال او ربیوی جب کہ گھر میں موجود ہے اور جن کو ہم نے گھر سے نہیں نکالا تو اس لڑکی اور اس کی والدہ کو نکالنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ اس پر میرے اور میرے

ماموں اوران کے رفقاء کار کے درمیان کچھ دیر گفتگو رہی بالآخر میں نے اپنے ماموں سے یہ کہا کہ جس میت کے ورثہ کے لئے ہم یہاں آئے ہیں ۔ ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ان کے انتقال کے بعد ہم اس کی پردہ داری کریں اور غیر حقیقی ورثاء کو جانے کے بعد جو بچ جائے اور ہم کو مل جائے تو ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے مورث نے یہی چھوڑا ۔ جس پر اس عورت اور لڑکی کو نواب غوث الدین صاحب کی دیوڑھی میں زنانہ پولیس کو اطمینان دلا کر رخصت کر دیا اور باہم متحد ہو کر ایک ثالثی قرار دی ۔ اس ثالثی کے بموجب ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ زیر غور رہا۔

چند دن کے بعد غوث الدین صاحب کی دو بیویاں معہ اپنی دونوں لڑکیوں کے اور ایک بڑی بیوی لاولد یہ پانچ ۔ میری والدہ اور میرے ماموں نواب سراج الدین صاحب کو الگ کر کے ایک علیحدہ صلح نامہ مرتب کرلیا اور یہ کہا کہ چونکہ سراج الدین بھائی اور ہمشیرہ سردار بیگم صاحبہ بوجہ قادیانی ہونے کے مذہب اسلام سے علیحدہ ہوگئے ہیں اس لحاظ سے وہ کوئی ورثہ نہیں پاسکتے ۔ یہ صلح نامہ انھوں نے عدالت دارالقضاء میں پیش کر دیا۔

مجھے جب اطلاع ملی تو میں نے ان لوگوں کو اپنے مکان پر بلوایا اور گفتگو کی لیکن وہ رضامند نہ ہوئے ۔ اس زمانے میں' میں وکیل نہ تھا اور مولانا ابوالحمید صاحب بوجہ ملازمت وکالت نہیں کر سکتے تھے ۔ مولوی حافظ عبدالعلی صاحب وکیل کو چونکہ وہ پنجابی جماعت کے صدر تھے اس لحاظ سے ایک حد تک ہم سے مانوس تھے ۔ میں نے ان کو وکیل مقرر کر کے علیحدہ درخواست عدالت دارالقضاء میں میری والدہ اور میرے ماموں کی جانب سے پیش کرتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ ہم مسلمان ہیں اور تمام اسلامی عقاید پر ہمارا ایمان ہے ۔ اگر عدالت چاہے تو اس بات کا اطمینان کروانے کو ہم تیار ہیں ۔ اس کے بعد ناظم عدالت دارالقضاء نواب ذوالقدر جنگ بہادر ہوم سکریٹری کے چھوٹے بھائی مرزا محمد اسحٰق بیگ تھے ۔ تاریخ پیشی پر دیگر ورثاء کے متعدد وکلا نے مذہبی معاملات میں میرا بیان اس وجہ سے لینے کی خواہش کی کہ میں قدیم سے جماعت احمدیہ حیدرآباد کا جنرل سکریٹری مشہور تھا۔

میرے بیان میں ''میں نے اپنا مذہب ''فقط اسلام'' لکھوایا ۔ اور ''فقط قرآن'' کے ماننے کا ذکر میں نے لکھوایا ۔ تب جرح میں مجھ سے پوچھا گیا کیا لفظ فقط ضروری ہے؟ تو میں نے

کہا کہ بغیر فقط کے میرا مذہب قائم نہیں رہ سکتا ۔ میں عام تفسیروں کا قائل نہیں ہوں ۔ ''فقط قرآن'' کا قائل ہوں ۔ میں عام مسلمانوں کی طرح نہیں ہوں اس لئے میں اپنے آپ کو ''فقط مسلمان'' لکھوایا ہوں ۔ ناظم صاحب نے عدالتی سوالات میں مجھ سے دریافت فرمایا کہ آپ ''فقط مسلمان'' کس طرح کے ہیں ۔ میں نے کہا جس طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ مسلمان تھے ۔ انہوں نے کہا کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی تو میں نے کہا میں شیعہ ہوں نہ سنی ہوں' پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ ''فقط مسلمان'' ہوں ۔ تب ان وکلاء کی طرف ناظم صاحب نے متوجہ ہو کر کہا کہ مولوی بشارت احمد صاحب سے آپ جتنے سوالات کریں گے وہ سرکاری طور پر مثل میں اپنے مذہب اور عقیدے کو لکھواتے جائیں گے ۔ ایک تو ان کی تبلیغ ہوتی جائے گی اور دوسرے وہ غیر مسلم بھی قرار نہیں پاسکیں گے ۔ ان کے جوابات سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں تو ان پر جرح کریں میں لکھنے کو تیار ہوں ۔ اگر چاہتے ہو تو صلح کرلو ۔ آخر وہ پیشی تبدیل ہوگئی اور اسی ہفتے میں وہ دیگر ورثاء اوران کے وکلاء میرے ہاں آئے اور متفقہ صلح نامہ لکھ کر پیش کر دیا گیا۔

اس کے بعد جملہ ورثاء کی جانب سے ثالث مقرر ہوگئے ۔ میری والدہ کی جانب سے میں' اور میرے ماموں نواب سراج الدین صاحب کی جانب سے حضرت مولوی میر محمد سعید صاحب ثالث مقرر ہوئے اور اس ثالثی کو عدالت میں پیش کر کے منظوری لے لی گئی ۔ اب اس ثالثی میں تقریباً دو مہینے میں تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ' مکانات و باغات و باورچی خانہ جات و مقطعات موقوفہ و غیر موقوفہ و نواب چال بلڈنگ واقع ممبئی ۔ نقد و زر و جواہر کی تقسیم اور نیلام ہوتا رہا۔

میرے نانا محمد شکور جمعدار مرحوم تقریباً چالیس ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جائیداد از قسم اراضی و مقطعات و جاگیرات وقف کئے تھے جس کی آمدنی سے ربیع الاول اور ربیع الثانی میں ان کی مردانہ اور زنانہ دیوڑھی میں مجالس وعظ منعقد ہوا کرتے ۔ پھر گیارہ پلے سے لے کر سو پلے تک بریانی وغیرہ کھلائی جاتی اور اس طرح سے غربا کی دلجوئی و ہمدردی کے کئی کام رمضان' رجب' شعبان اور عیدین کے مواقع پر کئے جاتے ۔

یہ مسئلہ پھر کھڑا ہوا کہ سراج الدین صاحب چونکہ احمدی ہیں یہ متولی نہیں ہو سکتے ۔ وہاں

بھی ہم نے یہی جواب دیا کہ ہم مسلمان ہیں' لیکن ورثاء کی تقسیم ہم نے پوری طرح کردی چونکہ ابتداء سے میں نے اپنی ذمہ داری پر اپنی والدہ اور ماموں کو غوث الدین صاحب کے مکان میں رکھا اور ماہانہ تقریباً پانچ' سات روپے انتظام کے لئے خرچ کرتا تھا' اس لئے جملہ انتظامات میرے ذمہ تھے اور میرے ہی مشورہ اور رائے کو میرے ماموں اور والدہ کے علاوہ دوسرے ورثاء اور ان کے عزیز واقارب بھی مانتے تھے۔

حیدرآباد کے علاقے کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کی تقسیم ہوچکی۔ ممبئ کی بلڈنگ کی فروختگی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور پیچیدہ تھا۔ دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے اچانک یہ انتظام فرمادیا کہ مکرم سیٹھ عبداللہ بھائی اور مکرم الہ دین بھائی صاحب میرے ماموں غوث الدین صاحب کے مکان پر جہاں میں مقیم تھا' تشریف لاکر کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے ماموں کی کوئی بلڈنگ ممبئ میں ہے جس کو آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں اور ہم اس کو خریدنے کے لئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ صحیح پتہ دیں تو الہ دین بھائی جاکر دیکھ آئیں گے اور قیمت کا تصفیہ ہوجائے گا۔ تب میں نے نواب چال Lamington Road ممبئ کی بلڈنگ کا پتہ دیا اور چند ہی روز کے بعد سیٹھ صاحب نے آکر مجھ سے کہا کہ ہم ایک لاکھ بیس ہزار میں خریدنے آمادہ ہیں بشرطیکہ کوئی جھگڑا اس معاملے میں آئندہ نہ پیدا ہو اور آپ ذمہ داری لیں تو پھر میں اور میرے بھائی اور احمد الہ دین کے ماموں خسر سیٹھ عبداللہ جو سب نصف قیمت پر خرید لیں گے۔ تب میں نے ہماری ثالثی کی کمیٹی میں اس معاملے کو پیش کیا تو ان لوگوں نے بھی یہی کہا کہ اگر آپ کو اطمینان ہے تو ہم اس کو قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ ثالثی سے یہ فیصلہ ہوا کہ سید بشارت احمد صاحب اس ممبئ کی بلڈنگ کی فروختگی کے معاملہ میں ذمہ دار قرار دیئے جاتے ہیں۔ سب معاملہ کرنے کے وہی ذمہ دار ہیں اور ورثاء نے یہ بھی تہیہ کرلیا تھا کہ جب تک دس ہزار روپیہ بیعانہ وصول نہ ہو ہم حیدرآباد سے روانہ نہ ہوں گے تو عبداللہ بھائی نے مجھ کو اطمینان دلایا تھا کہ آپ اپنے جملہ شرکاء کو اسٹیشن لائیں اسٹیشن پر میں آپ کو دس ہزار روپے روانگی سے قبل دے دوں گا۔ چنانچہ ناملی اسٹیشن پر عبداللہ بھائی نے بطور بیعانہ دس ہزار روپے کلدار پیش کردیئے اور دیگر شرکاء کو بتلادیا جس سے وہ مطمئن ہوکر ہمارے ساتھ ممبئ روانہ ہوگئے۔ ہمارے ساتھ سیٹھ احمد علاء دین بھی روانہ ہوئے۔

ممبئ جانے کے بعد مشکل یہ پیش آئی کہ ہائی کورٹ جج نے حکم دیا تھا کہ جب تک دو لڑکیاں نواب غوث الدین صاحب کی بالغ نہ ہوجائیں اس وقت تک رجسٹری نہیں ہوسکتی۔ تب میں نے ۱۴ فقرے عذرات کے لکھ کر بیرسٹر کو دیئے۔ خدا کے فضل سے میرے وہ عذرات جج نے قبول کرکے اجازت دے دی اور یہ معاملہ بہ آسانی طے ہوگیا اور ہر ایک حصہ دار نے اپنی رقم حاصل کرلی۔

اس جگہ اس امر کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ کے فضل سے اس بلڈنگ کی خرید و فروخت کا معاملہ جماعت ہائے احمدیہ حیدرآباد وسکندرآباد کے لئے ترقی وعروج کا سبب بنا۔ مثلاً سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب کا یہ معاملہ بعد فروخت بلڈنگ معلوم ہوا کہ چودہ ہزار روپے مکرم الدین بھائی صاحب کو اس معاملہ کی کوشش کے معاوضہ میں دے کر ان کی زندگی کو از سر نو ابھارا گیا۔ پھر عبداللہ صاحب نے مجھے دس ہزار روپے بطور تحفہ دے کر کہا کہ چونکہ آپ کے ذریعہ سے اور آپ کی کاوش سے یہ معاملہ بہ آسانی طے ہوا اس لئے آپ کو ہم بطور تحفہ یہ رقم دیتے ہیں۔ حالانکہ اس معاملے کے لئے سیٹھ صاحب اور میرے درمیان کوئی قبل از وقت معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہا شکر واحسان کہ اس مکان کی رقم سے عبداللہ بھائی نے سولہ ہزار روپے اپنے اور اپنی فیملی کی جانب سے ''مسجد لندن'' کے لئے اور دیگر چندہ جات میں دیا اور اسی طرح الہ دین بھائی' میں اور میرے ماموں اور میری والدہ بحیثیت احمدی ہونے کے اس وصول شدہ رقم سے حسب توفیق ''مسجد لندن'' اور دیگر چندوں میں حصہ لئے۔ چونکہ اس زمانے میں مسجد لندن کی تحریک ہورہی تھی۔

حیدرآباد کی شاہی عمارتیں

حضور نظام میر عثمان علی خاں کے دور شاہی میں حیدرآباد کی شاہی سرکاری عمارتوں کا سنگ بنیاد جیسے :ا۔ ہائی کورٹ ۲۔ سٹی کالج ۳۔ عثمانیہ ہسپتال ۴۔ شفاخانہ نظامیہ یونانی ۵۔ کتب خانہ آصفیہ ۶۔ ٹاون ہال وغیرہ کی سنگ بنیاد رکھی جاتی تو میں دوسرے کسی وقت جاکر خصوصیت سے یہ دعا کرتا کہ الٰہی اس عمارت سے تو اپنی مخلوق کو عموماً اور احمدیوں کو خصوصاً مستفید فرما۔ میری دعا کا خلاصہ یہ ہوا کرتا تھا۔

اسی زمانے میں حیدرآباد شہر میں الیکٹرک سٹی کے کام کا آغاز ہوگیا' جس شب کو لائٹ کا افتتاح ہوا میں اپنے مکان سے دعا کرتے ہوئے شہر کے محلوں کی ہر ہر بڑی سڑک سے گزرتے ہوئے تقریباً تالاب حسین ساگر چلا گیا اور غالباً تمام شب میری اس دعا میں گذرگئی کہ الٰہی جس طرح سے تو نے اس شہر کو الیکٹرک سٹی سے منور کیا ہے اپنے نور آسمانی سے ہر شہری کو منور کردے۔

ان دعاؤں کے سلسلے کی ابتداء اس غرض سے ہوئی کہ مجھے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ شہر حیدرآباد کے ہر محلے میں جو بڑی مسجد ہے اس میں جا کر محلے کے جملہ مساکین کے لئے خصوصیت سے اور پھر تمام اہلیان شہر اور پھر تمام سلطنت حیدرآباد کے لئے یہ دعا کرتا کہ الٰہی ان تمام کو دینی و دنیاوی' جسمانی و روحانی' جانی و مالی' علمی و عملی اور اخلاقی برکات سے بہرہ ور کر۔ آمین۔

مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری ......اور حیدرآباد

محترم سیٹھ عبداللہ الہ الدین صاحب کی بیعت کے بعد نہ صرف سکندرآباد و حیدرآباد میں' بلکہ ہر محلے میں جماعت احمدیہ کی تبلیغ کا شہرہ عام ہوا تمام ہندوستان اور یورپ و امریکہ میں ان کی شائع کردہ ہزار ہا ٹریکٹ و کتب کی وجہ سے جو مختلف زبانوں میں جیسے تلگو' گجراتی' انگریزی اور اُردو زبانوں میں شائع کر کے انجمن ترقی اسلام کے ذریعہ پھیلائے گئے سلسلہ کی تبلیغ ہوئی اور یہ کتب اور انجمن ترقی اسلام تبلیغ احمدیت کے لئے ایک فوجی میگزین کا کام دیتے رہتے ہیں۔ ان سے خوجہ سوسائٹی میں بھی بہت ہلچل مچ گئی۔ چونکہ جذبہ ہمدردی محترم سیٹھ صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ کبھی دیکھ ہی نہیں سکتے کہ جو نعمت الٰہی دین کی انھیں ملی ہے ان کے اہل خاندان اور برادری' قوم اور ملک والے اس سے محروم رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے اپنے گھر اور اپنے خاندان والوں کی بھرپور تبلیغ شروع کردی اور ساتھ ہی سکندرآباد کی جماعت اہل حدیث کو بھی اس خصوصیت سے تبلیغ شروع کردی کہ احمدی ہونے سے قبل سیٹھ صاحب محترم کے ہڈی کے کارخانے کے علاؤالدین افتخار کمپنی'' کے شرکاء نواب افتخار الدین اور جناب عبدالوہاب صاحب اہل حدیث تھے۔ جماعت اہل حدیث نے محترم سیٹھ صاحب کے مقابلے کے لئے یہ حرکت کی سیٹھ صاحب کے چھوٹے بھائی سیٹھ قاسم علی الہ دین صاحب کو جو صرف میٹرک تک تعلیم یافتہ تھے

اور مختصر اُردو انگریزی کی قابلیت تھی اور عربی دینیات سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے۔ جماعت اہل حدیث نے ان کو اپنا سرپرست بنالیا اور احمدیت کی تبلیغ کے مقابلے میں سیٹھ قاسم علی الہ دین سے طالب مدد رہے۔ چنانچہ اہل حدیث افراد نے مشورہ کر کے جماعت احمدیہ کے مقابلے کے لئے ۱۹۲۰ء میں مولوی محمد ثناء اللہ صاحب امرتسری کو معہ مولوی محمد صاحب گجراتی کے حیدرآباد بلوایا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کی آمد سے بہت قبل مقامی اخبارات کے ذریعہ پبلک میں مشہور کردیا کہ ''شیر پنجاب'' احمدیوں کے مقابلے کے لئے آرہے ہیں۔

جب مولوی ثناء اللہ صاحب حیدرآباد وارد ہوئے تو ان کو علاؤ الدین بلڈنگس سے متصل ایک وسیع احاطہ میں جہاں Y.M.C.A قائم تھی وہاں ٹھہرایا گیا۔ مولوی صاحب کی تشریف آوری کے روز ہی خان بہادر احمد الہ دین نے میرے ہاں اپنی موٹر کار مغرب کو بھیج کر مجھے یہ اطلاع دی کہ کل صبح ۷ بجے مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کو میں اپنے مکان پر گفتگو کے لئے بلایا ہوں۔ جماعت احمدیہ کی جانب سے صرف آپ کو بلواتا ہوں۔ آپ اپنے ساتھ ایک دو صاحبین کو لا سکتے ہیں لیکن گفتگو صرف آپ کو کرنی ہوگی۔ میری مرسلہ موٹر میں علی الصبح آجائیں۔ میں نے صرف مولوی بہاء الدین خان صاحب مرحوم کو ساتھ لے کر وہاں چلا گیا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ بھی صرف مولوی محمد صاحب گجراتی تھے۔

پہلی ملاقات جو الہ دین بلڈنگ میں ہوئی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کی طرف میں نے فراخ دلی کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مولوی ثناء اللہ صاحب نے اپنے ہاتھ کو کھینچتے ہوئے یہ کہا کہ میں احمدیوں سے اس لئے مصافحہ نہیں کرتا کہ احمدی بعض اوقات اپنے ہاتھوں میں 'ال پن' باندھ کر چبھا دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ کہہ کر مسکرا کر اثر ڈالنا چاہے' لیکن جب ناظرین نے یہ دیکھا اور سامعین نے یہ سنا ان پر مولوی صاحب کی تنگ دلی کا برا اثر ہوا۔ جب مجلس جمع ہوگئی تو تقریباً ایک سو مخصوص احباب سکندرآباد کے تھے' جن میں زیادہ تر الہ دین خاندان اور خوجہ سوسائٹی کے احباب تھے۔ مستورات کا بھی خاصہ انتظام تھا اس لئے کہ سیٹھ قاسم علی الہ دین نے مولوی محمد صاحب گجراتی کو محض مستورات کی خاطر بلوایا تھا کہ وہ گجراتی میں تبلیغ و تفہیم کر کے اثر ڈال سکیں۔ اولاً نواب احمد الہ دین خان بہادر نے سیٹھ عبداللہ بھائی' سیٹھ غلام

حسین الہ دین صاحب سیٹھ قاسم علی الہ دین صاحب اور سیٹھ الہ دین صاحب اور سیٹھ ابراھیم
صاحب اور اپنے تمام بال بچوں کو لے کر ایک طرف بیٹھ گئے ۔ مجھے اور مولوی ثناء اللہ صاحب کو
مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم تاجر لوگ ہیں ہمیں عربی' قرآن و حدیث سے کوئی خاص
واقفیت نہیں ہے ۔ ہمارے بڑے بھائی صاحب احمدی ہو کر ہمیں احمدیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور
ہمارے چھوٹے بھائی قاسم علی صاحب اہل حدیث ہو کر اپنے فرقہ کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ ہم آپ
دونوں کو اس لئے بلائے ہیں کہ صداقت کے ساتھ حق بات ہمارے سامنے بیان کریں ۔ تب
مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری نے بہ ایں الفاظ تقریر شروع کی کہ جس طرح کوئی بیرسٹر ہزار
روپے روزانہ لے کر مقدمے کی پیروی کرتا ہے میں اس سے بڑھ کر مذہبی خدمت کرتا ہوں ۔
میں اب ایسے طریقے سے مرزائیت کے جھوٹ کو بتلاؤں گا کہ آپ حیران ہو جائیں گے ۔ دیکھئے'
اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک ٹرنک کو بتا کر مسکراتے ہوئے یہ کہا کہ اس تابوت میں ایسے ایسے
بم (یا اس قسم کے کوئی اور الفاظ کہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں) ہیں' جس سے مرزائیت کے قلعہ
کو مسمار کر دیا جا سکتا ہے ۔

سب سے پہلے آخری فیصلہ جو میرے اور حضرت مرزا صاحب کے درمیان ہوا اس کو
پیش کرتا ہوں' چنانچہ انہوں نے تفصیل کے ساتھ اخبار الفضل اور اخبار اہلحدیث کے حوالوں سے
پڑھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مرزا صاحب اور میرے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جھوٹا
سچے کے سامنے مر جائے گا ۔ چنانچہ مرزا صاحب آنجہانی میرے سامنے مر گئے اور میں ابھی تک
زندہ موجود ہوں ۔ خان بہادر اب آپ فیصلہ کریں ۔

اس کے بعد خان بہادر احمد الہ دین نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ اس کا کیا
جواب دیتے ہیں ۔ چونکہ میں اپنے گھر سے بالکل نہتہ اور خالی الذہن اس مجلس میں آ گیا تھا ۔
نہ میرے ساتھ کوئی کتاب تھی نہ کوئی اخبار میں اس آخری فیصلے کے رسالے کو' جس کو مولوی ثناء
اللہ صاحب پڑھ کر سنا رہے تھے ان ہی سے لے کر اپنی جانب سے جواب دیتے ہوئے یہ بتلایا
کہ اخبار ''اہل حدیث'' کے نائب ایڈیٹر نے یہ لکھا تھا کہ جھوٹے سچوں کے سامنے نہیں مرتے
بلکہ حرام زادوں کی عمر کی رسی دراز ہوتی ہے ۔ یہ چھاپ کر قادیان بھجوا دیا اور جب حضرت

مرزا صاحب کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اب فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے ۔ وہ جھوٹے
اور سچے میں فیصلہ کر دے گا ۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق ہی سچوں کو اٹھا لیا اور
حرام زادوں کے عمر کی رسی دراز کر دی ۔ اس بات کو میں نے بیان کرتے ہوئے اس رسالے
کے بعض مقامات سے یہ ثابت کیا کہ حضرت مرزا صاحب کے اور مولوی ثناء اللہ صاحب
امرتسری کے درمیان کوئی مباہلہ نہیں ہوا بلکہ یہ تصفیہ ہوا کہ جو بھی چاہے وہ دعا لکھ دیوے اور
فیصلہ خدا کے ہاتھ ہوگا ۔

جب یہ بات میں نے سامعین کو سمجھا دی اور نواب احمد الہ دین پر صداقت کا اثر ظاہر
ہونے لگا تو سیٹھ غلام حسین الہ دین ان کے منجھلے بھائی یہ سمجھ کر کہ کہیں بشارت احمد صاحب کی
تائید میں ان کے بھائی فیصلہ نہ کر دیں' اپنے بھائی سے کہا کہ آپ خدا کی قسم کھا کر اور بغیر کسی لحاظ
کے فیصلہ کریں تب خان بہادر احمد الہ دین نے جوش سے کھڑے ہو کر خدائے تعالیٰ کی قسم کھاتے
ہوئے یہ فیصلہ کیا ۔

''میں نے اب جو دونوں کے بیانات سنے ہیں اس لحاظ سے میں یہ فیصلہ
کرتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحب اور مولوی ثناء اللہ صاحب کے درمیان
کوئی Agreement اگریمنٹ Confirm کنفارم نہیں ہوا ۔''

اس فیصلے کو سنتے ہی مولوی ثناء اللہ صاحب اور جماعت اہلحدیث کے افراد اور سیٹھ قاسم علی
صاحب پر ایک موت طاری ہو گئی اور مولوی ثناء اللہ صاحب اپنے تابوت میں' اپنی تمام کتابیں رکھ
کر رخصت ہو گئے ۔ اس طرح یہ پہلا مباحثہ جو میرے اور مولوی ثناء اللہ امرتسری کے درمیان
ہوا ۔ خدا کے فضل سے جماعت احمدیہ کو اس میں کامیابی نصیب ہوئی ۔ میں نے اس جلسے کی
روئیداد اور خان بہادر احمد الہ دین صاحب کا فیصلہ لکھ کر اور ان کو سنا کر ان کے دستخط لے کر اخبار
''الفضل'' میں چھپنے کے لئے بھجوا دیا جو ۱۹۲۰ء کے فائل میں موجود ہے ۔

دوسرے روز بموجب اعلان عام مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقریر بوقت شب انھیں کی
قیام گاہ Y.M.C.A کمپونڈ میں ہوئی ۔ تقریباً سات ہزار جملہ فرقہ ہائے اسلامی کا اجتماع تھا ۔
ہماری جانب سے جو رپورٹرز بھیجے گئے تھے ان سے معلوم ہوا کہ انتہا سے زیادہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی

مخالفت ہوئی مولوی محمد صاحب گجراتی اور مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقاریر ہوئیں۔ حضرت مولانا میر محمد سعید صاحب کے مشورہ سے جوابی تقریر کے لئے مولوی حافظ عبدالعلی صاحب وکیل اور مولوی بہاؤالدین خاں صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب مچھلی بندری کی تقاریر میری صدارت میں ہونا طے پایا۔ جب پولیس سے اجازت کے لئے خان بہادر احمد الہ دین کے ذریعہ مجسٹریٹ کے ہاں درخواست بھیجی گئی تو احمد بھائی یہ پیغام لائے کہ مجسٹریٹ نے مجھ سے یہ کہا کہ رات کی تقریروں کی جو رپورٹ ملی اس سے مجھے سخت تکلیف پہنچی جو کہ فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے والی تقریر تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ لیکن احمد بھائی نے مجسٹریٹ سے کہا کہ میری سفارش اور اطمینان پر اجازت دی جائے' لیکن مجسٹریٹ نے انکار کر دیا۔ اس پر احمد بھائی نے کہا کہ مجسٹریٹ اب کسی جلسے کی اجازت آپ کو یا مولوی ثناء اللہ صاحب کو سکندرآباد میں نہیں دے گا۔ تب میں نے کہا کہ آپ نے ان کو اجازت دلوا کر ہمارے خلاف پبلک مقام میں تقریر کروادی اور اب حیدرآباد کی پبلک جواب سننے کے لئے شدت سے منتظر ہیں۔ اگر مجسٹریٹ صاحب Y.M.C.A کمپاونڈ میں اجازت نہ دیں تو آپ کی الہ دین بلڈنگ کا احاطہ جو اس سے متصل اور اسی قدر وسیع بھی ہے اور جو آپ کا مکان ہے یہاں اس کی جوابی تقریر کردوں گا۔ اس پر احمد بھائی الہ دین صاحب مکرر مجسٹریٹ کے پاس گئے اور جا کر اصرار کیا تو اس نے اس شرط پر اجازت دی کہ اگر دوران جلسہ کوئی شور و ہنگامہ ہوتو میں اولاً مقرر کو گرفتار کرلوں گا۔ اس پر بھی میں نے رضامندی کا اظہار کردیا......

یہ خبر جب مشہور ہوگئی تو جماعت اہل حدیث نے سکندرآباد کے شریر اور نشہ باز غنڈوں کو صدہا روپے دے کر اس بات کے لئے تیار کیا کہ احمدی جلسے میں شور وغل کر دیا جائے تا کہ احمدی مقررین گرفتار ہوجائیں۔ اعلان عام ہزار ہا اشتہارات کے ذریعہ ہمارے جلسے کی تشہیر کرائی گئی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے جلسے سے زیادہ تعداد میں مجمع ہوگیا۔ حسب پروگرام میری صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ لیکن مولوی حافظ عبدالعلی ایڈوکیٹ بروقت نہ آسکے۔ تب بجائے ان کے مولوی شیخ غلام محمد صاحب مبلغ قادیان جو ان دنوں سکندرآباد کی جماعت میں ٹھیرے ہوئے تھے ان کی تقریر شروع کروادی۔ انہوں نے تبلیغی مضامین کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا۔

اس کے بعد مولوی حافظ عبدالعلی صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ ایک تو وہ علالت اور بخار اور درد گوش کے باعث کچھ کمزور ہوگئے اور پھر پیغامی انجمن کی صدارت سے ان کو علیحدہ ہوکر اور ہماری جماعت میں داخل ہوکر تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا' جس کے باعث اختلافی مسائل بیان کرنے میں انہیں کچھ دشواری محسوس ہورہی تھی اور ان کے روبرو سامعین جو اعتراض کررہے تھے ان کے جواب کے لئے جب وکیل نے مطالبہ کتب کا شروع کردیا تو حاضرین جلسہ کے کناروں سے شور وغوغا شروع ہوگیا۔

خان بہادر احمد الہ دین صاحب کی اس روز کی ہمدردی کو میں تادم زیست نہیں بھول سکتا کہ ہماری جماعت پر انہوں نے کیا احسان کیا؟ وہ اور مسٹر بنرجی اور خان بہادر عبدالکریم بابو خاں صاحب کو لے کر میرے اسٹیج کے قریب ہاتھ میں ہاتھ ملا کر میری مدافعت کے لئے کھڑے ہوگئے اور میرے عقب میں اسٹیج پر ہماری جماعت کے احباب بکثرت تھے۔

جب مجلس کی حالت بے قابو ہونے لگی اور تقریباً نصف سے زیادہ حاضرین کھڑے ہوگئے تب سیٹھ محمد غوث صاحب اور مولوی بہاؤالدین خاں صاحب دونوں جانب سے میرے قریب آکر ان لوگوں نے مجھے کھڑا کردیا اور خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میں تقریر شروع کروں۔ تب میں تشہد اور سورہ فاتحہ پڑھ کر حاضرین مجلس جو قریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ تھا کہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر ٹھیر جانے کے لئے عرض کرتا تو آپ اسی جگہ کھڑے ہوجاتے تو میں آپ احباب کو بھی خدا اور اس کے رسول کا واسطہ دے کر یہ کہتا ہوں کہ آپ حضرات جو کھڑے ہوئے ہیں وہ بیٹھ جائیں اور میری تقریر کو اختتام تک خاموشی اور متانت کے ساتھ سنتے رہیں۔ چنانچہ جوں ہی میرے منہ سے کلمات نکلے تو جو احباب مجلس میں کھڑے تھے وہ فوراً بیٹھ گئے' تب میں نے قریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک جماعت اہل حدیث اور جماعت احمدیہ کے مابین جو مراسلت ہوتی رہی اور جس کے نتیجہ میں مولوی ثناء اللہ صاحب کی تشریف آوری ہوئی اور پہلے ہی روز جو احمد الہ دین صاحب کے بنگلے میں ان کا اور میرا مباحثہ ہوا یہ ساری روئیداد سناتے ہوئے آخر میں سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے ہزار ہا روپے کے انعامی چیلنج کو سنا کر میں نے محبت اور درد کے

ساتھ مجلس سے کہا کہ اب آپ لوگ ٹھنڈے دل سے اپنے گھروں کو جا کر سوچیں اور غور کریں۔
میری تقریر سے خدا کے فضل و کرم سے سامعین کے جذبات چونکہ ٹھنڈے ہو گئے تھے اور حقیقی
واقعات کے سننے کے بعد ان کے مخالفانہ جذبات دور ہو گئے تھے۔ لہٰذا جلسے کا اختتام نہایت
پرامن اور خیر و خوبی کے ساتھ ہوا اور بجائے شور و شرارت کے لوگ بہ امن و اطمینان
برخاست ہوئے۔

اس کے بعد قادیان کو تار دے کر مولوی عبدالرحمٰن فاضل مصری اور مولوی فضل دین
صاحب پلیڈر کو طلب کیا گیا۔ ایک روز علاؤ الدین بلڈنگ میں ایک تحریری مباحثہ کی مجلس منعقد
ہوئی۔ جس میں شہر کے مشہور علماء و مشائخین اور بیرسٹرز جماعت اہل حدیث کی تائید میں جمع
ہوئے۔ جماعت مولوی عبدالرحمٰن صاحب مصری اور مولوی ثناء اللہ صاحب کے درمیان تین
پرچے ہوئے جو بعد میں طبع کر دیئے گئے جو مباحثہ دکن کے نام سے طبع ہوئے۔ اس کے بعد
مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقاریر کا سلسلہ حیدرآباد میں شروع ہو گیا۔ تو اس کے جواب میں
حیدرآباد میں ایک جلسہ سیٹھ محمد غوث صاحب کے مکان واقع عثمان گنج میں میری صدارت میں
منعقد ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن فاضل مصری مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقاریر کے اعتراضات کے
جوابات تقریباً تین گھنٹے تک مسلسل دیتے رہے۔ مسجد عثمان گنج جو سیٹھ محمد غوث صاحب کے
مکان سے متصل ہے وہاں سے سنگباری شروع کر دی گئی جس کے باعث جلسے کو برخواست
کر دینا پڑا۔

بعد ازاں جماعت احمدیہ نے یہ انتظام کیا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کی جہاں تقریر ہو
اس تقریر کے اعتراضات کے جوابات تفصیلی رنگ میں دوسرے دن شائع کروا دیئے جائیں۔
چنانچہ اس کام کے لئے میں نے اپنے شناسا ''امیکا پریس'' کے مالک سے تصفیہ کر لیا کہ مولوی ثناء
اللہ صاحب امرتسری جب تک رہیں گے۔ پریس ہمارے لئے وقف کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس
پریس کے مالک کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے تقریباً ایک مہینہ پریس کو ہمارے لئے وقف
کر دیا۔ تمام شب ہزاروں کی تعداد میں ''ہینڈ بل'' طبع کر کے صبح سے تقسیم کرتے۔ میری شاپ
''احمدیہ بلڈنگ کمپنی'' کے سامنے میاں سیٹھ احمد حسین صاحب فرزند سیٹھ مومن حسین صاحب کی

دوکان تقسیم ٹریکٹ کے لئے مختص کر دی گئی تھی۔ پبلک آ کر وہاں سے ہینڈ بل وغیرہ حاصل
کر لیتی۔ اللہ تعالیٰ میاں احمد حسین صاحب کو جزائے خیر دے کہ اس زمانے میں شب و روز تقسیم
ٹریکٹ کا کام کیا اور اپنی تجارت کی طرف بہت کم توجہ کی۔

پھر حیدرآباد میں میرا مکان واقع چوک اسپاں ''بشارت منزل'' میں مولوی ثناء اللہ
صاحب اور ہمارے درمیان مباحثہ ہونے کی مراسلت شروع ہوئی۔ ان دنوں میری والدہ مرحومہ
مرض الموت میں مبتلا تھیں وہ کسی نقل و حرکت کے قابل نہ تھیں باوجود اس کے جب یہ تصفیہ ہوا کہ
میرے بڑے مکان میں مجلس مناظرہ منعقد ہو گی تو میری والدہ نے باوجود کمزور حالت ہونے کے
بھی ہمارے دوسرے مکان میں انہیں منتقل کرنے پر راضی ہو گئیں اور وہ لوگ میرے مکان پر
آئے اور مجھ سے گفتگو کر کے چلے گئے۔ لیکن کوئی مناظرہ اس سلسلے میں نہ ہوا۔

تقریباً ایک ماہ تک مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقاریر کا سلسلہ شہر کے مختلف حصوں میں
ہوتا رہا، جس کے جوابات ہماری جانب سے مطبوعہ دیئے جاتے تھے۔ تخمیناً ایک لاکھ ورقیہ کا
اندازہ کیا گیا۔ جو تقسیم کئے گئے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کی تقاریر کے نتیجے میں حیدرآباد کی عوام
سے لے کر سر کشن پرشاد وزیر اعظم بھی ان کی قیام گاہ جا کر ان سے ملاقات کئے۔ مولوی ثناء اللہ
صاحب جو اہل حدیث فرقہ کی حمایت کر رہے تھے لیکن ان کی جماعت احمدیہ سے خصوصی مخالفت
کے باعث جملہ فرقہ ہائے اسلامی نے بھی اپنی نمائندگی ان کے سپرد کر دی تھی۔ الغرض یہ ایام
ہماری جماعت کے لئے سخت آزمائش اور امتحان کے تھے۔ مگر خداوند تعالیٰ نے محض اپنے فضل و
کرم سے نہایت خیر و خوبی سے اختتام کو پہنچایا۔

ہماری جماعت کا کوئی فرد بھی ان کی تقاریر سے متاثر نہ ہوا البتہ ایک چیز ان کی آمد کے
سلسلے میں جو ہوئی میں اس کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جہاں کہیں مولوی ثناء اللہ صاحب کی
تقاریر ہوتیں تو اس جلسے میں مولوی ثناء اللہ صاحب کا مصنفہ رسالہ ''عقاید مرزا'' نامی تقسیم کیا جاتا
تھا۔ میرے دل میں زبردست تحریک ہوئی کہ ہمارے عقاید بھی لکھنا چاہئے۔ لہٰذا اس تحریک کے
نتیجے میں عقاید احمدیہ کے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ دو ماہ کی محنت کے نتیجے میں ''عقاید احمدیہ''
رسالہ کی تالیف کی۔ ایک غیر احمدی معزز حکیم صاحب جن کا نام اس وقت میں بھول رہا ہوں ان

کی میرے ہاں آمد و رفت تھی اور وہ میرے زیر تبلیغ تھے بوجہ علالت والدہ میں ان کے بستر علالت
کے قریب رہتا تھا تو اس رسالے کی تالیف کا جملہ کام بالکل ان سے قریب کے کمرہ میں کرتا رہا
اور اس کام میں، میں حکیم صاحب سے بھی حوالہ جات نکالنے کی مدد لیتا تھا۔ ابھی یہ رسالہ مکمل نہیں
ہونے پایا تھا کہ حکیم صاحب نے نہایت اخلاص وعقیدت کے ساتھ پر جوش لب و لہجے سے یہ کہا
کہ اب تک باوجود میرے اصرار کے آپ مجھے بیعت سے روکتے رہے کہ میں اور بھی تحقیق
کرلوں، لیکن اب ان تمام کے مواد کے دیکھنے کے بعد میں بیعت سے رک نہیں سکتا۔ چنانچہ میں
ماہ صیام کی ۲۷ کو ان کو حضرت مولوی صاحب کے پاس لے گیا اور بیعت کرائی۔ اب وہ فوت
ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

عقاید احمدیہ کی تالیف وتصنیف مولوی ثناء اللہ صاحب کی آمد کا ایک مفید نتیجہ ہے اب
تک اس کے بہت سارے ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہتوں کے لئے یہ
کتاب نفع کا موجب ہوئی۔

حضرت نصرت جہاں بیگم صاحبہ زوجہ حضرت مسیح موعودؑ کے تعلق سے

محترمہ امتہ اللہ بشیر صاحبہ زوجہ سید بشارت احمد صاحب کی حسین یادیں

امان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار — گلچیں بہار تو زواماں گلہ دارد

ایک مدت سے مجھے خیال تھا کہ حضرت ام المومنین سلمہا کے شمائل پر میں اپنے دیرینہ
ذاتی مشاہدات لکھوں مگر یہ دیکھ کر سلسلہ کے سارے زبردست اہل قلم کبھی بھی آپ کی سیرت پر
کوئی خامہ فرسائی نہیں کرتے ہیں، اس لئے میں بھی اپنی جگہ دم گھونٹ کر خاموش ہو رہی مگر اب
جبکہ ہمارے قابل قدر بھائی مولوی محمود احمد صاحب عرفانی (اللہ تعالیٰ آپ کی صحت و عمر میں
برکت دیوے) نے اس مبارک کام کے لئے اخباری دنیا میں غلغلہ مچا دیا تو میں بھی اپنے دیرینہ
شوق کے مدنظر واقعات سپرد قلم کرتے ہوئے ڈر رہی ہوں کہ کہیں میرے اس مقالہ کو ناظرین و
ناظرات حضرت عالیہ کا ایک مکمل خاکہ زندگی ہی تصور نہ فرمالیں۔ اس لئے میں نے ایک فارسی

شعر زیب عنوان لکھا ہے۔ جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ میری ممدوحہ کی سیرت وحسن اخلاق کے
تذکرے بہت کثیر ہیں۔ میں ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ مجھے خود اپنی تنگ نظری صاف طور پر محسوس
ہوتی ہے البتہ ممدوحہ کے شمائل میں سے کچھ وہ بھی اپنے ذوق ونقطۂ نگاہ سے پیش کرنا چاہتی
ہوں۔ یوں تو عاجزہ کو اب تک قادیان شریف میں ۸۔۱۰ مرتبہ سے زیادہ مرتبہ حاضر ہونے کی
سعادت نصیب ہوئی، لیکن غالباً دو مواقع ایسے آئے کہ خاندان سمیت کافی طویل عرصہ تک مجھے
قادیان جنت نشان میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک تو ۱۹۲۰ء میں جب کہ حیدرآباد میں
میری خوشدامن سردار بیگم صاحبہ مرحومہ کے اصرار پر سید صاحب میرے شوہر نے (سید بشارت
احمد صاحب) ہم تمام کو لیکر تقریباً ۴ ماہ قادیان شریف میں حضرت ام المومنین سلمہا کے قدمیوں میں
گزارے تھے۔ پھر دوبارہ ۳۶۔۱۹۳۵ء میں تقریباً ایک سال میں اپنے جملہ متعلقین کے قادیان
شریف میں گزاری۔ ان ہر دو مواقع پر عاجزہ کو قریب سے حضرت ام
المومنین سلمہا اور خاندان نبوت کی تمام محترم و قابل عزت ہستیوں کو دیکھنے کی عزت حاصل رہی۔
میں بوجہ ایسے خاندان سے قریبی ربط رکھنے کے جو کہ مرشدی گھرانہ کہلاتا ہے۔ اس امر سے زیادہ
واقف اور باخبر تھی کہ عموماً مشائخین سجادہ نشینوں کے گھروں کی معاشرت وطرز معیشت وطریق
تہذیب وتمدن ولباس کا رنگ ڈھنگ بات چیت کا طور وطریق کیسا ہوتا ہے۔ میرے والد مرحوم
حضرت مولانا میر محمد سعید صاحبؓ قادری احمدی مرحوم (خدا تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے)
ایک جید مشائخ کا حلقہ دو، تین لاکھ سے کم نہ تھا۔ اسی طرح میرے ننہیالی قریبی رشتہ کے نانا
حضرت مسکین شاہ صاحب نقشبندی جو مرحوم اعلیٰ حضرت نظام دکن اور حیدرآباد کے ملک کے پانچ
لاکھ مریدین کے مرشد تھے۔ نیز میرے سسرال رشتہ داروں میں مولوی سید عمر علی شاہ صاحب مکی
میاں صاحب وغیرہ جو میرے چچا خسر تھے بڑے مرشد تھے۔ اس لئے فطرتاً اس ماحول کو جس
سے میں بہت حد تک مانوس و واقف تھی خاندان نبوت میں قیاس کرنے پر مجبور تھی مگر میرے ذاتی
مشاہدات نے میری تمام قیاس آرائیوں پر پانی پھیر دیا۔ مجھے نہ ام المومنین میں اور نہ خاندان نبوۃ
کی کسی خاتون میں یہ بات نظر آئی کہ وہ گفتگو و ملاقات میں کسی قسم کا تکلف کرتی ہیں یا بناوٹ کا
پہلو اختیار کرتی ہیں یا کوئی خاص قسم کا مشائخانہ یا صوفیانہ لباس زیب تن فرماتی ہیں یا دنیاوی زیب

وزینت واشیاء سے اس قدر متنفر ہیں کہ گویا رہبانیت اختیار کر رہی ہیں' بلکہ حضرت ام المومنین اور
خاندان نبوت کے اس پاکیزہ و بے ریا عمل کا اس قدر گہرا اثر ہر غائر نظر سے دیکھنے والے پر پڑتا
ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان پاک قلوب کے آئینہ میں ریا و بناوٹ میں خود کو ملوث دیکھتا ہے۔ مجھے
خوب یاد ہے اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے اپنی خوشدامن صاحبہ مرحومہ کی
زندگی میں ایک انقلاب عظیم محض حضرت ام المومنین کے فیض صحبت کی وجہ سے دیکھا۔ وہ یہ کہ
میری خوشدامن صاحبہ ایک بڑے امیر کبیر گھرانے کی خاتون تھیں جو ۲۷ سال میں ہی تین لڑکے
اور ایک لڑکی کی ماں ہو کر بھرپور جوانی میں بیوہ ہو گئیں تو انہوں نے اپنی جوانی اور بیوگی کو اس قدر
سادگی اور صوفیانہ رنگ میں گزارا کہ جب میری شادی ہوئی اور ان کے خاندانی طمطراق اور خدم و
حشم اور امارت کے مدنظر ان کو معمولی لباس میں ملبوس دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی' مگر جب کہ
میری ہی خوشدامن صاحبہ مرحومہ حضرت ام المومنین کی صحبت میں چند ماہ رہیں تو یہ دیکھا کہ کوئی
دن ناغہ ہوتا تھا کہ وہ اس ضعیفی میں کنگھی چوٹی کر کے پاک وصاف لباس اور خوشبو وغیرہ کا استعمال
کر کے حضرت ام المومنین کی خدمت میں روزانہ جایا کرتی ہوں اور اس کے بعد اس انتقال تک
میں نے مرحومہ کو دیکھا سابقہ اس دنیا دارانہ صوفیانہ طرز زندگی کو بالکل خیر باد کر کے متقیانہ رنگ
میں اما بنعمت ربک فحدث کے ماتحت حسب ضرورت عمدہ لباس وغیرہ پہنا کرتیں چنانچہ حضرت ام
المومنین پر بھی یہ امر جب ظاہر ہوا تو وہ بہت مسرور ہوئیں' چنانچہ جبکہ ہماری خوشدامن صاحبہ کا
انتقال ہوا تو حضرت ام المومنین نے ان کی اولاد کے نام ایک تعزیت نامہ اپنی انتہائی کرم فرمائی
سے جو فرمایا اسمیں وہ میرے شوہر مولوی بشارت احمد صاحب و میرے دیور مولوی حکیم میر سعادت
علی صاحب مرحوم کو تحریر فرماتی ہیں کہ:

عزیزان من سلامت رہیں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے عزیز نامہ سے یہ سن کر از حد تاسف ہوا کہ آپ کی والدہ صاحبہ اور ہماری مخلص
اور اخلاص مند خاتون نے داغ جدائی دیا۔ اللھم اغفرھا مرحومہ بہت اخلاص مند احمدی خاتون
تھیں۔ ان کی علالت کی حالت میں بھی دعائیں کیں' مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے پیارے ہر طرح آرام

وراحت میں رکھنے پسندیدہ ہیں' گو ہمارے لئے وہ جدا اور نظروں سے پوشیدہ ہیں' مگر بیٹوں کے
ہاتھوں سپرد خاک ہو کر مقام اعلیٰ کو پہنچ گئیں۔

خدائے ذوالجلال نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا اور آخر جو ملا ہے وہ بچھڑے گا۔ چند روز بعد
ہم بھی ان سے ملاقی ہونے والے ہیں۔ مرحومہ مغفورہ اپنے اخلاق حسنہ اور نیکی و تقویٰ کے
باعث ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اور اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کے باعث اجر عظیم عنایت کرے
گا اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے گا باقی رہا اولاد کے لئے جُدائی کا صدمہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو سب
سے زیادہ پیار رکھتے ہیں وہ کبھی غم زدہ نہ ہونے چاہئے۔ اس پیارے پر سب پیارے قربان ہیں۔

اب دعا ہے کہ خداوند کریم مغفورہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دیوے اور جنت کے اعلیٰ
مقامات کا وارث بنائے ہم کو جملہ متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔ والسلام

آپ کی ہمشیرہ[1] بہوؤں سے خاص اظہار ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو مرحومہ کے
نیکیوں کا وارث بنادے اور صبر جمیل کی توفیق عطا فرمادے۔

از قادیان دارالامان' — والدہ مرزا محمود احمد
۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء — خلیفۃ المسیح علیہ السلام

در حقیقت میری خوشدامن نے جب سے حضرت ام المومنین کو دیکھا ان کے اخلاص
ایک رنگی میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ حضرت ام المومنین کی عاشق و فدائی تھیں' چنانچہ
ایک واقعہ اسی ضمن میں درج کرتی ہوں۔ اگرچہ حضرت ممدوحہ کا وہ مکتوب اس وقت دستیاب نہیں
ہوا' مگر اس کا مفہوم یاد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت خوشدامن صاحبہ کے مرض الموت میں جو ۱۰ ماہ
کی طویل علالت کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد کے ایک محترم احمدی نواب اکبر یار جنگ بہادر نے میری
نند مسماۃ حاجی بیگم مرحومہ کے لئے اپنا پیغام دیا تو حضرت خوشدامن صاحبہ محض اس وجہ سے متامل
ہو گئیں کہ چونکہ نواب صاحب ایک تو پٹھان ہیں' دوسرے غیر ملکی ہیں' ممکن ہے بعد وظیفہ حسن
خدمت اپنے وطن فرخ آباد کو میری لڑکی کو نہ لیجائیں۔ تب سید صاحب نے حضرت ام المومنین کی
خدمت میں عریضہ لکھا جس پر حضرت ام المومنین نے خوشدامن صاحبہ کو خط تحریر فرمایا۔ اس کا

---
[1] حاجی بیگم صاحبہ اور عاجزہ اور شرف النساء بیگم صاحبہ اہلیہ حکیم صاحب مرحوم

مفہوم یہی تھا کہ میں یہ مناسب سمجھتی ہوں کہ آپ اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں یہ کام کردیں تا کہ آپ کو اطمینان نصیب ہو۔ پس جونہی حضرت ام المومنین کا یہ مکتوب بستر علالت پر سنایا گیا بلاکسی پس وپیش کے فوراً اسی ہفتہ میں رخصتانہ کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی مرحومہ کے اخلاص اور حضرت ام المومنین کے اس ارشاد پر عمل کے نتیجہ میں ایک عمدہ پھل یہ عنایت فرمایا کہ میری نند مرحومہ کو ایک اولاد نرینہ پیدا ہوئی جو کہ اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ سردار محمود رشید الدین خاں طولعمرہ ایک ۱۹ سالہ نوجوان ہے جو علیگڑھ میں ایف' اے[1] کلاس کا طالب علم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو صالح مبلغ اسلام و خادم اسلام بنائے۔ آمین

طعام ولباس کے متعلق:

حضرت ام المومنین کی معاشرت برخلاف گدی نشینوں اور مشائخین کے ٹھیٹھ اسلامی سادگی پر مبنی ہے' آپ کے ہاں جو ہر وقت مخلصین تحائف پیش کرتے ہیں اور آپ انہیں قبول فرماتی ہیں۔ اگر تحفہ کھانے کی قسم سے ہے تو کھالیتی ہیں۔ اگر کپڑے کی قسم سے ہے تو انہیں پہن لیتی ہیں' اگر زیور کی قسم ہو تو زیب تن فرماتی ہیں' یہاں تک کہ اس عمر میں اگر پیش کرنے والے مخلصین رنگین وشوخ کپڑے بھی پیش کریں' تو بھی آپ قبول فرمالیتی ہیں محض پیش کرنے والے مخلصین کے اخلاص ومحبت کے پیش نظر وہ اپنے آپ کو ایک مجاہدہ میں ڈال لیتی ہیں تا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ ریا و نام ونمود سے کوسوں دور ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کبھی وہ فاخرہ لباس زیب تن فرماتی ہیں اور کبھی تھوڑی دیر بعد ہی بالکل سادہ لباس میں آجاتی ہیں' کبھی معمولی زیور پہن لیتی ہیں کبھی نہیں پہنتیں' کبھی دیکھا کہ وہ غربا کے ہاں کھانوں کے حصے بھیج رہی ہیں اور مسکینوں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی فرمارہی ہیں' یہاں تک کہ اپنے عزیز سے عزیز چیز کو دوسروں کے فائدہ کے لئے قربان کرتی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ اس معاشرہ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ آپ کی طبیعت میں رہبانیت کا میلان ہے اور نہ ہی تکلف' ریاکاری کی جھلک ہے' جیسا کہ عام طور پر مشائخوں کے گھرانوں میں ہوتا ہے کہ محض ریا وعوام کی نکتہ چینی کے مدنظر

[1] اب بی۔ اے میں ہے۔ بعد میں وہ ممبر آف پارلیمنٹ رہے۔ ان کی شادی حضرت سیٹھ الہ دین صاحب کی چھوٹی صاحبزادی ہاجرہ بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی۔

وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے بھی مستفید نہیں ہوتیں۔

ملاقات کے وقت بالعموم مشائخین کی جانب سے یہ عمل ہوتا ہے کہ ریاکاری کی وجہ سے منہ سے بہت سے غیر ضروری بناوٹی الفاظ نکال دیں گے کہ بیٹا تم کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور بہت دنوں کی آرزو پوری ہوئی وغیرہ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ بے رخی و بے مروتی سے بات کریں گے۔ یہ دونوں طریق افراط تفریط کے پہلو لئے ہوئے ہیں اور حضرت ام المومنین ملاقات کے وقت حفظ مراتب کا خیال فرماتی ہیں اور جیسا اخلاص ملنے والے میں محسوس فرماتی ہیں اسی مناسبت سے ملاطفت کے ساتھ اس سے ملاقات فرماتی ہیں۔ نہ تو ظاہرداری کے الفاظ فرماتی ہیں اور نہ کسی سے بے مروتی سے پیش آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسا رعب عطا فرمایا ہے کہ ملاقاتی اس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جائز تعظیم وادب کرنا اس کا حق ہوتا ہے۔

حضرت ام المومنین ایک بہت بڑے کنبہ کے سرپرست اعلیٰ ہونے کی حیثیت میں ایک بڑی مشغول زندگی گزارتی ہیں۔ باوجود اس کے آپ بڑی ذکی الحس واقع ہوئی ہیں۔ ملاقاتی کے بشرے سے جان لیتی ہیں کہ وہ کس حال میں ہے' چنانچہ اس بارے میں میں ہی اپنے آپ ایک مثال ہوں۔ میری والدہ ماجدہ مرحومہ جن دنوں قادیان میں سخت علیل تھیں۔ زیست کی امید کم ہوتی جارہی تھی' میں عالم بدحواسی میں حضرت ام المومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوتی تو وہ فوراً پہچان لیتیں اور مجھے اپنے ہاں سے کھانا کھلا کر روانہ کرتیں۔

میری والدہ جب علیل تھیں تو بوجہ مسافرت انہیں بان کی چارپائی پر لٹایا گیا تھا۔ حضرت ام المومنینؓ جب عیادت کے لئے تشریف لائیں تو دیکھا کہ چارپائی بان کی ہے' اپنے گھر پہنچیں تو فوراً ایک سوت کی بنی ہوئی نفیس چارپائی روانہ فرمائیں' یہ ذرہ نوازی کا اعلیٰ نمونہ ہے اور ممدوحہ کی درازی عمر کے لئے بے اختیار دعائیں نکلوانے کا موجب۔

بیکاری سے بیزاری:

حضرت ام المومنینؓ عورتوں میں بیکاری کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کا یہ مسلک رہا ہے کہ کبھی بیکار نہ رہیں اور نہ کسی اور کو بیکار رہنے دیں۔ چنانچہ مجھ سے بھی حضرت ممدوحہ نے کارچوبی بٹوے بہت سارے سلوائے تھے۔ غرض آدمی جو کام جانتا ہو اس کام پر اس کو

لگا دینا وہ بہت ضروری خیال کرتی ہیں[1]۔ صاحبزادی امت الحمیدہ بیگم صاحبہ کی شادی کے موقع پر یہ روح عملاً کام کرتی ہوئی دکھائی دی ۔ صاحبزادی موصوفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کی لڑکی ہیں جو حضرت مبارکہ بیگم صاحبہ کے صاحبزادے میاں محمد احمد خاں صاحب سے بیاہی گئی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت خلیفہ رشید الدین صاحب کی صاحبزادی غالباً حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی سالی صاحبہ نے حضرۃ ام المومنین سے عرض کیا کہ امتحان کی کامیابی کے لئے دعا فرماویں۔ آپ نے جواب دیا کہ ہمارے لئے ایک تکیہ کا غلاف تیار کر کے روانہ کرو۔ یہ طریق تعلق کی زیادتی کے لئے بزرگان دین کرتے رہے ہیں' آپ نے بھی ایسا ہی فرمایا۔

تہذیب وشائستگی:

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی' ایسا اتفاق ہوا کہ ایک خاندان نبوت کی خاتون میری طرف سے گزریں اور چلتے چلتے نادانستہ طور پر ان کی اوڑھنی مجھے لگ گئی' حضرت ام المومنین نے اس کو دیکھ لیا اور اس معمولی فروگذاشت پر ہی کافی چشم نمائی فرمائیں ۔ میں ندامت سے عرق عرق ہوئی کہ میری وجہ سے اس محترمہ خاتون کو یہ باتیں سُننی پڑیں اور جب کہ یہ واقعہ قلمبند کر رہی ہوں تو بھی میری پشیمانی کی کوئی حد نہیں ۔ اس سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لڑکیوں کی تربیت کا خیال حضرت کو کس درجہ ہے وہاں آپ کی تہذیب و شائستگی کے خلق اتم کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے ہاں تو عام طور پر مجلسوں میں شانہ کو شانہ اور مونڈھے کو مونڈھا ٹکراتا ہے' مگر کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور اس کو سادگی پر محمول کیا جاتا ہے۔

میرے شوہر (مولوی سید بشارت احمد صاحب) جب مجھے قادیان میں چھوڑ کر حیدر آباد واپس ہونے لگے تو حضرت ام المومنین سے یہ التماس کی کہ وہ عاجزہ کو اپنی نگرانی میں رکھیں اور عرض کیا کہ سوائے آپ کی اجازت کے عاجزہ کسی دعوت میں شریک ہو اور نہ کہیں مہمان جائے۔ حضرت ام المومنین نے اس کو قبول فرما لیا اور بہت پسند فرمایا' جتنے دنوں میں وہاں رہی میرا وہ خاص خیال

[1] میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عورتیں بیکاری میں اکثر غیبت و بیجا شکایات میں مبتلا رہتی ہیں تو کچھ نہ کچھ کام میں لگ جانے سے بدعات جاتی رہتی ہے۔

فرماتیں ۔ کئی مواقع ایسے آئے کہ انہوں نے بعض جگہ دعوتوں میں شریک ہونے سے روکا اور بعض میں شرکت کی اجازت عطا فرماتیں' تو اکثر ایسا ہوا کہ مجھے پہلے روانہ کر دیتیں' تھوڑی دیر بعد دیکھتی کہ وہ خود بھی تشریف لاتیں ہیں۔ ایک دفعہ حضرتہ نے دریافت فرمایا کہ فلاں جگہ تم کیوں گئیں تھیں' عاجزہ کے عرض کرنے پر کہ کہیں نہیں گئی تھی' فرمایا کہ برقعہ تو تمہارا یا تمہارے جیسا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس کام کو وہ اپنے ذمہ لیتیں اس کو کس خوبی سے نباہ لینے کی عادی ہیں۔

ایک دفعہ دیکھا کہ چرخہ لیکر تاگا کات رہی ہیں۔ میں جب حاضر ہوئی تو فرمایا کہ کیا تمہیں چرخہ کاتنا آتا ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں' تو پھر آپ نے مجھے اپنے آغوش میں لیکر مجھے سکھلایا۔ اس میں آئندہ نسلوں کو یہ سبق ہے کہ بیکار نہ رہیں اور کوئی نہ کوئی مفید کام کرتے رہیں' یا ممکن ہے کہ زمانہ ایسا پلٹا کھائے کہ ہم میں سے اکثروں کو چرخہ کاتنا پڑے۔

حضرت مسیح موعودؑ اور آپ کے خلفاء پر راسخ ایمان:

باوجود اس کے کہ آپ حضرت مسیح موعود کی چہیتی بیوی اور حرم محترم ہیں' لیکن اس تعلق زوجیت سے بڑھ کر حضرت ام المومنین اپنے تعلق' روحانیت کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ جیسا کہ ہم وابستگان دامن مسیح موعودؑ جس طرح اور جن القاب سے حضرت مسیح موعودؑ کو یاد کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی ادب سے یاد فرماتی ہیں جب کبھی بھی وہ حضرت صاحب کا ذکر فرمائیں گی تو حضرت مسیح موعودؑ حضرت صاحب یا حضرت اقدس فرمائیں گی ۔ اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کو بھی یا تو میاں صاحب کہیں گی یا خلیفۃ المسیح فرمائیں گی۔

آپ بالعموم جب سیر کو تشریف لے جاتی ہیں تو جاتے جاتے یا آتے آتے احمدی اصحاب کے گھروں میں ایک ایک' دو دو منٹ کے لئے تشریف لیجاتی ہیں اور ہر گھر ان کے مناسب حال ضروری ہدایات دے آتی ہیں۔ مثلاً گھروں کی صفائی' لباس کی صفائی' بچوں کی دیکھ بھال یا علاج معالجہ کے متعلق مشورہ دے دیتی ہیں۔ اس طرح آپ جماعت کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش فرماتی ہیں اور حسب ضرورت و جائز و ضروری امداد و ہمدردی میں مصروف رہتی ہیں۔

اسراف سے اجتناب:

میں نے دیکھا ہے کہ آپ کی طبیعت باوجود بے انتہا سخی ہونے کے پھر بھی ذرہ سے اسراف سے اجتناب کرتی ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی کپڑے کے رنگنے کے لئے نمک شریک کرنے کی ضرورت ہوئی۔ نمک منگوایا اور رنگ میں شریک کرنے کے بعد جو بچ گیا وہ ایک چٹکی ہوگا جس کو ہم یونہی پھینک دیتے ہیں، مگر نہیں آپ نے اپنے دست مبارک سے وہ چٹکی بھر نمک نمک دانی میں ڈال کر محفوظ کر دیا اور ضائع نہ ہونے دیا۔ اس کا میرے دل پر خاص اثر ہوا۔

یہ ایک عجیب بات مشاہدہ میں آئی کہ حضرت ام المومنین کسی مخلص کو جزاکم اللہ فرمادتیں تو وہ اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فیض کو تمام جماعت احمدیہ کے لئے عام کرے اور اس عاجزہ کو بھی اس سے خاص حصہ ملے۔ آمین۔

میرے زمانہ میں عید الضحیٰ وعید الفطر کے موقع پر میں نے دیکھا کہ حضرت ام المومنین ہمہ تن مصروف انتظام ہیں۔ خود بھی کام کر رہی ہیں اور دوسروں سے بھی کام لے رہی ہیں۔ گھر کے ایک ایک حصہ کو التزام کے ساتھ صاف کر رہی ہیں۔ تمام اشیاء کو جھنکوا رہی ہیں، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مٹی کے برتنوں کو بھی لال گیرو کے رنگ سے رنگ دے رہی ہیں۔ عیدین کے مواقع پر بڑی خوشی کا اظہار فرماتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عید اسی لئے بنائی ہے کہ مومنین خوش ہوں۔

حضرت ام المومنینؓ کو خوشبو سے بڑی الفت و رغبت ہے۔ دکن کی اگربتی و برکھی شوق سے استعمال فرماتی ہیں۔ یہ آپ کے طہارت نفس کی کافی دلیل ہے، جتنے نیک و پاک بندگان خدا ہوتے ہیں ان سب کو بہ اتباع سنت یہی طریق عمل اختیار کرنا پڑتا ہے۔

باوجود اس کے کہ میں ایک طویل زمانے تک خدمت میں حاضر رہی، لیکن مجھے وہ اپنا مہمان ہی خیال فرماتی ہیں اور ہر طرح کی تواضع و اکرام کا اظہار فرماتی رہیں اور جب سالانہ جلسہ کے موقع پر مجھے جلسہ گاہ جانا ہوتا تو آپ موٹر میں مجھے بھجوا دیتیں۔

میرے باغ کا پھلنا پھولنا:

میں نے حضرت ام المومنینؓ کی خدمت میں ایک مرتبہ اپنے باغ کے پپیتے[1] اور لال[2] موز بطور تحفہ پیش کئے تھے۔ آپ نے قبول فرمایا اور اسی وقت تناول فرمایا اور دعا دی اور میں دیکھتی ہوں کہ اس کے بعد سے میرا باغ اتنا ثمرور ہوا کہ پہلے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا بالخصوص پپیتے کے درخت پر اب مختلف قسم کے صدہا کی تعداد میں پھل نصیب ہوگئے ہیں۔ پہلے سے دگنی تگنی آمدنی ہونے لگی۔ میرا ایمان ہے کہ حضرت ام المومنینؓ کی دعا کی برکت ہے، خدائے تعالیٰ مجھے حضرت کی دعائیں لینے کے مواقع عطا فرمائے۔ آمین۔

صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب سے محبت:

یوں تو خاندان کے بنیادی فرد ہونے کی حیثیت میں آپ ہر فرد خاندان سے محبت والفت سے پیش آتی ہیں لیکن صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب اپنے بڑے پوتے سے خاص الفت ہے۔ ایک مرتبہ عاجزہ کو صاحبزادہ صاحب کا مکان لیجا کر بتلایا جو کہ حضرت نے تعمیر کروایا ہے۔ آپ نے اس مکان کے بالائی حصہ پر بیت الدعاء بتلا کر فرمایا کہ میں نے تبرکاً حضرت مسیح موعودؑ کے گھر کی ایک اینٹ مکان کے بالائی حصہ میں لگوادی ہے۔ حضرت کا یہ جذبہ عقیدت حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت کی ہزار دلیلوں سے بڑھ کر ایک دلیل ہے۔

شادی وغمی کے نظارے:

میرے قادیان کے قیام کے دوران میں کئی مواقع ایسے آئے جن میں مجھے حضرت ام المومنینؓ کی وساطت سے شادی وغمی کے نظارے دیکھنے نصیب ہوئے۔ حضرتہ صاحبزادی امۃ الحمید بیگم صاحبہ کی شادی کی تقریب جو نواب محمد علی خان صاحب مالیر کوٹلہ کے صاحبزادہ سے ہوئی ساری کی ساری میرے سامنے عمل میں آئی ہے[3] میں سچ کہتی ہوں کہ جس انتہائی سادگی و بردباری کے ساتھ تقریب عمل میں آئی اس کا نشان کچھ تیرہ سو سال پہلے میں ہی ملتا ہے۔ اسی

۱۔ ارنڈ خربوزہ ۲۔ لال کیلا ۳۔ آپ نے خصوصیت سے اس شادی مبارک شادی کی شرکت کے لئے کئی ماہ روک لیا تھا

طرح کئی دفعہ تعزیت کی تقریبیں آئیں' یہاں بھی اس حد تک رنج وغم جتنا کہ خدا کے احکام اجازت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں علم اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن میں یہاں یہ مشاہدہ کرتی ہوں کہ علم اور عمل میں مطابقت پیدا کی جارہی ہے۔

اگرچہ ذاتی طور پر مجھے حیا آتی ہے کہ میں ظاہر کردوں لیکن حضرت ام المومنین کے ایک خُلق کا اظہار اس حیا پر غالب آرہا ہے۔ اس لئے عرض کرتی ہوں جس وقت حیدرآباد سے میرے شوہر قادیان شریف لائے اور حضرتہ ام المومنین کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے مبارکباد دی کہ تمہارے شوہر آگئے۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بیویوں پر خاوندوں کی عظمت ظاہر ہو۔

جس وقت کوئی مخلص خاتون یہ عرض کرتی کہ میں آپ کی خدمت میں فلاں تحفہ بھیجنا چاہتی تو آپ قبول کرتے ہوئے سادگی سے کبھی فرمادیتی ہیں کہ فلاں وقت تک جو بھیجنا ہو بھیج دو۔

اچھے ناموں سے یاد کرنا: حضرت ام المومنینؓ کی یہ عادت شریف ہے کہ آپ اپنے ملنے والوں کو خواہ وہ چھوٹی ہیں یا بڑی عمر کی ان کے اچھے ناموں سے یاد فرماتی ہیں' برے مختصر ناموں سے نہیں یا فرماتیں۔ مثلاً میری خوشدامن صاحبہ مرحوم مجھے دلہن پاشاہ کے نام سے بلاتی تھیں اور حضرت ام المومنینؓ نے اسے سن لیا تو خود بھی اپنی شفقت سے دلہن پاشاہ ہی فرمایا کرتی ہیں۔

حضرت نانی جان مرحومہ کی زندگی کا واقعہ ہے کہ حضرت ام المومنینؓ ایک دفعہ حضرت نانی صاحبہ کے ہاں تشریف لے گئیں اور ہم سب حضرت میر ناصر نواب صاحب کو جو ام المومنینؓ کے والد بزرگوار تھے امت کے نانا جان تصور کرتے تھے۔ ان کے مکان پر گئے۔ پس کہ ہم مہمان کی خدمت اور خاطر وتواضع کے لئے حضرتہ نانی جان صاحبہ نے حضرت ام المومنینؓ کو ارشاد فرمایا کہ بیٹا ان مہمانوں کی تم خاطر کرو تو میں نے دیکھا کہ اس خدمت میں ام المومنینؓ ایسی مصروف ہوگئیں گویا کہ آپ اس گھر کی منتظمہ ہیں۔ ایک ایک مہمان کے آگے پان سپاری نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش فرماتی رہیں اور مہمانوں کو خوش کرتی رہیں۔ ماں کی اطاعت کا یہ جذبہ کس قدر خلق عظیم ہے۔

حضرت ام المومنینؓ عبادت کے بروقت ادا کرنے کی سختی سے پابندی فرماتی ہیں۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد دیر تک عبادت میں مشغول رہتی ہیں یا تو کوئی نوافل آپ اس وقت پڑھتی ہیں یا بوجہ خرابی جو عام طور پر آپ کی صحت درست نہیں رہتی۔ عشاء کی نماز ملالیتی ہیں۔ میں جرأت نہ کرسکی دریافت کی۔

شرعی پردہ:

حضرت ام المومنینؓ شرعی پردہ کی سختی سے پابند ہیں۔ آپ کبھی بے نقاب نہیں ہوتیں۔ چہرہ کو حتی الامکان چھپاتی ہیں۔ اگر کوئی خاص نقاب وغیرہ نہ ہو تو کم از کم چہرہ کے آگے پنکھا رکھ لیتی ہیں یا کسی اور چیز کی اوٹ لے لیتی ہیں۔

حضرت ام المومنینؓ ہم میں خدا تعالیٰ کی ایک برکت ایک زبردست انعام اور اس کا فضل ہیں۔ جو مقام اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ کے پردہ کرنے کے بعد دنیا پھر کبھی نہ دیکھے گی۔ وہ نبی وقت کی حرم محترم صفات الٰہی کی جلوہ گری کی محمل رہی ہیں۔ وہ حضرت مسیح موعودؑ کے ان اندھیری رات کی گھڑیوں کی شاہد ہیں جہاں تکلف وتصنع کام نہیں آتا۔ اس نبی کی صحبت میں جو کچھ حاصل ہوا وہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ اے مادر مہربان تجھ پر ہزاروں صلوۃ وسلام ہم غریبوں پر بھی نظر رکھو۔ گناہ گار وکمزور ہونے کی وجہ سے ساتھ رہنے کے قابل نہیں۔ میرے اللہ اپنے فضل وکرم سے اور اپنے عاجز بندوں پر رحم کرکے اس وجود باجود کو ہمارے سروں پر دیر تک سلامت رکھیو۔ آمین

(مضمون از: محترمہ امۃ اللہ بشیرہ بیگم صدر لجنہ اماء اللہ حیدرآباد دکن
اہلیہ مولوی سید بشارت احمد صاحب (امیر جماعت حیدرآباد دکن)
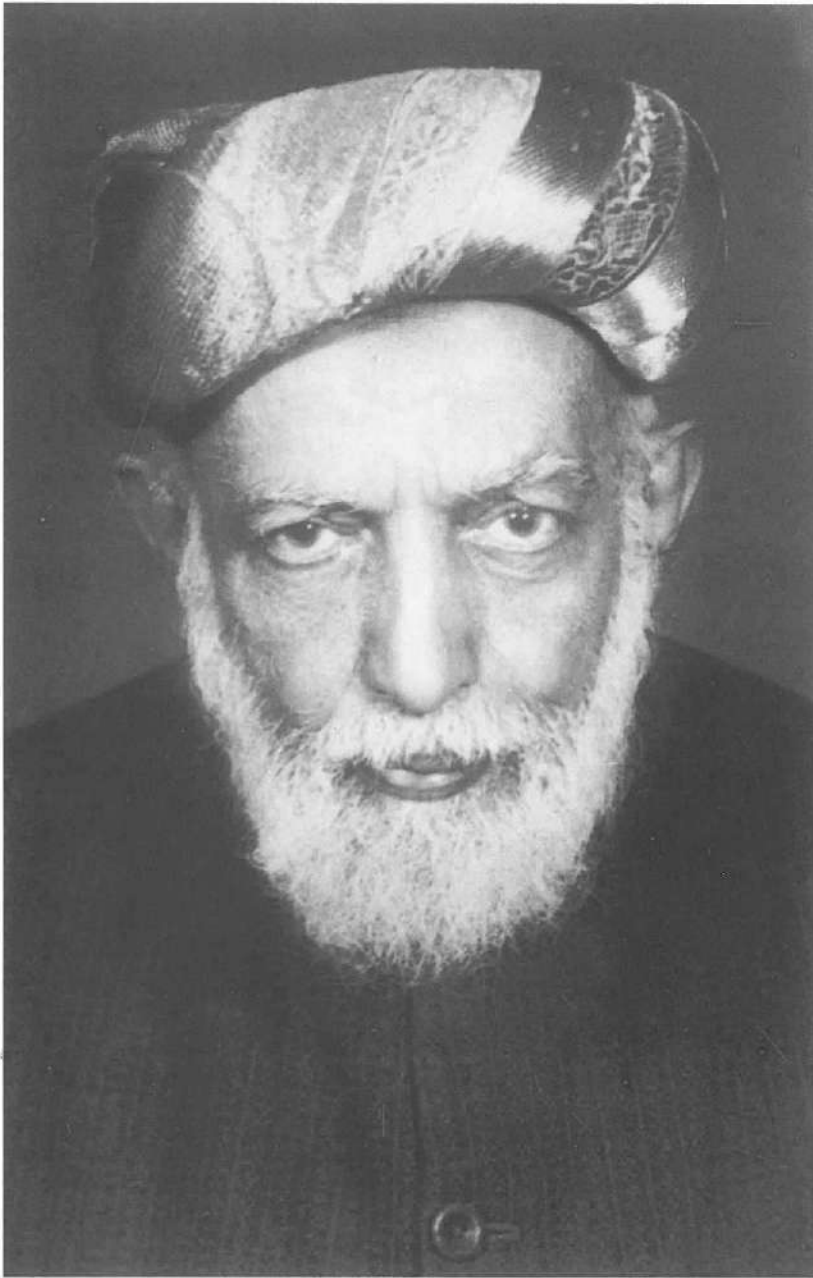
حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت احمدیہ سکندر آباد

حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کی قبول احمدیت اور تبلیغ احمدیت

سکندر آباد کے ایک مخلص اور متقی ولی صفت انسان کی

ایمان افروز خودنوشت

میں عبداللہ الہ دین کس طرح احمدی ہوا اور خدا تعالیٰ نے عاجز کو کیسی عظیم الشان نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔" اس کے متعلق سید نا حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے اور دوسرے بزرگانِ دین نے اور خاکسار نے جو خواب اور الہام پائے اور وہ کس طرح پورے ہوئے۔ اس کی صحیح حقیقت بیان کرتا ہوں۔ اور خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں نے خواب یا الہام میں کچھ اپنی طرف سے ملایا ہے، تو مجھ پر اس دنیا اور آخرت میں لعنت اور عذاب الٰہی نازل ہو۔ اس مضمون کا اکثر حصہ اخبار الحکم ۲۸ رجون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوگیا ہے۔"

میں ہز ہائینس سر آغا خاں کو ماننے والی خوجہ شیعہ اسماعیلی قوم کا ایک فرد تھا۔ میری پیدائش ممبئی میں ۱۲ ر اکتوبر ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ اب میری عمر انگریزی حساب سے ۶۲ اور اسلامی حساب سے ۶۴ سال کی ہے۔

۱۹۱۳ء میں جب میری عمر ۳۶ سال کی تھی۔ قادیان سے ہماری تجارتی فرم کے نام Review of Religions انگریزی رسالہ اس کے مینیجر کی طرف سے برائے اشتہار وصول ہوا۔ اس سے پیشتر قادیان کا نام میں نے کبھی سنا نہ تھا۔ مجھے مذہب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے کئی روز تک وہ رسالہ میرے میز پر پڑا رہا۔ ایک دن اس کے آخری صفحہ پر The Teachings of Islam کتاب کے متعلق جو اشتہار دیا گیا تھا، اس پر نظر پڑی، جس میں کتاب کی بہت تعریف تھی۔ اس لیے میں نے وہ منگوائی۔ اس کتاب سے مجھ پر ایسا معجزانہ اثر ہوا کہ میرے دل میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔

سیٹھ یوسف الہ دین صاحب فرزند خرد حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب

محترم حافظ صالح محمد الہ دین صاحب سابق امیر جماعت احمدیہ سکندرآباد

حال مقیم قادیان۔ صدر صدر انجمن احمدیہ قادیان

احمدیہ جوبلی بلڈنگ انہدام سے قبل کا بیرونی حصۂ قدیم

احمدیہ جوبلی بلڈنگ انہدام سے قبل کا اندرونی حصۂ قدیم 1931A D

اللہ تعالیٰ سنتا ہے کے تعلق سے میرا خواب:

ٹیچنگس آف اسلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اردو کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی کا ترجمہ ہے۔ مختصر طور پر گویا قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھے بہت تعجب معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ دعا سنتا ہے اور اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ تو دنیا کے تمام لوگ مانتے ہیں کہ خدا دعا سنتا ہے، کلام کرتا ہے اور دعاؤں کا جواب دیتا ہے یہ تو غیر مسلم مانتے ہیں۔ لیکن تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ گذشتہ زمانوں میں تو خدا اپنے پیغمبروں سے کلام کرتا تھا اور دعاؤں کا جواب دیتا تھا، مگر وہ سلسلہ اب موقوف ہوگیا ہے، مگر اس زمانہ کے خدا کے مامور نے اسی پر بہت زور دیا ہے کہ جس طرح خدا آگے کلام کرتا تھا اور دعاؤں کا جواب دیتا تھا۔ اسی طرح اب بھی وہ حق کے طلبگاروں سے کلام کرتا ہے اور ان کی دعاؤں کا جواب دیتا ہے۔

اس زمانہ میں میری یہ حالت تھی کہ میں کبھی نماز پڑھتا تھا اور کبھی نہیں پڑھتا تھا، مگر مجھے اس بات کی جستجو تھی کہ خدا تعالیٰ دعاؤں کا جواب دیتا ہے یا نہیں۔ اس لیے ایک روز مغرب کی نماز میں یہ دعا مانگی کہ یا اللہ اگر تو دعا سنتا ہے اور اس کا جواب بھی دیتا ہے تو میرے ایک سوال کا جواب دے، تاکہ مجھے یقین ہو جائے، تب میں نے خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ یا اللہ میرے والد صاحب جن کو فوت ہو کر دس سال کا عرصہ ہوگیا ہے۔ ان کی حالت مجھے معلوم کروا۔ دعا کرنے کے ایک یا دو روز کے بعد والد صاحب مجھے نظر آئے اور کہنے لگے کہ میں اب تک خوش ہوں اور مجھے ایک انگوٹھی بتلائی، جس کے ایک دو نگینہ چمکتے تھے اور ایک دو سیاہ تھے۔ اس وقت میں اس کی تعبیر نہ سمجھ سکا، مگر احمدی ہونے کے بعد میں نے سمجھا کہ انگوٹھی کے نگینوں سے مراد والد صاحب کی اولاد اور ان کی حالت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نور سے چمکا دے۔

بہرحال یہ خواب دیکھنے سے مجھے یقین ہوگیا کہ درحقیقت خدا تعالیٰ دعا سنتا ہے اور جواب بھی دیتا ہے، مگر میں نے خیال کیا کہ اگر میں کسی سے یہ ذکر کروں گا تو وہ کہے گا کہ تمہارے دل میں ایک خیال تھا، اسی کے مطابق خواب نظر آیا۔ یہ کوئی یقینی ثبوت نہیں۔ بہ فرضِ محال مان بھی لیں کہ خیال کے مطابق خواب نظر آیا، تو میرے سوال کا جواب کس طرح ہوا؟ تاہم میں نے چاہا
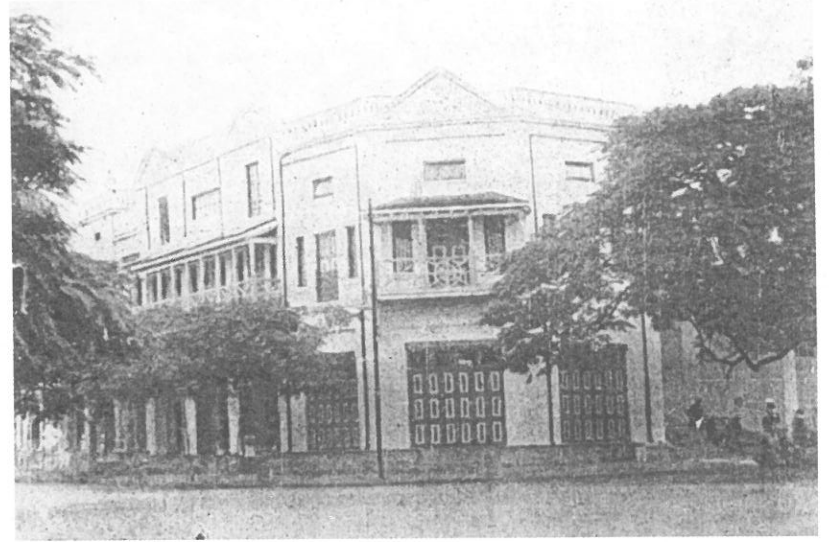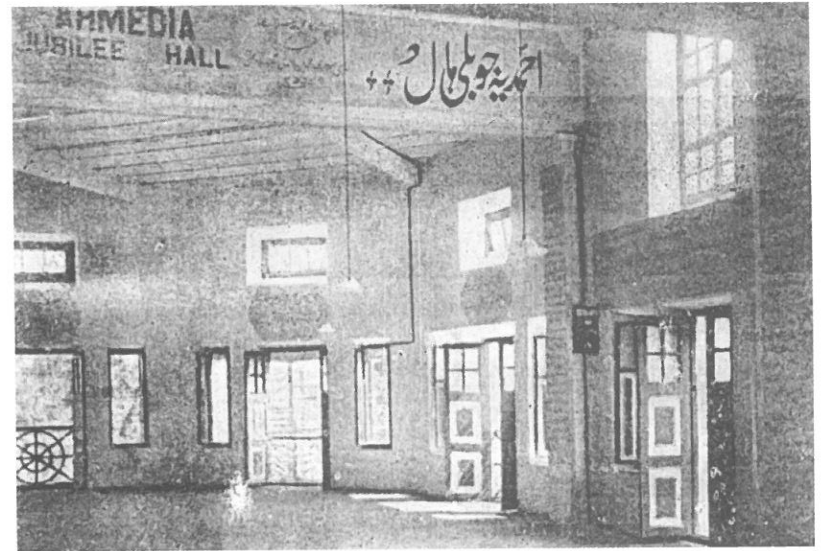
کہ اس سے زیادہ صاف ثبوت ملے۔ اس لیے خدا تعالیٰ سے دوسری بار یہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے تو معلوم ہوگیا کہ تو دعا سنتا ہے اور جواب بھی دیتا ہے، مگر شاید دوسروں کو اس کا یقین نہ ہوگا، اس لیے اور ایک سوال کا جواب دے۔ تا کہ مجھے کامل یقین ہو جائے اور دوسروں کے لیے ایک کامل حجت ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری دعا کا جواب:

میری دوسری دعا یہ تھی کہ یا اللہ! میری والدہ کا کیا حال ہے؟ وہ مجھے معلوم کروا۔ میں جب تین سال کا بچہ تھا، اس وقت میری والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ اس لیے مجھے ان کا چہرہ مطلق یاد نہیں۔ اس لیے میں نے دعا میں یہ بھی عرض کی کہ یا اللہ! اگر پھر کوئی خواب نظر آئے اور اس میں کوئی عورت بھی نظر آئے، مگر یہ مجھے کیسے یقین ہو کہ یہی میری حقیقی والدہ ہے؟ میرے دوسرے سوال کا جواب جلد نہ ملا۔ اس لیے میں کئی روز تک یہی دعا مانگتا رہا۔ آخر ایک رات پھر خواب نظر آیا، جس میں ایک عورت ایک تخت پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس کے اطراف بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں بھی ان میں شریک تھا۔ کسی نے پوچھا کہ یہ عورت جو بڑے درجے والی معلوم ہوتی ہے یہ کون ہے۔ تو میں نے جواب دیا کہ میری والدہ ہے۔ میری جنّتی والدہ ہے اور جنّتی والدہ کے الفاظ بار بار کہتے ہوئے میں نیند سے ہوشیار ہوگیا اور جنّتی والدہ جنّتی والدہ کہتا رہا۔ میں متعجب ہوا کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں، پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اگر خواب میں کوئی عورت نظر بھی آجائے، پھر بھی مجھے یہ کیسے یقین ہو کہ یہی میری حقیقی والدہ ہے، تو اس قادر و حکیم خدا تعالیٰ نے اپنے ایک عاجز بندے کی خواہش پوری کرنے اور اپنے مامور کی اس تعلیم کو کہ خدا دعا سنتا ہے اور جواب دیتا ہے صاف طور سے صحیح ثابت کر دیا۔ الحمدللہ۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے مامور کی صحیح تعلیم کے متعلق اس قدر زبردست ثبوت عطا فرمایا، پھر بھی آپ کے دعاوی ماننے میں مجھے بہت رکاوٹ ہوگئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے ایک تجارتی معاملہ میں ایک اہلحدیث سے شراکت کا تعلق تھا۔ اس نے مجھے بدظن کر دیا۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے مجھ عاجز پر رحم فرما کر قادیان سے ایک احمدی بزرگ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ ایڈیٹر الحکم کو معجزانہ طور سے ۱۵۰۰ سومیل کے فاصلہ سے میرے مکان تک پہنچا دیا تا کہ وہ

مجھے حق سمجھائیں، مگر افسوس کہ میں ایسا متعصب اور کٹر اہلحدیث ہوگیا تھا کہ ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے بہت سا لٹریچر قادیان سے منگوا دیا اور جب کبھی وہ میری ملاقات کے لیے تشریف لاتے تو بہت کچھ سمجھاتے، کتابوں کا کچھ حصہ خود پڑھ کر سناتے اور میں خود بھی پڑھتا۔ مگر وہی حصہ پڑھتا جس میں اسلام یا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیوں کا ذکر ہوتا، مگر جہاں کہیں حضرت عیسیٰؑ کا یا دعاوی کا ذکر ہوتا تو وہ چھوڑ ہی دیتا۔ اس طرح جب میں اصل ضروری حصہ ہی چھوڑ دوں تو مجھے احمدیت کی صداقت کس طرح معلوم ہوسکتی تھی؟ مگر میں نے تو ارادہ ہی کر لیا تھا کہ احمدی نہ ہوں گا۔ اس لیے دعاوی کے متعلق کا ذکر چھوڑ دیتا تھا، آخر عرفانی صاحب کو واپس جانا پڑا۔ مگر خدا تعالیٰ کو مجھ عاجز کو احمدیت سے سرفراز کرنا منظور تھا۔ اس لیے اس نے ایک عظیم الشان سکیم تجویز فرمائی۔

شاہِ دکن کو تبلیغ:

اپنے موجودہ خلیفہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کو ایک خواب کے ذریعہ سے یہ تحریک پیدا ہوئی کہ وہ شاہِ دکن کو تبلیغ فرمائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں آپ نے ایک اعلیٰ کتاب ''تحفۃ الملوک'' مؤثر الفاظ میں اور خوبصورت طرز میں چھپوا کر حضور شاہ دکن کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ اس کے بعد اس کتاب کی صدہا کاپیاں خاص و عام لوگوں میں مفت تقسیم کی گئیں۔ اس کام کے لیے اولاً حضرت حکیم محمد حسین صاحب قریشیؓ اور بعد میں مولانا سید محمد سرور شاہ صاحبؓ اور حضرت مفتی محمدؐ صادق صاحبؓ قادیان سے تشریف[1] لائے اور دو تین ماہ تک حیدرآباد میں تبلیغ کرتے رہے۔ مگر کسی کو ہدایت نصیب نہ ہوئی اور وہ واپس تشریف لے گئے۔

(۱) شیخ یعقوب علی صاحب کا بیان ہے کہ ''جب قافلہ مبلغین کا حیدرآباد کو روانہ ہوا تو میں نے مفتی محمد صادق صاحب کو خصوصیت سے کہا کہ سکندرآباد میں سیٹھ عبداللہ بھائی الہ دین ایک طالب حق ہے اور ان کے چہرہ پر آثار سعادت ہیں۔ ان سے ضرور ملنا۔ مگر وہ اپنے پہلے سفر میں بھول گئے۔ دوسری مرتبہ جب وہ پھر آئے۔ خصوصیت سے تاکید کی۔ کہ اب نہ بھولنا۔ میرا اپنا ایمان یہی ہے کہ ان کا یہ دوسرا سفر خدا تعالیٰ نے محض عبداللہ بھائی کے لئے کر دیا۔'' (عرفانی)

مگر خدا تعالیٰ نے یہ ساری اسکیم اس عاجز کے لیے تجویز فرمائی تھی۔ اس لیے پھر سیدنا حضرت امیر المؤمنین کے دل میں یہ بات ڈالی کہ پھر ایک بار حیدرآباد اور سکندرآباد میں تبلیغ کی جائے۔ اس لیے پھر حضور نے حضرت مفتی محمدؓ صادق صاحب اور مولانا حافظ روشن علی صاحبؓ کو روانہ فرمایا۔ ان کے ساتھ مکرم و معظم جناب سید بشارت احمد صاحب جو اس وقت جماعت احمدیہ حیدرآباد کے جنرل سکریٹری تھے۔ اب انہوں نے سکندرآباد کی طرف توجہ کی مجھے ان کا پتہ لگا۔ میں نے ہمارے الہ دین بلڈنگ میں ان کی ایک تقریر کروائی۔ اس کے بعد روزانہ قرآن شریف کا درس اور تبلیغ کا سلسلہ ہمارے یہاں جاری ہوگیا۔ دوسری طرف سے سنی اور شیعہ علماء احمدیت کے خلاف سمجھانے حیدرآباد سے تشریف لاتے رہتے تھے۔ اس طرح مجھے دونوں فریق کے دلائل سننے کا موقع ملتا رہا۔ دو تین مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھ پر احمدیت کی صداقت کھل گئی، مگر پھر بھی مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ میں اپنے قرابت داروں کو اہل حدیث دوستوں کو ناراض کر کے احمدی ہوجاؤں بلکہ میں نے قرآن شریف کے درس اور تبلیغ کا سلسلہ جو روزانہ جاری تھا وہ بھی موقوف کردیا۔ جب خدا تعالیٰ نے میرا یہ حال دیکھا تو اس نے میری عقل درست کرنے کے لیے ایک سخت علاج تجویز فرمایا۔

ایک مُنذر خواب:

وہ سخت علاج یہ تھا کہ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں اپنے اہلحدیث دوست اور دوسرے ایک شخص کے ساتھ بیٹھا ہوَا تھا اور کسی کی مذمت ہو رہی تھی، اتنے میں پولیس آئی اور ہم تینوں کو گرفتار کر کے سکندرآباد کی پولیس کورٹ میں کھڑا کردیا اور ہم تینوں کو آٹھ آٹھ روز کی قید کی سزا ہوئی۔ میں جیل میں رو رہا ہوں اور کہتا ہوں کہ مذمت تو میرے اہلحدیث دوست نے کی اور میں ناحق گرفتار ہوگیا، تو کسی نے کہا۔ تو نے اس کی صحبت کیوں ترک نہ کی؟ جب میں سمجھ گیا کہ میرا اہلحدیث دوست تو احمدیت کا مخالف تھا۔ اس لیے وہ خلاف کہتا تھا، مگر مجھ پر احمدیت کی صداقت کھل گئی تھی، پھر بھی میں اسی کے ساتھ ملا جلا رہتا تھا۔ اس لیے اس جہاں میں مجھے بھی اس کے ساتھ جیل کی سزا ملی اور اگر میں اس پر اڑا رہا تو اس جہاں میں جہنم کی سزا ہوگی۔ یہ خواب میں نے اپنے اہلحدیث کو سنا دیا اور اس کے بعد ۹ اپریل ۱۹۱۵ء جمعہ کے دن بعد نماز حیدرآباد کے

امیر مولانا مولوی حاجی میر محمدؓ سعید صاحبؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوگیا۔ الحمد للہ

”چمکی ہے فرزند تیری ان دنوں تقدیر ہے   تخت سلطانی پہ تیرے باپ کی تصویر ہے“

احمدی ہونے کے پیشتر ایک دن جب اوپر کی منزل پر چڑھ رہا تھا، تو مذکورہ بالا شعر زور سے میری زبان سے نکل گیا۔ میں متعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے۔ تقدیر کا چمکنا تو اسی کو سمجھتے ہیں کہ کہیں سے بہت سا خزانہ مل جائے، مگر وہ تو کچھ اس وقت ملا نہیں۔ اس لیے میں اس کو ایک معمولی بات سمجھ کر بھول گیا، مگر جب خدا تعالیٰ نے مجھے سرفراز فرمایا اور اس کے بعد بھی فضل پر فضل ہوتا رہا، تب مجھے یہ شعر یاد آیا اور میں سمجھ گیا کہ واقعی یہ شعر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک الہام تھا اور اس میں یہ عظیم الشان بشارت تھی کہ میری تقدیر دینی اور دنیوی دونوں طرف سے چمکنے والی تھی۔

خدا تعالیٰ بہت غیور ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص یہ فخر کرے کہ میں نے فلاں کام اپنی لیاقت یا علم یا طاقت یا مال وغیرہ سے کیا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی کو اپنا نبی یا رسول بناتا ہے تو وہ ایک ایسے شخص کو منتخب کرتا ہے کہ لوگ اس کا دعویٰ سنتے ہی انکار کردیں، مگر رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ اپنی قدرت اور اس کی صداقت ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اس قادر اور حکیم خدا نے محض اپنی رحمانیت سے مجھ جیسے ایک حقیر شخص کے ذریعہ قدرت کا ایک نمونہ دنیا میں آشکار کرنا چاہا۔ اس لیے اس نے اپنے دین اسلام کی خدمت کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ دینی خدمت ایک عظیم الشان کام ہے۔ اس کے لیے بڑے عالم فاضل شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے عوض وہ ایک ایسے جاہل شخص کو منتخب کرتا ہے جو دین سے بالکل ناواقف، مگر دیکھو، وہ قادر خدا کس طرح اپنی قدرت کا کرشمہ دکھلاتا ہے اور کس طرح وہ مذکورہ بالا الہام پورا کر کے میری تقدیر کو چمکاتا ہے۔ اس کی تفصیل ظاہر کرنا ضروری ہے۔

میں نے شروع ہی میں عرض کردیا ہے کہ میں سر آغا خاں کو ماننے والی شیعہ اسماعیلی قوم کا ایک فرد تھا۔ گو ان میں معزز اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں، مگر ان کا اکثر حصہ شریعت اسلام سے ناواقف ہے۔ یہ صرف سال میں دو بار عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی کوئی مسجد نہیں، کیوں کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے عوض ان کا ایک جماعت خانہ ہے۔ اس میں ان کے مرد یا

عورت صبح یا شام ان کی بنائی ہوئی سندھی زبان کی دعا پڑھ لیا کرتے ہیں۔ ایسی قوم کا میں ایک فرد تھا۔ اس لیے میں بھی شریعت سے بالکل ناواقف تھا۔ نماز کے عوض دعائے گنج العرش وغیرہ پڑھ لیا کرتا تھا۔

سکندر آباد سے چار میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے یہاں کے لوگ اس کو مولا علی کا پہاڑ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے امراء وہاں جاتے ہیں۔ نذر نیاز کرتے ہیں۔ عرس کرتے ہیں۔ ہم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ بلکہ سجدے بھی کرتے تھے۔ یہ میری دینی لیاقت تھی۔ ایسے ایک جاہل شخص کو خدا تعالیٰ اسلام کی دینی خدمت کے لیے چن لیتا ہے اور اس کو دین اسلام کی صحیح تعلیم دلوانے قادیان سے ''اسلامی اصول کی فلاسفی نامی کتاب پہنچاتا ہے۔ وہ کتاب پڑھتے ہی مجھ پر معجزانہ اثر ہوتا ہے۔ میرے دل میں دین کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر میری مزید تعلیم کے لیے خدا تعالیٰ قادیان سے عالم فاضل علماء اور مبلغین کو ہمارے مکان تک پہنچا دیتا ہے اور کئی ماہ تک ہمارے یہاں روزانہ قرآن شریف کا درس اور تبلیغ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مجھ پر صداقت احمدیت کھل جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام کی دینی خدمت وہی شخص کرسکتا ہے جو احمدیت سے واقف ہو۔ اس لیے اس نے میرے لیے ایسی عظیم الشان اسکیم تجویز فرمائی۔ الحمد للہ۔

احمدیت کی تعلیم کے طفیل میرے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ میں روزانہ پانچ وقت باجماعت نماز پڑھتا ہوں، بلکہ امام ہوکر جماعت کو نماز پڑھاتا ہوں۔ سنت کے علاوہ دن رات میں کئی بار نوافل بلکہ تہجد بھی باقاعدہ پڑھتا ہوں۔ صبح و شام ذکر الٰہی میں مصروف رہتا ہوں۔ رمضان المبارک کے پورے روزوں کے علاوہ کئی نوافل بلکہ چند ماہ تک ایک دن کے وقفے سے ماہوار پندرہ روزے رکھتا تھا۔ سالانہ زکوٰۃ برابر ادا کی جاتی ہے۔ حج کا فریضہ اہل وعیال کے ساتھ ادا کر چکا ہوں۔

اس کے علاوہ احمدی ہونے سے انسان کو اپنی زندگی کی غرض و غایت یقینی طور سے معلوم ہوجاتی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم خدمت دین کے لیے اپنے جان و مال سے قربان ہوجائیں۔ دنیا اس راز سے واقف نہیں۔ اس لیے اس کو خدا تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کی کچھ قدر نہیں بلکہ مخالفت میں مصروف ہے۔ مگر جس پر یہ صداقت کھل جاتی ہے، اس کے دل میں ایک جوش و ولولہ

پیدا ہوجاتا ہے اور جس طرح بھی ممکن ہو دین کا خادم ہونے میں ہی اپنی سعادت سمجھتا ہے، مگر میں تو یہ معلوم کرکے اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے خصوصیت کے ساتھ اسی کام کے لیے چن لیا ہے اور مجھ پر اپنا فضل کرتا جارہا ہے۔ اس لیے اس کے حضور میں نے یہ دعا کرنے کی جرأت کی کہ

''یا اللہ تو مجھ سے ایسے دینی کام کروا جو دنیا میں کسی اور نے نہ کیے ہوں اور وہ محض تیری رضا مندی اور تیری مخلوق کی خیر خواہی کے لیے ہو اور یہ تیرا فضل میری نسل میں بھی تا قیامت جاری رہے اور وہ بھی ایسے کام کریں کہ ہر زمانہ کے لوگ ان کو دل سے دعائیں دیں۔''

خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے مجھ حقیر کی یہ دعا قبول فرمائی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مجھ سے انگریزی۔ اردو وغیرہ زبانوں میں ایسی کتابیں شائع کرائیں جو تمام جہاں میں مقبول ہوگئیں۔ ہر ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً Extracts from Holy Quran نامی کتاب میں مختلف مسائل کے متعلق قرآن مجید کی اکثر آیات احادیث اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ کارنامے جن کی دنیا میں نظیر نہیں، وہ جمع کیے گئے ہیں۔ نیز مختلف نام کے معزز لوگوں کے آراء اسلام اور بانی اسلام کے متعلق درج کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کتاب ایسی مقبول ہوگئی ہے کہ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن ختم ہوگئے ہیں اور اب نویں بار چھپ کر پریس سے باہر آگئی ہے۔ دنیا کے تمام حصوں سے اس کی مانگ آرہی ہے۔ مختلف اقوام کے لوگ یہ کتاب پڑھ کر اپنے تاثرات دلی دعاؤں کے ساتھ لکھ بھیجتے ہیں، جو اسی کتاب کے آخر میں شائع کی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آسمان سے بھی اس کی مقبولیت کا پیغام وصول ہوگیا ہے، جس کے متعلق مکرمی حضرت شیخ یعقوب علی صاحبؓ عرفانی جو ۱۹۲۷ء میں لندن میں مقیم تھے۔ وہاں سے ۱۷ فروری کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''میں یہ خط آپ کو ایک بشارت کے طور پر لکھتا ہوں۔ ۱۲ اور ۱۳ فروری کی درمیانی رات کو میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ

آئے ہیں اور انہوں نے ایکسٹراکٹ کی بہت تعریف کی ہے۔ یعنی یہ کہا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کو بہت ہی پسند فرمایا ہے، مگر ساتھ ہی کہتے ہیں کہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھی اور انہوں نے آپ کے مخالف بھائیوں کے طرز عمل کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کریں گے۔ مخالفت نہ چھوڑیں گے۔ بہر حال میں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب ملاء الاعلیٰ میں مقبول ہوگئی ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھے گی اور یہ انشاء اللہ بابرکت ہوگی۔''

خدا تعالیٰ نے اپنے قانون کے مطابق اس زمانہ میں دنیا کی رہنمائی کے لیے ایک عظیم الشان مصلح کو مبعوث فرمایا، جس کو بسروچشم قبول کرنے کے عوض دنیا کی تمام اقوام مخالفت میں لگی ہوئی ہیں۔ خصوصاً اسلامی علماء کہلانے والے دھوکے فریب و ناجائز طریق سے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے اس عاجز کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں ہزار ہا روپے کے انعامات کے ساتھ ایسے چیلنج شائع کروں تا کہ دنیا کو ان کے دھوکے فریب صاف ظاہر ہو جائیں اور صداقت پسند لوگ حق کی طرف رجوع کریں۔ ان چیلنجوں کی تفصیل مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہے:

دنیا کی تمام اقوام کو چیلنج:

دنیا کے تمام مذاہب کے نزدیک خدا تعالیٰ کا یہ قانون مسلمہ ہے کہ جب لوگوں کے دلوں سے خدا تعالیٰ کا خوف جاتا رہتا ہے اور وہ ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ان کی اصلاح کے لیے ایک ربانی مصلح مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق گذشتہ زمانوں میں مختلف اقوام میں ایسے ربانی مصلح کا ظہور ہوتا رہا۔ مگر جب سے خدا تعالیٰ نے اسلام کو دنیا کی تمام اقوام کے لیے ایک عالمگیر مذہب قائم کیا۔ تب سے یہ سلسلہ دوسرے مذاہب میں موقوف کیا گیا اور صرف اسلام ہی میں جاری رکھا گیا۔ اگر یہ سلسلہ اب بھی کسی اور مذہب میں جاری ہے، تو اس مذہب کا مدعی اپنا دعویٰ پبلک میں پیش کرے اور ثابت کرے اور ہم سے دس ہزار روپے کا انعام حاصل کرے۔ گو یہ چیلنج کئی سال سے، مختلف زبانوں میں شائع کیا گیا مگر کسی غیر مسلم نے حق کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی جرأت نہ کی۔

اسی طرح اسلام میں بھی یہ عقیدہ مسلمہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر صدی کے شروع میں تجدید دین کے لیے ایک مجدد مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس قانون کے مطابق اس صدی میں حضرت میرزا غلام احمد صاحبؑ کا ظہور ہوا۔ مسلم علماء کا فرض تھا کہ وہ اس کو شناخت کرتے اور قبول کرتے۔ اس کے خلاف وہ دن رات اس کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں۔
اس لیے خاکسار نے ان کو بھی دس ہزار روپے کا چیلنج دیا کہ اگر حضرت میرزا صاحبؑ اس صدی کے ربانی مجدد نہیں ہیں تو پھر اس منصب کا دوسرا کوئی صادق مدعی ہو، تو اس کو پبلک میں پیش کرو اور ہم سے مذکورہ انعام لو۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس منصب کا صادق مدعی ہوتا تو وہ خود پبلک میں پیش ہوتا اور خود دنیا کو چیلنج دیتا کہ اگر میں صادق مدعی نہیں ہوں تو جو صادق ہے وہ پبلک میں میرے مقابلہ میں پیش ہو۔ مگر حضرت میرزا صاحبؑ کے مقابلہ میں دوسرے کسی شخص نے بھی پیش ہونے کی جرأت نہ کی۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کو دس ہزار پانچ سو روپے کا چیلنج:

مولوی ثناء اللہ صاحب جو احمدیت کے سب سے بڑے مخالف کہلائے جاتے ہیں وہ جنوری ۱۹۲۳ء میں سکندرآباد تشریف لائے اور احمدیت کے خلاف بہت ہنسی مذاق کے لیکچر دیتے رہے۔ تب خاکسار نے ان کو ۱۲ فروری ۱۹۲۳ء کے اشتہار میں یہ چیلنج دیا کہ وہ جو کچھ احمدیت کے خلاف عقیدے ظاہر کر رہے ہیں وہی عقیدے ایک جلسہ میں حسب ذیل الفاظ میں بیان کریں۔
تو ہم ان کو اسی جلسہ میں نقد پانچ سو روپے دیں گے اور اگر ایک سال تک ان پر موت نہ آئی یا کوئی عبرتناک عذاب (جس میں انسانی ہاتھ کا دخل نہ ہو) نہ آیا تو مزید دس ہزار روپے نقد دیا جائے گا۔ جس کا مطالبہ خود انہوں نے اپنے ۶ رفروری ۱۹۲۳ء کے اشتہار میں کیا ہے۔
جو مولوی ثناء اللہ صاحب جلسہ عام میں تین مرتبہ دہرائیں گے اور ہر دفعہ خود بھی اور حاضرین بھی آمین کہیں گے۔

حلف کے الفاظ یہ ہیں:

''میں ثناء اللہ ایڈیٹر اہلحدیث خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اس بات پر حلف کرتا ہوں کہ میں نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے تمام دعاوی و دلائل کو بغور دیکھا اور سنا اور سمجھا

اور اکثر تصانیف ان کی میں نے مطالعہ کیں اور عبداللہ الہ دین کا چیلنج انعامی دس ہزار کو بھی بغور پڑھا مگر میں نہایت وثوق اور کامل ایمان اور یقین سے یہ کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کے تمام دعاوی والہامات جو چودھویں صدی کے مجدد امام وقت و مسیح موعود مہدی موعود امتی نبی ہونے کے متعلق ہیں، وہ سراسر جھوٹ وافتراء اور دھوکہ وفریب اور غلط تاویلات کی بناء پر ہیں۔ برخلاف اس کے عیسیٰ علیہ السلام وفات نہیں پائے، بلکہ وہ بجسد عنصری زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور ہنوز اسی خاکی جسم کے ساتھ موجود ہیں اور وہی آخری زمانہ میں آسمان سے اتریں گے اور وہی مسیح موعود ہیں اور مہدی علیہ السلام کا ابھی تک ظہور نہیں ہوا، جب ہوگا تو وہ اپنے منکروں کو تلوار سے قتل کر کے اسلام کو دنیا میں پھیلا دیں گے۔ مرزا صاحب نہ مجدد وقت ہیں نہ مہدی ہیں، نہ امتی نبی ہیں بلکہ ان تمام دعاوی کے سبب میں ان کو مفتری اور کافر اور خارج از اسلام سمجھتا ہوں۔ اگر میرے یہ عقائد خدا تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے اور قرآن شریف وصحیح احادیث کے خلاف ہیں اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی درحقیقت اپنے تمام دعاوی میں خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ہیں تو میں دعا کرتا ہوں کہ اے قادر ذوالجلال خدا جو تمام زمین و آسمان کا واحد مالک ہے اور ہر چیز کے ظاہر و باطن کا تجھے علم ہے۔ پس تمام قدرتیں تجھی کو حاصل ہیں، تو ہی قہار اور غالب و منتقم حقیقی ہے۔ اور تو ہی علیم وخبیر وسمیع وبصیر ہے۔ اگر تیرے نزدیک مرزا غلام احمدؑ صاحب قادیانیؑ اپنے دعاوی والہامات میں صادق ہیں اور جھوٹے نہیں اور میں ان کے جھٹلانے اور تکذیب کرنے میں ناحق پر ہوں، تو مجھ پر ان کی تکذیب اور ناحق مقابلہ کی وجہ سے ایک سال کے اندر موت وارد کر یا کسی ایسے غضبناک وعبرتناک عذاب میں مبتلا کر کہ جس میں انسانی ہاتھ کا دخل نہ ہو، تا کہ لوگوں پر صاف ظاہر ہو جائے کہ میں ناحق پر تھا اور حق و راستی کا مقابلہ کر رہا تھا، جس کی پاداش میں خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا مجھے ملی ہے۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔"

نوٹ : اس عبادرت میں اگر کوئی ایسا عقیدہ درج ہو، جسے مولوی ثناء اللہ صاحب نہیں مانتے تو میرے نام ان کی دستخطی تحریر آنے پر اس عقیدہ کو اس حلف سے خارج کر دوں گا۔

خاکسار عبداللہ

الہ دین بلڈنگ سکندر آباد ۱۲؍فروری ۱۹۲۳ء

دوسو روپے کا چیلنج:

مذکورہ بالا حلف کے الفاظ کیسے صاف ہیں اور یہ وہی الفاظ ہیں جن کے ذریعہ ہمارے خلاف پبلک میں مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی حلفاً بیان کرنے کی جرأت نہ کی۔ مولوی صاحب اب جلد یہاں سے پنجاب واپس جانے والے تھے، اس لیے خاکسار نے پھر ایک بار ان پر اور ان کے ہم خیال لوگوں پر خدا کی حجت پوری کرنے کے لیے ۸؍مارچ ۱۹۲۳ء کو ایک اشتہار دیا کہ اگر کوئی صاحب مولوی ثناء اللہ صاحب کو خاکسار کا مذکورہ بالا حلف اٹھانے پر تیار کریں گے تو ان کو ان کی کوشش کے عوض دوسو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ معلوم نہیں کس قدر لوگوں نے کوشش کی مگر مولوی ثناء اللہ صاحب تیار نہ ہوئے کیوں کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ان کے بعض عقائد حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور جسد عنصری سے آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور ہنوز خاکی جسم کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہی آسمان سے اتر آئیں گے اور مہدی علیہ السلام جب ظاہر ہوں گے تو وہ اپنے تمام منکروں کو تلوار سے قتل کرتے ہوئے اسلام پھیلائیں گے وغیرہ عقائد سراسر قرآن شریف وحدیث شریف کے خلاف ہیں، مگر پھر بھی وہ احمدیت کی مخالفت کے لیے عوام میں بیان کرتے رہتے ہیں اور اس طرح خدا کی مخلوق کو دھوکہ وفریب سے گمراہ کر لیتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کو کس طرح حلفاً کہیں کہ اے علیم، خبیر، سمیع، بصیر خدا اگر میرے یہ عقائد تیرے نزدیک غلط ہیں تو مجھے موت دے یا عبرتناک عذاب میں مبتلا کر۔ اس لیے تو دس ہزار روپے دینے پر بھی ٹالتے رہے۔ یہ ہے احمدیت کے سب سے بڑے مخالف کی حالت جو اپنے آپ کو شیر پنجاب اور فاتح قادیان کہتے ہیں۔ ان کے کارستان، اسی پر بس نہیں اور بھی دیکھیے۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کو ایک اور ۳۵۰۰ روپے کا چیلنج:

مولوی ثناء اللہ صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں حضور کی تکذیب اور سخت مخالفت کرتے تھے۔ اس لیے حضور نے سچے اور جھوٹے کے فیصلہ کے لیے ایک دعائے مباہلہ شائع فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا۔ ہم میں جو جھوٹا ہو۔ وہ سچے کی زندگی میں فوت ہو جائے، اور آخر میں یہ تحریر فرمایا کہ: بالآخر مولوی صاحب سے التماس ہے کہ میرے اس مضمون کو اپنے

پرچہ میں چھاپ دیں اور جو چاہیں اس کے نیچے لکھ دیں۔ اب فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔''

حق اور باطل کے فیصلہ کے لیے مولوی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ اس کے نیچے اپنی منظوری لکھ دیتے، مگر مولوی صاحب کو اپنی موت نظر آنے لگی۔ اس لیے اس کے جواب میں یہ لکھ دیا کہ ''اس دعا کی منظوری مجھ سے نہیں لی اور بغیر میری منظوری کے اس کو شائع کر دیا۔'' پھر یہ لکھا کہ ''خدا دروغ گو مفسد اور کذابوں کو لمبی عمر دیتا ہے۔'' وغیرہ بہت سے اعتراض کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ''مختصر یہ ہے کہ یہ تحریر تمہاری مجھے منظور نہیں اور نہ کوئی دانا اس کو منظور کر سکتا ہے۔'' اس طرح یہ معاملہ منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک سال کے بعد حضرت میرزا صاحب خدا تعالیٰ سے الہام پا کر مقررہ وقت پر وفات پا گئے۔

اب مولوی ثناء اللہ صاحب اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو میرزا صاحب نے سچے اور جھوٹے کے فیصلہ کے لیے جو فیصلہ کن دعا شائع کی تھی وہ قبول ہوگئی اور اس کے مطابق وہ جھوٹے ثابت ہو کر سچے کی زندگی میں فوت ہو گئے۔ (نعوذ باللہ)

دیکھو یہ کتنا بڑا دھوکہ اور فریب ہے، جو خدا کی مخلوق کو دیا جا رہا ہے۔ واقعی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانہ کے علماء کے متعلق یہ جو فرمایا کہ وہ آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے، وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق خاکسار نے مولوی ثناء اللہ صاحب کو اس مطلب کا چیلنج دیا کہ وہ ایک جلسہ میں حلفاً یہ بیان کریں کہ ''میرزا صاحب نے سچے اور جھوٹے کے فیصلہ کے لیے جو دعا شائع کی تھی وہ واقعی فیصلہ کن تھی۔ قرآن و حدیث کے مطابق تھی، اس لیے میں نے اسی وقت منظور کر لی تھی اور میں نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ جھوٹے تھے، اس لیے خدا کی گرفت میں آ کر فوت ہو گئے اور میں میرزا صاحب کی مخالفت میں حق پر تھا۔ اس لیے خدا نے مجھے زندہ رکھا۔ پس اے سمیع، علیم، خبیر خدا اگر میرا یہ حلفیہ بیان تیرے نزدیک غلط یا جھوٹ ہے۔ تو مجھ پر موت وارد کر یا ایک سال کے اندر ایسا عبرتناک عذاب نازل کر کہ جس کو دیکھ کر لوگ کہہ دیں کہ واقعی یہ صادق کی تکذیب کا نتیجہ ہے۔''

ایسا حلف اٹھاتے ہی اسی جلسہ میں ان کو پانچ سو روپے نقد دیا جائے گا اور اس کے بعد وہ اگر ایک سال تک زندہ رہے اور کسی عبرتناک عذاب الٰہی سے جس میں انسانی ہاتھ کا دخل نہ ہو۔

محفوظ رہے، تو مزید تین ہزار روپے کا انعام نقد دیا جائے گا، مگر انہوں نے اب تک جرأت نہ کی۔ گو لوگوں کو دھوکہ دینا برابر جاری ہے۔ دیکھو آسمان کے نیچے یہ کتنا بڑا ظلم اسلام کے علماء کہلانے والے لوگ کرتے ہیں۔ دوسرے علماء بھی مولوی ثناء اللہ صاحب کی اس کارروائی میں شامل ہیں۔ وہ بھی حق چھپا کر لوگوں کو دھوکہ و فریب دیتے ہیں تا کہ لوگوں پر احمدیت کی صداقت کھل نہ جائے۔ کیا ان لوگوں کو مرنا نہیں ہے۔ خدا کو جواب دینا نہیں ہے؟

ایک ہزار روپے کا اور ایک چیلنج:

اس زمانہ کے علماء کس طرح خدا کی مخلوق کو راہِ راست پر آنے سے روکنے کے لیے بلکہ ان کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے خدا تعالیٰ سے بے خوف ہو کر کیسے دھوکہ و فریب سے کام لیتے ہیں۔ اس کا اور ایک نمونہ بیان کرتا ہوں۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث یوں آئی ہے کہ:

کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم و امامکم منکم ۔ یعنی تم کیسے ہو گے۔ جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور وہ تم میں سے تمہارے امام ہوں گے۔ دیکھو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ مسیح موعود تم میں سے یعنی تم مسلمانوں میں سے ہوگا اور وہ تمہارا امام ہوگا، مگر سکندر آباد کی انجمن اہلحدیث ہمارے خلاف ایک اشتہار شائع کرتی ہے۔ اس میں یہ حدیث یوں بیان کرتی ہے کہ کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم من السماء (صحیح بخاری و بیہقی) امامکم منکم الفاظ کاٹ کر من السماء ''یعنی تم مسلمانوں'' میں کے الفاظ کاٹ کر آسمان سے کے الفاظ داخل کرتی ہے۔ اس لیے خاکسار نے ان کو چیلنج دیا کہ صحیح بخاری میں منکم کی بجائے من السماء الفاظ ہم کو دکھاؤ اور ہم سے ایک ہزار روپے کا انعام لو، مگر کہاں سے بتلا سکتے ہو۔ ان کا کام تو صرف یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو احمدیت کی مخالفت کی جائے، مگر کب تک آفتاب پر خاک اڑاؤ گے؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مالی نوازش:

میرے والد صاحب ۱۸۸۲ء میں ممبئی سے سکندر آباد تجارت کے لیے تشریف لائے۔ ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ہمارے والد صاحب فوت ہو گئے۔ اس وقت ۲۲ سال کے

عرصہ میں وہ کوئی سرمایہ جمع نہ کر سکے، بلکہ ہم ہمیشہ مقروض ہی رہتے تھے۔ میں ہمیشہ یہ ہماری حالت دیکھ کر فکر مند رہتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ میں تجارت کے عوض کہیں ملازم ہو جاؤں، مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مولیٰ نے میرے لیے دین کی ملازمت مقرر کر رکھی تھی اور اس لیے میرا نام بھی عبداللہ رکھا گیا تھا۔ یوں تو لاکھوں مسلمان عبداللہ نام رکھتے ہیں مگر میں اللہ کا عبد یا غلام مقرر کیا گیا ہوں ۔ وہ ثابت کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے ایک معزز خاندان کے ہندو صاحب جو مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کو خواب میں یہ بتلایا کہ میں رام داس ہوں، رام داس کے بھی معنے خدا کا غلام۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے روز اول سے یہ مقدر کر رکھا تھا کہ وہ مجھے اپنے دین کا خادم بنائے، مگر خدمت دین کے لیے روپے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تو میرے پاس مطلق نہیں، صرف ہمارے والد صاحب کی تجارت تھی، مگر اس تجارت سے وہ خود کوئی دولت نہ جمع کر سکے۔ تو میری کیا بساط۔ میں تو ان کے مقابلہ میں کچھ نہ تھا، مگر خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے دین کا خادم مقدر کر رکھا تھا۔ اس لیے اس نے مجھ پر الہاماً ظاہر بھی کر دیا کہ وہ میری تقدیر چمکانے والا ہے۔ دینی معاملہ میں تو اس نے عظیم الشان طریق سے میری تقدیر چمکا دی۔

اسی طرح دنیوی معاملہ میں بھی میری تقدیر عظیم الشان طریق سے چمکا دی۔ وہ اس طرح کہ میرے والد صاحب فوت ہوئے۔ اسی سال سے اور اسی تجارت سے ہزارہا روپے نفع ہونا شروع ہو گیا۔ جب میرے والد صاحب فوت ہوئے۔ اس وقت میری عمر ۲۷ سال کی تھی۔ میرے دوسرے بھائی جو اب خان بہادر سیٹھ احمد الہ دین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ وہ میرے تجارت میں شامل تھے اور مجھے بہت ہی کارآمد ہوئے۔ تیسرے بھائی سیٹھ غلام حسین ۱۳ سال کے تھے اور اسکول میں پڑھتے تھے، چوتھے بھائی سیٹھ قاسم علی چھٹے سال کے بچے تھے۔ یہ بھائی بعد میں اہلحدیث ہو گئے۔

دیکھو اس تجارت میں ہمارے والد صاحب ۲۲ سال کے لمبے عرصہ میں کوئی دولت جمع نہ کر سکے، مگر خدا تعالیٰ نے مجھے لاکھ روپے دیا، جو کچھ منافع ہوا۔ وہ میں نے چاروں بھائیوں کے درمیان مساوی طور سے تقسیم کر دیا۔ میرے حصہ جو رقم آتی اس کا اکثر حصہ میں خدمت دین میں لگا دیتا۔ مجھے احمدی ہو کر ۲۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں خاکسار نے ساڑھے تین لاکھ

سکہ عثمانیہ جس کے انگریزی تین لاکھ ہوتے ہیں۔ وہ تمام خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ نے خاکسار کو اس قدر روپیہ محض اپنے دین کی خدمت کے لئے عطا فرمایا۔ اس لئے میرا فرض تھا کہ میں اس کی امانت اسی کی راہ میں خرچ کروں ۔ وہ میں کرتا رہا اور کرتا رہوں گا۔

اس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے الہام کے مطابق مجھے دینی اور دنیوی دونوں نعمتوں سے سرفراز فرما کر میری تقدیر عجیب طور سے چمکا دی۔ یہ احمدیت کی صداقت کا آفتاب کی مانند روشن نشان ہے۔ الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔

پیغامِ احمدیت ان کے تمام افرادِ خاندان کو

اے میرے عزیزو! آپ لوگوں میں سے اکثروں کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ ہمارے والد صاحب کا زمانہ کس طرح مالی تنگی میں گزرا۔ گو ہم آخری چند سال ۶۵ روپے کے کرایہ کے بنگلے میں رہتے تھے۔ مگر ہم اس کا کرایہ پانچ چھ ماہ تک نہ دے سکتے تھے۔ ہم ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ ہمارے خلاف ڈگریاں ہوتی تھیں۔ وارنٹ ہمارے مکان پر آتے تھے۔ ساہوکاروں سے ماہوار سینکڑہ دو روپے سود سے قرض لے کر تجارت کرتے تھے، مگر والد صاحب کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے معجزانہ طور سے ہماری حالت میں تبدیلی کر دی۔ رہائش کے لیے ہمارا ذاتی کوئی مکان نہ تھا، مگر صرف سات سال میں ہم جس ۶۵ روپے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، اسی مکان کے ہم خود مالک ہو گئے۔ اس میں رفتہ رفتہ اضافہ کر کے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کو سوا لاکھ روپے کی شاندار بلڈنگ بنا دیا۔ احمدیہ لٹریچر میں میرے پتہ کی وجہ سے یہ الہ دین بلڈنگ تمام جہاں میں مشہور ہو گئی۔ مختصر یہ کہ ہم نادار جیسے تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے لکھ پتی ہو گئے۔ یقیناً یہ فضل صرف اس لیے ہوا کہ خدا تعالیٰ مجھ سے اپنے دین کی مالی خدمت کروانا چاہتا تھا، مگر میرے پاس نہ روپیہ تھا، نہ کوئی اور خانگی معاملہ۔ صرف ہماری تجارت تھی اور وہ ہماری فرم کے نام سے چلتی تھی۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے ہماری فرم کو مالدار بنا دیا جس کے طفیل الہ دین خاندان کے تمام افراد کو اس کا فیض پہنچا۔

اس کا اور ایک ثبوت یہ ہے کہ ہمارے معزز دوست حضرت شیخ یعقوب علی صاحب ۱۹۲۷ء میں یعنی ۱۲ سال پیشتر لندن میں مقیم تھے۔ وہاں سے مجھے انہوں نے یہ تحریر فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو یہ بتلایا کہ ہم عبداللہ الہ دین کے بھائیوں کو جو کچھ دیتے ہیں ان کے طفیل سے دیتے ہیں۔'' اس کا مجھے کوئی فخر نہیں کیوں کہ اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔ یہ سارا معاملہ خدا تعالیٰ کا ہے۔

دینی خدمت کے لیے وقت یا فرصت کی ضرورت ہے، مگر اس وقت ہماری تجارت اس قسم کی تھی کہ ہم کو صبح کے چار پانچ بجے سے رات کے نو دس بجے تک کام کرنا پڑتا تھا، مگر خدا تعالیٰ مجھ کو ان کاموں سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میرے دل میں حج کی تحریک پیدا کی۔ اس لیے میں اس کی تیاری میں لگا اور جو تجارتی کام میں دیکھتا تھا وہ میرے عزیز بھائی سیٹھ احمد الہ دین صاحب کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح میں آزاد ہوگیا اور دن رات ۱۸ گھنٹے دینی کاموں میں مصروف رہتا۔ خدا تعالیٰ نے میرے اس بھائی کا وجود میرے لیے ایک نعمت بنا دیا ہے۔ وہ باپ کی مانند میرا ادب کرتے ہیں اور اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ تجارت کا سارا کام کرتے ہیں اور تجارت میں جو کچھ منافع ہوتا ہے اس میں سے میرا مقرر کردہ حصہ مجھے برابر ادا کرتے ہیں۔ میں کچھ کام کرتا ہوں، تو وہ صرف دعا ہے۔ بھائی صاحب کو احمدی بزرگوں کی دعا پر کامل یقین ہے۔ اس لیے اگر کوئی خاص کام ہو تو وہ ان کے ذریعہ دعا کراتے ہیں اور صدہا روپے ان کو دیتے ہیں۔ حضرت امیر المؤمنین کے ذریعہ مشکل بلکہ ناممکن معاملات کے متعلق دعا کراتے ہیں اور اس میں خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے معجزانہ طور سے کامیابی حاصل ہوتی ہے، جس کے طفیل ان کو ایک ایک معاملہ میں لاکھ لاکھ روپے منافع ہوا ہے۔ اور یہ دس دس ہزار روپے بطور نذرانہ حضور کی خدمت میں ارسال کرتے ہیں اور مجھے بھی دس دس بیس بیس ہزار روپے منافع میں سے دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ دونوں جہاں میں خوش رکھے۔ آمین۔

یہ سب خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کے تصرفات کے نمونے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے دین کا خادم بنایا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق تمام ضروری سامان کا انتظام بھی آگے سے مقدر

کردیا ہے۔ ورنہ اس عاجز سے کیا ہوسکتا تھا۔ درحقیقت سارا کام وہ خود ہی کررہا ہے صرف نام ہے۔ بغیر ان سب انتظامات کے میں کیا کرسکتا تھا۔ کچھ نہیں، مطلق نہیں۔ س کے فضل واحسان کا طفیل ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

سیدنا حضرت امیر المؤمنین کا ایک خواب:

سیدنا حضرت امیر المؤمنین یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ خلیفہ ہیں۔ جو قرآن شریف کی سورہ نور کی آیت استخلاف سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ خدا تعالیٰ جس کسی کو اپنا نبی یا رسول یا خلیفہ یا اور کسی منصب پر مقرر فرماتا ہے تو اس پر اسی طرح کا فضل بھی کرتا ہے۔ احمدی جماعت کے ہزارہا لوگ حضرت امیر المؤمنین سے مختلف مواقع پر دعائیں کراتے ہیں اور وہ معجزانہ طور سے پوری ہوتی رہتی ہیں۔

دیکھو خدا تعالیٰ اس عاجز پر کیسے عظیم الشان احسانات کرتا چلا جارہا ہے اور گو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے الہاماً ظاہر بھی کردیا کہ وہ میری تقدیر کو چمکانے والا ہے، مگر میں نے مطلق سمجھا ہی نہیں، مگر خدا تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو میرے احمدی ہونے کے پیشتر بتلا دیا کہ خاکسار سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوجائے گا اور اس کا فضل خاکسار پر بارش کی طرح نازل ہوگا جس کے متعلق حضور خاکسار کو مارچ ۱۹۲۵ء کے عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

معلوم نہیں یہ یاد ہے کہ نہیں کہ آپ کے احمدی ہونے سے پہلے جب حیدرآباد سے غالباً مفتی صاحب نے آپ کے متعلق لکھا تھا کہ آپ احمدیت کی طرف مائل ہیں اور شاید جلد بیعت میں داخل ہو جاویں۔ تو میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ ایک بڑی عمارت میں بیٹھے ہیں، جس کے بیچ میں ایک بڑا صحن ہے، ایک تخت اس میں بچھا ہے اور آپ اس پر بیٹھے ہوئے ہیں اور میں نے دیکھا کہ آسمان سے خدا تعالیٰ کے فضل کی بارش بہ شکل نور ہورہی ہے اور آپ پر گررہی ہے۔ تب میں نے یقین کیا کہ آپ سلسلہ میں داخل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کے وجود کو مفید بنائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں اللہ تعالیٰ سے یقین کرتا ہوں کہ وہ اس خواب کو اور بھی زیادہ وضاحت سے آپ کی ذات اور آپ کے خاندان کے ذریعہ سے پورا کرے گا۔''

پھر ۱۹۳۳ء کے سالانہ جلسہ پر تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''حیدرآباد کی پرانی جماعت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی جماعت ہے، مگر بحیثیت تبلیغ بہت پیچھے ہے۔ البتہ بحیثیت فرد وہ دوسری جماعتوں کو چیلنج دے سکتی ہے۔ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب اس جماعت میں ایسے فرد ہیں کہ جنہیں دیکھ کر مجھے دوہری خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو خوشی ان کی تبلیغی خدمات کو دیکھ کر حاصل ہوتی ہے اور دوسری خوشی اس لیے کہ ان کے بیعت کرنے سے پہلے شیخ یعقوب علی صاحب نے مجھے لکھا کہ سکندرآباد میں ایک مخیّر سیٹھ ہیں، جو احمدیت کی طرف مائل ہیں۔ دعا کریں کہ وہ احمدیت میں داخل ہوجائیں۔ اس وقت میں نے دعا کی اور رؤیا دیکھا کہ تخت بچھا ہے۔ جس پر سیٹھ صاحب بیٹھے ہیں۔ رویاء میں ان کی میں نے جو شکل دیکھی بعینہ وہی شکل تھی جو میں نے اس وقت دیکھی جب وہ مجھے ملے۔ اس وقت آسمان کی کھڑکی کھلی اور میں نے دیکھا کہ فرشتے سیٹھ صاحب پر نور پھینک رہے ہیں۔ ان کے بیعت کرنے پر مجھے خوشی ہوئی کہ میرا خواب پورا ہوگیا، وہ اتنا وقت اور اتنا روپیہ تبلیغ احمدیت کے لیے صرف کرتے ہیں کہ کوئی اور فرد نہیں کرتا۔ تبلیغ احمدیت کے متعلق ان کا جوش ایسا ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پرانے صحابہ مولوی برہان الدین صاحب وغیرہ میں تھا اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا جوش اس طرح ہے جیسے سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب میں تھا۔''

جو میری رفیق زندگی کے متعلق ہے، میرا رشتہ ۱۹۰۳ء میں میرے احمدی ہونے کے ۱۲ سال پیشتر خوجہ قوم میں ہوا جس قوم کے مرد دین سے ناواقف ہوں۔ ان کی مستورات کا کیا حال ہوگا مگر خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے دین کا خادم بنانا مقدر کر رکھا تھا تو اس معاملہ میں بھی میرے لیے میرے مولیٰ نے ایک اعلیٰ انتظام کر رکھا تھا۔ میرے سسرال کا مکان دو منزلہ تھا۔ مکان کے نیچے کے حصہ میں ایک دیندار مسلم خاتون کرایہ سے رہتی تھی، وہ نماز روزہ کی پابند تھی۔ میری اہلیہ اس کے لیے وضو کا پانی لا دینا ایسی خدمت کرتی تھی۔ اس لیے وہ بہت دعائیں دیتی تھی اور ان کو

شریعت کی باتیں سمجھاتی تھی۔ اس طرح میری اہلیہ اپنے والدین کے مکان میں ہی نماز کی پابند ہوگئی تھیں۔ ان کے مکان کے لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ تیرے باپ دادا تو نماز جانتے ہی نہیں اور تو بڑی نماز پڑھنے لگی ہے۔ میری اہلیہ کو یہ فکر تھا کہ میری شادی ہوگی اور خاوند بے نمازی ہوگا تو وہ مجھے نماز پڑھنے نہ دے گا۔ مگر میں ہرگز نماز ترک نہ کروں گی چھپ کر یا راتوں کو پڑھ لیا کروں گی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے میرے رشتہ کے معاملہ میں بھی اپنے فضل سے ایسا انتظام کیا کہ میرا تعلق ایک نیک اور دیندار بیوی سے ہوگیا۔ میرے احمدی ہونے کے بعد وہ بھی احمدی ہوگئیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کے دل میں بھی خدمت دین کا شوق اور اخلاص ڈال دیا ہے۔ اس لیے وہ مجھے دینی معاملہ میں بھی بہت مددگار ہیں۔ اس کے علاوہ خانہ داری، بچوں کی تربیت ہمارے سوتیلے خاندان میں سب رشتہ داروں سے عمدہ سلوک، وقت بے وقت مہمان آجائیں تو اس کا انتظام، خود بیمار ہوں یا بچے بیمار ہوں تو اس کا انتظام خود ہی کر لینا، غرض مجھے کسی قسم کی تکلیف یا فکر تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کا نام سکینہ رکھوایا ہے، نام کے مطابق ان کی طرف سے مجھے ہر طرح سے آرام و تسکین ہے۔ الحمد للہ۔ ان کے متعلق سیدنا حضرت امیر المؤمنینؓ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کے خطبہ جمعہ میں فرماتے ہیں:۔

''ہماری جماعت کی عورتوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اخلاص رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ جیسا کہ مردوں میں مخلصین کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ چنانچہ دیکھتا ہوں اس تحریک کے ساتھ ہی ایسی مثالیں سامنے آنی شروع ہوگئی ہیں جو نہایت اعلیٰ اثر پیدا کرنے والی اور روحانیت کو ابھارنے والی ہیں۔ مثلاً ہماری جماعت میں سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب ایک نہایت ہی مخلص اور نہایت ہی قربانی کرنے والے آدمی ہیں وہ ذاتی طور پر اپنے اموال کا ایک بہت بڑا حصہ تبلیغ کے لیے ٹریکٹ اور رسالے شائع کرنے میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب ''ٹیچنگس آف اسلام'' یعنی اسلامی اصول کی فلاسفی ''ایکسٹرا کٹس فرام ہولی قرآن'' اور ''احمد'' جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں سے ہی اسلامی مسائل پر گہری روشنی ڈالی گئی ہے اور

اسی طرح بعض اور مسائل اپنے ذاتی خرچ پر شائع کر چکے ہیں اور ایک ایک کتاب کے چھ سات ایڈیشن نکل چکے اور ہزاروں کی تعداد میں یہ کتابیں دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ ان کی اہلیہ کے متعلق جو اخلاص میں انہی کے رنگ میں رنگیں ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ وہ کئی سالوں سے اپنے جیب خرچ کی رقم میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتی آ رہی تھیں اور اس وقت تک ہزار روپے جمع کر لیا تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ یہ اس قسم کی عظیم الشان تحریک نہیں جیسی مسجد لندن کی تعمیر کے لیے کی گئی تھی اور میں نے لکھا تھا کہ تمام جماعتوں کی خواتین تھوڑا تھوڑا کر کے یہ بوجھ اٹھائیں اور جس قدر آسانی سے چندہ دے سکتی ہیں۔ دیں۔ اور باوجود دوسروں نے بھی انہیں مشورہ دیا کہ اس جمع کردہ روپے میں سے ایک حصہ اپنے لیے بھی رکھ لیں۔ مگر انہوں نے ساری کی ساری رقم جو کئی سالوں سے جمع کر رہی تھیں، مسجد لندن کی مرمت کے لیے خدا کے راستہ میں دے دی۔ بعض عزیزوں نے بھی انہیں کہا کہ آپ ایک لمبے عرصہ سے یہ رقم ایک کام کے لیے جمع کر رہی تھیں اس لیے کچھ حصہ اس میں سے اپنی ضروریات کے لیے رکھ لیں۔ مگر انہوں نے کہا ''نیک کاموں کے لیے روز روز کہاں مواقع ملتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ مال میں دنیا میں جمع کروں، چاہتی ہوں کہ خدا کے بینک میں جمع ہو جائے۔''

واما بنعمت ربک فحدث:

یہ حلفیہ مضمون جو میں لکھ رہا ہوں وہ قادیان سے مکرمی محترمی اخویم مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبشر مولوی فاضل کے اعلان کے جواب میں ہے مگر اس کے سات سال پیشتر میری مخلص رفیق زندگی نے ایک دن کہا کہ خدا تعالیٰ نے آپ پر جو نعمتیں نوازش فرمائی ہیں وہ آپ لکھ رکھیں تو اچھا ہے مگر میں نے ضروری نہیں سمجھا۔ چند روز کے بعد پھر یاد دلایا۔ اس وقت بھی میں نے ٹال دیا تو یکا یک خدا تعالیٰ نے میرے دل میں **واما بنعمت ربک فحدث** کی آیت کی تحریک فرمائی۔ جب میں سمجھا کہ میری اہلیہ کی یہ تحریک خدا تعالیٰ کی طرف سے تھی اور یہ اس کا حکم ہے کہ میں اس کی نعمتوں کی کچھ تفصیل لکھ رکھوں۔ پھر میں نے یہ کام شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا

کہ کس قدر نعمتوں کی نوازش خدا تعالیٰ نے میری پیدائش کے وقت سے عطا فرمائی ہے۔ میں سمجھا چند صفحوں میں یہ کام ختم ہو جائے گا مگر جب لکھنے لگا تو ۱۴۰ صفحوں کی ایک موٹی کتاب ہوگئی۔ یہ کتاب میں نے گجراتی زبان میں لکھی ہے تا کہ ہمارے خاندان کے لوگ بھی پڑھ سکیں۔ اس کتاب میں سے جو خواب یا الہام والا مضمون میں نے یہاں بیان کیا ہے اور کچھ بیان کرنا باقی ہے۔ وہ بھی کر دیتا ہوں۔

بہت سے احمدی بزرگوں نے میرے متعلق خوابیں دیکھی تھیں اور وہ مجھے لکھ کر بھی بھیجتے تھے، مگر افسوس کہ میں انھیں محفوظ نہ رکھا۔ کچھ محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ یہاں درج کر دیتا ہوں۔

مکرمی اخویم حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ اپنے ۲۰ اگست ۱۹۲۶ء کے انگریزی خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

''جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ ہے۔ حضورؑ نے ایک اہم معاملہ میں جلسہ منعقد کرنے کا حکم فرمایا۔ جس میں صرف انہیں کو شامل کیا جائے جو اولین سابقین اور مخلصین میں سے ہوں۔ جلسہ مسجد مبارک کی چھت پر ہوا، جس میں میں نے آپ کو دیکھا گو کہ آپ دیر سے آئے۔ پھر بھی اچھے اعمال کی وجہ سے اولین میں شریک کیے گئے۔''

(۲) مکرم اخویم مولانا عبدالرحیم صاحب نیرؓ نے ایک خواب میں دیکھا کہ خاکسار بار بار یہ کہتا ہے کہ ''میرے تعلق کے لیے، خدا کے ساتھ تعلق ضروری ہے۔''

(۳) مکرم اخویم حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ اپنے ۲۳؍ جولائی ۱۹۲۹ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''آج رات میں نے ایک خواب دیکھا جو آپ کے خاندان کے متعلق ہے۔ میں نے چاہا کہ آپ کو لکھ دوں تا کہ جب اللہ تعالیٰ اسے کسی رنگ میں پورا کرے تو ایمان کے بڑھانے کا ذریعہ ہو۔ خواب یہ ہے:۔

میں اتفاقاً سکندر آباد گیا ہوں معلوم ہوا ہے کہ میں راج مندری سے سکندر آباد آیا ہوں۔ آپ کا مکان بہت عالیشان اور بہت وسیع ہے۔ اس کے احاطہ میں ایک نہر جاری ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ پانی اس کا نہایت شفاف ہے جیسے چاندی یا پارے کا ہو۔ اس

کے کنارے پر سنگ مرمر کی سیڑھیاں ہیں۔ میں نے وہاں بیٹھ کر وضو کیا۔ اس وقت آپ آکر مجھے ملے ہیں اور بہت ہی خوش اور جوش سے آپ نے مصافحہ اور معانقہ کیا ہے اور ساتھ لے کر دفتر کو گئے ہیں۔ یہ کمرہ مربع ہے اور بہت بڑا ہے، اس میں عزیز علی محمد انچارج ہیں۔

عزیز دوست محمد اور ان کا بھائی ان کو میں پہچانتا ہوں اور کچھ اور لوگ ہیں۔ یہ سب بڑی محبت سے ملے ہیں۔ آپ کے گھر کی مستورات بھی آئی ہیں لیکن والدہ علی محمد پردہ کر کے آئی ہیں۔ سیٹھ احمد کے گھر سے اور چھوٹی لڑکیاں وہ پردہ کر کے نہیں آئی، سب نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر اندر چلی گئی ہیں۔ میں وہاں عزیز محمد کے پاس بیٹھ گیا۔ اور انہوں نے مجھے ایک کتاب دکھائی اور وہ قرآن مجید کی لغت معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے کہا یہ میں نے تیار کی ہے۔ اس کا نام عقد الجواہر بتایا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے میں کہتا ہوں کہ آپ کو قرآن مجید کی خدمت کی بہت ہی بڑی توفیق ملی ہے۔ یہ دفتر دیکھتے دیکھتے بہت بڑا ہو گیا۔ سیٹھ علی محمد کا اپنا کام کرنے کا کمرہ بہت بڑا ہو گیا اور اس کا فرنیچر نہایت شاندار نظر آتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ یہ علمی اور خدمت دین کا کام ایک مستقل دفتر ہو گیا ہے۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ سید بشارت احمد صاحب آئے ہیں۔ کوئی شخص کہتا ہے کہ ان کا نام آسمان پر بشارت میرزا ہے۔ ان کا رنگ بہت روشن لباس صاف اور قیمتی اور سر کے بال نہایت سیاہ چمکدار اور بڑے ہیں۔ وہ بھی اپنی ایک لغت کی تصنیف مجھے دکھاتے ہیں۔ اس میں لفظ بے غرض کے معنے وہ پڑھ رہے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ عقد الجواہر میں جو بیان کیا گیا ہے وہ بہترین معنیٰ ہے۔ غرض اس قسم کی ایک پرلطف صحبت ہے۔ اس سلسلہ میں ٹیچنگس آف اسلام کا ذکر بھی آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت تیس ہزار تک پہنچی ہے۔

اسی اثناء میری آنکھ کھل گئی اور میں نے نماز فجر میں ان کے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اسے واقعات کے رنگ میں پورا کردے۔ اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کا فضل شامل حال رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سلسلہ اشاعت و تبلیغ ایک نہر کی صورت میں دنیا کو سیراب کرے گا اور اس میں سیٹھ علی محمد صاحب بھی دلچسپی اور حصہ لینے لگیں گے اور خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے کام میں برکت پر برکت دے گا اور اس کا فضل مجھے موقع دے کہ میں ان ترقیات کو دیکھوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

(۴) پھر آپ ۱۳؍جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں خاکسار کو تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ آپ کا نام مرزا ظفر اللہ خان ہے۔ میں بیدار ہوا اور دعا کی پھر سو گیا تو خواب میں حضرت خلیفہ اولؓ کو دیکھا اور میں ان کو خواب میں کہتا ہوں کہ آپ کا نام مرزا ظفر اللہ خان ہے۔ اور عبدالباسط بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کا لباس بہت صاف اور سفید ہے۔ میں نے دیکھا کہ دیر تک خواب ہی میں خواب سناتا رہا، پھر میں بیدار ہوا، تو مجھے بہت خوشی اور مسرت ہوئی۔ یہ خواب اپنی جگہ ایک حقیقت رکھتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے خاص محبت اور تعلق کی وجہ سے آپ کو بھی آسمان پر مرزا ہی کہا گیا ہے اور ظفر اللہ خان کا نام بتاتا ہے کہ خدا کے حضور کامیابیاں خاص طور پر مقدر ہیں پھر دوبارہ حضرت حکیم الامت کے رنگ میں رنگین دکھایا گیا گویا آپ کا اور ان کا وجود ایک ہی ہو گیا اور ان کا نام نورالدین تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نور دین آپ کو دیا ہے اور ایسی تکمیل اپنے رنگ سے فرمائے گا کہ نورالدین کی شان پیدا ہو جائے اور عبدالباسط حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا نام الہامی تھا جود وسخا اور ہمدردی مخلوق کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان کا نام عبدالباسط رکھا تھا۔ مجھے خواب میں آپ کے لیے تین صورتیں یا تین نام دکھائے گئے۔ مرزا ظفر اللہ خان، نورالدین، عبدالباسط۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحم سے یہ کیفیت آپ میں پیدا کردے اور کامل کردے اور مجھے بھی محروم نہ رکھے اور ہر مسلمان کے لیے یہ امتیاز بخشے کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے عشق و محبت میں گم ہو کر مرزا ہی ہو جائے اور ہر قسم کی کامیابیوں کو اپنے اندر جذب کرے اور صحیح معنوں میں نور الدین اور عبدالباسط ہو۔ آمین۔

پھر ایک اور خواب میں نے دیکھا کہ:

میرے ہاں مرحوم حافظ روشن علی صاحبؓ اور جناب مفتی فضل الرحمٰن صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ یہاں کب تشریف لائے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہیں رہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل و رحم خاکسار کے شامل حال ہے اور یہاں سے دین کی روشنی جاری ہے۔

(۶) پھر ایک اور خواب میں ان کو میرا نام عبدالقیوم بتایا گیا۔

(۷) میں نے دیکھا تھا کہ عبداللہ بھائی کے میز پر بہت سے ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں اور مختلف زبانوں میں لوگ بات کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے، مگر عبداللہ بھائی سمجھ رہے ہیں۔ بعد میں میں نے تعبیر کی کہ دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ان کو خط لکھتے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں۔

(۸) میرے ایک بہنوئی جناب سیٹھ عبداللہ میاں حاجی رحمت اللہ صاحب جو کئی سال سے سرفاضل بھائی کی عثمان شاہی میل کے ایجنٹ تھے اور ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اب وہ شاہی محلات کے افسر ہوئے ہیں۔ وہ مذہباً خوجہ شیعہ اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جب یہ بمبئی میں تھے تب اس فرقہ کی جماعت کے سیکرٹری تھے۔ یہ جب سکندرآباد تشریف لائے تو میں ان کو احمدیت کی تبلیغ کرتا رہتا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ ''میں نے رات کو ایک خواب دیکھا کہ میں ایک خراب بدبودار جگہ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ اتنے میں آپ آئے اور مجھے کہنے لگے کہ ''عبداللہ میاں آپ کیسی خراب بدبودار جگہ پر بیٹھے ہو۔ چلو اٹھو'' یہ کہہ کر آپ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہال میں لے آئے۔ وہاں میز پر فلاور پاٹ تھا۔ اس پر ٹیچنگس آف اسلام کتاب تھی۔ اس کے سنہری حروف برقی روشنی کی مانند چمکتے تھے۔ وہ بتلا کر آپ نے مجھے کہا ''دیکھو عبداللہ میاں حقیقی اسلام کس طرح چمکتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ اوپر کی منزل پر چلے گئے۔''

تعبیر بالکل صاف ہے۔ خراب بدبودار جگہ سے مراد ان کا فرقہ ہے۔ ٹیچنگس آف اسلام کے حروف برقی روشنی کی مانند چمکنا یہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب ہے۔ ان کا آشکار کیا ہوا۔ اسلام برقی روشنی کی مانند چمکتا ہے۔

(۹) مکرمی اخویم مولانا محمد بہاء الدین صاحب مرحوم جو دارالعلوم کے عربی کے مدرس تھے اور جماعت حیدرآباد کے ایک زبردست عالم تھے۔ پانچ سال پیشتر مورخہ ۲۱ دے ۴۳ ف پوسٹ کارڈ میں خاکسار کو تحریر فرماتے ہیں۔

''رات کو ایک خواب دیکھتا ہوں کہ میں ایک نہایت خوشنما محل کے ابتدائی ہال میں داخل ہوا ہوں۔ محل کی زمین شیشے کی ہے جیسا کہ محل سلیمان کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ صرح ممرد من قواریر اور جب کہ میں کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پیروں کے نیچے شیشہ ہے اور شیشے

کے نیچے شہد یا دودھ کی نہر چل رہی ہے۔ میرے قریب ابراہیم بھائی کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ عبداللہ بھائی محل کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ محل کی خوبی اور نفاست کا کیا ذکر کروں کہ صبح تک اس کا لطف مجھ کو آتا رہا۔ مطلب صاف ہے۔ خدا نیکوں کے ساتھ رکھے اور نیکوں کے ساتھ مارے۔''

(۱۰) چند سال پیشتر خاکسار نے اردو میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان یہ تھا کہ ''اہل اسلام کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔'' یہ مضمون لکھنے کے بعد ایک رات خواب میں خاکسار کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ خطاب کی نوازش ہوئی کہ تو ''ایم اے'' ''ایم اے'' یونیورسٹی کی طرف سے فضیلت کا اعلیٰ خطاب ہے۔ خدا تعالیٰ کسی کو کوئی خطاب عنایت فرماتا ہے تو اس کے مناسب اس پر کچھ نوازش بھی فرماتا ہے۔ ایم اے کا خطاب علم کے متعلق ہے۔ خدا تعالیٰ نے مذکورہ بالا رسالہ اہل اسلام میں بہت ہی مقبول فرمادیا۔ اس کی تعریف میں کئی خط آئے۔ اس کا ہر ایک اڈیشن کئی کئی ہزار کا تھا۔ اس کے ۱۲ اڈیشن ختم ہوگئے۔ حال میں تیرہواں چھپا ہے۔ دیکھو میں کیسا جاہل اور دینی علم سے بالکل ناواقف شخص تھا۔ اس کے ذریعہ مختلف زبانوں میں وقتاً فوقتاً ایسا لٹریچر شائع کروانا جو تمام جہاں میں مقبول ہوجائے۔ یہ کیا خدا تعالیٰ کی خاص نوازش کے بغیر ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

''گذشتہ ماہ رمضان المبارک میں خاکسار نے اور ایک اردو مضمون لکھا۔ اس کا عنوان ''خدا تعالیٰ کا ایک عظیم الشان پیغام'' تھا۔ یہ مضمون لکھنے کے بعد میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک بڑی عمارت ہے معلوم نہیں کہ وہ محل ہے یا جیل ہے۔ اس کی چار دیواری میں ایک دروازہ تھا۔ کسی نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس کا چوکھٹا تو نے بنایا میں نے جواب دیا، میں نے نہیں بنایا۔ یہ کام میں نہیں جانتا۔ تو مجھے جواب میں کہا گیا کہ یہ مضمون جو تو نے لکھا ہے وہ لوگ کہیں گے کہ تو نے لکھا، مگر تو نے نہیں لکھا، بلکہ خدا نے لکھا یا خدا نے لکھوایا۔ کہا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ اصل الفاظ خدا نے لکھا یا خدا نے لکھوایا۔

خدا تعالیٰ نے اس رسالہ کو بھی بہت مقبول فرمادیا۔ ہمارے سلسلہ کے منکرین ومخالفین کیا مسلم کیا غیر مسلم اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ رسالہ محض اس لیے دیکھا کہ یہ رسالہ ایک

احمدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے اس کو دیکھیں اور اس پر اعتراضات کریں۔ مگر ہم کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے علمی نوازش کا اور ایک نشان ہے۔ حق کے طالب مذکورہ بالا دونوں رسالے یا ان کے علاوہ اور بھی اردو، انگریزی، گجراتی وغیرہ زبانوں کا لٹریچر دیکھنا چاہتے ہوں تو صرف ایک کارڈ لکھنے سے ان کی خدمت میں مفت ارسال کر دیا جائے گا۔

اب میں میرا حلفیہ مضمون ختم کرتا ہوں۔ یہ مضمون کیا ہے، صرف خدا تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت واحمدیت کی صداقت کا زندہ نمونہ ہے۔

سلسلہ عالیہ احمدیہ کے منکرین ومخالفین ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ اگر یہ سلسلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو کیا وہ اپنے دین اسلام کی اشاعت کے لیے احمدی افراد پر اس قدر فضل واحسان نازل کرتا؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً نہیں۔ ہمارا کام تو صرف حق ظاہر کرنا ہے۔ وہ ہم جس طرح ہو سکتا ہے ادا کرتے ہیں۔

نوٹ: جناب سیٹھ صاحب موصوف نے حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی قبولیت دعا کے بھی بعض واقعات لکھ کر ارسال کیے ہیں، چوں کہ یہ واقعات بھی ازحد مفید اور مؤثر ہیں۔ اس لیے ان کو بھی طالبان حق کے لیے اسی مضمون کے ساتھ شائع کر دیا گیا ہے۔ (خاکسار مرتب)

قبولیت دعا کے واقعات عبداللہ الہ دین

خاکسار کو سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شامل ہو کر قریباً پچیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس درمیان کئی بار حضرت امیر المؤمنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز سے اشد ضروری امور کے لیے دعائیں کروانی پڑیں اور وہ سب معجزانہ طور پر قبولیت کا شرف پاتی رہیں، مگر افسوس کہ مجھے وہ تمام لکھ کر محفوظ رکھنے کا خیال تک نہ ہوا۔ خدا تعالیٰ میری یہ غفلت معاف فرمائے۔ اس وقت جو کچھ یاد ہے وہ درج کر دیتا ہوں۔

(۱) ۱۹۱۸ء میں میں نے میرے لڑکے علی محمد صاحب کو اور سیٹھ الہ دین ابراہیم

بھائی نے اپنے لڑکے فاضل بھائی کو قادیان تعلیم کے لیے روانہ کیا۔ علی محمدؐ صاحب نے ۱۹۲۰ء میں میٹرک پاس کر لیا۔ ان کو لندن جانا تھا۔ دونوں لڑکے مکان واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ یکا یک فاضل بھائی کو Typhoids بخار ہو گیا۔ نور ہاسپٹل کے معزز ڈاکٹر جناب حشمت اللہ صاحب اور حضرت خلیفہ رشید الدین صاحب نے جو کچھ ان سے ہو سکا سب کچھ کیا۔ طبیعت درست بھی ہو گئی مگر اس کے بعد بدپرہیزی کے سبب طبیعت پھر ایسی بگڑی کہ زندگی کی امید نہ رہی۔ جب یہ خبر حضرت امیر المؤمنین کو پہنچی تو حضور خود بورڈنگ میں تشریف لائے اور بہت دیر تک دعا فرمائی۔ اس کے بعد طبیعت معجزانہ طور پر سدھرنے لگی اور خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے فاضل بھائی کو نئی زندگی حاصل ہو گئی۔

یقیناً حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ موت نہیں ٹلتی مگر دعا سے یہ حقیقت ہم نے صاف طور سے اپنی نظر سے دیکھی۔ الحمدللہ

(۲) اسی طرح کا اور ایک واقعہ ہوا۔ میری تیسری لڑکی عزیزہ ہاجرہ بیگم کے پیٹ میں یکا یک درد ہو گیا، ہم نے اپنے قریب رہنے والے سرکاری خطاب یافتہ ڈاکٹر جو آنریری مجسٹریٹ بھی ہے۔ اسے بلوایا۔ اس نے دیکھ کر کہا لڑکی کے پیٹ میں پیپ ہو گیا ہے۔ فوراً آپریشن کر کے نکال دینا چاہیے ورنہ جان خطرہ میں ہے۔ وہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ مجھے سالانہ جلسہ پر ایک دو روز میں قادیان جانا تھا اور یہاں یہ حالت ہو گئی۔ پھر ہم نے یہاں کے ہاسپٹل کے بڑے یورپین ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس نے خوب معاینہ کیا اور کہا کہ نہ پیپ ہے نہ آپریشن کی ضرورت۔ ہم سب یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا، مگر وہ ڈاکٹر اپنی ہی رائے پر اڑا رہا کہ پیپ یقیناً ہے۔ فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر یہ لڑکی بچ جائے تو میں اپنی ڈاکٹری چھوڑ دوں گا، مگر ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی میں دوسرے روز قادیان روانہ ہو گیا۔ وہاں سے واپس آنے تک لڑکی اچھی رہی۔ مگر اس کے بعد یکا یک لڑکی کی ناف میں سوراخ ہو گیا اور اس قدر پیپ نکلی کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ہم نے پھر اسی ڈاکٹر کو بلوایا جس نے کہا تھا پیپ ہے۔ اب ہم آپریشن کے لیے بھی رضامند ہو گئے، مگر اس نے کہا کہ لڑکی کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے۔ اب آپریشن کا وقت نہیں رہا۔ اب یہ کیس Hopeless ہو گیا۔ ہم نے

دیکھا کہ اب کوئی علاج نہیں سوائے دعا کے۔ میں نے فوراً ایک تار امیر المؤمنین کی خدمت میں اور دوسرا الفضل کو روانہ کیا اور پھر ایک بار حضور کی دعا کا معجزانہ نتیجہ دیکھا کہ بغیر کسی ڈاکٹری علاج کے صرف ایک معمولی دائی کی دوائی سے میری پیاری لڑکی کامل صحت پا گئی۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔

حضرت امیر المؤمنین کے ارشاد کے مطابق میں نے اپنے لڑکے علی محمد صاحب کو I.C.S کے لیے لندن روانہ کیا۔ وہاں ان کو پہلے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنی ضروری تھی۔ مگر ایم اے میں اس قدر دیر ہوگئی کہ I.C.S کے لیے موقع نہ رہا۔ ایم اے کے سات مضامین میں سے چھ تو انہوں نے پاس کر لیے مگر آخری مضمون Constitutional Law اور Constitutional History میں متواتر فیل ہوتے گئے۔ اس لیے وہ ناامید ہوکر واپس چلے آنا چاہتے تھے۔ ان کو سات سال کا عرصہ ہوتا تھا اس لیے میں نے حضرت امیر المؤمنین سے ان کو واپس بلانے کی اجازت چاہی، مگر حضور نے فرمایا کہ میں نے خواب میں ان کا نام پاس ہونے والوں کی فہرست میں دیکھا ہے۔ اس لیے انشاء اللہ یہ یقیناً پاس ہوکر آئیں گے۔ اس لیے میں نے ان کو یہ کیفیت لکھی اور پھر کوشش کرنے کو کہا۔ انھوں نے پھر ایک بار کوشش کی، مگر پھر بھی فیل ہوگئے۔ یہ پریشان حالی میں تھے کہ اب آئندہ کیا کیا جائے۔ ان کے استاد کو جب معلوم ہوا کہ پھر فیل ہوگئے، تو اس نے تحقیق کی۔ معلوم نہیں، خدا تعالیٰ کا وہاں کیا کرشمہ ہوا کہ ایک دو روز میں ان کو یونیورسٹی کی طرف سے اطلاع ملی کہ آپ کے فیل ہونے کی خبر غلط تھی۔ آپ پاس ہوگئے ہو۔ یہ بہت خوش ہوئے اور سمجھ گئے کہ یہ محض خدا تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کا خواب پورا کرنے کے لیے ان پر یہ فضل کیا ہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور ڈگری حاصل کر کے حج کا موقع تھا۔ اس لیے واپس ہوتے ہوئے حج کر کے الحاج علی محمد ایم۔ اے بن کر ہم سے آ ملے۔ الحمد للہ۔ ثم الحمد للہ۔

سیٹھ جی ایم ابراہیم بھائی نامی ہمارے ایک ماموں تھے۔ وہ بمبئی کے ایک لکھپتی سیٹھ تھے۔ ان کو تجارت میں بہت نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر یورپ امریکہ چلے گئے۔ بیس سال کے بعد یورپین لیڈی سے شادی کر کے اپنی بیوہ بیٹی کو ملنے سکندرآباد آئے۔ بھوپال میں ان کو دو سو روپیہ کی سرکاری ملازمت ملی تو وہاں چلے گئے۔ چند سال کے بعد پھر واپس سکندرآباد

آئے۔ وہ پکے شیعہ تھے۔ میں نے ان کو احمدیت کی تبلیغ کی۔ آخر وہ احمدی ہوگئے۔ عیسائی ممالک میں رہنے سے بالکل بے دین ہوگئے تھے، مگر احمدی ہونے کے بعد ان میں بڑی تبدیلی ہوگئی۔ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ ہمیشہ تہجد پڑھا کرتے تھے۔ ۷۵ سال کی عمر تھی۔ پھر بھی سخت گرمی میں بھی روزہ ترک نہ کرتے تھے۔ اپنی آمدنی کا کافی حصہ للّٰہ خرچ کرتے تھے۔ جس رات وہ فوت ہوئے اسی رات خانصاحب دوست محمد الہ دین صاحب جو یہاں کے سپیشل مجسٹریٹ ہیں۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ہمارے ماموں صاحب کے بنگلے میں فوجی لوگ جمع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان کے افسر سے دریافت کیا کہ آپ لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں؟ اس نے کہا آج ایک بڑے بزرگ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کے اعزاز کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

اس مخلص بزرگ کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں: ایک بار ہم دونوں سالانہ جلسہ پر قادیان گئے۔ وہاں ہم کو ایک بھوپال کے دوست ملے۔ وہ ہمارے ماموں صاحب کا جی۔ ایم' ابراہیم نام سن کر کہنے لگے۔ آپ پر ایک فوجداری مقدمہ تیار ہورہا ہے۔ اس بارے میں آپ نے وہاں کے ایک بڑے افسر کے خلاف کچھ لکھا تھا۔ یہ کیفیت معلوم ہوتے ہی ہمارے ماموں صاحب بہت گھبرا گئے۔ مکرم معظم آنریبل چودھری سر ظفر اللہ خاں صاحب سے اُن کا بہت دوستانہ تھا۔ ان سے ملے۔ انہوں نے ان کو بہت تسلی دی۔ مگر یہ مطمئن نہ ہوئے۔ اور حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں اپنا یہ حال سنایا۔ حضور نے ان کے متعلق دعا فرمائی تو خدا تعالیٰ نے جواب میں فرمایا يَـانَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰٓى اِبْرَاهِيْم . یہ قرآن شریف کی وہ آیت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق نازل ہوئی تھی جس کے یہ معنی ہیں کہ اے آگ۔ تو ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجا۔ الحمد للہ عین اسی کے مطابق ہوا۔ بھوپال والے مقدمہ کی آگ بالکل ٹھنڈی ہوگئی اور یہ ابراہیم اس آگ سے بالکل سلامت نکل آئے۔

یہ کیسا عظیم الشان نشان ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا اپنے موعود خلیفہ کے ساتھ خاص تعلق ہے۔

(۳) ہمارے مکرم دوست جناب سید بشارت احمد صاحب جو جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن کے امیر ہیں۔ ان کے ایک ماموں نواب غوث الدین صاحب جو حیدرآباد کے

ایک امیر وجاگیر دار تھے ۔ ان کے لاولد فوت ہوجانے سے ہمارے سید صاحب اپنی والدہ صاحبہ کی جانب سے منجملہ اور ورثاء کے نواب صاحب کے اسٹیٹ کی تقسیم وغیرہ کے متعلق مختار ومجاز تھے ۔ ان کی ایک بلڈنگ نواب چال نام کی بمبئی میں تھی ۔ سید صاحب موصوف نے معہ دیگر ورثا ہم سے اس بلڈنگ کی فروخت کے متعلق معاملات شروع کئے ۔ تو ہم نے ایک بمبئی والے رشتہ دار کے ذریعہ اس کے متعلق دریافت کرکے سوا لاکھ روپیہ میں خرید کرلی ۔ اس خرید میں ہمارے بمبئی والے رشتہ دار اور ہمارے ایک ماموں سیٹھ الہ دین ابراہیم احمدی بھی شریک تھے ۔ ہم نے یہ بلڈنگ صرف اس لئے خرید کی کہ اس کو فروخت کرکے کچھ نفع حاصل کریں۔ ہم سب کو امید تھی کہ پندرہ بیس ہزار روپیہ منافع ہوجائے گا ۔ میں نے یہ شرط پیش کی کہ ہم اس کے متعلق حضرت امیرالمؤمنین سے دعا کرائیں ۔ اور ہم کو جو منافع ہو اس کا پانچواں حصہ ہم تبلیغ کے لئے قادیان روانہ کریں۔ میرے بھائی خان بہادر سیٹھ احمد بھائی نے اور ہمارے ماموں صاحب نے یہ شرط مان لی ۔ مگر ہمارے بمبئی والے رشتہ دار نے نہ مانی ۔ خیر اس کے بعد میں نے یہ حقیقت حضرت امیرالمؤمنین کی خدمت میں لکھ بھیجی ۔ اس کے بعد غیر معمولی طور پر اس جائیداد کی قیمت تیز ہونے لگی ۔ مجھے حج کے لئے جانا تھا اس لئے میں نے ہمارے بمبئی والے رشتہ دار کو لکھا کہ قیمت خوب تیز ہوگئی ہے اب اسے فروخت کردو۔ مگر ان کا خیال تھا کہ قیمت اور تیز ہوگی ۔ اس لئے ہم اور ٹھہریں یا جس قیمت میں یہ جائیداد مانگی جاتی ہے اسی قیمت پر ہم ان کو فروخت کردیں ہم نے منظور کیا۔ اور ہم کو اس میں اسی ہزار روپیہ منافع ہوا۔ جس کا پانچواں حصہ سولہ ہزار روپیہ میں نے قادیان روانہ کردیا۔ اس کے بعد حج کے لئے روانہ ہوگیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے بمبئی والے رشتہ دار سے جائیداد کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ

قیمت تو صرف ہمارے لیے تیز ہوئی تھی۔ ہمارے فروخت کردینے کے بعد قیمت کم ہوتی چلی گئی۔ حتی کہ اصل قیمت بھی وصول نہ ہوسکی۔ ہمارے رشتہ دار نے اقرار کیا کہ واقعی آپ دعا کروا کے کامیاب ہوگئے اور میں بہت نقصان میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اس واقعہ کو ۱۸ سال کا عرصہ ہوا، اب تک وہ جائیداد بغیر فروخت ہوئے ایسی ہی پڑی ہے۔ دیکھو یہ خدا تعالیٰ کا کیسا کھلا نشان ہے۔ ایک ہی معاملہ ہے جس کے تین حصہ دار ہیں ۔ دو حصہ دار خدا کے خلیفہ پر ایمان رکھتے ہیں

اور اس سے دعا کرواتے ہیں تو خدا تعالیٰ ان کو اسی ہزار روپے منافع عطا فرماتا ہے۔ مگر تیسرا حصہ دار نہ خدا کے خلیفہ کو مانتا ہے اور نہ اس کی دعا کی پروا کرتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس کو نہ صرف منافع سے محروم رکھتا ہے بلکہ ان دونوں مومن حصہ داروں کو اسی ہزار روپے اسی کی جیب سے دلواتا ہے۔ اس طرح اس کو نفع کے عوض اتنی بڑی رقم بطور جرمانہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ دیکھو یہ احمدیت کی صداقت کا کیسا عظیم الشان نشان ہے۔ جس کی آنکھ ہو وہ دیکھے اور عبرت حاصل کرے اور حق قبول کرے، ورنہ آخرت میں سخت بھگتنا پڑے گا۔

(۴) میرے بھائی خان بہادر سیٹھ احمد الہ دین صاحب کو حضرت امیرالمؤمنین کی دعاؤں کی تاثیر کا علم ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ بھی وقتاً فوقتاً حضور سے دعائیں کرواتے رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے دو اہم معاملات کے متعلق دعا کروائی ۔ دونوں امور میں عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی، جس کے نتیجہ میں ان کو دو لاکھ روپے کا منافع ہوا جس کی خوشی میں انہوں نے بیس ہزار روپے کا چک حضور کی خدمت میں روانہ کردیا۔

(۵) ہماری تجارتی فرم میں ہم چار بھائی مختلف کام دیکھتے تھے۔ خان بہادر احمد بھائی سیمنٹ اور کول کا کام دیکھتے تھے۔ غلام حسن بھائی آئیس اور سوڈا کا۔ قاسم بھائی دفتر کا۔ میں بونس کا۔

میں جب سے احمدی ہوا۔ تب سے مجھے حضرت امیرالمؤمنین کی دعاؤں کی تاثیرات کا خوب علم تھا۔ اس لیے میں میرے ذمہ جو کام تھا اس کی ترقی کے لیے حضور سے دعائیں کرواتا رہتا تھا، جس کے طفیل ہماری فرم کو سالانہ ایوریج دس ہزار روپے منافع ہوا کرتا تھا۔ میرے بھائی قاسم علی صاحب اہلحدیث ہوگئے اور میری مخالفت شروع کی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کو امرتسر سے بلوا کے خوب مخالفت کروائی، جس میں میرے غلام حسین بھائی بھی شریک ہوگئے۔ اب یہ دونوں بھائی میں جو کام دیکھتا تھا، اس میں دخل دینے لگے اور میں جو ماہوار رقم قادیان روانہ کرتا تھا، اس کے متعلق اعتراض کرنے لگے۔ اس لیے میں نے روپیہ بھیجنا موقوف کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فرم کو جو سالانہ دس ہزار روپیہ منافع ہوتا تھا وہ جاتا رہا تھا، بلکہ نقصان ہوتا رہا۔ آخر وہ وقت آیا کہ ہماری فرم نے یہ تجارت ترک کردی۔ تب میں نے اسے اپنے ذمہ لیا۔ میں نے حضور سے آگے کے مطابق دعا کروانی شروع کی اور ماہوار آگے جو ایک سو روپیہ روانہ کرتا تھا اس کے عوض

دوسو روپیہ روانہ کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو سالانہ ایوریج پندرہ ہزار روپیہ نفع ہونے لگا۔ الحمدللہ۔ثم الحمدللہ۔

(۶) اسی تجارتی معاملہ میں میں نے ایک بار دو کنٹراکٹ کیے۔ سولہ سوٹن مال نوے روپے کے حساب سے دینے کا سودا کیا۔ یہ نرخ بہت اچھا تھا۔ اس لیے اتنا بڑا کنٹراکٹ کردیا گیا۔ مگر چند روز میں نرخ ایک سوبیس روپیہ ہوگیا۔ اب سولہ سوٹن مال دینے میں فی ٹن تیس روپیہ کے حساب سے ۴۸۰۰۰ روپے کا نقصان تھا۔ میں بہت گھبرا گیا۔ میں نے حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں سارا حال لکھا اور خاص دعا کی درخواست کی۔ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے معاملہ کی صورت ایسی بدل گئی کہ ۴۸۰۰۰ نقصان کے عوض ۲۰۰۰۰ روپے منافع ہوا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

(۷) ہمارے دونوں بھائی جب بڑے اور سمجھدار ہوگئے تب ہم چاروں نے باہمی رضامندی سے ایک شراکت نامہ تیار کیا۔ جس کی مدت دس سال کی تھی۔ ہماری فرم کا قدیم سے یہ دستور تھا کہ ہم ہماری تجارت کا نفع نقصان کا حساب ہر ماہ نکالتے تھے۔ پھر ہر چھ ماہ کو کھاتوں میں درج کیا جاتا تھا۔ پھر سالانہ حساب دیکھ کر ہم سب بھائی دستخط کرکے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اس طرح دس سال ختم ہوگئے۔ جب نیا شراکت نامہ کرنے کا وقت آیا تو دونوں بھائیوں نے انکار کردیا اور مجھ پر اور خان بہادر احمد بھائی پر ایک ایک لاکھ سے زاید رقم کا مطالبہ کیا جب یہ اختلاف آپس میں دور نہ ہوسکا تو اس کے فیصلہ کے لئے تین مشہور معروف قانون دان ثالثین کا ایک بورڈ قائم کیا ہر ایک کو ایک ایک ہزار روپیہ فیس دی گئی۔

میں نے تمام حقیقت صحیح صحیح طور پر حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں لکھ بھیجی اور خاص دعا کے لئے گذارش کی۔ حضور نے جواب میں فرمایا۔ آپ بالکل بےفکر رہیں۔ آپ کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بلکہ آپ کے حق میں فائدہ ہی ہوگا۔ اگرچہ ثالثین بھی آپ کو نقصان پہنچانا چاہیں گے پھر بھی ہرگز وہ آپ کو نقصان نہ پہنچاسکیں گے۔ یہ معلوم کرکے میں بہت متعجب ہوا۔ کیونکہ ثالثین جو چاہیں سو فیصلہ کرسکتے ہیں ان کے فیصلہ کے خلاف اپیل بھی نہیں ہوسکتی۔ پھر ان کو کون روک سکتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور ہوا بھی وہی۔

ثالثین نے ہم چاروں بھائیوں کی سالانہ حساب کی ہماری تصدیقی دستخطیں بھی

دیکھیں۔ پھر بھی انہوں نے اول سے آخر تک ہمارے بھائیوں کے دعووں کی کامل تحقیق کی۔ یہ مقدمہ ایک سال سے زاید مدت تک جاری رہا۔ میرے خلاف ۱۱۴۷۸۳ روپے کے دعوے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے تمام کے تمام ڈسمس کردیئے گئے۔ صرف خرچ کے متعلق ۱۱۳۰۹ کی ڈگری ہوئی۔ مگر دوسرے بھائیوں کے خلاف بھی سفر خرچ وغیرہ کی ڈگری ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں مجھے ۳۴۱۴ روپے کا نفع ہوا۔

یہ ساری حقیقت لکھنے کی غرض صرف یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؓ نے میرے متعلق جو دعا فرمائی اور حضور کو خدا تعالیٰ نے اس معاملہ میں جو کچھ بتلایا وہ حرف حرف صحیح ثابت ہوا۔ صرف ایک بات باقی رہ گئی کہ ثالثین بھی اگر نقصان پہنچانا چاہیں گے پھر بھی ہرگز وہ نقصان نہ پہنچاسکیں گے۔ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہمارے مقدمہ کا فیصلہ ہوجانے کے بعد میں ہمارے تین ثالثین جن میں ایک پارسی صاحب تھے اور دو غیر احمدی صاحبان تھے۔ تو میں ایک دن ان پارسی صاحب کے پاس گیا اور ان سے دریافت کیا آپ لوگوں نے ہمارے مقدمہ کا فیصلہ کیا۔ کیا وہ آپ تینوں کی اتفاق رائے سے ہوا' یا آپ کے درمیان کچھ اختلاف بھی ہوا؟ انہوں نے فرمایا: مقدمہ کے تمام اشوز کا فیصلہ ہم تینوں کے اتفاق رائے سے ہوا۔ صرف آپ ہی کے متعلق اختلاف ہوا۔ بمبئی والی جائیداد کے متعلق آپ نے خلیفہ قادیان سے دعا کرائی۔ اور اسی ہزار (۸۰۰۰۰) روپے نفع ہوا۔ اس کا پانچواں حصہ ۱۶۰۰۰ روپے آپ نے قادیان روانہ کردیا۔ ان دونوں ثالثین کی یہ رائے تھی کہ وہ رقم آپ کے ذمہ لگائی جائے۔ میں نے ان سے اتفاق نہیں کیا صرف اسی ایک اشو کے لئے ہم کو تین بار میٹنگ کرنی پڑی۔ آخر وہ میرے ساتھ متفق ہوگئے۔ دیکھو اس مقدمہ سے خدا تعالیٰ کی قدرت کا کیسا عظیم الشان نشان ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے عالم الغیب ہونے کی صفت کیسی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت امیر المؤمنین یقیناً خدا تعالیٰ کے موعود خلیفہ ہیں۔ تب ہی تو ایسی عظیم الشان راز کی بات قبل از وقت آپ پر کھول دی گئی۔

غلام حسین بھائی اور قاسم علی بھائی نے مجھ پر دنیوی اور دینی دونوں معاملوں میں حملے کیے، مگر میں حق پر تھا۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے مجھے معجزانہ طور سے کامیابی عطا فرمائی۔ اسی طرح انشاء اللہ دینی معاملہ میں بھی ہوگا۔ مگر اس کا نتیجہ بعد وفات معلوم ہوگا۔ میری درد دل سے دعا ہے

کہ خدا تعالیٰ میرے ان دونوں پیارے بھائیوں پر رحم فرمائے اور ان کو حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تا آخرت میں وہ فلاح پائیں۔ آمین

اب میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں جس کے دل میں تعصب نہ ہوگا اس پر سلسلہ عالیہ احمدیہ کی صداقت صاف طور سے کھل جائے گی، جو اس سلسلہ میں شریک ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے ایسے محبوب خلیفہ سے اپنا تعلق جوڑتا ہے، جس کی تعلیم و دعا سے انسان یقیناً دونوں جہاں میں فلاح پاتا ہے۔

واخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

(۲۷ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ م ۱۰/ نومبر ۱۹۳۹ء)

سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے تبلیغی ثمرات

احمدیت قبول کرنے والوں میں سے جن کے نام معلوم ہوسکے، درج کیے جاتے ہیں:

آپ کی اہلیہ محترمہ آپ کے برادران نسبتی فاضل کرم علی صاحب (مدفون بہشتی مقبرہ قادیان) و غلام حسین کرم علی صاحب، جی ایم ابراہیم صاحب اور ان کی صاحبزادی شہر بانو بیگم صاحبہ سیٹھ الہ دین ابراہیم صاحب، سکندرآباد۔ سید غلام دستگیر صاحب مرحوم ساکن فلک نما، حیدرآباد دکن۔ سید حسین صاحب ساکن کاچی گوڑہ حیدرآباد دکن، عبدالصمد صاحب مرحوم ساکن جڑچرلہ ضلع محبوب نگر، آندھرا پردیش عبدالغفور صاحب حیدرآباد (جو تبلیغی کتب فروخت کرتے تھے)، عبدالحی صاحب حیدرآباد، محمود صاحب سکندرآباد، محمد حسین صاحب ممبئی، آرٹش عبداللہ احمد مرے، اور خان بہادر نواب احمد نواز، جنگ صاحب کے علاوہ

سید غلام دستگیر صاحب اور ان کے فرزند سید جہانگیر علی صاحب بمنظوری حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ۱۹۹۱ء امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد کے عہدے سے سرفراز کیے گئے۔ موصوف ڈسمبر ۱۹۹۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ دوسرے فرزند ڈاکٹر سید جعفر علی صاحب، ایم بی بی ایس امریکہ میں ہیں۔
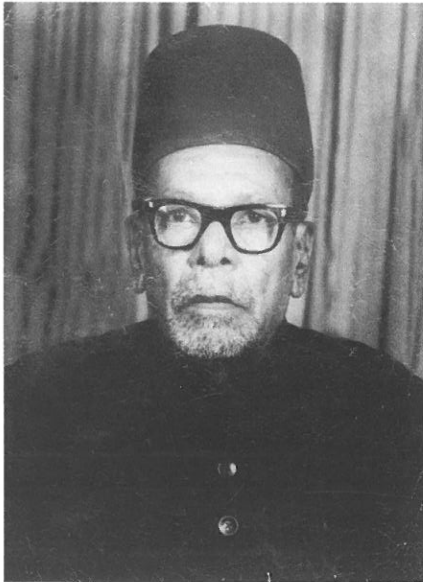
میرے والد سید غلام دستگیر مرحوم تبلیغی ثمرہ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب مرحوم (مولف)

میرے ماموں سید حسین صاحب مرحوم تبلیغی ثمرہ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب مرحوم (مولف)

ایک آئرش نومسلم عبداللہ احمد مرے قادیان میں دینی تعلیم کے لیے آئے تھے۔ اردو بہت اچھی طرح بولتے تھے۔ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے ذریعے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ (الفضل ۱۵ جنوری ۱۹۳۰)

عبداللہ احمد صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ مجھے مختلف مذاہب کے مطالعے کا شوق تھا۔ صداقت اسلام کا میں قائل ہوگیا اور ایک یورپین نومسلم سے خط وکتابت کرنے پر میں نے اسلام قبول کرلیا، جس سے میری ساڑھے تین سو روپے ماہوار کی ملازمت سے جواب مل گیا۔ پھر میں سکندر آباد آ گیا تو وہاں ایک فرشتہ سیرت انسان عبداللہ الہ دین سے میرا تعارف ہوگیا اور وہ میرے گہرے دوست ہوگئے۔'' ان سے احمدیت کے بارے میں تعارف ہوا اور مجھ پر مزید محاسن اسلام کھلے اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اب بھی اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ سو میں نے احمدیت قبول کرلی جس پر مجھے زیادہ ایذا ملنے لگی۔ (الفضل ۹/۵ فروری ۱۹۳۰ء۔ صفحہ ۱۰، ۱۱)

حضرت سیٹھ صاحب کے برادر سیٹھ احمد الہ دین صاحب (بعدہ نواب احمد نواز جنگ) کی مخفی بیعت کا ذکر حضرت مصلح موعودؓ کے ایک مکتوب بنام حضرت سیٹھ صاحب مورخہ ۸/اگست ۱۹۴۹ء میں ہے۔ مسجد لندن کے تعمیر ہونے پر موصوف نے ایک سو پونڈ کا قالین دیا اور اس رمضان میں ان کے لیے بھی خصوصی دعائیں کرنے کا ذکر ہے۔

ریویو (انگریزی) کے لیے تحریک ہونے پر ایک سال کے لیے آپ نے ایک سو روپے کی خریداری کی۔ (الفضل ۷ دسمبر ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۳۔ وصداقت احمدیت ...... نشانات صفحہ ۲۰۶ وغیرہ۔

حضور کی خدمت میں دس دس ہزار روپے پیش کیا تھا۔ حضور نے سفر دکن میں ان کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ قریباً چودہ ہزار روپے تحریک جدید دور اول میں دیا۔ (پانچ ہزاری فوج) آپ نے ۲۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کو وفات پائی۔

سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کا سپاس نامہ

بتقریب افتتاحی احمدیہ جوبلی بلڈنگ افضل گنج

معزز حضرات! آج ہم جس نئی تعمیر شدہ بلڈنگ میں جمع ہوئے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے اپنے اندر دو عظیم الشان نشان رکھتی ہے۔

پہلا نشان تمام جہاں کے لئے ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے سرکار دوعالم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعہ جو اعلان کروایا تھا کہ ان اللّٰہ یبعث لھذہ لا مة علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا ۔یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایک ایسے شخص کو مبعوث فرمائے گا جو ان کے لئے ان کا دین تازہ کرے گا۔اس ربانی اعلان کے مطابق اس چودھویں صدی کے شروع میں خدا تعالیٰ نے حضرت میرزا غلام احمدؑ نامی ایک عظیم الشان بزرگ کو اسلامی امت کے لئے اس صدی کا مجدد بنا کر قادیان میں مبعوث فرمایا، جس کو آج پچاس سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں خدا تعالیٰ نے آپ کو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ارشاد کے مطابق عیسائیوں کے صلیبی مذہب کی تردید کے لئے مسیح موعود کے نام سے دنیا میں مبعوث کیا جس کو آج چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے، جس طرح گزشتہ زمانوں میں جب کبھی کسی ربانی مصلح کا ظہور ہوا تو اس کی سخت مخالفت کی گئی۔اس طرح یہ سلسلہ بھی مخالفت سے محفوظ نہ رہا۔ دنیا نے آپ کو اور آپ کے سلسلہ کو کچل ڈالنے کی ہر طرح کی کوشش کی، مگر جس کو خود خدا تعالیٰ نے دنیا کی رہنمائی کے لئے اپنا مامور ومرسل بنایا ہو اس کو کون کچل سکتا ہے۔پس وہ خود ہر حال میں اس کا حافظ وناصر رہا اور اس کے سلسلہ کو وہ ترقی عطا فرمائی کہ باوجود دنیا کی سخت مخالفت کے اس کی تبلیغ دنیا کے کناروں تک پہنچ گئی اور لاکھوں سعید روحیں اس کے ماننے والی ہوگئیں اور خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم کو اب وہ وقت نصیب ہوا ہے کہ جس میں ایک طرح سے اس کی چالیس سالہ اور دوسری طرح سے پچاس سالہ جوبلی منائی جائے۔خدا تعالیٰ کے فضل ورحم سے اس عظیم الشان موقع کی یادگار دکن میں قائم کرنے کے لئے

ایسا انتظام مقدر کیا گیا کہ جس کے باعث یہ بلڈنگ عین وقت میں تعمیر ہو کر احمدیہ جوبلی بلڈنگ کے نام سے وجود میں آگئی۔الحمد للہ علی ذلک۔

الہ دین خاندان کے لئے ایک نشان:

اس کے بعد یہ بلڈنگ جو دوسرا نشان اپنے اندر رکھتی ہے اس کا تعلق خاص ہمارے الہ دین فیملی سے ہے۔وہ اس طرح کہ ہمارے سارے خاندان کا اصلی مذہب آغا خانی تھا، مگر اس ملک دکن میں ان کے بعد رفتہ رفتہ ہمارے عقائد مختلف ہوگئے ۔خصوصاً مجھ پر اور میرے ایک عزیز بھائی پر ہمارے ایک اہلحدیث دوست کی صحبت کی وجہ سے ان کے عقائد کا گہرا اثر ہوگیا۔اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں ہمارے یہاں جماعت احمدیہ کے تین مشہور مبلغ اصحاب تشریف لے آئے اور ہمارے مکان میں کئی ماہ تک قرآن شریف کا درس وتبلیغ احمدیت کا سلسلہ جاری رہا، چونکہ ہمارے اہل حدیث دوست نے میرے دل میں احمدیت کے خلاف بہت ہی نفرت ڈال دی تھی، اس لئے میں نے بہت عرصہ تک احمدیت کی طرف خاص طور سے کوئی توجہ نہ کی۔ صرف قرآن شریف کا درس ہی سنتا رہا۔ اگرچہ مجھے قادیان سے احمدیت کے متعلق بہت سی کتب بھی منگوا کر دی گئیں۔مگر میں اس میں سے صرف وہی حصہ دیکھا کرتا جس میں اسلام اور بانی اسلامؐ کی خوبیوں کا بیان ہوتا اور جہاں کہیں حضرت عیسیٰؑ کی وفات یا صداقتِ مسیح موعود کا ذکر آتا تو وہ حصہ صاف ہی چھوڑ دیتا۔

ان دنوں میری نظر سے ایک حدیث گزری جس میں لکھا تھا کہ ایک روز کے وقفہ سے متواتر روزے رکھتے رہنا خدا تعالیٰ کی بڑی رضا مندی کا کام ہے۔اس لئے میں نے خدا تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے کئی ماہ تک مہینہ میں پندرہ روزے برابر رکھتا رہا اور اس کے ساتھ اھدنا الصراط المستقیم کا بھی بہت ورد کرتا رہا۔اس درمیان میں ایک واقعہ سے میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوگیا کہ اگر حضرت میرزا صاحب درحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث شدہ مرسل ہیں تو ہمارے مرنے کے بعد یقیناً ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو منکرین رسول کا ہوا کرتا ہے۔اس خیال سے مجھے فکر پیدا ہوگئی اور میں توجہ سے دلائل بھی سننے لگا اور کتب بھی غور سے دیکھنے لگا۔جس کے سبب رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ کے فضل ورحم سے عاجز پر صداقت احمدیت کھل گئی۔

مگر پھر بھی اپنے اہل حدیث دوست کی صحبت کی وجہ سے میں نے سلسلہ احمدیہ میں ظاہرا طور سے
شریک ہونا نہ چاہا تو آخر ایک رات میں خواب میں دیکھا کہ میں اپنے اہل حدیث دوست اور
دوسرے شخص کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں اور کسی کی مذمت ہو رہی ہے۔ اتنے میں پولیس آئی اور ہم
تینوں کو گرفتار کر کے سکندر آباد کے کورٹ آفس میں جا کھڑا کیا اور ہم تینوں کو مجسٹریٹ نے آٹھ
آٹھ روز کی قید کی سزا دی تب میں جیل میں رو رہا ہوں کہ مذمت تو میرے اہل حدیث نے کی،
مگر میں ناحق گرفتار ہو گیا تو مجھے سمجھایا گیا کہ تو نے اس کی صحبت کیوں اختیار کی۔ تب میں سمجھ گیا
کہ وہ اہلحدیث دوست تو احمدیت کا مخالف ہے۔ اس لئے وہ اس کے متعلق برا بھلا کہتا ہے، مگر
چونکہ مجھ پر احمدیت کی صداقت کھل گئی ہے۔ باوجود اس کے میں نے اس کی صحبت ترک نہ کی۔
اس لئے رویا میں مجھے اس جہاں میں قید کی سزا ہوئی اور اس پر بھی اگر اس کی صحبت ترک نہ کی گئی
تو آخرت میں جہنم کی سزا ہوگی۔ یہ خواب میں نے اپنے اہل حدیث دوست کو سنا دیا اور بعد میں
یہ سلسلہ احمدیہ میں شامل ہو گیا۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے دن بدن میرا ایمان صداقت احمدیت کے
متعلق اور بھی پختہ ہوتا گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی رضا مندی اور مخلوق کی خیر خواہی کا
اس سے بہتر کوئی کام نہیں کہ احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی صداقت تمام جہاں میں آشکار کی جائے۔
اس لئے میں اپنی جان و مال سے دن رات تبلیغی کام میں لگا رہا اور سالانہ دس بارہ ہزار روپیہ تک
خرچ کرتا رہا۔ مگر اس کے خلاف میرے عزیز بھائی کا تعلق جماعت اہلحدیث کے ساتھ پختہ
ہو گیا۔ اور انہوں نے احمدیت کو اسلام کے خلاف کوئی جھوٹا مذہب گمان کر کے، اس کی مخالفت
شروع کر دی۔ اور سلسلہ احمدیہ کے اشد ترین مخالف مولوی ثناء اللہ صاحب کو امرتسر سے بلایا گیا
اور جابجا سکندر آباد و حیدر آباد میں احمدیت کے خلاف جلسے کئے گئے۔ اور مخالفت کی آگ خوب
بھڑکائی گئی۔ قریباً دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کے بعد وہ چلے گئے اور یہاں میرے اہل حدیث بھائی صاحب میری مخالفت میں
اور بھی دلیر ہو گئے۔ یہاں تک کہ تبلیغ احمدیت کے لئے میں جس ذریعہ سے ہزارہا روپیہ خرچ
کر سکتا تھا اس میں رکاوٹ ڈال دی۔

مگر حقیقی اسلام کی تبلیغ خدا تعالیٰ کی رضا مندی اور اس کی مخلوق کی خیر خواہی کا کام تھا۔
اس لئے خدا تعالیٰ کی غیرت نے یہ مطلق برداشت نہ کیا کہ اس طرح سے میرے تبلیغی کام میں
رکاوٹ ڈالی جائے۔ اس لئے اس رحمان و رحیم خدا نے میرے عزیز بھائی خان بہادر احمد الہ دین
صاحب کے دل میں ایک ایسی تحریک کر دی کہ جس کی وجہ سے انہوں نے بلا میری درخواست کے
مجھ سے یہ کہا کہ آپ فکر نہ کریں، میں اپنے خانگی معاملے کے منافع سے آپ کو پانچواں حصہ دیا
کروں گا، اس وقت ان کا کوئی ایسا خاص معاملہ نہ تھا، مگر جیسا کہ انہوں نے مجھ سے یہ عہد کیا اس
وقت سے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے ہاتھ ایسے معاملات آنے شروع ہوئے کہ جس
کے طفیل ان کو ہزارہا روپے کا منافع حاصل ہوتا رہا، جس کا وہ مجھے اپنے عہد کے مطابق پانچواں
حصہ برابر دیتے رہے۔ اس طرح میرے تبلیغی کام میں خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی رکاوٹ
نہ آنے پائی۔ خدا تعالیٰ کی غیرت کا یہ ایک زبردست نشان ہے جو اس نے صداقت احمدیت کے
لئے ہمارے خاندان میں ظاہر کیا۔

لوگوں کے لئے ایک نشان:

مگر خدا تعالیٰ نے اسی پر بس نہ کی، بلکہ وہ صداقت احمدیت کے متعلق اپنی غیرت کا
نشان نمایاں طور پر یہ دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ہم کو ہمارے لیکچروں کے لئے
کوئی جگہ حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ جو ملی وہ شہر سے بہت دور زیر کٹہ تالاب
میر جملہ گلیوں کے اندر واقع ہے۔

مجھ کو بارہا یہ خیال ہوتا تھا کہ ہماری جماعت ایک تبلیغی جماعت ہے اس لئے ہماری
انجمن کو پبلک میں نمایاں ہو کر رہنا بہت ضروری ہے، مگر کوئی صورت اس قادر خدا کو اس خاکسار
کے ذریعہ اس کے متعلق بھی ایک نشان دکھلانا منظور تھا۔ اس لئے خدا کے فضل نے ایسا انتظام کیا
کہ جس میں آج ہم جمع ہوئے ہیں۔ بغیر ہماری کسی طرح کی کوشش یا وہم و گمان کے مفت میں
حاصل ہو گئی اور اس کے ساتھ ایک معقول رقم کی مستقل ماہوار آمدنی بھی جاری کروا دی۔ جس
کے لیے ہم جس قدر بھی اس رحمان و رحیم و قادر خدا کا شکریہ بجالائیں کم ہے۔ **الحمد للہ.**
اس بلڈنگ کے لئے بیس سے پچیس ہزار روپے کے خرچ کی ضرورت تھی، مگر خدا تعالیٰ

کے فضل وکرم سے ہماری جماعت کو نہ تو خرید زمین کے لئے اور نہ تعمیر کے لئے......کوئی خرچ کرنا پڑا۔ یہ محض اس رحمان ورحیم کی رحمانیت کا عطیہ ونشان کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ اس طرح ہوا کہ میرے عزیز بھائی احمد الہ دین صاحب کے ہاتھ ایک ایسا معاملہ آیا جس کا خود ان کو بھی کوئی گمان و وہم تک نہ تھا اور اس معاملہ میں ان کو ایک لاکھ سے زائد روپے کا منافعہ ہوا، جس کا انہوں نے اپنے عہد کے مطابق پانچواں حصہ مجھ کو دیا، گویا عین اس بلڈنگ کی تعمیر وخرید زمین کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت تھی وہ غائبانہ طور سے حاصل ہوگئی اور باقی رقم کی انہوں نے خود بھی ایک عالی شان بلڈنگ چار مینار روڈ پر تعمیر کرواکے اس کی تمام آمدنی سلطنت آصفیہ کے مسلم طالب علموں کی امداد کے لئے وقف کردی۔ **الحمد للہ۔**

حق و باطل کی تمیز کے لئے عام فہم قانون:

ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو اپنے طرف سے مامور و مرسل بنا کر دنیا کی رہنمائی کے لئے مبعوث فرماتا ہے اس کے خلاف خواہ کیسی ہی مخالفت اندرونی یا بیرونی طور سے کی جائے، مگر وہ ہر حال میں اس کا حافظ و ناصر ہوتا ہے اور اس کے سلسلہ کو وہ ترقی دیتا ہے، جو انسانوں کے گمان و وہم سے بالاتر ہوتی ہے۔ جس کا ایک زندہ ثبوت اس ملک کے لوگوں کے لئے یہ احمدیہ جوبلی بلڈنگ ہے۔

خدا تعالیٰ کا یہ قانون یاد رکھنا چاہیے کہ وہ نبوت کے سچے مدعی کو باوجود سخت مخالفت کے رفتہ رفتہ ترقی ہی دیتا چلا جاتا ہے، مگر اس کے خلاف جھوٹے مدعی کو ہرگز ایسی ترقی نہیں دی جاتی بلکہ وہ خود قتل کیا جاتا ہے اور اس کا سارا سلسلہ رفتہ رفتہ تباہ و برباد ہوکر دنیا سے نیست و نابود ہوجاتا ہے، جس کا ثبوت توریت، انجیل وقرآن شریف سے ظاہر ہے، جس کا ہمارے مخالفین کو بھی اقرار ہے۔ جیسا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب اپنی تفسیر ثنائی کے صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں کہ:

''نظام الٰہی میں جہاں اور قوانین الٰہی ہیں۔ یہ بھی ہے کہ کاذب مدعی کو ترقی نہیں ہوتی، بلکہ وہ جان سے مارا جاتا ہے۔ واقعات گزشتہ سے بھی اس امر کا ثبوت پہنچتا ہے۔ خدا نے کبھی کسی جھوٹے نبی کو سرسبز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں باوجود غیر متناہی مذاہب ہونے کے جھوٹے نبی کی امت کا ثبوت مخالف بھی نہیں بتلا سکتے۔''

دیکھو خدا تعالیٰ نے سچے اور جھوٹے نبی کو پرکھنے کا کیسا صاف اور عام فہم طریق دنیا پر ظاہر کر رکھا ہے۔ کاش لوگ ایسے اہم معاملہ کے متعلق خدا تعالیٰ کا خوف رکھ کر غور کریں اور سمجھیں ورنہ آخر ہم سب کو ایک دن مرنا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

خان بہادر احمد الہ دین صاحب کا شکریہ:

اب میں اپنا مضمون ختم کرنے سے پیشتر اپنے عزیز بھائی خان بہادر سیٹھ احمد الہ دین صاحب کا بھی بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا فضل اور احسان ہے کہ اس نے اپنا ایک عظیم الشان نشان ظاہر کرنے کے لئے آپ کو چن لیا اور ایک ذریعہ بنایا اور ہم سب دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ پر مزید فضل واحسان فرما کر اس زمانہ میں جو عظیم الشان حق اس نے نازل فرمایا ہے اس کو ظاہری طور پر قبول کرنے کی آپ کو توفیق عطا فرمائے۔ اور جس طرح اس نے اپنے فضل واحسان سے آپ کو اس جہاں میں معزز و خوش نصیب بنایا ہے اس سے بڑھ کر آخرت میں بھی معزز وخوش نصیب بنائے اور حقیقی معزز و خوش نصیب وہی ہے جو آخرت میں بھی خدا تعالیٰ کے فضل واحسان کا وارث ہو۔

اب ہم سب کی یہ جامع دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے فضل ورحم سے میرے دوسرے عزیز بھائیوں کو بلکہ ہمارے سارے خاندان کو اور نہ صرف ان عزیزوں کو بلکہ اس سلطنت آصفیہ کے عظیم الشان سلطان کو جس کے زیر سایہ ہم آزادی اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں اور حضور کے شاہزادگان کو۔ حضور کے حکام کو، حضور کی رعایا کو، بلکہ کل جہاں کے تمام مرد وزن کو، جو حق کے طالب ہیں۔ ان کے لئے یہ حقانی معاملہ سمجھنا آسان کردے۔ تا کہ موجودہ خطرناک حالت تبدیل ہوجائے اور ہر طرف صلح وامن قائم ہوجائے، پھر آخرت میں بھی یہ سب خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کے وارث ہوجائیں۔

اس کے بعد میں ہمارے مکرم عزیز عالی جناب سیٹھ مہر علی فاضل صاحب کا بہت بہت

شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت سے جس طرح اس شہر کو خوبصورت بنادیا ہے اور بنار ہے ہیں اسی طرح اس چھوٹی سی بلڈنگ کو بھی خوبصورت بنانے کے لئے عمدہ نقشہ تیار کیا اور وقتاً فوقتاً تکلیف فرما کر یہاں تشریف لاتے رہے اور تعمیر کے متعلق مناسب ہدایات فرماتے رہے۔ وہ بھی محض للہ۔ اس لئے ہماری دلی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں میں اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ خدا تعالیٰ نے جس طرح اپنے فضل واحسان سے ہماری جماعت کو یہ بلڈنگ مفت میں دلوادی۔ اسی طرح ایسے ایکسپرٹ یعنی ماہرین کی خدمات بھی مفت میں عطا فرمائیں۔

میری خواہش ہے کہ خدا تعالیٰ کے اس عطیہ میں اس شہر کی رعایا بھی حصہ لے سکے۔ اس لئے میں بہت خوشی سے اس موقع پر یہ اعلان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ احمدیہ جوبلی ہال عموماً بلا قید مذہب وملت ہر ایسی تقریب کے لئے جو رعایائے سرکار عالی کے مختلف فرقوں میں ارتباط ومحبت بڑھانے والی ہو۔ اور بالخصوص مسلمانان جملہ فرقہ ہائے اسلامی کے متحدہ ومتفقہ اغراض کے لئے ہر وقت استعمال کے لئے دیا جاسکے گا۔ ضرورت مند احباب بوقت ضرورت صرف ہماری انجمن احمدیہ کے جنرل سکریٹری جناب مولوی سید بشارت احمد صاحب وکیل ہائی کورٹ سے درخواست کر کے اجازت حاصل فرماسکتے ہیں۔

اب میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں اور اپنی جماعت کے بزرگ مولانا الحاج عبدالرحیم صاحب نیر مبلغ انگلستان وافریقہ کی خدمت میں مودبانہ عرض کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے دستِ مبارک سے اس بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، اس طرح اب اس کا افتتاح بھی کیا جائے۔ اور اس ہال کی غرض وغائت کا اظہار فرما کر دعا کے ساتھ کارروائی ختم کی جائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم واخر دعونا ان الحمدللہ رب العلمین۔

(عبداللہ الہ دین، ۲۳؍اکتوبر ۱۹۳۱ء)

الحاج مولانا عبدالرحیم صاحب نیّر کا عالمانہ خطاب

ہماری تحقیق میں یہ بات آئی ہے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب نیر مبلغ جماعت نے احمدیہ جوبلی بلڈنگ کی تعمیر کی تکمیل پر افتتاحی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ مضمون پڑھا تھا۔ جس کا عنوان تھا احمدیہ جوبلی بلڈنگ ''ایک الٰہی نشان ہے''، جس کی افادیت کو پیش نظر رکھ کر تاریخ احمدیت میں شامل کیا گیا ہے۔ (مؤلف جہانگیر علی)

اشھدان لا الہ اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

واذ یرفع ابرھیم القواعد من البیت و اسمعیل. ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم. ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنآ امة مسلمة لک . وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم. ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم ایتک ویعلمھم الکتب والحکمة ویزکیھم. انک انت العزیز الحکیم. (بقرہ۱۲۱تا۱۲۳)

لمسجد اُسّس علی التقوٰی مِن اول یوم احق ان تقوم فیہ. فیہ رجال یحبون ان یتطھروا. واللہ یحب المطھرین. (توبہ آیت ۱۰۹)

قرآن پاک سے جو آیات میں نے تلاوت کی ہیں وہ ایک عمارت کی تعمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی آیتوں میں حضرت ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم اور آپ کے فرزند اکبر سیدنا اسمٰعیل ایک عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ باپ ہاتھ سے معماری کررہا ہے اور بیٹا تعمیر کا مسالہ دے رہا ہے اور دونوں دعائیں کرتے ہیں کہ:

(۱) اے اللہ! ہماری اس خدمت کو قبول کر۔

(۲) اے رب ہمارے! ہم دونوں کو اپنے فرمانبردار بنا اور فرمانبرداری کے طریق بھی خود سکھا۔

(۳) ہمارے بعد ہماری اولاد پر بھی فضل کر۔ ان میں ایک عظیم الشان مصلح پیدا کر۔ جو بادشاہ ہو۔ مزکی ہو۔ علم وحکمت کا سکھانے والا ہو۔

آخری آیت میں ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کی قبولیت دعا سے برگزیدہ رسول خاتم الانبیاء سرور الاولیاء سید الاولین و الآخرینؐ پیدا ہوئے۔ اس کے لئے ارشاد باری ہے کہ جس عبادت گاہ کی بنیاد پہلے ہی سے خوف الٰہی و پرہیزگاری پر ہو تیرے لئے اس میں کھڑا ہونا بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں وہ لوگ ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو پاکیزہ ہوتے ہیں۔

آج ہم جس عمارت کے افتتاح کے لئے جمع ہیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیات کو تشبیہاً چسپاں کر کے میں برکت کا طالب ہوں کیونکہ اللہ کی مصلحت نے چاہا کہ ایک خاندان کے دو آدمی مخلوق خدا کی سب سے بڑی خدمت میں حصہ لیں اور اس زمانہ میں ایک نشان کو پورا کرنے میں خدا ان سے وہ کام لے جو اس کی پسندیدگی کا موجب ہے۔

میرے محترم بھائی عبداللہ الہ دین صاحب نے بتایا کہ کس طرح ان کو اور ان کے عزیز بھائی کو اللہ نے ایک نشان کے پورا کرنے کا موقع دیا ہے' چنانچہ اگر آپ یہ تصور کر لیں کہ سیٹھ عبداللہ بھائی اس عمارت کو تعمیر کر رہے ہیں اور سیٹھ احمد بھائی جن کا سلوک کیا بلحاظ اطاعت اور کیا بلحاظ خدمت و ادب کے اپنے بڑے بھائی سے بیٹے کا سا ہے۔ اس تعمیر کے لئے مسالہ بہم پہنچا رہے ہیں۔ تو تشبیہاً سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسمٰعیلؑ کا مقدس گھر کی تعمیر کرنا ایک معنوں میں ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ پس میں کہوں گا کہ یہ دونوں بھائی بھی آج اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں اور قرآن کریم کے الفاظ میں دعا کریں کہ:

(۱) خدا ان کی اس خدمت کو قبول کرے۔

(۲) ان دونوں کو اپنے فرمانبردار بندے بنائے اور بندگی کے صحیح طریق سکھائے۔

(۳) اور ان کی اولاد' ان کی ذریت میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوں جو الہ دین کی دینی خدمت و دنیوی فیوض کو جاری رکھیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں جن معنوں کی طرف اشارہ ہے اس پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

گو یہ عمارت باقاعدہ عبادت گاہ یا مسجد نہیں' مگر اسلام کی تعلیم کی رو سے صرف نماز پڑھنا ہی عبادت نہیں بلکہ خدا کی مخلوق پر شفقت اور ان کی خدمت بھی عبادت ہے اور یہ عمارت جس کی بنیاد و خدمت بنی نوع انسان اور تقویٰ و طہارت اور دنیا میں امن و صلح کو ترقی دینے کے لئے رکھی گئی ہے یقیناً اس مبارک مفہوم کے نیچے آتی ہیں۔

میرے مکرم بھائی عبداللہ الہ دین نے اپنے ایڈریس میں احمدیت کی صداقت پر زور دیا ہے اور لوگوں کو اس حق کی طرف بلایا ہے جو ان کے دل کو تسکین دے چکا ہے اور جس کی نسبت وہ اور میں یقین رکھتے ہیں کہ وہی دکھوں کا علاج ہے اور اس یقین سے کہ اس کا پیش نہ کرنا بخل ہوگا۔ ہم اپنے ان پیاروں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے ہم کو محبت ہے۔

جس طرح اسلام کو مغربی ممالک اور غیر مسلم اقوام میں بعض خود غرض لوگوں نے بگاڑ کر پیش کیا ہے' اسی طرح ہم بھی غلط بیانیوں کا شکار ہیں۔ پس میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ احمدیت کیا ہے۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین سمجھ کر ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ قرآن کریم کو خاتم الکتاب اور شریعت اسلام کو کامل و مکمل ہدایت نامہ یقین کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلام تلوار کا مذہب نہ کبھی تھا نہ اب ہے اور نہ ہوگا۔ کیونکہ اسلام کے معنیٰ صلح و امن کے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کے آئندہ قصر امن کی بنیاد اسلام کی تعلیم پر رکھی جائے گی۔ اس لئے اس تعلیم کی پرامن طریق سے اشاعت ہماری زندگیوں کا مقصد اعلیٰ ہے۔

خدا کے وفادار۔ حکومت کے وفادار۔ خود زندہ رہنے والے اور دوسروں کو زندہ رہنے کی آزادی دیئے جانے کے اصول پر ہمارا عمل ہے۔ ہمارے پارسی بھائی کے پاس اگر حضرت زرتشت برگزیدۂ خدا ہیں تو ہم بھی ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہمارے ہندو بھائی کے پاس اگر کرشن اور رام قابل تقلید وجود ہیں تو ہم ان کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے بدھ بھائی کو اگر عارف بدھ سے پیار ہے تو ہم اس کے پیار میں شریک ہیں۔ ہم موسائی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے لئے اور عیسائی کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کے لئے اور ہر قدیم مذہب کے پیشوا کے لئے اس کے متبعین کے ہمراہ محبت و آشتی کے گھر میں اتحاد کی چھت

کے نیچے بیٹھنے اور بٹھانے میں سعی کرتے رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہی ارشاد الٰہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وان من امۃ الا خلافیھا نذیر۔

مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی نسبت ہمارا مسلک یہ ہے کہ اگر ہمارا سنّی بھائی خلافت راشدہ وصحابہ کرامؓ کا مداح ہے تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہؑ فرماتے ہیں کہ:

''میرے لئے یہ کافی فخر ہے کہ میں ان لوگوں (صحابہ) کا مداح ہوں۔'' اگر میرا شیعہ دوست اہل بیت سے نقار کو موجب سلب ایمان سمجھتا ہے تو احمدی کو بھی ارشاد مسیح موعودؑ ہے کہ جو حسینؓ یا کسی اور بزرگ کی جو ائمہ مطہرین میں سے ہے تحقیر کرتا ہے وہ اپنے ایمان کو ضائع کرتا ہے۔'' اگر اہلحدیث کو ائمہ حدیث سے محبت ہے تو احمدی ان کے ساتھ شریک ہے اور کسی کم ظرف کی طرح حضرت امام بخاری یا دوسرے بزرگ پر طعن نہیں کرتا اور اگر حنفی دوست سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ غوث اعظم سے عقیدت رکھتے ہیں تو سلسلہ احمدیہ کا مقدس پیشوا فرماتا ہے ''میری روح اور سید عبدالقادرؒ کی روح کو خمیر فطرت سے باہم ایک مناسبت ہے۔''

اگر ائمہ اربعہ بالخصوص حضرت امام اعظمؒ کی بزرگی وعظمت کا سوال آجائے تو احمدی کو یہ کہنے کا حکم ہے کہ ''یہ چار امام اسلام کے واسطے چار دیواریں تھے۔'' اور ''امام اعظمؒ اپنی قوت اجتہادی اور اپنے علم اور درایت اور فہم میں ائمہ ثلاثہ باقیہ سے افضل و اعلیٰ تھے۔

غرض احمدی کہلانے کے ساتھ ہی ہر نبی، ہر ولی، ہر غوث، ہر امام، ہر مجدد، ہر بزرگ کا احترام لازم ہے اور احمدی وہ ہے جو سب پاکبازوں پر حضرت آدمؑ سے لیکر تا ایندم ایمان لاتا ہے اور جس کا عقیدہ ہے کہ قرآن خدا کا کلام (ناسخ ومنسوخ کی۔ بحث سے پاک) اور کائنات خدا کا کام ہے۔ خدا کا کام اور خدا کا کلام ایک دوسرے کے مطابق ہونے ضروری ہیں۔ اس لئے اسلام کی تعلیم معقولیت پر مبنی ہے۔ اور اس میں توہم پرستی کو دخل نہیں۔ پس نہ کوئی آسمان پر جسم عنصری کے ساتھ جاتا ہے نہ وہاں سے زمین پر اترتا ہے۔ نیز ایسی معقول تعلیم جو فطرت کے مطابق ہے اس امر کی محتاج نہیں کہ کوئی خونی مہدی آکر تلوار سے اس کی اشاعت کرے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ احمدیت اسلام کی اس امن پسند تبلیغی تحریک کا نام ہے جو قادیان

کے ایک مرکز سے ایک امام کے ماتحت اسلام کو اس کی خوبیوں کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر پیش کرتی ہے اور اعتقاد رکھتی ہے کہ کل ادیان کا موعود اسلام میں چودھویں صدی کے سر پر کامل چاند کی طرح بحیثیت ایک مسلم مصلح و امام کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے جو روحانی نظام شمسی کا سورج ہیں روشنی لیکر پیدا ہوا اور وہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی ہیں جن کے دعویٰ کی جوبلی پر یہ عمارت بطور ایک یادگار کے ہے اور اس عمارت کو سلطنت آصفیہ کے دارالحکومت میں رعایائے سرکار عالی کے مختلف طبقات باہمی اتحاد و اتفاق اور سرکار سے جذبات وفاداری پیدا کرنے کے لئے بلا اختلاف مذہب وملت استعمال کرسکیں گے۔

اے خدا! تو اس عمارت کو بادشاہ و رعایا اور اپنی مخلوق کے لئے بابرکت کر اور سیٹھ عبداللہ الہ دین اور احمد الہ دین اور ان کے خاندان کو اس صدقہ جاریہ کے فیوض سے متمتع کر۔

خدا ہمارے بادشاہ جاہ کو سلامت رکھے آمین ثم آمین۔

صداقت احمدیت از روئے قرآن مجید

جسے مولانا عبدالرحیم صاحب نیرؔ نے افتتاح جوبلی بلڈنگ کے موقع پر پڑھ کر سنایا

چونکہ احمدیہ جوبلی بلڈنگ احمدیت کی صداقت کا ایک نشان ہے اور اس صداقت کو دلائل سے بھی سمجھانا ہمارا فرض ہے۔ اس لئے پبلک کی خدمت میں قرآن مجید فرقان حمید سے چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں تاکہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے سعید روحوں کے لئے باعث ہدایت ہوں۔

.... (۱) ....

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

یوم ندعو کل اناس بامامھم ۔ یعنی روز قیامت ہم ہر ایک فرقے کے لوگوں کو ان کے اماموں کے ساتھ بلوائیں گے (سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۱)

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فطرتاً ہر ایک فرقے کے لوگ کسی نہ کسی شخص کو اپنا امام یا پیر مرشد مان کر اس کی بیعت میں داخل ہونا اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ

ہم جس کو مانیں اور جس کی ہم بیعت کریں وہ درحقیقت ایسا ہی شخص ہے جس کو ماننے سے اور جس کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے سے ہم کو نجات بلکہ فلاح حاصل ہوگی۔ ایسا شخص کوئی معمولی حیثیت کا تو نہیں ہوسکتا' بلکہ وہ خاص خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث شدہ ہونا چاہیے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ کسی کو لوگوں کے لئے امام بنانا خاص اسی کا کام ہے جیسا کہ **انی جاعلک للناس اماما**۔ سورۂ بقرہ کی ۱۲۴ آیت سے ظاہر ہے۔ یعنی یقیناً میں ہی تجھے لوگوں کے لئے امام بناؤں گا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سچے امام کی صداقت اور پہچان کا سب سے عظیم الشان نشان یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام مبعوث ہونے کا مدعی ہو۔ ایسا شخص امام زمان کہلاتا ہے۔

پس حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے ہی شخص کو ماننے کی تاکید فرمائی ہے کہ **من لم یعرف امام زمانه فقد مات میتة الجاهلیه**۔ یعنی جس نے اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانا وہ یقیناً جاہلیت کی موت مرا۔ یعنی اسلام سے پیشتر کی جاہلیت کے زمانے کے کافروں کی موت مرا۔ اسی لئے ایسا ربانی امام اپنی بعثت کا دنیا میں اعلان کردیتا ہے' تاکہ لوگوں کو اس کا پتہ لگے اور وہ اس پر ایمان لاکر مومن بنیں اور جاہلیت کی موت سے بچیں۔

یہ امر بخوبی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ایسے اعلان کی جرأت صرف وہی راستباز انسان کرسکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام حکماً مبعوث ہوا ہو۔ جھوٹا شخص ہرگز ہرگز ایسی زبردست جرأت نہیں کرسکتا۔ اس زمانے میں اس شان کے امام زمان ہونے کا مدعی سوائے حضرت مرزا غلام احمد کے اور کوئی نہیں۔ آپ نے بموجب حکم ربی اپنے دعویٰ کا اعلان دنیا میں شائع کردیا اور خدا تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ یہ بھی شائع کروادیا کہ جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف رہے گا وہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہے۔ (اشتہار معیار الاخیار ۲۵)

.... (۲) ....

وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضی لهم. یعنی وعدہ کیا

اللہ نے لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیئے' البتہ ضرور بالضرور انہیں زمین میں خلیفہ کریگا۔ جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ کیا' جو ان سے پہلے تھے اور ضرور بالضرور ان کے لئے ان کا دین مضبوط کریگا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ (سورۂ نور آیت:۵۶)

اس آیت شریف کے مطابق دین کو مضبوط کرنے والے خلیفہ کا ظہور کب ہوگا۔ اس کے متعلق حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے علم غیب پاکر یہ اعلان فرمایا کہ **ان الله یبعث لهٰذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها**۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی ضرور بالضرور اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایک ایسے شخص کو مبعوث کریگا جو ان کے لئے ان کا دین تازہ کریگا۔

یہ اسلام کی ایسی عظیم الشان خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی اور مذہب میں مطلق پائی نہیں جاتی۔ اس سے بانیٔ اسلام کی صداقت اور اسلام تا قیامت قائم رہنے والا زندہ مذہب ثابت ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مذہب میں اس کی اشاعت کرنے والے لوگ ہیں' مگر کسی مذہب میں کوئی ایسا شخص نہیں کھڑا ہوتا ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام کے حکم پاکر مدعی ہوا ہو۔

مذکورہ بالا ربانی اعلان کے مطابق سچے مجدد کی شناخت کے لئے حسب ذیل نشانات ضروری ہیں:

(۱) یہ کہ ایسا شخص خاص خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے حکم سے مبعوث ہونے کا مدعی ہو۔

(۲) یہ کہ ایسے شخص کا ظہور صدی کے شروع میں ہو۔

(۳) یہ کہ ایسا شخص ساری امت کے لئے ہو۔ کسی خاص فرقے کے لئے نہیں۔

(۴) یہ کہ ایسا شخص دن رات تجدید دین میں مصروف ہو۔ ہر صدی میں ایسے ربانی مجدد دین کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ پس اس طرح اس زمانہ میں حضرت میرزا غلام احمد کا ظہور ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تمام دنیا میں اسّی کے قریب کتب تصنیف فرما کر اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت ادا کی کہ دشمن بھی اقرار کرتے ہیں کہ تیرہ سو سال میں اس کی نظیر نہیں۔

اس لئے بہت سے لوگ آپ کو اس صدی کا مجدد مانتے ہیں مگر آپ کے مسیح موعود مہدی معہودؑ ہونے کے دعویٰ کا انکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ صدی

کے مجدد جس کو خدا تعالیٰ خاص اپنے حکم سے دنیا کی رہنمائی کے لئے مبعوث فرماتا ہے وہ ہرگز جھوٹا دعویٰ کر کے لوگوں کو گمراہ نہیں کرسکتا۔ اس کا ہر ایک قول وفعل خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کی رضا مندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ صحیح نہیں تو آپ اس صدی کے ربانی مجدد کیسے ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص جھوٹا ہو وہ ربانی مجدد کیسے ہوسکتا ہے۔ اس طرح آپ کو اگر مجدد کے دعوے سے بھی خارج کر دیا جائے تو پھر بتلاؤ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربانی اعلان کے مطابق اس صدی کا صادق مدعی کون ہے جس کی شناخت مذکورہ بالا چار صفات کے مطابق ہوسکتی ہے؟

اس کے متعلق خاکسار کی طرف سے ایک چیلنج دربارہ امام زمان دس ہزار روپیہ کے انعام کے ساتھ کئی سال ہوئے، مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں میں شائع کیا گیا اور اب نصف صدی بھی ختم ہونے کو ہے مگر کسی نے بھی آپ کے مقابلہ میں صادق مدعی بن کر کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کی اور نہ اب آئندہ کوئی دعویٰ کرسکتا ہے' کیونکہ صدی کے شروع کی جو مقررہ میعاد تھی وہ ختم ہو چکی۔

پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت میرزا صاحب ہی اپنے تمام دعوؤں کے ساتھ اس زمانہ کے صادق ربانی مصلح ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان اور آفتاب کی طرح روشن نشان ہے' جس کو خدا تعالیٰ نے اسلام اور بانیٔ اسلام کی صداقت کے لئے دنیا میں ظاہر فرمایا۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور جھٹلاتے ہیں۔ ان کے متعلق خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

والذین کفروا و کذبوا بایتنا اولٰئک اصحب الجحیم۔ یعنی وہ جنہوں نے انکار کیا اور جھٹلایا ہمارے نشانوں کو یہی ہیں دوزخ والے۔ (سورہ الحدید آیت ۲۰)

.... (۳) ....

اھدنا الصراط المستقیم. صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین۔ یعنی اے اللہ تو دکھا ہم کو راہ راست۔ راہ ان کی جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔

یہ دعا ہم دن رات کئی بار نماز میں پڑھتے ہیں اس کے متعلق مفسروں کا یہ متفق علیہ عقیدہ ہے کہ **مغضوب علیھم** سے مراد یہودی ہیں۔ جن پر غضب کیا گیا' کیونکہ ان کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے سلسلہ بنی اسرائیل کے مسیح موعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا نبی گمان کر کے ان کا انکار کیا اور مخالفت کی۔ اور اذیت دی۔ یہاں تک کہ آخر صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنے کی کوشش کی۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس لئے انکار کیا تھا کہ ان کی حدیث میں ان کے مسیح موعود کے ظہور کا یہ نشان بتلایا گیا تھا کہ حضرت الیاسؑ جن کو وہ آسمان پر اٹھالئے گئے سمجھتے تھے (۲ سلاطین ۲۔۱۱) پھر واپس آسمان سے نازل ہوں گے۔ اس کے بعد مسیح موعود کا ظہور ہوگا۔ (ملاکی ۴۔۵) مگر حضرت الیاسؑ تو آسمان سے نازل نہ ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوگیا۔ انہوں نے یہودیوں کو بہت کچھ سمجھایا کہ الیاسؑ کا آسمان پر اٹھائے جانے اور پھر آسمان سے واپس آنے کا عقیدہ غلط ہے۔ کیونکہ نہ کوئی نبی آسمان پر جاسکتا ہے اور نہ کوئی آسمان سے آسکتا ہے۔ اور مذکورہ حدیث کی یہ تاویل کی کہ حضرت یحییٰؑ حضرت الیاسؑ کے ہم صفت ہیں اور ان کی مثیل ہو کر آئے ہیں۔ اس لئے ان کو الیاسؑ مانا جائے (متی ۱۱۔۱۳۔۱۴۔۱۵) (متی ۱۷۔۱۰ تا ۱۴ ملاحظہ ہو) مگر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تاویل ماننے سے صاف انکار کر دیا اور ان کو نبوت کا جھوٹا مدعی گمان کر کے بہت ہی بری طرح سے پیش آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان منکرین یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور ان میں طاعون پھوٹ نکلا۔ پھر ان سے سلطنتیں چھین لی گئیں اور وہ تتر بتر ہوگئے اور ہمہ قسم کے سیاسی مظالم کئے گئے اور بالآخر وہ **مغضوب علیھم** ہوگئے۔

اسلام میں بھی مسیح موعود کے ظہور کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ تو اس خیال کے مدنظر کہ مبادا چونکہ مسلمان بھی یہودیوں کی طرح غلطی میں مبتلا ہو کر اپنے محمدی مسیح موعود کا انکار نہ کر بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ یہ تعلیم دی کہ وہ یہ دعا بکثرت کرتے رہیں کہ وہ یہودیوں کی طرح اپنے مسیح موعود کا انکار کر کے مغضوب علیھم نہ ہوجائیں۔ مگر باوجود گزشتہ امت کی ٹھوکر اور تلخ تجربہ سے سبق حاصل کرنے کے پھر بھی یہی عقیدہ عام طور پر ہے کہ

حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور وہی آسمان سے واپس آئیں گے حالانکہ قرآن شریف کی تیس آیات سے عیسیٰؑ کی وفات ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جو اس جہاں سے گزر جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا۔ یہاں تک کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ ابن مریم نامی شخص مسلمانوں میں سے ظاہر ہوگا جیسا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم۔ یعنی تمہارا کیا حال ہوگا۔ جب کہ ابن مریمؑ تم میں نازل ہوگا اور وہ تم میں سے تمہارا امام ہوگا۔'' (رواہ صحیح بخاری: ۴۹۰)

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی ایسی صفائی سے لفظ بلفظ پوری ہوئی کہ مسلمانوں کا مسیح موعود مسلمانوں میں سے ہی ظاہر ہوگیا۔ جس کو خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے مسلمانوں کے لئے امام زمان مقرر کیا ہوا تھا۔ اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے' جبکہ خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہی یہ ارشاد موجود ہے کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ۔ یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی مانند ہوں گے۔

پس حسب فرمان رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک عظیم الشان عالم بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت عیسیٰؑ کا مثیل ہوا تو یہ گویا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد لفظ بلفظ پورا ہوا۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان اور صداقت دنیا میں آشکار کرتے' مگر افسوس! کہ ہمارے مسلمان بھائیوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا انکار کر دیا اور مثیل مسیح کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اپنے محمدی مسیح موعودؑ کو ہر طرح سے اذیت پہنچانے میں ہی اپنی سعادت سمجھی۔

مسلمانوں کے اس فعل کے متعلق بھی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشتر سے ہی پیشگوئی فرمائی تھی کہ میری امت یہود جیسی ہو جائے گی' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اسلام چھوڑ کر یہودیوں کا مذہب اختیار کریں گے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے عقائد و اعمال یہودیوں کی طرح ہوں گے۔ یہ پیش گوئی بھی مسلمانوں نے اپنے عقائد و اعمال کے ذریعہ لفظ بہ لفظ پوری کر دکھلائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور طاعون و زلازل و دیگر آفات پھوٹ پڑے۔ ان کی حکومتیں چھینی جا رہی ہیں اور ان پر سیاسی مظالم کئے جا رہے ہیں۔ وہ

ہر طرح سے مظلوم و ذلیل ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا جب تک کہ وہ اپنے غلط عقائد سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حق نازل ہوا ہے اس کی طرف رجوع نہ کریں۔

.... (۴) ....

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت اسحٰقؑ اور دوسرے حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحٰقؑ سے بنی اسرائیل کا سلسلہ جاری ہوا اور حضرت اسماعیلؑ سے بنی اسماعیل کا۔ بنی اسرائیل میں شریعت لانے والے عظیم الشان نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور بنی اسماعیل میں شریعت لانے والے عظیم الشان نبی ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ان دونوں سلسلوں کی مشابہت قرآن شریف سے ثابت ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الٰی فرعون رسولا .

(سورۃ مزمل آیت ۱۶)

پھر سورۂ نور کی آیت استخلاف سے ثابت ہے کہ جس طرح موسوی سلسلہ میں خلافت کا سلسلہ جاری تھا' اسی طرح محمدی سلسلہ میں بھی خلافت کا سلسلہ جاری رہنا ثابت ہے۔ پھر جس طرح موسوی سلسلہ میں بہت سے فرقے ہو گئے تھے' تو ان کا تصفیہ کرنے کے لئے چودھویں صدی میں حکم کے طور پر مسیح ناصری کا ظہور ہوا پس اسی طرح محمدی سلسلہ میں بہت سے فرقے ہو گئے تو ان کا تصفیہ کرنے کے لئے چودھویں صدی میں حکم کے طور پر مسیح محمدی کا ظہور ہوا۔ غرض یہ کہ موسوی اور محمدی یہ دونوں الگ الگ سلسلے ہیں۔ اس لئے ان کے نبی اور ان کے خلیفے اور ان کے مسیح موعود بھی الگ الگ ہیں۔ مگر ابن مریم کا نام حدیثوں میں آنے سے ہمارے مسلمان بھائی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لئے وہ موسوی سلسلہ کے فوت شدہ مسیح کو اور محمدی سلسلہ کے مسیح موعود کو ایک ہی شخص گمان کرنے لگے۔ حالانکہ یہ دو مختلف سلسلوں کے دو مختلف افراد ہیں اور ان کے کام اور اُن کے حلیے بھی علیحدہ علیحدہ بتلائے گئے ہیں۔

.... (۵) ....

اھدنا الصراط المستقیم. صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین.

یہاں ضالین سے مراد عیسائی ہیں جس کے متعلق تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ اس لئے وہ خوب جانتا تھا کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ مسلمان عیسائیوں کی صحبت سے متاثر ہوکر ہر طرح ان کی پیروی کریں گے اور گمراہ ہوجائیں گے۔ اس لئے ان کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے سورۂ فاتحہ میں یہ تعلیم دی گئی تا کہ وہ یہود اور عیسائیوں کی مانند نہ ہوجائیں۔

اگرچہ مسلمان دن رات ہر نماز میں کئی بار سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں، مگر اس کی حقیقت اور پرلطف معارف و مطالب سے کوسوں دور ہیں۔ سورۂ فاتحہ کی پاکیزہ تعلیم کو توجہ وغور سے سمجھنے کی کوشش نہ کرنے کی وجہ سے آخر وہ ٹھوکر کھا گئے اور نہ صرف وہ غلط عقائد کی پیروی کرنے لگ گئے بلکہ لاکھوں مسلمان اپنے باپ دادوں کا مذہب ترک کر کے عیسائی ہوگئے اور پادری بن کر اسلام اور بانی اسلام کو گالیاں دینے کا مذہب اختیار کرلیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دے کر ان کی ایسی شان وشوکت بیان کرنے لگے کہ گویا وہی ایک وحدہ لاشریک ہیں کہ جو بجسد عنصری آسمان پر اٹھالئے گئے۔ اور وہی ایک وجود ہے جو اب تک آسمان پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہی ہے جو آسمان سے پھر اتر آئے گا۔

عیسائی قوم ان غلط عقائد کی تمام دنیا میں اشاعت کرتی پھرتی ہے مگر خدا تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دینا یہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند ہے کہ وہ فرماتا ہے:

''**تکاد السموت یتفطّرن منہ وتنشقُّ الارض وتخِرُّ الجبال ھَدًّا انَ دَعَو للرحمن وَلَدًا** ۔'' یعنی قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اس سے۔ اور پھٹ جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر اس سے کہ دعویٰ کیا انہوں نے رحمان کے لئے اولاد کا (سورہ مریم آیت ۹۱-۹۲)

جبکہ قرآن شریف سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا یہ باطل عقیدہ خدا تعالیٰ کو بہت ہی ناگوار معلوم ہوتا ہے تو پس مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ وہ عقائد باطلہ کی تردید کر کے حضرت عیسیٰؑ کی صحیح حیثیت دنیا پر ظاہر کر کے لوگوں کو ضلالت سے بچاتے، مگر افسوس! وہ خود بھی حضرت عیسیٰؑ کے متعلق غلط عقائد میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس لئے ان سے یہ کام نہ ہوسکتا تھا اور نہ ہوسکا۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس چودہویں صدی میں ایک ایسے عظیم الشان مجدد کو مسیح موعود کے نام سے

مبعوث کیا، تا کہ وہ عیسائیوں کے تمام عقائد باطلہ کی تردید کر کے اصل حقیقت دنیا پر ظاہر کرے۔

چنانچہ حضرت مرزا صاحب جب تک زندہ تھے دلائل کے حربہ سے صلیبی فتنہ کو توڑتے رہے اور ایک ایسی جماعت قائم کر گئے جو آپ کی وفات کے بعد بھی اس باطل عقیدہ کو جو خدا تعالیٰ کو بہت ناپسند اور ناگوار ہے روئے زمین سے نابود کرنے کے لئے عیسائی ممالک میں پہنچ کر وہاں لاکھوں روپیہ کے خرچ پر مشن قائم کر کے دن رات عیسائیت کی تردید میں مصروف ہے۔ احمدیوں کے اس عظیم الشان کام کی غیر احمدیوں کو چاہیئے تھا تائید کرتے، تا خدا تعالیٰ کو جو بات اس قدر ناگوار معلوم ہوتی ہے وہ دنیا سے جلد نابود ہوجائے، مگر افسوس کہ اس کے برخلاف غیر احمدی رکاوٹ ہی ڈالتے رہے ہیں، مگر یہ یاد رہے کہ خدا کا کام رکتا نہیں۔ وہ تو ہر حال میں ہوکر ہی رہتا ہے، مگر کیا اس سے صاف ثابت نہیں ہوتا کہ کون اللہ تعالیٰ کے وفادار و اطاعت گزار بندے ہیں اور کون مخالف و نافرمان؟

.... (۶) ....

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ۔ یعنی آج کے دن میں نے کامل کیا تمہارے لئے دین تمہارا اور پورا کیا میں نے تم پر اپنی نعمت کو (سورۂ مائدہ: آیت ۴)

قرآن شریف کی اس آیت سے ہمارے مخالفین کو یہ غلط فہمی لگی ہے کہ جب دین کامل ہوگیا تو پھر کسی نبی کی ضرورت ہی نہ رہی۔ حالانکہ اس آیت شریف سے بخوبی نبوت کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ دین کا کمال اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں (جن میں سے دین کے لئے اصل نعمت نبوت ہے) خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کو عطا کئے جانے کا اس میں ارشاد ہے۔ پھر بھی اس کے خلاف یہ کہنا کہ اس اصل نعمت سے ہی یہ خیر امت محروم رکھی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد کے بالکل خلاف ہے کہ اس نے مذہب اسلام کو کمال تک پہنچایا اور تمام نعمتیں عطاء کیں۔

اس کے علاوہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھلائی ہے کہ **اھدنا الصراط المستقیم . صراط الذین انعمت علیھم** ۔ یعنی اے اللہ! دکھا تو ہم کو راہ راست۔ راہ ان کی جن پر تو نے انعام کیا۔ یہاں پر **انعمت علیھم** سے مراد قرآن شریف اور مفسرین سے یہ ثابت

ہے کہ وہ نبی، صدیق، شہید و صالح ہیں۔

جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس امت کو یہ تعلیم فرمائی ہے کہ تم مجھ سے یہ انعامات مانگا کرو۔ اور یہ انعامات عطا بھی کئے گئے۔ یعنی بہت سے لوگ اس امت محمدیہ میں صدیق، شہید، صالح کا انعام پاتے رہے۔ تو اگر اسی طرح خدا تعالیٰ نے کسی کو نبوت کا انعام بھی عطا فرمایا تو عین اس دعا کا کامل طور سے پورا ہونا ثابت ہوا۔ اور نہ صرف اسی دعا کا بلکہ مذکورہ بالا آیت شریفہ **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی** کا وعدہ بھی پورا ہوا۔ جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کو تمام نعمتیں عطا کئے جانے کا ارشاد ہوا ہے۔

بیشک ہم یہ مانتے ہیں اور ہمارا یہی ایمان ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی صاحب شریعت یا مستقل نبی خواہ وہ نیا ہو یا پرانا تا قیامت نہیں آسکتا۔ سوائے اس کے جو آپؐ کا امتی ہو اور خود کو آپؐ کی غلامی میں فنا فی الرسولؐ کے مقام پر پہنچا کر خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی کا خطاب پائے۔

خَاتم کے لفظ سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے معنی و مفہوم بالکل صاف کر دیئے ہیں جیسا کہ حضور دو عالمؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ **انا خاتَم النبیین وانت یا علی خاتَم الاولیاء** ۔ یعنی میں خَاتم النبیین ہوں اور تو اے علی خَاتم الاولیاء ہے۔

پس اگر خاتم کے معنیٰ خَتم کرنے والا صحیح ہیں تو پھر اسلام میں حضرت علیؓ کے بعد کوئی ولی نہ ہوتا، مگر برخلاف اس کے بہت سے اولیاء اللہ ہوئے۔ اس سے بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو معنیٰ اس کے برخلاف سمجھے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ورنہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسیح موعود کے متعلق نبی اللہ کا خطاب بار بار کیوں استعمال فرماتے؟

اس کے علاوہ حضرت رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نبیوں میں سے اولین و آخرین کا سردار ہوں۔ اگر آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ ہو تو آپؐ آخرین کے سردار کس طرح کہلا سکتے ہیں؟ اس لئے ہماری ماں ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: **قولوا انہ خاتم الانبیآء ولا تقولوا لا نبی بعدہ** ۔ یعنی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تو کہو کہ آپؐ خاتم

الانبیاء ہیں، مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

پھر ایک اور حدیث بھی ہے جس سے لوگوں کو غلطی ہوئی ہے اور وہ **لا نبی بعدی** ہے۔ جس سے یہ مراد ہے کہ کوئی نبی شریعت لانے والا مستقل نبی سردار دو عالمؐ کے بعد نہیں آسکتا۔ اس حدیث کے متعلق بھی غلط فہمی رفع کرنے اور اس کے معنی بھی صاف کرنے کے لئے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال فرمائی۔ **اذا هلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ واذا هلک قیصر ولا قیصر بعدہ** ۔ یعنی جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا، مگر پھر بھی قیصر و کسریٰ ہوتے ہی رہے۔ تو پس اس کے یہ معنیٰ معلوم ہوئے کہ اس شان کے کسریٰ و قیصر نہ ہوں گے۔ اسی طرح تا قیامت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان کا کوئی نبی نہ ہوگا۔ اور جو ہوگا وہ آپؐ کا امتی اور آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کا خدمت گار ہوگا اور ایسے نبی کی بعثت کوئی نئے نبی کی بعثت نہیں کہلا سکتی، بلکہ بانئے اسلامؐ کی ہی بعثت ثانی کہلائے گی کیونکہ اس کا کوئی نیا کلمہ نہ ہوگا بلکہ بانی اسلام ہی کا کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ۔ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) ہی ہوگا۔

.... (۷) ....

دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب میں ان کے نبی کی بعثت ثانیہ کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں ان مذاہب کے لوگ اپنے اپنے موعود نبی کے ظہور کے منتظر ہیں۔ لیکن جب کہ ان سب مذاہب کے انبیاء وفات پا چکے ہیں اس لئے وہ تو بذات خود اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے، مگر ان کے وعدے پورے ہونا ضروری ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ان کی طرف سے ایک مثیل مبعوث کرنے کا انتظام فرمایا ہے تا کہ ان کے وعدے پورے ہو جائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگلے نبی صرف خاص خاص قوم کے لئے آئے تھے۔ اس لئے ان میں صرف خاص خاص صفت تھی، لیکن ہمارے سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ اس لئے آپؐ ان تمام انبیاء کی جامع صفات کے مجموعہ تھے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ مقدر کیا تھا کہ اس زمانہ میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانی کے لئے آپؐ کا ایک مثیل مبعوث کیا جائے تا کہ گزشتہ تمام نبیوں کا وعدہ پورا ہو جائے۔ اس کا ثبوت

قرآن شریف کی سورۂ جمعہ کی آیت و اخرین منھم لما یلحقوابھم سے ظاہر ہے۔

اس کے علاوہ پھر سورہ صف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ۔ یعنی (اللہ) وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ساتھ ہدایت اور دین حق کے تا کہ غالب کرے ان کو کل مذاہب پر (سورہ صف آیت ۹)

اس کے متعلق بھی تمام مفسروں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ گو یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔ مگر چونکہ آپؐ کے زمانہ میں اسلام کو دنیا کے تمام مذاہب پر غالب کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس لئے یہ وعدہ مسیح موعود کے ذریعہ پورا ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے مسیح موعود کا ظہور خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہے۔ آپؐ کی پہلی بعثت شریعت اسلام کی تکمیل کے لئے تھی۔ اور دوسری بعثت اشاعت اسلام کی تکمیل کے لئے۔

الحمدللہ! خدا تعالیٰ نے اس زمانہ میں اسلام کے مسیح موعود کو مبعوث فرما کر ان تمام امور کی تکمیل فرمادی۔ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس زمانہ میں ریل، ڈاک، تار، پریس وغیرہ کی ایسی سہولت ہوگئی کہ جس کے ذریعہ اسلام کو دنیا کے تمام مذاہب پر غالب کرنا اسلام کے مسیح موعود کے لئے بہت آسان ہوگیا۔ یہ فرض اس نے کامل طور سے ادا کیا۔ اس طرح حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانی کا وعدہ پورا ہوگیا۔ جس کے طفیل دنیا کے تمام مذاہب کے نبیوں کی بعثت ثانی کا وعدہ بھی پورا ہوگیا۔

الحمدللہ! یہ کیسا عظیم الشان نشان ہے جو دنیا کے تمام مذاہب پر ظاہر کر کے ان پر اسلام کی فضیلت و حُجت ثابت کرنے کا کام و فرض مسلمانوں کا تھا۔ مگر افسوس کہ انہوں نے اس کے برخلاف راہ لی۔

.... (۸) ....

ما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا یعنی ہم عذاب نازل نہیں کرتے یہاں تک کہ بھیجیں ہم رسول (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۷)

اللہ تعالیٰ کی یہ قدیم سنت ہے کہ جب کبھی لوگوں کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ ان کے دل سے خدا تعالیٰ کی ہستی کا یقین جاتا رہتا ہے اور ان کو آخرت کی جزاوسزا کا کوئی خوف نہیں رہتا

اور وہ ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ تب اس کی صفت رحمانیت جوش میں آتی ہے اور وہ الرحمٰن الرحیم اپنے بندوں پر رحم فرما کر ان کو راہ راست پر لے آنے کے لئے ایک رسول کو مبعوث فرماتا ہے جو ان کے غلط عقائد و برے اعمال ان پر کھول دیتا ہے۔ اور ان کو صحیح عقائد و نیک اعمال کی راہ بتلاتا ہے، مگر ان لوگوں کی اس وقت ایسی حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی کو عین صراط مستقیم سمجھتے ہیں۔ اور اس مبعوث شدہ مصلح کی تعلیم کو عین گمراہی خیال کر کے اس کی ہر طرح سے مخالفت کرتے ہیں اور اس کی تبلیغ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اس کو اور بعد میں اس کے ماننے والوں کو ہر طرح سے تکلیف دیتے اور ایذا پہنچانے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کا رسول یا مصلح وہ سب کچھ برداشت کرتا اور دن رات ان کی اصلاح کے کام میں مصروف رہتا ہے۔ آخر صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس لئے جب خدا تعالیٰ کی نظر میں نرمی کی تمام حجت کی حد ختم ہوجاتی ہے۔ تب ان کا غرور توڑنے کے لئے وہ ان پر عذاب نازل کرنا شروع کرتا ہے۔ تا کہ ان کے دل نرم ہوں اور جو حق اس کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اس کے متعلق وہ سوچیں اور سمجھیں۔

اس حقیقت سے ہر ایک قرآن دان بخوبی واقف ہے کہ گزشتہ زمانوں میں جب کبھی کسی نبی کا ظہور ہوا تو اس زمانہ کے لوگ کس طرح اس کے ساتھ پیش آئے اور آخر کس طرح ان پر عذاب الٰہی نازل کیا گیا اور کس طرح وہ لوگ تباہ و برباد کئے گئے۔ اس کی تفصیلی حقیقت قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے۔ پس بعینہ اس زمانہ کا یہی حال ہے۔ ہاں اگلے زمانے کے نبی صرف خاص خاص قوم کے لئے تھے۔ اس لئے اس زمانے کے لوگوں پر عذاب بھی خاص خاص قسم کا تھا۔ مگر اس زمانہ میں جس نبی کا ظہور ہوا ہے وہ گزشتہ تمام نبیوں کا مثیل ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ اس زمانہ میں گزشتہ زمانوں کے تمام اقسام کے عذاب پھر دہرا رہا ہے۔ کاش! لوگ اس راز کو سمجھیں اور حق کی طرف رجوع کریں۔

.... (۹) ....

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے ایک عظیم الشان نبی تھے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ آپؐ کے متعلق فرماتا ہے:

ولو تقول علینا بعض الاقاویل . لا خذنا منه بالیمین . ثم لقطعنا منه الوتین ۔یعنی اور اگر یہ (نبی) گھڑے ہم پر بعض باتیں۔ البتہ پکڑتے ہم اس کو دہنے ہاتھ سے۔ پھر کاٹ ڈالتے ہم اس کی گردن کی رگ کو (سورۃ الحاقہ آیت ۴۵۔۴۶۔۴۷)۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ اپنا ایک قانون ظاہر کرتا ہے کہ گو کوئی سچا ہی نبی ہو۔ (اور خدا تعالیٰ کی طرف سے سچی وحی اور الہام بیان کرتا ہو۔ پھر بھی اگر اس کے ساتھ وہ اپنی طرف سے کوئی جھوٹی وحی یا الہام اللہ تعالیٰ کے نام سے بیان کرے۔ تو خدا تعالیٰ یقیناً اس کو ہلاک کردے گا۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص جو نبی بھی نہ ہو اور نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور تمام جھوٹی وحی یا الہامات خدا تعالیٰ کے نام سے دنیا میں شائع کرے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو چھوڑ دے گا؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ ہمارے اشد ترین مخالف بھی اس قانون الٰہی کے قائل ہیں اور زبردست دلائل سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جیسا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب اپنی تفسیر ثنائی کے صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں:

''تورات کی پانچویں کتاب استثنا کے ۱۸ باب ۱۹ آیت میں لکھا ہے:

''اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ (نبی) میرا نام لے کر کہے گا۔ نہ سنے گا تو میں اُس کا اُس سے حساب لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہ دیا ہو اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ بھی قتل کیا جاوے۔''

یہ عبارت واضح طور پر ہمیں قانون الٰہی سے آگاہ کرتی ہے کہ کاذب مدعی نبوت کی ترقی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ جان سے مارا جاتا ہے۔ واقعات گزشتہ سے بھی اس امر کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کبھی کسی جھوٹے مدعی نبوت کو سرسبزی نہیں دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں باوجود غیر متناہی مذاہب ہونے کے جھوٹے نبی کی امت کا ثبوت مخالف بھی نہیں بتلا سکتے۔''

''یہودیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جھوٹا نبی زندہ نہیں رہ سکتا' بلکہ جان سے مارا جاتا ہے۔''

اس طرح قرآن شریف کی بہت سی آیات سے یہ ثابت ہے کہ مفتری علی اللہ کو ہرگز

ترقی نہیں ہوتی' بلکہ وہ اور اس کا سارا سلسلہ ہلاک و برباد کر دیا جاتا ہے اور یہاں مولوی ثناء اللہ صاحب جیسے ہمارے مخالف بھی اقرار کر رہے ہیں کہ الٰہی قانون سے یہ ثابت ہے کہ کاذب مدعی کو نبوت کی ترقی نہیں ہوتی۔ خدا نے کبھی کسی جھوٹے نبی کو سرسبزی نہیں دکھائی۔ اس لئے دنیا میں کسی جھوٹے نبی کی امت یا سلسلہ کا نام و نشان نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب یہاں طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حضرت احمدؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اللہ تعالیٰ کے نام سے صدہا الہامات دنیا میں شائع کئے۔ اگر آپ اپنے دعوی نبوت میں نعوذ باللہ سچے نہ ہوتے اور آپ کے الہامات محض افترا ہی افترا ہوتے تو کیا خدا تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق آپ کو قتل کروا کے آپ کے سارے سلسلہ کو تباہ و برباد نہ کرتا؟ یقیناً کرتا۔ مگر آپ چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کئے ہوئے سچے نبی تھے اور آپ کے الہامات بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے سچے الہامات تھے اس لئے آپ کا قتل ہونا تو درکنار بلکہ ہر خوف و خطرہ کے موقع پر وہ آپ کا حافظ و ناصر رہا اور دن رات آپ کے سلسلہ حقہ کو ترقی ہی دیتا رہا۔ اور دیتا ہی چلا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ اس ۱۳۵۰ھ کے سال میں آپ کے سلسلہ کی پچاس سالہ جوبلی منانے کا عظیم الشان موقع عطا فرمایا۔ کیا ایسے روشن و زبردست دلائل اور واقعات حق و باطل کی تمیز کرنے کے لئے کافی نہیں۔

.... (۱۰) ....

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی مبعوث کئے جانے کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں حقیقی توحید قائم کرے اور اس کی اشاعت کرے۔ جس کے ذریعہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہوجائے۔ اور ان کو یقین ہوجائے کہ ان کا ایک ایسا خالق و مالک ہے جو تمام اعلیٰ صفات کا حامل ہے۔ وہ رب العالمین و رحمان و رحیم ہے اور ہماری ہر ایک حرکت و قول و فعل پر اس کی نظر ہے۔ اور ہماری نیکی و بدی کی جزا و سزا دینے والا مالک ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا نبی اس کی مخلوق کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے' جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتا اور بدی سے منع کرتا ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں ان کی وہ ایک جماعت قائم کرتا ہے' جو اس نبی کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد بھی اس سلسلہ حقہ کی جان و مال سے تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔

ایسی ہی جماعت کو خدا تعالیٰ فلاح پانے والی جماعت قرار دیتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر. و اولئک هم المفلحون ۔یعنی اور چاہئے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت جو بلاویں طرف بھلائی کے اور حکم کریں نیکی کا اور منع کریں بدی سے اور وہی ہیں فلاح پانے والے (سورۃ آل عمران آیت ۱۰۵)

نبی کی تعلیم کی دوسروں کو تبلیغ کرنا یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ کیونکہ ہر ایک وہ شخص جو شرک و کفر میں مبتلا رہتا ہے وہ جب اس کی تعلیم کے طفیل راہ راست پر آجاتا ہے تو نہ صرف وہ خود ہلاکت سے بچ جاتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا ذریعہ ہو جاتا ہے کہ اس کا سارا خاندان نسلاً بعد نسل ایک عظیم الشان نعمت کا وارث ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر نہ صرف وہ اپنے ہی خاندان کے لئے رحمت ہوتا ہے بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے بھی رحمت ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تبلیغ کو اسلام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ پھر ایسے تبلیغ کرنے والے علماء جو خدا کے نبی کی وفات کے بعد بھی شب و روز سلسلہ حقہ کی تبلیغ کے کام میں مصروف رہتے ہیں ان کے متعلق حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

العلمآء وارث الانبیآء

یعنی علماء نبیوں کے وارث ہوتے ہیں اور ان کے درجے کے متعلق یہ فرمایا کہ ایک عالم ہزار عابدوں سے بہتر ہے' کیونکہ ہزار عابدوں کی مجموعہ نیکی بھی ایک تبلیغ کرنے والے عالم کے برابر نہیں۔ یہ اس لئے کہ عابد دن رات صرف اپنے ہی نفس کے لئے عبادت کرتا ہے۔ اور عالم بذریعہ تبلیغ ہزار ہا لوگوں کو فیض پہنچا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک سچے نبی کو پرکھنے کا یہ بھی ایک نشان ہوتا ہے کہ وہ جس عظیم الشان کام کے لئے مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ کامیابی حاصل کرتا ہے اور ہمیشہ وہ کام دنیا میں جاری رکھنے کے لئے ایک ایسی جماعت قائم کرتا ہے جو اس کے بعد بھی اس کے قائم کردہ سلسلہ کی تبلیغ میں دن رات مشغول رہتی ہے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے اولوالعزم اور سچے نبی تھے۔ آپؐ نے بھی یہی عظیم الشان کام کیا۔ اور ایک ایسی جماعت قائم کر دی جو آپؐ کے بعد بھی آپؐ کے تبلیغ اسلام کا کام کرتی رہی۔

پھر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے' مگر ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ باقی تمام جہنمی۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہؐ! کونسا فرقہ جنتی ہوگا' تو آپؐ نے فرمایا۔ **ما انا علیه و اصحابی**۔ یعنی جو کام میں اور میرے اصحاب کرتے ہیں' وہ کام کرنے والا فرقہ جنتی ہوگا۔

دنیا جانتی ہے کہ آپ کا کام توحید قائم کرنا اور پھر اس کی اشاعت کرنا تھا۔ اور آپؐ نے ایسی ایک جماعت قائم کر دی تھی جو کہ آپؐ کے بعد بھی تبلیغ اسلام میں ہر وقت مصروف رہتی تھی۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ نے جس نبی کو مبعوث فرمایا' اس کا بھی اصل کام دنیا میں حقیقی توحید قائم کرنا اور تمام جہاں میں اس کی تبلیغ کرنا تھا۔ اور اس نے بھی ایک ایسی جماعت قائم کر دی جو اس کے ساتھ اور اس کے بعد بھی وہی تبلیغ کے کام میں دن رات اپنے جان و مال سے مصروف ہے۔ ایسی ہی جماعت کی نسبت خدا تعالیٰ کا مذکورہ بالا آیت میں ارشاد ہے کہ وہ فلاح پانے والی جماعت ہے اور وہی اس زمانہ میں اسلام کا جنتی فرقہ ہے۔

.... (۱۱) ....

واعتصموا بحبل الله جمیعا ولا تفرقوا یعنی مضبوط پکڑو اللہ کی رسی کو سب مل کر۔ اور تفرقے مت کرو۔ (سورۃ آل عمران ۔ آیت ۱۰۳)

مگر مسلمان اس حکم پر قائم نہ رہے اور مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں وہ اپنی تمام ترقیات و شان و شوکت کھو بیٹھے۔ گو حالت دن بدن بدتر ہو رہی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے اندرونی جھگڑوں کو ترک کر کے متحد نہیں ہوتے۔ جس کا یہ بدیہی نتیجہ ہے کہ وہ ہر طرح غیر مسلم اقوام کے شکار اور ان کے ذریعہ ہر طرح سے ذلیل و خوار کئے جا رہے ہیں۔

گو مختلف عقائد کے فرقے ہر مذہب میں موجود ہیں پھر بھی وہ موقع کے لحاظ سے متحد ہو جاتے ہیں۔ ہندو قوم کو ہی دیکھ لو۔ اگر چہ ان میں صدہا فرقے ہیں۔ اور ان میں آپس میں

زمین و آسمان کا مذہبی اختلاف ہے۔ پھر بھی وہ ہندو راج قائم کرنے کے لئے متحد ہو گئے ہیں۔ اور مسٹر گاندھی جیسے شخص کو اپنا لیڈر بنا کر جس طرح چاہیں اپنا مدعا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ سیاسی جدوجہد میں مبتلا اور پراگندہ حال ہی رہیں تو ان کی حالت بہت ہی خطرناک ہو جائے گی۔ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی علاج ہے جو خدا تعالیٰ نے بتلایا ہے۔ اس کی تعمیل کی جائے اور وہ یہ کہ مسلمان آپس میں متحد اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہو جائیں اور ایک نظام کے ماتحت عمل کریں۔ گو مسلمان مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، مگر پھر بھی وہ خدا تعالیٰ کو اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن شریف کو ماننے میں متفق ہیں۔ اس لئے ان کو ایک واجب الاطاعت امام کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔ اگر دین کی خاطر نہیں تو کم از کم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لئے اور اپنی دنیوی زندگی عزت سے بسر کرنے کی خاطر متحد ہونا ضروری ہے۔ اس کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

یا ایھا الذین امنو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ۔یعنی اے مومنو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تم میں جو حاکم ہو۔ حاکم سے مراد دنیوی معاملہ میں دنیوی حاکم اور دینی معاملہ میں دینی حاکم یا امام زمان۔ (سورۂ نساء آیت ۶۰)

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون** ۔یعنی اے مومنو! ڈرو اللہ سے اور اسی کی طرف وسیلہ کو ڈھونڈو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ (سورۂ مائدہ آیت: ۳۵)

پھر فرمایا ہے: **ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص** ۔یعنی یقیناً اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف باندھ کر۔ گویا کہ وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

غرض کہ ان تمام آیات کلام الٰہی سے یہی مراد ہے کہ دین و دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک واجب الاطاعت امام کے تحت متحد ہو کر کوشش کرنا ضروری ہے۔ اگر فی الحال دین کی خاطر نہیں تو دنیا ہی کی خاطر ایک انتظام کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک گر ہے جو خدا تعالیٰ نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے سکھلایا ہے۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو کم از کم

اتنا تو ضرور کیا جاوے کہ اپنی زندگی اسلام کی تعلیم کے مطابق بسر کریں۔ شادی و غمی کے بدعتی رسومات کو ترک کر دیں۔ اور ہر طرح کی فضول خرچی سے بچیں۔ سودی روپیہ ہرگز نہ لیں۔ صنعت و حرفت کی اسلامی دکانیں کھولیں۔ تجارت کریں اور مسلمان تاجروں کی سرپرستی کریں۔ اگر مسلمان اتنا بھی نہ کر سکیں تو ان کو دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھونا ہوگا۔

.... (۱۲) ....

جس طرح دنیا میں کسی بڑے معاملہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ایک لائق رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح دینی معاملے کے لئے بھی ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایسا شخص جو دینی معاملہ کی رہنمائی کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جاتا ہے وہ رسول یا نذیر یا امام کہلاتا ہے۔ پھر جس طرح دنیوی معاملہ میں ایک لائق رہنما کے بغیر کام کیا جائے، تو آخر میں خسارہ ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح دینی معاملہ میں بھی دینی رہنما کی تعلیم کے بغیر عمل کیا جائے تو اس کا بھی انجام آخرت میں خسارہ ہی ہوتا ہے۔ جس کے متعلق قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے:

یٰبنی ادَمَ امایا تینکم رُسُلٌ مِّنکم یَقُصُّون علیکم ایٰتی . فمن اتقی واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون. والذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنھا، اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون ۔یعنی اے بنی آدم! اگر آویں تمہارے پاس رسول تم میں سے۔ بیان کریں تم میں میری آیتیں۔ پس جو پرہیزگاری کرے اور اصلاح کرے تو نہیں ڈر ان پر اور نہ وہ غمگین ہونگے اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے۔ یہ لوگ آگ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (سورۂ اعراف آیت ۳۶ و ۳۷)۔

خدا تعالیٰ کا یہ قانون شروع دنیا سے ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے جس طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے بندوں کی جسمانی پرورش کرے۔ اسی طرح ان کی روحانی پرورش بھی کرتا رہے۔ اسی لئے ہر زمانہ میں اس کی طرف سے کسی نہ کسی شخص کا ظہور ضرور ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے مرنے کے بعد ہر انسان سے سب سے اول ایک ہی اہم سوال ہے جس کی پرسش ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کے زمانہ میں اس کے پاس

خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی رسول یا نذیر آیا تھا یا نہیں؟ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول یا نذیر کو مانتا ہے' اس کے تمام دینی عقائد اور اعمال کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص تکبر کرتا ہے اور انکار کرتا ہے وہ اپنے غلط عقائد کی وجہ سے اپنے تمام اعمال برباد کرتا ہے اور جہنم کی سزا پاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

یمعشر الجن والانس الم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم ایتی وینذرونکم لقاء یومکم هذا ، قالوا شهدنا علیٰ انفسنا وغرتهم الحیوةُ الدنیا و شهدوا علیٰ انفسهم انهم کانوا کفرین ۔ یعنی اے جماعت جنوں اور آدمیوں کی! کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس رسول' تم میں سے۔ بیان کرتے تھے تم پر میری آیتیں اور ڈراتے تھے تم کو اس دن کی پیشی سے۔ وہ کہیں گے گواہی دی ہم نے اپنی جانوں پر اور دھوکے میں ڈال دیا ان کو زندگی دنیوی نے۔ اور گواہی دی انہوں نے اپنی جانوں پر یہ کہ وہ تھے انکار کرنے والے (سورۂ انعام آیت ۱۳۱)

پھر ایسے انکار کرنے والے جب جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ اس وقت بھی ان سے اسی سوال کی پرسش ہوگی کہ ان کے پاس انہی میں سے خدا تعالیٰ کا کوئی رسول ظاہر ہوا تھا یا نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

وسیق الذین کفروا الی جهنم زمرا ، حتی اذا جآء و ها فتحت ابوابها وقال لهم خزنتهآ الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم ایت ربکم وینذرو نکم لقآء یومکم هذا ، قالوا بلی ولکن حقت کلمة العذاب علی الکفرین. قیل ادخلوا ابواب جهنم خلدین فیها فبئس مثوی المتکبرین ۔ یعنی اور ہانکے جائیں گے جو منکر ہوئے تھے دوزخ کی طرف گروہ گروہ۔ یہاں تک کہ جب آویں گے اس کے پاس۔ کھولے جائینگے اس کے دروازے۔ اور کہیں گے ان کو چوکیدار اس کے کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس رسول تم میں سے۔ جو پڑھتے تھے تم پر آیتیں تمہارے رب کی۔ اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات سے اس دن کی۔ کہیں گے ہاں! لیکن لگ چکا فرد جرم کافروں پر۔ کہا جائے گا داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے۔ ہمیشہ رہنے والے ہو اس میں۔ پس برا ہے ٹھکانہ تکبر کرنے والوں کا۔ (سورۂ زمر آیت ۷۲و۷۳)

پھر ایک اور آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ایسے انکار کرنے والے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا گناہ قبول کریں گے اور افسوس کریں گے کہ کیوں انہوں نے خدا کے رسول کی بات سنی نہیں اور عقل سے کام نہ لیا؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

کلما القی فیها فوج سألهم خزنتهآ الم یاتکم نذیر . قالوا بلیٰ قدجئنا نذیر فکذبنا وقلنا مآ نزل الله من شیء ان انتم الا فی ضلل کبیر. وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحب السعیر ۔ یعنی جب ڈالی جائے گی اس (جہنم) میں کوئی جماعت۔ پوچھیں گے ان سے چوکیدار اس کے کیا نہ آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا۔ کہیں گے ہاں یقیناً آیا تھا ہمارے پاس ڈرانے والا۔ مگر جھٹلایا ہم نے اور کہا ہم نے نہیں اتارا اللہ نے کچھ۔ نہیں ہو تم مگر گمراہی بڑی میں۔ اور کہیں گے اگر ہوتے ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے نہ ہوتے ہم دوزخ والوں میں۔ (سورۃ ملک آیت ۹ تا ۱۲)۔

پھر بڑی مدت دوزخ میں عذاب بھگتنے کے بعد وہ صرف ایک دن عذاب موقوف کرنے کے لئے عرض کریں گے جب بھی یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا ان کے پاس خدا تعالیٰ کا کوئی رسول آیا تھا یا نہیں؟ جیسا کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

وقال الذین فی النار لخزنة جهنم ادعوا ربکم یخفف عنا یوما من العذاب، قالوا اولم تک تاتیکم رسلکم بالبینت قالوا بلی، قالوا فادعوا وما دعاو الکفرین الا فی ضلل ۔ یعنی اور کہیں گے وہ لوگ جو آگ میں ہونگے داروغوں کو دوزخ کے کہ دعا کرو اپنے رب سے کہ وہ کم کر دے ہم سے ایک دن عذاب سے۔ کہیں گے وہ کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول روشن نشانوں کے ساتھ؟ کہیں گے ہاں تو (چوکیدار) کہیں گے دعا کرو۔ اور نہیں دعا انکار کرنے والوں کی مگر بیکار (سورۂ مومن آیت ۵۰۔۵۱)

اس طرح دوزخ کے چوکیداروں سے سوال و جواب ختم ہونگے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بھی ان حق کے منکروں سے یہی فرمائے گا کہ تمہارے پاس نذیر آیا' مگر تم نے کوئی نصیحت نہ پکڑی' اس لئے اب تم دوزخ کا عذاب ہی چکھتے رہو۔ اس کے سوائے اور کوئی بدلہ نہیں۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

والذین کفروا لھم نار جھنم لا یقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا، کذلک نجزی کل کفور. وھم یصطرخون فیھا ربنآ اخرجنا نعمل صالحا غیرالذی کنا نعمل، اولم نعمر کم ما یتذکر فیہ من تذکرو جآء کم النذیر. فذوقوا فما للظلمین من نصیر۔یعنی وہ جنہوں نے انکار کیا ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے۔نہیں قضا آئیگی ان پر کہ وہ مرجائیں۔اور نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے کچھ عذاب اسکا۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں انکار کرنے والے کو۔اور وہ چلائیں گے اس میں۔اے رب ہمارے نکال ہم کو کہ عمل کریں' ہم اچھے سوائے ان کے جو ہم عمل کرتے تھے۔کیا نہ عمر دی تھی ہم نے تم کو اس قدر کہ نصیحت پکڑتے' اس میں اگر کوئی نصیحت پکڑتا اور آیا تمہارے پاس ڈرانے والا۔پس چکھو' پس نہیں ظالموں کے لئے کوئی مددگار۔(سورۂ فاطر آیت ۳۷۔۳۸)

اس کے مقابل جو لوگ اپنے زمانہ کے ربانی رہنما کو مان لیتے ہیں وہ جب تک دنیا میں رہتے ہیں یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفر عنا سیاتنا وتوفنا مع الابرار. ربنا اتنا ما وعدتنا علی رسلک ولا تخزنا یوم القیمة انک لا تخلف المیعاد۔یعنی اے رب ہمارے بیشک ہم نے سنا پکارنے والا پکارتا ہے ایمان کے لئے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔پس ہم ایمان لائے۔اے رب ہمارے گناہ بخش' ہمیں ہمارے گناہ اور دور کر ہم سے ہماری برائیاں اور وفات دے ہم کو ساتھ نیک لوگوں کے۔اے رب ہمارے اور دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے بذریعہ اپنے رسولوں کے اور نہ ذلیل کر ہم کو بروز قیامت۔بیشک تو نہیں وعدہ خلافی کرتا۔(سورہ آل عمران آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵)۔

پھر ربانی راہ نما کو ماننے والے مرنے کے بعد جنت میں داخل ہونگے۔تو اس طرح خدا تعالی کی حمد وشکر گزاری ادا کرتے رہیں گے:

وقالوا الحمدلله الذی ھدنا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدنا الله لقد جآءت رسل ربنا بالحق۔یعنی اور کہیں گے سب تعریف اللہ ہی کی ہے' جس نے ہدایت کی ہم کو اس کی طرف۔اور نہ تھے ہم کہ راہ پاتے۔اگر نہ راہ دکھاتا ہم کو اللہ۔البتہ یقیناً آئے رسول ہمارے رب کے حق کے ساتھ۔(سورۂ انعام آیت ۴۳)

سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے چند اہم افرادِ خاندان کا ذکر خیر

☆ نواب احمد نواز جنگ بہادر

''حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب احمدی ہونے کے بعد اپنے تمام قریبی رشتہ داروں کو احمدیت کی تبلیغ متواتر کیا کرتے تھے، چنانچہ ان کی بڑی بہو فیض النساء بیگم کے نانا حضرت ابراھیم بھائی الہ دین نے احمدیت قبول کی اور صاحب کشف ورؤیا کے مدارج پر فیضیاب ہوئے۔اس طرح اُن کے سمدھی حضرت فاضل بھائی ابراھیم کو بھی احمدیت کی قبولیت کی سعادت نصیب ہوئی۔مگر ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے تین سوتیلے بھائی جو سب ان سے چھوٹے تھے وہ بھی اس سعادت سے حصہ پاویں، ان کے سب سے چھوٹے بھائی سیٹھ علی صاحب اسماعیلی مذہب ترک کر کے اہل حدیث جماعت میں شامل ہو گئے اور آخر وقت تک اسی مسلک پر قائم رہے۔ان سے بڑے بھائی سیٹھ غلام حسین اسماعیلی عقیدے پر قائم رہے۔ان کے تیسرے بھائی جو عمر کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھے اور جن کا نام احمد علاؤ الدین تھا کاروباری دنیا میں بہت کامیاب رہے پہلے سرکار انگریزی کی طرف سے خان بہادر اور بعد میں O.B.E کے خطابات عطا ہوئے اور عہد عثمانیہ کے آخری دور میں نواب احمد نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ان کی طرف حضرت قبلہ سیٹھ صاحب کی ہمیشہ توجہ رہی، چنانچہ ایک طرف تو سر آغا خان کی طرف سے وہ ریاست حیدرآباد کی اسماعیلی جماعت کے وزیر تھے تو دوسری طرف حضرت مصلح موعود سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور تحریک جدید کے مجاہدین میں آخر وقت تک شامل رہے اور جب کبھی انہیں کاروبار میں منافع ہوتا تو ایک خطیر رقم حضرت مصلح موعود کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کرتے، چنانچہ جب ۱۹۳۸ء میں حضرت مصلح موعود، حیدرآباد دکن کی سیاحت پر آئے تو نواب احمد نواز جنگ کو حضور نے میزبانی کا شرف عطا کیا۔اس عرصے میں وہ سرکار نظام کے ساتھ کئی بڑی صنعتوں میں ۴۹ فیصد کے تناسب سے حصہ دار بن گئے۔اس کاروبار میں میر لائق علی بھی شامل

تھے۔ حضرت قبلہ سیٹھ صاحب کے متواتر اصرار پر ۱۹۴۸ء سے قبل کسی وقت مخفی طور پر بیعت بھی کرلی اور اس کے اعلانیہ اظہار کو پردہ اخفا میں رکھنے کے لئے یہ عذر کیا کہ چونکہ سرکار نظام کاروبار میں سینئر پارٹنر ہیں اور احمدیت سے بغض رکھتے ہیں، لہٰذا بیعت کے اعلانیہ اظہار سے ان کے کاروبار کونقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔

لیکن جب ستمبر ۴۸ء میں ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کرلیا تو نظام حیدرآباد کی سرکار کے جو ۵۱ فیصد حصے ان صنعتوں میں تھے وہ کانگریس گورنمنٹ نے ضبط کرکے برلا اینڈ کمپنی کے ہاتھ فروخت کردیئے۔ ادھر میر لائق علی سیاسی وجوہ کی بنا پر پہلے نظر بند ہوئے اور بعد میں فرار ہوکر پاکستان آگئے۔ ہندوستانی حکومت نے اس شبہ کی بنا پر کہ میر لائق علی کے فرار میں نواب صاحب کا ہاتھ ہے انہیں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا اور کچھ عرصے بعد رہا کردیا۔ نواب صاحب اس صدمے سے بہت مضمحل ہوئے اور ۲۲ر ڈسمبر ۱۹۵۴ء میں انتقال کرگئے، مگر ۱۹۴۹ء میں جبکہ نظام حیدرآباد کی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا اور نواب صاحب مرحوم کے دربار پر نظام کے دباؤ کا مزید کوئی اندیشہ نہ تھا۔ حضرت مصلح موعود نے سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کولکھا ''اس رمضان میں خصوصیت سے آپ کے لئے اور احمد بھائی کے لئے دعائیں کرتا رہا ہوں۔ احمد بھائی کے لئے اب مناسب تو یہی ہے کہ وہ نظام والا بت ٹوٹ گیا ہے تو اب وہ مخفی بیعت کوترک کرکے ظاہر ہوجائیں، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کے ہمجولی والے بت کوتو توڑ دیا ہے اب توان کوخدا کی راہ سے ہی عزت ملے گی اور جس طرح ان کے اندر اخلاص پایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ یہ قدم اٹھائیں تو انہیں مزید قربانیاں کرنی پڑیں گی، مگر دین و دنیا کی برکات بھی بہت ملیں گی۔ مگر چونکہ ان کے دل پر دنیا کی محبت کا رنگ ابھی ہے اس لئے میں زور نہیں دیتا کہ رہا سہا تعلق بھی کمزور نہ پڑ جائے اور اللہ تعالیٰ سے ہی دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو ہمت بخشے۔

والسلام۔ خاکسار

مرزا محمود احمد

نواب صاحب کے مخفی بیعت کے بارے میں حال ہی میں چودھری صاحب

(سر محمد ظفر اللہ خان صاحب) سے لاہور میں گفتگو ہوئی، تو انہوں نے فرمایا:

''مجھے نواب صاحب (یعنی قبلہ سیٹھ صاحب کے بھائی) کی مخفی بیعت کا علم تھا، میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی بیعت کا اعلانیہ اظہار کیوں نہیں کرتے تو نواب صاحب نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اگر اس کی نگاہ میں میرا ایسا کرنا بہتر ہے تو مجھے ہمت دے، اس پر میں نے پوچھا کہ جب آپ فراخی رزق کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو کیا اس وقت بھی یہ شرط لگاتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو میرے لئے فراخی رزق کو بہتر جانتا ہے تو فراخی عطا کر انہوں نے کہا نہیں اس پر اس موقع پر تو میں بلا شرط دعا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

(مکرم شیخ محمود الحسن صاحب، لاہور چھاونی پاکستان کا بیان ہے)

ایک اور تاریخی واقعہ

غالباً ۱۹۵۰ء کے اپریل کے مہینے میں' محترم نواب احمد نواز جنگ صاحب (جو حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں) کے متعلق اطلاع شائع ہوئی کہ ان کو سرکار کی طرف سے حراست میں لے لیا گیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے خاص طور پر دعا کے لئے تحریک ہوئی۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ نواب صاحب حضرت سیٹھ صاحب کے بھائی ہیں اور سیٹھ صاحب اپنے اخلاص، تقویٰ اور دینی خدمات کی وجہ سے سلسلہ کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ میں نے متواتر کئی دن تک نواب صاحب کے لئے دعا کی اور بوجہ تعلق محبت اور ہمدردانہ شفقت کے مجھے دعا کی اچھی توفیق میسر آگئی۔

مئی کے پہلے ہفتے میں' میں نے کشفی طور پر دیکھا کہ جناب سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب مع جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر کے میرے سامنے کھڑے ہیں اور میں ان کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہوں کہ نواب احمد نواز جنگ اور ان کے صاحبزادے (جو ان کے ساتھ ہی زیر حراست تھے) کے لئے دعا کی گئی ہے۔ وہ عنقریب رہا کردیئے جائیں گے۔ میں نے دوسرے دن اس کشف سے پشاور میں کئی دوستوں کو بھی اطلاع دیدی۔

چنانچہ ۱۸ رمئی کے الفضل میں عزیزہ مکرمہ زینب حسن صاحبہ برادرزادی نواب احمد نواز جنگ صاحب کی طرف سے نواب صاحب کی رہائی کی اطلاع شائع ہوئی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل واحسان ہے کہ اس نے اپنے اس عبد حقیر کو سیدنا حضرت مسیح موعودؑ اور آپ کے مقدس خلفاء کے فیض سے یہ عینی اطلاع دے کر نوازا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔ (حیات قدسی۔ ۲۸)

☆ آہ! حضرت سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب

فرزند اکبر سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب

اسلام اپنے متبعین کو تلقین کرتا ہے تم اپنی زندگیوں میں ایک زندہ جاوید کارنامہ انجام دے جاؤ قبل اس کے کہ موت کا فرشتہ تمہارے دروازے پر دستک دے تم اس کام کی تکمیل کرلو اور اس مستعار زندگی کو غنیمت جان کر اپنے لئے زادِ راہ تیار کرلو۔ جو کل خدائے ذوالجلال کے روبرو پیش کرسکو، جس سے اس کی خوشنودی اور ابدی حیات نصیب ہوجائے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک عظیم الشان اور قابل تقلید نمونہ چھوڑ جاؤ ایسے وجود جماعتوں اور قوموں کے لئے تعویذ کا کام دے جاتے ہیں ان کی برکتوں سے قومیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اور ان کے گذر جانے سے ایک بہت بڑی خلا واقع ہوجاتی ہے۔

حضرت سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب ایسے ہی وجودوں میں سے تھے جو اس دار فانی سے کوچ کرکے اپنے محبوب لامکانی کے حضور حاضر ہوگئے۔ حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے فرزند اکبر تھے اور ۱۹۱۵ء میں قابل فخر باپ کے ہمراہ حضرت مصلح موعودؓ کے عہد میں بیعت کرنے کی سعادت حاصل کی۔ حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب آسمان احمدیت کے درخشندہ ستاروں میں سے ایک تھے، جن کے بارے میں حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا کہ آپ بعد میں آکر پہلوں سے آگے نکل گئے آپ نے جس رنگ میں اشاعت لٹریچر کا کام کیا ہے، اس کے تعلق سے حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا کہ آپ کے بارے اس کام کو دیکھ کر مرکز کو بھی شرم آتی ہے۔ ایک دور میں حضرت سیٹھ صاحب پر شدید مالی ابتلا آیا، مگر چندوں کی رفتار وہی رہی جب حضرت مصلح موعودؓ کو

علم ہوا تو آپ نے تحریر فرمایا کہ ''ایک دوست نے لکھا ہے کہ آپ کی مالی حالت کمزور ہوتی جارہی ہے، آپ بہت زیادہ چندہ دیتے رہے ہیں، فی الحال آپ بقایوں اور اگلا چندہ دینے کا خیال چھوڑ دیں۔ تو بات پسندیدہ ہوگی۔'' یہ ایسا عظیم الشان اعزاز تھا جو خلافت کے دربار سے ملا۔ نیز حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

''حضرت مسیح موعودؑ نے یہ جو فرمایا ہے کہ مجھے چالیس مومن مل جائیں، تو میں ساری دنیا پر اسلام کو غالب کرسکتا ہوں، ان چالیس مومنین میں کا ایک نمونہ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب ہیں۔

حضرت سیٹھ علی محمد الہ دین ۲۱ جون ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم سکندرآباد و قادیان میں حاصل کی، چنانچہ حضرت مصلح موعودؓ کے مشورہ اور ارشاد پر آپ کو برطانیہ میں مزید تعلیم کے لئے بھجوایا گیا جہاں آپ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور واپسی پر حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ آپ ہائی اسکول کی کمیٹی کے ممبر رہے، جماعتی طور پر قائد مجلس خدام الاحمدیہ، سکریٹری تبلیغ، سکریٹری وصایا اور نائب امیر رہے۔'' نیز ''حیات قدسی'' کا پہلا حصہ آپ کو ترتیب دینے کا شرف حاصل رہا۔

آپ نہایت مخلص فدائے احمدیت اور والہانہ عقیدت خلفاء عظام سے رکھتے تھے۔
آپ ہی کے فرزند محترم حافظ ڈاکٹر صالح محمد الہ دین صاحب پی ایچ ڈی صدر جماعت احمدیہ سکندرآباد ہیں حال صدر صدر انجمن احمدیہ جو جماعت کی ممتاز شخصیت ہیں۔ اور خدمات جلیلہ انجام دے رہے ہیں۔ حضرت سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب مورخہ ۱۹ جون ۱۹۹۰ء شام ساڑھے پانچ بجے چلتے پھرتے جان جانِ آفریں کے سپرد کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ سے جب ملاقات ہوتی تو آپ مسکرا کر ملتے اور دعائیں دیتے۔ آپ کے ملنے سے ایک روحانی قوت محسوس ہوتی۔ جب خاکسار نے آپ کا چہرہ وفات کے بعد دیکھا تو عجیب نورانی تھا۔ اور ویسے ہی مسکراتا ہوا۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ غم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور ہچکیاں لیتی تھیں، خاکسار نے تسلی دی۔ فرمانے لگیں مولوی صاحب فرشتہ چلا گیا، اس جملے میں نہ جانے کیا قوت تھی کہ میں بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور آنکھیں بہہ پڑیں اور سچ ہے کہ حضرت سیٹھ علی

محمد الہ دین چلتے پھرتے فرشتہ تھے۔ گویا آسمان احمدیت کا ایک اور درخشندہ ستارہ مسکراتے ہوئے غروب ہوگیا۔ آپ پابند صوم صلوٰۃ تھے اور شب بیدار تھے۔ آپ بیشمار خوبیوں کے مالک تھے۔ خلفاء عظام اور خاندان حضرت مسیح موعودؑ سے والہانہ محبت وعقیدت تھی۔ آپ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ آپ چلتے پھرتے فرشتہ تھے۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا   اسی پراے دل تو جاں فدا کر

آپ کا خاندان نہایت مخلص اور قابل تقلید نمونہ پیش کر رہا ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی محترم سیٹھ یوسف احمد الہ دین صاحب جو میرے ہمزلف ہیں جنہیں تبلیغ کا جنون ہے اللہ تعالیٰ صحت والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔ اور حقیت میں حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب نے اپنی اولاد کی بہترین انداز سے تربیت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ سچ ہے ؎

یہ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

آپ کی وفات پر الہ دین بلڈنگ میں کثیر تعداد میں جماعت احمدیہ حیدرآباد وسکندرآباد اور غیر از جماعت اکٹھے ہوئے تھے خاکسار نے بعد نماز ظہر نماز جنازہ پڑھائی۔ بعدہ آپ کے جسد خاکی کو بنڈلا گوڑہ فارم ہاؤس میں امانتاً دفنایا گیا۔ یہاں بھی حیدرآباد کے بہت سارے دوست اکٹھے ہوگئے تھے۔ لہٰذا محترم حافظ صالح محمد الہ دین صاحب صدر جماعت احمدیہ سکندرآباد نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین کے بعد خاکسار نے اجتماعی دعا کروائی۔ اس خاندان کو ابھی کچھ عرصہ پہلے محترمہ صدیقہ الہ دین صاحبہ کے شوہر ڈاکٹر ماجد صاحب امریکہ کی وفات کا غم ہلکا ہوا بھی نہ تھا کہ محترم سیٹھ صاحب کی وفات اس خاندان کے لئے دوسرا بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ مرحوم نے قابل فخر اولاد محترم حافظ صالح محمد الہ دین صاحب، محترم راشد الہ دین صاحب امریکہ، محترمہ انیسہ بیگم صاحبہ آف پاکستان، محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ امریکہ کو چھوڑا ہے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(از: محترم مولانا حمید الدین صاحب شمس مبلغ انچارج حیدرآباد۔ آندھرا)

☆ محترمہ فیض النساء صاحبہ کا ذکر خیر

بڑی بہو بیگم، سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب

میرے والد محترم سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب مرحوم ۱۹ جون ۱۹۹۰ء کو وفات پاگئے۔ ان کی وفات پر ان کا ذکر خیر اخبار بدر میں شائع فرمایا تھا، لیکن میری والدہ محترمہ فیض النساء صاحبہ کی وفات کے بعد ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد فضل واحسان ہے کہ خاکسار کو ایک مضمون والدہ محترمہ کے بارے میں لکھنے کی توفیق مل رہی ہے۔

میری والدہ ۲۱ رمئی ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئیں۔ اور یکم جون ۱۹۹۸ء کو وفات پائی۔ اس طرح بفضل اللہ تعالیٰ ۹۰ سال کی عمر انہوں نے پائی۔

میری والدہ کے والد کا نام ہمزہ سجن لال تھا۔ وہ چھوٹی عمر میں فوت ہوگئے جبکہ میری والدہ بچہ تھیں۔ میری والدہ کی والدہ کا نام شہر بانو تھا۔ وہ کتاب کشتی نوح کا مطالعہ کرنے اور بعض خوابیں دیکھنے کے بعد بیعت کر کے احمدیت میں داخل ہوئیں تھیں۔

میری والدہ کے کئی چچا تھے۔ اور ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک چچا مکرم قاسم علی سجن لال عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں کئی سالوں تک نہایت قابل استاد رہے۔ والدہ کے ایک اور چچا مکرم ڈاکٹر اکبر علی سجن لال لمبے عرصہ نظامیہ آبزرویٹری حیدرآباد کے نہایت قابل Director رہے۔ انہوں نے فلکیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مجھے امریکہ بھیجنے کی کوشش کی تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیاب رہی۔ اور خاکسار ۱۹۵۹ء میں امریکہ کے لئے روانہ ہوا۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر اکبر علی سجن لال صاحب کی وفات ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میری والدہ ابتداء میں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کے ساتھ بہت محبت رکھتی تھیں۔ احمدیت قبول کرنے کے بعد ان محبتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اور بعد میں حضرت مسیح موعودؑ اور ان کے اہل بیت کی محبت بھی پیدا ہوگئی۔ الحمدللہ۔

میری والدہ کے ذریعہ مجھے نماز سے اور سچائی سے محبت پیدا ہوئی۔ میری عمر چھ سال کی

ہوگی کہ انہوں نے مجھے بڑے شوق سے نماز سکھائی تھی۔ اتنے شوق سے کوئی دوسری چیز کبھی نہیں سکھائی۔ وہ نماز کی پابند تھیں اور سچ بولتیں تھیں۔ انہوں نے مجھے نماز پڑھنے اور سچ بولنے کی عادت ڈالی۔ نیز نمازیں پڑھنے اور دعائیں کرنے کی عادت ڈالی۔

میری والدہ کو حضرت ام المومنین سے ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ حضرت ام المومنین نے میری دادی صاحبہ سے فرمایا تھا کہ آپ کی بہو اچھی ہے۔ الحمدللہ۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اس کے تفصیلی کوائف محترم ملک صلاح الدین صاحب مرحوم نے تابعین اصحاب احمد حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین میں شائع فرمائے ہیں۔ یہاں پر خاکسار ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ جس کا میری والدہ محترمہ پر بہت گہرا اثر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی زندگی کا انتہائی خوشی کا حسین ترین واقعہ ہے۔ جبکہ ان کو حضرت مصلح موعود کا بہت دیر تک قرب حاصل رہا۔ حضرت مصلح موعود کے ساتھ ان کی بہن حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ، حرم محترم حضرت سیدہ ام متین صاحبہ اور ان کی بیٹی تشریف لائی تھیں۔ ایک روز جب یہ بزرگ خواتین، میری دادی اور دوسری مستورات کے ساتھ باہر گئی ہوئیں تھیں۔ اور صرف میری والدہ محترمہ مکان میں تھیں۔ یہ اطلاع ملی کہ حضرت مصلح موعودؓ مستورات کو ملاقات کا شرف بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ میری والدہ محترمہ کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ عورتوں کا حضور سے تعارف کروائیں۔ چنانچہ تمام عورتیں الہ دین بلڈنگ سکندرآباد کے ایک بڑے کمرے میں جو اس وقت میری چچی محترمہ ساجدہ بیگم اہلیہ محترم سیٹھ یوسف الہٰ دین صاحب مرحوم کے مکان کے ایک حصہ میں جمع ہوگئیں۔ حضرت مصلح موعودؓ تشریف لائے اور صوفہ پر تشریف فرما ہوئے۔ اور میری والدہ بہت دیر تک ان کا تعارف کرواتی رہیں۔ میری والدہ کہتی تھیں کہ بعض عورتیں اپنے شوہر کا نام بتانے سے بھی شرماتیں تھیں۔ اور مجھے بڑی مشکل ہوتی تھی تعارف کروانے میں۔ میری عمر اس وقت سات سال کی تھی۔ میں بھی اس کمرے میں حضور کے بہت قریب بیٹھا رہا۔ اس پیارے نظارے کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہے۔ میں سارا وقت حضرت مصلح موعود کے چہرہ مبارک کو دیکھتا رہا۔ سارا وقت حضور انور کی نظر نیچے رہی۔ ایک لمحہ بھی حضور نے اوپر نہیں دیکھا۔ جب کافی دیر ہوگئی تو مسجد سے اذان

کی آواز سنائی دی۔ میری والدہ بتلاتی تھیں کہ اذان سنتے ہی میرے بھائی راشد محمد الہٰ دین جو اس وقت ایک سال کے تھے اور اس وقت نیویارک (امریکہ) میں رہتے ہیں انہوں نے حضور کے سامنے سجدہ کردیا۔ یہ دیکھ کر حضور ناراض ہوگئے کہ بچے کو شرک نہیں سکھانا چاہئے۔ میری والدہ نے کہا کہ حضور یہ آپ کو سجدہ نہیں کررہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کررہا ہے۔ اس بچہ کی عادت ہے کہ جب بھی اسے اذان کی آواز سنائی دے تو جہاں بھی ہو وہ سجدہ کردیتا ہے۔

میری والدہ اس واقعہ کو بار بار دہراتی رہتی تھی۔ آخری عمر میں تو اس بات کی تکرار اور بھی بڑھ گئی کہ حضور تشریف لائے تھے اور میں حضور کے قریب تھی۔

خاکسار اور خاکسار کی اہلیہ فرحت الہٰ دین مرحوم آخری زندگی میں ان کے ساتھ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخری واقعہ جو ان کے ذہن میں تھا وہ یہی تھا کہ جب حضور اقدس حیدرآباد تشریف لائے تھے وہ ان کے قریب تھیں۔

میری والدہ کو دادا جان حضرت سید عبداللہ الہٰ دین مرحوم سے بڑی محبت تھی۔ اور میرے دادا بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرے دادا جان کی وفات ۲۶ فروری ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے بعد میری والدہ اور ہمارے خاندان کے دوسرے افراد جلسہ سالانہ ربوہ میں شرکت کے لئے دسمبر ۱۹۶۲ء میں ربوہ گئے تھے۔ وہاں پر حضرت ام متین صاحبہ نے میرے افراد خاندان کی ملاقات حضور انور سے کروائی۔ جب ہم ربوہ جاتے تو حضرت ام متین صاحبہ کے مکان میں ٹھہرا کرتے تھے۔ حضرت دادا جان کی وفات کے بعد بھی انہوں نے اس شفقت کو ہم پر جاری رکھا اور ہم کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ جزاہا اللہ احسن الجزاء۔

۱۹۶۲ء میں ملاقات کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ نے دریافت فرمایا کہ عبداللہ بھائی کیسے ہیں؟ کسی نے جواب دیا کہ وہ تو فوت ہوچکے ہیں۔ والدہ بتلاتی ہیں کہ یہ سن کر حضور اقدس رونے لگے اور فرمایا کہ وہ بہت تبلیغ کرتے تھے۔ حضور کی تکلیف دیکھ کر فوراً یہ کوشش کی گئی کہ گفتگو کا موضوع بدل دیا جائے۔

حضرت مصلح موعودؓ کو حضرت دادا جان کی وفات کی خبر پہلے ہی جا چکی تھی۔ اور حضور اقدسؓ نے ہم کو گراں قدر تعزیت کا خط بھی تحریر فرمایا تھا۔ لیکن پھر حضورؓ بھول گئے تھے لہٰذا حضورؓ

نے ہم سے ان کی خیریت دریافت فرمائی۔ اس واقعہ سے حضور اقدس کی میرے دادا جان سے انتہائی شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میری والدہ جو سکندرآباد میں حضرت دادا جان کے ساتھ رہتی تھیں ۔ وہ ان کی وفات کے وقت مشرقی پاکستان گئی ہوئیں تھیں۔ اور میری پھوپھی جان محترمہ زینب حسن اہلیہ سید محمود الحسن صاحب (انہیں اسٹار آف پاکستان کا ایوارڈ ملا تھا) جو پاکستان میں رہتی تھیں، وہ ان کے قریب تھیں۔ میری پھوپھی جان کو حضرت دادا جان سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے حضرت دادا جان کے بارے میں کئی مضامین لکھے جو اخبارات میں شائع ہوئے۔

حضرت دادا جان نے بروز جمعہ ۹ اپریل ۱۹۱۵ء میں بیعت کی تھی اور میری پھوپھی جان بھی اسی سال اکتوبر کے مہینے میں غالباً ۲۶ اکتوبر کو پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس وقت زندہ ہیں اور لاہور میں ہیں۔ بہت نیک اور دعا گو ہیں۔

والدہ صاحبہ کی وفات پر ہمارے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے پر شفقت تعزیت کا خط ارسال فرمایا تھا۔ نیز محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب و محترمہ سیدہ امتہ القدوس بیگم صاحبہ بیگم محترم صاحبزادہ صاحب اور دوسرے بزرگوں و عزیزوں نے ہمدردی کے خطوط تحریر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ سب کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

میرے والد نے ایم اے تک تعلیم ایڈنبرا میں حاصل کی تھی۔ وہ کتابیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے بالمقابل میری والدہ نے صرف مڈل اسکول تک پڑھا تھا۔ وہ گھر کا تمام کام خوش اسلوبی سے دیکھ لیتی تھیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ دونوں نے بہت ہی خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔

ایک اور واقعہ میری والدہ کی زندگی کا نہایت ہی قابل ذکر ہے۔ غالباً دسمبر ۱۹۶۸ء میں ہم جلسہ سالانہ ربوہ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ وہاں پر سیدنا حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی۔ حضرت صاحب نے اپنا دست مبارک میرے والد صاحب کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ محترم مولوی محمد عمر صاحب جو اس وقت موجود تھے، نے مجھ سے بیان کیا کہ جب حضور بیعت کے بعد دعا سے فارغ ہوئے تو ان کا چہرہ مبارک آنسوؤں

سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد تمام ہندوستان سے آنے والوں کو حضور کی طرف سے ایک بہت اچھی دعوت دی گئی تھی۔ حضور نے فرمایا سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟ پھر حضور نے میرے والد صاحب کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ حضور کے ایک طرف حضرت مرزا عزیز احمد صاحب تھے اور دوسری طرف میرے والد صاحب۔ وہ پر شفقت سلوک جو حضرت مصلح موعودؓ میرے دادا صاحب سے فرمایا کرتے تھے وہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے میرے والد کے ساتھ جاری رکھا۔ الحمدللہ

الغرض یہ میرے والدین کے لئے نہایت ہی خوشی کا دن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفۂ وقت کی ملاقات سے مشرف فرمایا۔ الحمدللہ۔

از مکرم حافظ صالح محمد صاحب الہ دین امیر جماعت احمدیہ سکندرآباد

(ہفت روزہ بدر قادیان، ۲۴ رجون ۲۰۰۳ء)

☆ محترمہ فرحت الہ دین صاحبہ

بڑی بہو بیگم۔ سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب

افسوس ۱۰ رجون کو مختصر سی علالت کے بعد محترمہ فرحت الہ دین صاحبہ اہلیہ محترم حافظ صالح محمد الہ دین صاحب سابق صدر شعبہ فلکیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سکندرآباد میں وفات پاگئیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

محترمہ ۱۹ رنومبر ۱۹۳۹ء کو محترم مولانا عبدالمالک خان صاحب (ناظر اصلاح و ارشاد ربوہ) کے ہاں پیدا ہوئیں تھیں۔ اس طرح آپ نے باسٹھ سال عمر پائی۔ آپ محترم مولوی ذوالفقار علی خان صاحب کی پوتی تھیں۔ آپ کی شادی محترم ڈاکٹر حافظ صالح محمد الہ دین صاحب جو کہ حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب سکندرآباد کے پوتے اور محترم علی محمد الہ دین صاحب کے بیٹے کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو ہوئی تھی۔

شروع سے ہی آپ کی طبیعت میں دین سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ نے لجنہ اماء اللہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہ کر خدمت دین کی سعادت پائی۔ سالہا سال تک آپ صدر لجنہ اماء اللہ

سکندرآباد بھی رہیں۔ قادیان جلسہ سالانہ اور سالانہ اجتماعات میں اکثر تشریف لے جاتی تھیں اور تقریر کا بھی آپ کو موقع ملتا رہا۔ آپ کو علمی اور ادبی شغف تھا۔ آپ کے مضامین اخبار بدر کی زینت بنتے رہے ہیں۔ نیک سیرت، ہمدرد، غرباء کا خیال رکھنے والی، مہمان نواز، خلافت سے گہری وابستگی رکھنے والی اور بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھنے والی مثالی خاتون تھیں۔

۱۱ جون کو نماز ظہر و عصر کے بعد محترم مرزا وسیم احمد صاحب ناظر اعلیٰ و امیر جماعت احمدیہ قادیان جو حیدرآباد میں ان دنوں مقیم تھے سکندرآباد تشریف لائے اور نماز جنازہ پڑھائی۔ بعدہ مرحومہ کے خاوند اور بیٹے سلطان محمد اور پوتی فرحانہ بذریعہ جہاز رات ۹ بجے تابوت کے ساتھ دہلی پہنچے اور پھر بذریعہ ٹرین ۱۲؍جون ۲۰۰۲ء کی صبح ساڑھے دس بجے قادیان پہنچے۔ اسی روز ایک بجے محترم محمد انعام صاحب غوری قائم مقام امیر جماعت احمدیہ قادیان نے مدرسہ احمدیہ کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی۔ اور بہشتی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔ آپ ۱/۵ حصہ کی موصیہ تھیں۔ مرحومہ نے خاوند کے علاوہ دو بیٹے مکرم سلطان محمد الہ دین صاحب نائب قائد علاقائی آندھرا اور مکرم خالد احمد الہ دین قائد خدام الاحمدیہ سکندرآباد اور تین بیٹیاں ڈاکٹر مبارکہ نصرت صاحبہ زوجہ مکرم ڈاکٹر کریم احمد شریف آف امریکہ، مکرمہ عتیقہ صاحبہ زوجہ مکرم ڈاکٹر محمد احمد محمود قریشی صاحب آف امریکہ مکرمہ ڈاکٹر منصورہ صاحبہ اہلیہ مکرم محمد رشید طارق صاحب آف قادیان چھوڑیں۔ سب بفضلہٖ تعالیٰ صاحب اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ (ہفت روزہ بدر قادیان، ۲۶؍جون ۲۰۰۲ء)

☆۔ محترمہ فرحت اختر صاحبہ کا ذکر خیر

میری اہلیہ محترمہ فرحت اختر حضرت مولانا عبدالمالک خان صاحب مرحوم کی بڑی بیٹی تھیں اور حضرت مولانا ذوالفقار علی خان صاحب کی پوتی تھی۔ آپ ۱۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو فیروز پور میں پیدا ہوئی تھیں۔ میرے دادا جان حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب مرحوم نے سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت میں خط لکھا تھا کہ وہ میری شادی فرحت اختر صاحبہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضور کو مناسب معلوم ہو۔ حضرت مصلح موعودؓ کے پاس سے جواب موصول ہوا کہ مولوی

عبدالمالک صاحب کی بیٹی بہت اچھی ہے۔ پھر حضرت مصلح موعود سے درخواست کی گئی کہ وہ نکاح پڑھائیں۔ حضور نے ازراہ شفقت کراچی میں ۷ مارچ ۱۹۵۹ء کو ہمارا نکاح پڑھا۔ حضور بیمار تھے لیکن اس کے باوجود لیٹے لیٹے خطبہ نکاح پڑھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں حضرت مصلح موعودؓ پر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کو بہت بابرکت کیا اور میری بیوی میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک رہی اور ان سے مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ بچے عطا فرمائے۔ سلطان محمد، مبارکہ نصرت (زوجہ کریم احمد شریف صاحب)، صالحہ عتیقہ (زوجہ ڈاکٹر محمود قریشی صاحب)، منصورہ (زوجہ محمد رشید طارق صاحب) اور خالد احمد۔

نکاح سے قبل خاکسار کو نہ ریسرچ کے کام میں کامیابی حاصل ہوئی اور نہ کوئی ملازمت ملی۔ نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاکسار کے لئے بڑی ترقیات کے دروازے کھولے۔ امریکہ جاکر فلکیات کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ خاکسار اکتوبر ۱۹۵۹ء کو وہاں گیا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ میں اپنی اہلیہ کو اپنے پاس بلالوں۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو وہ امریکہ پہنچی۔ محترم پروفیسر خلیل احمد ناصر صاحب مرحوم نے ہمارا استقبال نیویارک میں کیا اور اپنے گھر ٹھہرایا۔ پھر ہم Williams Bay کے لئے روانہ ہوئے جہاں خاکسار کا قیام تھا۔ ۱۹۶۱ تا ۱۹۶۳ء تین سال ہم امریکہ میں ساتھ رہے۔ میری اہلیہ نے دعاؤں اور حوصلہ افزائی سے میری مدد کی۔ علاوہ ازیں گھنٹوں کام کر کے بعض حسابات بھی مجھے کر کے دیئے تا کہ میرا وقت بچ جائے۔

پی، ایچ، ڈی کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاکسار کو اپنی اہلیہ کے ساتھ عمرہ کرنے کی سعادت بخشی اور ربوہ میں حضرت مصلح موعودؓ سے ملاقات کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۶۳ء سے ہم سکندرآباد میں مقیم رہے۔

ایک جلسہ سالانہ ربوہ کے موقع پر میری اہلیہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے عرض کیا کہ حضور میرے عزیز ربوہ میں آپ کے قریب رہتے ہیں۔ بوجہ دوری میں آپ کے قرب سے محروم ہوں تو حضور نے یہ کہہ کر دلجوئی فرمائی کہ ان کی مثال تو عام کھانوں کی طرح ہے جو ہر روز ملتا ہے۔ آپ تو پلاؤ کی طرح ہیں جو کبھی کبھی میسر آتا ہے۔

۱۹۹۱ء میں میری بیٹی مبارکہ نصرت کی شادی میں شرکت کے لئے میری اہلیہ دوبارہ

امریکہ گئی تھی۔ وہ تنہا گئی میرے بھائی راشد محمد الہ دین صاحب نے شادی کے لئے سارا انتظام کیا تھا۔ واپسی پر بفضلہ تعالیٰ وہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ سے لندن میں ملاقات کی سعادت حاصل کر کے ہندوستان آئی تھی۔ لندن میں حضور نے ایک شعر پڑھ کر انہیں سنایا اور پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ میرے دادا کا لگتا ہے۔ حضور صحیح جواب سن کر خوش ہوئے۔ نیز جلسہ سالانہ قادیان ۱۹۹۱ء میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہم سب کے ساتھ بھی حضور سے ملاقات کرنے کی سعادت عطا فرمائی تھی۔ الحمدللہ

میری اہلیہ ایک مثالی بیوی تھی۔ زندگی بھر ہر طرح مجھے ان کا تعاون حاصل رہا۔ دعا گو، ہمدرد، قدردان اور بہادر تھی۔ خلافت سے گہری وابستگی تھی۔ سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کے خاندان سے بہت محبت تھی۔ میرے والدین محترم علی محمد الہ دین صاحب مرحوم اور محترمہ فیض النساء صاحبہ کی بہت خدمت کی اور دونوں کی وفات کے وقت وہ قریب تھی۔ اپنے والد محترم مولانا عبدالمالک خان صاحب مرحوم کو بہت یاد کیا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ترقیات دیں، اس میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ خاکسار سائنس کے تعلق سے اور جماعتی کام کے تعلق سے جب بھی سفر پر جاتا وہ سارا بوجھ خوشی سے اٹھا لیتی۔ میری حوصلہ افزائی کرتی اور کامیابی پر بہت خوش ہوتی۔ میرے پانچوں بچوں کے علاوہ میری پوتی فرحانہ کو بھی اس نے خود قرآن مجید ناظرہ پڑھایا۔ فرحانہ کو اس نے کئی سورتیں حفظ کروائیں۔ اور نظمیں یاد کرائیں جو وہ خوش الحانی سے پڑھتی ہے۔

مطالعہ دینی کتب اور جماعت کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ کئی سالوں تک لجنہ اماء اللہ سکندرآباد کی صدر رہیں۔ جلسہ سالانہ قادیان کی تقاریر تیار کرنے میں خاکسار کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ پر توکل تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کا ایک واقعہ یہ ہے جب ہم جلسہ سالانہ قادیان ۲۰۰۱ء کے لئے روانہ ہونے کے لئے سکندرآباد اسٹیشن پہنچے تو وہ جوڑوں میں درد کی وجہ سے ریل کی روانگی کے وقت تک اپنے ریل کے ڈبے تک نہیں پہنچ سکی۔ تشویش ہوئی کہ اب ریل چلی جائے گی۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ خلاف معمول ریل لیٹ ہوگئی اور نہیں چلی جب تک کہ وہ پہنچ گئی۔

جلسہ سالانہ قادیان ۲۰۰۱ء کے ختم ہونے کے بعد انہوں نے رمضان کا مہینہ اور مزید

ایام قادیان میں گذارے۔ حضرت مرزا وسیم احمد صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ امۃ القدوس بیگم صاحبہ نے ان کے ساتھ بہت ہی پرشفقت سلوک فرمایا۔ اپنے پاس ٹھہرایا۔ میری بیٹی اور داماد کے ساتھ بھی وقت گذارا۔ اللہ تعالیٰ نے قادیان میں قیام کی جو توفیق بخشی اس پر بہت خوش تھی۔ اپنی والدہ محترمہ اور عزیزوں سے ملنے کے لئے پاکستان جانے کا ارادہ تھا لیکن حالات خراب ہونے کی وجہ سے نہ جا سکی۔ جنوری ۲۰۰۲ء میں میری طبیعت خراب ہوگئی تو یہ سنتے ہی اول ریل سے میرے پاس آ گئی۔ میری بیٹی منصورہ سے کہا کہ میں نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری وقت ان کا ساتھ نہ دوں۔ ان کے آنے کے بعد بفضلہ تعالیٰ میری صحت جلد اچھی ہوگئی۔

جوڑوں میں درد تو ان کو عرصے سے تھا، لیکن اس کے باوجود وہ کام کرتی جاتی تھی۔ خدام الاحمدیہ سکندرآباد نے مئی ۲۰۰۲ء میں تین ہفتے بچوں کو پڑھانے کے لئے کلاسوں کا انتظام کیا تھا۔ اس میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا اور اطفال کی باقاعدگی سے کلاسز لیں اور اجتماع کی تیاری بھی کروائی۔ وفات سے صرف دو روز قبل خدام الاحمدیہ سکندرآباد کا اجتماع ہوا۔ انہیں ایک ہفتہ سے بخار چل رہا تھا، اس کے باوجود انہوں نے از خود دوا کی گولیاں کھالیں تاکہ بخار نہ چڑھے۔ اس اجتماع کے پروگرام کو تا اختتام، رات کے گیارہ بجے تک سنا، لطف اٹھایا، بچوں کو بہت پیار کیا اور اپنی طرف سے انہیں تحفے بھی دیئے۔

وفات سے ایک روز قبل ۹ جون کو شام کے وقت حلقہ فلک نما میں توسیع مسجد کا افتتاح اور جلسہ سیرۃ النبیؐ تھا خاکسار اس پروگرام میں شرکت کے لئے جلد چلا گیا۔ بعد میں میرے بیٹے سلطان محمد نے اپنی والدہ سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اس پروگرام میں جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے خوشی سے رضامندی ظاہر کی اور میرے بیٹے نے پروگرام میں شرکت کی۔ میرے چھوٹے بیٹے خالد احمد گھر میں ان کے ساتھ رہے۔ ۱۰ جون کو ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ دوپہر تین بجے ہمارے ڈاکٹر مکرم عبدالرزاق صاحب تشریف لائے اور معائنہ کر کے اطلاع دی کہ وہ وفات پا چکی ہیں۔ آخری وقت سلطان محمد سورہ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔
۱۱ر جون کو دوپہر اڑھائی بجے سکندرآباد میں محترم محمد کلیم خان صاحب مبلغ سلسلہ

حیدرآباد نے نماز ظہر وعصر جمع کر کے پڑھائی۔ بعدازاں حضرت مرزا وسیم احمد صاحب ناظر اعلیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ کثیر تعداد میں احباب جماعت نے جنازہ میں شرکت کی۔

تابوت کو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی تک اور بذریعہ Van قادیان تک لایا گیا۔ میرے ساتھ سلطان محمد اور فرحانہ تھے۔ محترم مولوی خورشید احمد انور صاحب' محترم وحید الدین صاحب شمس مکرم بشارت احمد صاحب اور دوسرے دوست تابوت کے ساتھ قادیان آنے کے لئے دہلی تشریف لائے تھے۔ ۱۲ جون کو قادیان میں دوپہر ایک بجے محترم مولانا محمد انعام صاحب غوری قائم مقام امیر جماعت نے نماز جنازہ پڑھائی اور بعد تدفین بہشتی مقبرہ میں دعا کرائی۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے کہ بہشتی مقبرہ میں تدفین ہوئی۔ حضرت مرزا وسیم احمد صاحب تابوت کی روانگی تک سکندرآباد ائرپورٹ میں ہمارے ساتھ رہے۔ ہر امر میں ہماری رہنمائی فرمائی۔ وہ اور آپ کی بیگم صاحبہ حضرت آپا جان نے انتہائی شفقت کا سلوک فرمایا۔ محترم خورشید منور صاحب نے انتظامات سفر میں گراں قدر مدد کی۔ سب احباب جماعت اور رشتہ داروں اور دوستوں نے بہت ہمدردی کی اور ہمدردی کررہے ہیں۔ خاکسار تہہ دل سے ان سب کا مشکور ہے۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

میرے برادر نسبتی مکرم عبدالرب انور محمود خان صاحب نے ۱۲ جون کو امریکہ سے ایسا انتظام کیا کہ خاکسار سب عزیزوں سے جو پاکستان میں ہیں اور امریکہ میں ہیں بیک وقت فون پر بات کرسکے۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ خاکسار کو ان سے اور اپنی خوشدامن صاحبہ سے اور اپنی اہلیہ محترمہ کی بہنوں (مکرمہ شوکت صاحبہ اہلیہ مکرم ڈاکٹر لطیف احمد قریشی صاحب' مکرمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ' مکرمہ امۃ الحی فضیلت صاحبہ اہلیہ مکرم حسین احمد صاحب) اور اپنی بیٹیوں سے فون پر بات کرنے اور ساتھ دعا کرنے کا موقع ملا۔ سب کو صدمہ ہوا۔ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ٹوٹی ہوئی کمر کا اللہ ہی ہے سہارا   اللہ ہی ہے ہمارا اللہ ہی ہے تمہارا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اہلیہ محترمہ کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اپنے فضل وکرم سے ہمارا بھی خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین۔

از محترم حافظ ڈاکٹر صالح محمد الہ دین صاحب سکندرآباد

(ہفت روزہ، بدر قادیان، ۲۴ر جولائی ۲۰۰۲ء)

اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

حضرت سیٹھ صاحب مرحوم کے سانحہ ارتحال پر چودھری فیض احمد صاحب گجراتی درویش کا حقیقت افروز مضمون جو اخبار بدر میں شائع ہوا تھا پیش ہے۔ (سید جہانگیر علی)

تاریخ احمدیت کے ایک درخشندہ باب کا قابل صدرشک عنوان بن کر وہ عظیم المرتبت انسان ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء کو بہشتی مقبرہ کی مقدس سرزمین میں سما گیا، جسے دنیائے احمدیت حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین کے نام سے جانتی تھی، جانتی ہے اور جانتی رہے گی۔ کاروانِ احمدیت الٰہی نوشتوں کے مطابق منزل بہ منزل بڑھتا رہے گا۔ قومیں اور نسلیں احمدیت کے دامن سے وابستہ ہوتی چلی جائیں گی۔ بڑے بڑے تاجر اور کروڑپتی سیٹھ احمدیت کی خدمت اور غلامی کا دم بھرنے والے پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن وہ حیرت انگیز قربانی اور بے مثال خدمت جو اس جیالے مومن نے کی، وہ ایک لاثانی شاہکار بن کر افق احمدیت پر زندہ وتاباں رہے گی۔ مورخین احمدیت اس باب کو مرتب کرتے وقت انگشت بدنداں، عالم امکان کو اپنے تصور میں لائیں گے اور ایک دوسرے سے پوچھ کر یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش کریں گے کہ متواتر چھیالیس سال تک تعلیم احمدیت کے روحانی خزائن لٹانے والا یہ کوئی فرد واحد تھا یا ادارہ......؟ عالمِ امکان اس کا جواب نفی میں دے گا اور حقیقت پکارے گی کہ...... "میں یہاں موجود ہوں" ......اور اگر تصدیق چاہتے ہو تو ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے پرانے احمدی خاندانوں کی لائبریریاں دیکھ لو۔ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی موجود ہوگی، جو شہادت دے گی کہ میں ...... "کارڈ آنے پر مفت" بھجوائی گئی تھی۔!

کہاں پیدا ہوتے ہیں روز روز ایسے لوگ، جو اپنی مادی فرزانگی کو روحانی دیوانگی کی قربان گاہ میں سر وار الٹا لٹکا کر زندگی بھر روحانی مسرتوں کے گہوارے میں سانس لیں۔ وہ ایک دیوانہ تھا اور ان دو مطلوبہ دیوانوں میں سے ایک تھا جن کی تلاش میں خلافتِ ثانیہ کے سالار نے فرمایا تھا ؎

عاقل کا یہاں پر کام نہیں وہ لاکھوں بھی بے فائدہ ہیں
مقصود مرا پورا ہو اگر مل جائیں مجھے دیوانے دو

اور حقیقت یہی ہے کہ تاریخ عالم نے آج تک جن بڑے بڑے انقلابات کو ترتیب دیا ہے وہ سب دیوانوں کے ذریعہ ہی رونما ہوئے ہیں، ورنہ فرزانگی تو اندیشہ ہائے سود وزیاں کے سلاسل سے ہی آزاد نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و مرسلین جنہوں نے دریاؤں کے تیز دھاروں کے رخ موڑ دیئے، اپنے اپنے وقت میں ساحر اور مجنون کے ناموں سے یاد کیے جاتے رہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے جو انقلاب برپا کیے، وہ عقل انسانی کی گرفت میں نہ آتے تھے۔

حضرت سیٹھ صاحب ۱۹۱۵ء میں خلافت ثانیہ کے ابتدائی ایام میں احمدیت میں داخل ہوئے اور اپنی آخری سانس تک عہد بیعت کو اس طرح نبھایا، جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ایک مستقل لگن اور مسلسل دھن کے ساتھ آپ نے احمدیت کی خدمت یوں کی کہ **ان صلاتی و نسکی و محیای ومماتی للّٰہ رب العالمین** ان پر صادق آیا۔ اس دوران میں آپ کو بعض دفعہ مالی ابتلاء بھی پیش آیا، مگر وہ ابتلا تبلیغ واشاعت کے کام میں رخنہ نہ ڈال سکا۔

بڑی لطیف بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری ساری رات نوافل میں قیام فرماتے تھے، تو ارشاد الٰہی ہوا "قم اللیل الا قلیلا۔" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت کا ایک اظہار تھا۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر قائم اللیل تھے کہ آپؐ کے پاؤں مبارک متورم ہو جاتے تھے۔ حضرت سیٹھ صاحب پر شدید مالی ابتلاء آیا مگر چندوں کی رفتار وہی رہی۔ حضرت مصلح موعود ایدہ اللہ تعالیٰ کو علم ہوا تو آپ کو تحریر فرمایا کہ:

"ایک دوست نے لکھا ہے کہ آپ کی مالی حالت بہت کمزور ہوتی جا رہی ہے، آپ بہت زیادہ چندہ دیتے رہے ہیں۔ فی الحال آپ بقایوں اور اگلا چندہ دینے کا خیال چھوڑ دیں، یہ بات پسندیدہ ہوگی۔"

یہ کتنا بڑا سرٹیفکیٹ ہے جو آپ کو ملا اور یقیناً یہ اپنی قسم کا واحد سرٹیفکیٹ ہے جو خلافت ثانیہ کی بارگاہ سے جاری ہوا۔!!

حضرت سیٹھ صاحب نے قربانی کے ہر میدان میں نہایت قابل رشک نمونہ پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ جو فرمایا ہے کہ مجھے چالیس مومن مل جائیں، تو

میں ساری دنیا پر اسلام غالب کرسکتا ہوں۔ ان چالیس (۴۰) مومنین میں کا ایک نمونہ سیٹھ عبداللہ الٰہ دین صاحب ہیں۔"

اس نوٹ میں حضرت سیٹھ صاحب کی بے مثال قربانیوں کا جائزہ لینا مقصود نہیں اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن ہے، کیوں کہ اس مرد مجاہد کے سوانح کے لیے تو ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں تو جماعت کے ان احباب سے خطاب ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مالی طور پر وسعت بخشی ہے، کیوں کہ حضرت سیٹھ صاحب کی وفات سے قربانیوں کے میدان میں جو جگہ خالی ہوئی ہے، اسے پر کرنا ان کا فرض ہے۔ اس وقت جب کہ ہماری جماعت اپنے ابتدائی دور میں سے گذر رہی ہے اور اس کی بنیادوں کی استواری کا کام جاری ہے۔ ضروری ہے کہ معماروں اور مزدوروں کے تسلسل میں کوئی خلا اور انقطاع پیدا نہ ہو اور جس طرح حضرت سیٹھ صاحب نے اپنی ساری قوتوں کو احمدیت کی ترقی واشاعت پر لگا دیا تھا اور دیوانہ وار کام کر کے احمدیت کا لٹریچر دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا، اب اور لوگ آگے آئیں اور ملک کے ہر حصہ میں ایسے ادارے قائم کریں جو اسی طرز اور اسی پیمانے پر اشاعت لٹریچر کا کام کریں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کے فضل سے ہماری جماعت میں ایسے ذی استطاعت احباب کی کمی نہیں ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں اخلاص اور مرکز کے ساتھ گہری وابستگی بھی موجود ہے اور پھر وہ اشاعتِ اسلام کے لیے ایک تڑپ بھی اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر جذبے کی بیداری کی ایک ساعت ہوتی ہے۔ شاید یہی مضرابِ درد کسی کے سازِ خلوص سے چھو جائے اور اس کے تحت الشعور میں سوئے ہوئے بیدار ہو جائیں۔!

درحقیقت آج ہم قلمی جہاد کے دور میں سے گذر رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ سلطان القلم نے ہمیں علم کلام کے زبردست ہتھیار سے لیس کر دیا ہے اور دلائل و براہین کے ہر میدان میں ہم عملاً ھل من مبارز کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارا میدان عمل بہت وسیع ہے اور ہمیں کروڑوں افراد تک اسی صداقت کو پہنچانا ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضامن ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہاں کہیں ہماری بڑی بڑی جماعتیں قائم ہیں وہاں نشر واشاعت کے ادارے قائم ہوں اور ہر ادارہ اپنی اپنی جگہ اتنا فعال اور

منظم ہو کہ نہ صرف اندرون ملک میں، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ترسیل لٹریچر کا کام کرے۔

اور یہ امر قطعاً مشکل نہیں۔ حضرت سیٹھ صاحب مرحوم کی مثال ہمارے سامنے ہے آپ نے اکیلے اتنا بڑا کام سرانجام دیا کہ دنیا کے کونے کونے میں آپ کا لٹریچر پہنچا اور ہزاروں گم گشتگانِ راہِ ہدایت نے راستی کی راہ پائی۔ بس دیر صرف عزم کی ہے اور عزم صمیم کی حرارت جن لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے وہ وقت کی رفتار سے بھی کچھ آگے ہی چلتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو سود زیاں کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر ناممکنات کی دیواروں کو پھلانگ جاتے ہیں اور پھر اس قسم کی سند خوشنودی پاتے ہیں۔

''احمدیت سے ان کا عشق بڑھتا گیا اور وہ بڑی سے بڑی قربانی اور ہر رنگ کی قربانی کرتے رہے ہیں۔ تبلیغ میں اس حد تک جوش ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم میں ''والنّٰزعٰت غرقاً والنّٰشطٰت نشطا والسّٰبحٰتِ سبحاً . فالسّٰبقٰتِ سبقاً . فالمدبرات امراً'' ارشاد فرمایا گیا ہے یہ مقام ان کو حاصل ہے اور پھر تبلیغی لٹریچر شائع کرانے کی ایسی دھن ہے کہ ان کی جدوجہد کو دیکھ کر شرم آجاتی ہے کہ قادیان میں اتنا عملہ ہونے کے باوجود اس دھن سے کام نہیں ہوتا جس سے وہ کرتے ہیں...... وہ اپنی ایک ایک کتاب کے ۱۵۔۱۵، ۱۶۔۱۶ ایڈیشن شائع کر چکے ہیں...... اگر چند اور ایسے ہی کام کرنے والے ہوتے، تو اس وقت تک بہت بڑا کام ہو چکا ہوتا۔''

آج حضرت سیٹھ صاحب کی روح اپنا جانشین تلاش کر رہی ہے۔ دربارِ خلافت میں ایسی ہی خوشنودی کے سرٹیفکیٹ چشم براہ ہیں کہ کون خوش قسمت مستحق قرار پا کر ہماری طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اذا الصحف نشرت کا زمانہ ہمیں دے دیا ہے۔ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی گراں بار ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی ہے اور سلطان القلم نے قلم کی بے پناہ قوتیں ہمیں تفویض کر دی ہیں۔ یہ قوتیں صرف ہونے کے لیے سیماب آسا بیتاب ہیں اور پر پرواز کی تلاش میں ہیں، جو اس وقت بصورت زر امراء کی جیبوں میں ہے۔ اے کاش انسانوں کے بوجھل جیبوں کے پس پردہ دلوں میں خلوص کاری متحرک ہو اور جیبیں انگڑائیاں لے کر سلطان القلم کا دستِ راست بننے کے لیے وا ہو جائیں۔! (فیض احمد گجراتی)

(ہفت روزہ بدر قادیان مورخہ ۷ر فروری ۱۹۶۳ء)

نوٹ: سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے تفصیلی حالات تابعین اصحاب احمد جلد نہم میں ملاحظہ فرمائیں۔
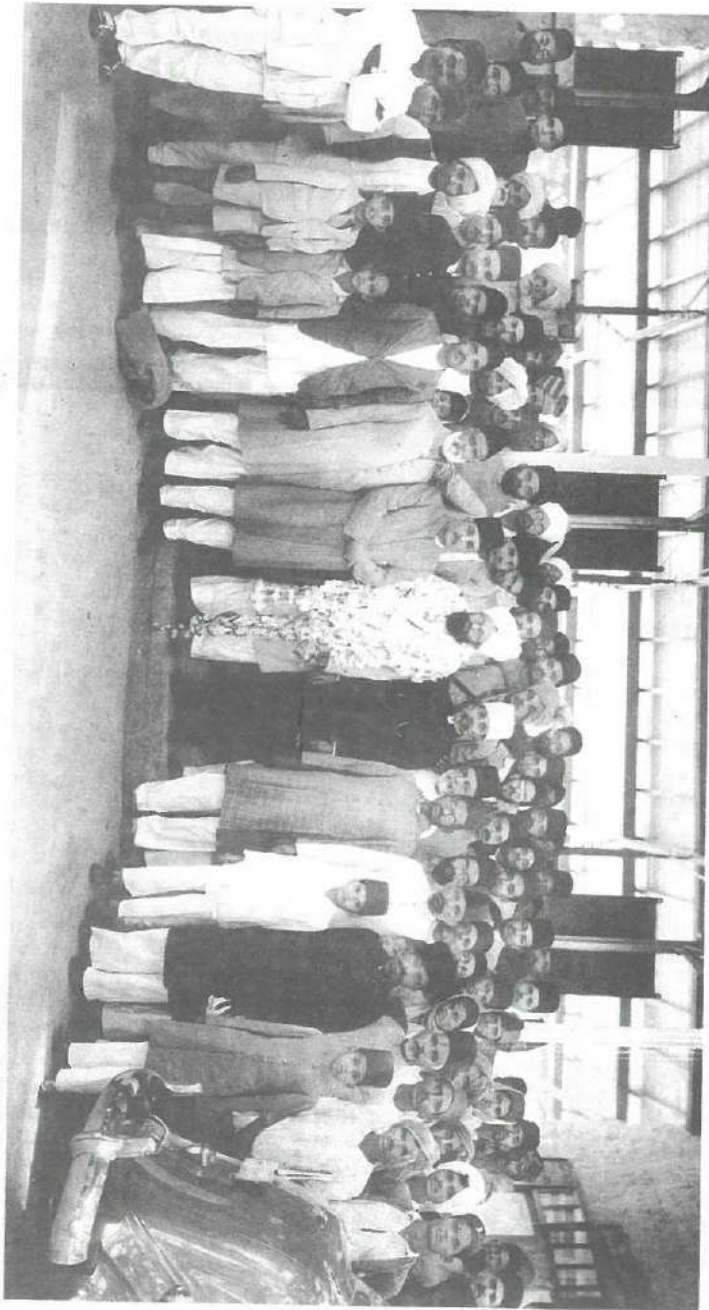
حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی حیدرآباد آمد پر لی گئی یادگار تصویر (حیدرآباد کا مضافاتی ریلوے اسٹیشن بیگم پیٹھ)

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے سفر حیدرآباد کی ایک گروپ فوٹو
خان بہادر احمد الہ دین صاحب المعروف احمد نواب جنگ بہادر کی کوٹھی پر

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا سفر حیدرآباد دکن

۱۹۳۸ء کا ایک نہایت اہم اور ناقابل فراموش واقعہ

حضور کا یہ مبارک سفر ایک رؤیا کی بناء پر تھا اور اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ ریاست حیدرآباد جو مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسلمانان ہند کی تہذیب وتمدن اور علم وفن کا سب سے بڑا مرکز تھی، وہاں کے حالات کا جائزہ لیا جائے اور عام مسلمانوں کی بہبود اور جماعت احمدیہ کی تبلیغی سرگرمیوں میں اضافہ کی عملی تدابیر سوچی جائیں۔

مکتوب سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے نام:

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ قادیان سے یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء کو روانہ ہوئے اور روانگی سے قبل ۲۷ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت احمدیہ سکندرآباد کے نام مندرجہ ذیل مکتوب لکھا[1]۔

''قادیان ضلع گورداسپور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

...... مدت سے میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا تھا۔ کیونکہ میرے نزدیک کسی جگہ کو دیکھنے کے بعد وہاں کے کام کی اہمیت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ لیکن کچھ تو کم فرصتی کی وجہ اور کچھ وہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ وہ علاقہ دور ہے۔ اخراجات زیادہ ہوں گے۔ میں آنے سے رکا رہا۔

---

[1] اس سفر میں حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ، حضرت سیدہ ام متین صاحبہ اور امۃ القیوم صاحبہ حضور کے ہمراہ تھیں۔ ملک صلاح الدین صاحب ایم اے (مؤلف ''اصحاب احمد'') پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے شامل سفر تھے اور سیٹھ صاحب اور میاں عطا محمد صاحب تنگلی پہرہ دار کے طور پر ممبئی سے حیدرآباد تک کے سفر اور وہاں کے قیام میں مولانا ابوالعطاء صاحب (مبلغ ممبئی) بھی حضور کے ساتھ رہے۔

لیکن اب حالات اس طرف کے ایسے ہوگئے ہیں۔ شاید مجھے ان علاقوں کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑے...... میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس دفعہ سندھ سے میں حیدرآباد ہوتا آؤں۔ مجھے اس کا زیادہ خیال اس لیے بھی ہوا ہے کہ جو رویاء میں نے حیدرآباد کے متعلق دیکھی تھی، اس میں ایک حصہ یہ تھا کہ میں پہلے حیدرآباد کا معائنہ کرنے گیا ہوں اور پھر میں نے آکر فوج کو حملہ کا حکم دیا ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ پہلے سرسری معائنہ حیدرآباد کا ضروری ہے۔

اس لئے اگر ہوسکا تو میں انشاء اللہ سندھ سے حیدرآباد کی طرف روانہ ہوں گا۔ پروگرام یہ ہے کہ پندرہ ممبئی ورود ۱۶۔۱۷۔۱۸۔۱۹ ممبئی قیام، ۱۹رکو ہوائی جہاز کے ذریعہ سے حیدرآباد، ساڑھے چھ بجے ورود حیدرآباد ۲۰۔۲۱۔۲۲ حیدرآباد قیام، ۲۲ کی شام کو سات بجے دہلی جانے والی گاڑی سے پنجاب کی طرف رجوع۔ میرے ساتھ ایک میری بیوی مریم صدیقہ، لڑکی امۃ القیوم اور ہمشیرہ مبارکہ بیگم ہوں گی۔ چھ سات دوسرے ہمراہی ہوں گے۔ یہ لوگ ریل سے سفر کرکے ممبئی سے حیدرآباد پہنچیں گے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ ہمارا سفر صرف غیر رسمی رہے یعنی کوئی لیکچر وغیرہ یا شور نہ ہو۔ اگر بعض خاص آدمیوں سے ملاقات ضروری سمجھی گئی تو جماعت کے مشورہ سے میں ان کو ملنے کا موقعہ دے دوں گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔

میرا پروگرام یہ ہوگا کہ جس کے متعلق آپ مذکورہ دوستوں سے مشورہ کرکے تفصیلات طے کرلیں۔ (۱) حیدرآباد کا موٹر میں ایک عام چکر جس سے اس کی عظمت اس کے علاقہ کی وسعت، آبادی کی طرز وغیرہ کا علم ہو جائے۔ (۲) علمی اداروں کا دیکھنا۔ (۳) تاریخی یادگاروں کا دیکھنا۔ (۴) موجودہ ترقی یا جدوجہد کا معائنہ۔

آپ اس مشورہ میں اگر چاہیں تو نواب اکبر یار جنگ صاحب کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔ ایک مجلس ایسی رکھی جاسکتی ہے جس میں سب جماعت کے دوست ہوں اور میں انہیں مختصر ہدایات دوں، جمعہ کا دن اس دوران میں آئے گا۔ وہ لازماً مسجد میں پڑھوں گا اور جماعت سے ملاقات ہوجائے گی۔

...... چونکہ مجھے مردوں کے ساتھ پھرنا ہوگا اس لئے عورتوں کی سیر کا الگ انتظام کردیا

جائے۔ یعنی روزانہ پروگرام طے ہوکر پہلے بتا دیا جائے کہ عورتیں اپنا وقت اس طرح خرچ کریں گی اور میرا پروگرام اس اس طرح ہوگا۔

تحریک جدید نے جہاں کھانے کے متعلق سادگی پیدا کردی ہے وہاں میرے جیسے بیمار کے لئے مشکلات بھی پیدا کردی ہیں۔ ایک کھانے کی وجہ سے سوائے خاص حالات کے چاول میں نہیں کھاسکتا، روٹی کھاتا ہوں کیونکہ چاول کم پچتے ہیں۔ اگر ایک سالن ہماری پنجابی طرز کا پک سکے اور تنور کی یا توے کی چپاتی مل سکے تو مجھے سہولت رہیگی۔ حیدرآباد کی طرف پیاز کی کثرت اور میٹھا اور کھٹا کھانے میں ملا دیتے ہیں، جو میرے معدے کے لئے سخت مضر ہوتا ہے اور مجھے بہت جلد ایسے کھانوں سے بخار ہوجاتا ہے۔ گو مجھے کھانے کے متعلق یہ ہدایت دینے سے شرم محسوس ہوتی ہے مگر چونکہ میری صحت سخت کمزور ہے اور میری زندگی درحقیقت ایسی ہے جیسے ربڑ کی گڑیا میں پھونک مار کر بٹھا دیتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی پھونک ہی کچھ زندہ رکھے جاتی ہے۔ اس وجہ سے مجھے باوجود حیا کے یہ امر لکھنا پڑا۔

میں پرسوں سندھ جارہا ہوں۔ اس بارے میں اگر کوئی اور بات آپ نے پوچھنی ہو تو ناصرآباد (کنجینی) ضلع میرپور خاص سندھ کے پتہ پر خط لکھیں۔

ممبئی ہم جہاز کے ذریعہ آئیں گے، میرے ساتھ پرائیویٹ سکریٹری کے علاوہ صرف چند معاون کار ہوں گے۔ شائد کوئی دوست قادیان سے میری ہدایت کے مطابق آجائیں۔ والسلام۔

خاکسار

مرزا محمود احمد

قادیان، ضلع گورداسپور، پنجاب[1]

بتاریخ ۳۸۔۹۔۲۷

---

[1] مکتوب حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے ورثاء کے پاس محفوظ ہے۔

قادیان سے ممبئی تک :

حضرت اقدسؓ قادیان سے بذریعہ ٹرین ۳/اکتوبر ۱۹۳۸ء[1] کو سندھ پہنچے اور اراضیٔ سندھ کا معائنہ فرمانے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد ۲۳/اکتوبر ۱۹۳۸ء[2] کو لاہور میل سے کراچی وارد ہوئے اور اسی روز بحری جہاز سے روانہ ہوکر ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۸ء[3] کو ممبئی پہنچے۔ بندرگاہ پر جماعت احمدیہ ممبئی نے اپنے امیر حضرت سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب اور مقامی مبلّغ مولانا ابوالعطاء صاحب کی قیادت میں حضور کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ ممبئی میں اس وقت امیر جماعت سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب تھے اور انہوں نے ہی ایک محلہ میں رہائش کے لئے ایک بالا خانہ کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ حضورؓ پہلے روز بارہ بجے رات تک مجلس میں نماز مغرب و عشاء جمع کرنے کے بعد گفتگو فرماتے رہے۔ اس میں ایک سابق گورنر پنجاب سرایمرسن کا واقعہ بھی بیان فرمایا تھا جو کہ حضورؓ کے وصال کے بعد اخبار بدر میں ملک صلاح الدین صاحب ایم۔ اے کے ایک مضمون میں شائع ہو چکا ہے۔ وہاں حضرت سیٹھ صاحب نے اپنے مکان پر حضور اور حضور کے رفقاء کی دعوت بھی فرمائی تھی۔ حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کی بھتیجی ممبئی میں ہی مقیم تھیں۔ ان کے خاندان کی دعوت کی۔ جائے قیام سے غالباً دس بارہ میل دُور ان کی جائے رہائش تھی۔ وہ موٹروں میں سارے قافلہ کو اپنے ہاں لے گئے۔

جناب ملک صلاح الدین صاحب ایم۔ اے کا بیان ہے کہ:

''ممبئی میں حضرت نے ایک بار خود ہی ایک ہوائی جہاز کے پانچ ٹکٹ خرید کئے۔ چار اپنے خاندان کے لئے اور ایک میرے لئے۔ وہاں ایسے ہوائی جہاز کا انتظام غالباً کسی کمپنی کی طرف سے تھا جو مختصر وقت میں ممبئی کی سیر کراتی تھی۔ صرف پانچ ہی سیٹیں اس میں تھیں۔ میں ہوا باز کے پاس کی سیٹ پر تھا اور حضور اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ پیچھے تشریف فرما تھے۔ تیرہ صد پچاس فٹ تک جہاز نے اڑان کی تھی اور نصف گھنٹہ کے قریب صرف ہوا تھا۔ ہوائی اڈہ تک اور واپسی پر مکرم شیخ محمود احمد صاحب عرفانی اور مکرم مولوی ابوالعطاء صاحب (جو اس وقت ممبئی کے مبلّغ تھے) ساتھ تھے[4]۔''

---

[1] ''الفضل'' ۵/اکتوبر ۱۹۳۸ء صفحہ (۲) کالم (۱)۔ [2] ایضاً ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۸ء صفحہ (۱) کالم (۱)۔ [3] ایضاً ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء صفحہ (۱) کالم (۱)۔ [4] مکتوب ملک صلاح الدین صاحب ایم اے بنام مؤلف محررہ ۱۷/جولائی ۱۹۶۷ء۔

حیدر آباد دکن میں آمد اور مصروفیت :

خلیفۃ المسیح الثانیؓ چند دن تک ممبئی میں فروکش رہنے کے بعد بذریعہ ریل ۱۹/اکٹوبر ۱۹۳۸ء کو بوقت دوپہر روانہ ہوکر ۲۰/اکٹوبر بروز پنجشنبہ صبح ۸½ بجے حیدر آباد کے مضافاتی ریلوے اسٹیشن بیگم پیٹھ پر رونق افروز ہوئے۔

جماعت احمدیہ حیدر آباد نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی آمد کے سلسلہ میں نہایت وسیع پیمانے پر ریاستی روایات کے تحت شاندار انتظامات حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب کے زیر انتظام کئے تھے۔ حضور کے مکتوب موصولہ حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کی ہدایات کی روشنی میں اس امر کو پیش نظر رکھا گیا تھا کہ سارے شہر کی سیر ہو جائے جس سے حضور کو حیدر آباد کے تاریخی و اسلامی شہر کی عظمت اور اس کی وسعت کا ایک اندازہ ہو جائے اور اس کے علاوہ حیدر آباد کے علمی اداروں اور تاریخی یادگاروں اور حالیہ صنعتی ترقی کے معاینہ کا بھی موقع مل جائے۔ حضور کی اس سیر کا انتظام سیٹھ محمد اعظم صاحب کے سپرد تھا اور حضور کی اس ہدایت پر کہ حضور کے ساتھ جو خواتین تھیں ان کی سیر کا علیحدہ انتظام کیا جائے۔ اس کے انچارج سیٹھ محمد معین الدین صاحب[1] مقرر کئے گئے تھے۔ حضرت سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب کے چھوٹے بھائی خان بہادر الہ دین صاحب المخاطب نواب احمد نواز جنگ بہادر جو اگرچہ سلسلہ میں شامل نہ تھے لیکن حضور سے بیحد عقیدت تھی۔ انہوں نے حضور کے قیام ممبئی کے دوران تحریری طور پر درخواست کی تھی کہ حضور سکندر آباد میں جو حیدر آباد ہی کا حصہ ہے ان کی کوٹھی پر ان کے معزز مہمان کے طور پر قیام فرماویں جس کو حضور نے قبول فرمالیا تھا۔

حضور کے ورود مسعود کی اطلاع ریاست حیدر آباد کے اضلاع کے احباب کو دے دی گئی تھی اور وہ کثیر تعداد میں حیدر آباد پہنچ گئے تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جب حضور حیدر آباد کے مضافاتی ریلوے اسٹیشن بیگم پیٹھ پر رونق افروز ہوئے وہاں جماعت ہائے احمدیہ کے صرف نمائندہ اصحاب نیز حیدر آباد و سکندر آباد کے بعض اور مخصوص احباب تھے، جن میں سے بعض حضور کے

---

[1] حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب مرحوم کے دوسرے صاحبزادے۔

خویش واقارب تھے۔حضور کے ریل سے اترتے ہی احمدیہ گروپ کے سلامی نعرہ تکبیر سے سارا اسٹیشن گونج اٹھا۔اس کے بعد مولوی سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد نے ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اسی رنگ میں ظہار و اخلاص مقامی خواتین محترم کے ساتھ حضور کی معیت میں تشریف لائی تھیں۔احباب جماعت پلیٹ فارم پر خط مستقیم کی صورت میں استادہ تھے۔بڑی شفقت و مہربانی سے ہر ایک سے مصافحہ کرتے گئے۔ساتھ ساتھ مولوی سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت حیدرآباد ہر ایک کا مختصر تعارف بھی کراتے گئے۔اسٹیشن کا بیرونی احاطہ موٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔جب حضور اسٹیشن سے باہر تشریف لائے تو اس موقع کا فوٹو لیا گیا۔حضور اہل بیت اور کارکنوں کی معیت میں شامل ہوکر نواب احمد نواز جنگ بہادر کی کوٹھی موسومہ الہ دین بلڈنگ سکندرآباد تشریف لائے جہاں حضور نے قیام فرمایا۔

پہلے روز کی مصروفیات:

پہلے روز حضورؓ کی مصروفیات میں شہر کی وسعت کا معائنہ[1] اور آپ کی گاہ پر معززین کی ملاقات رہی۔شام کو حضور نے جناب عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت احمدیہ سکندرآباد کے تعمیر کردہ احمدیہ جوبلی ہال واقع افضل گنج میں جماعت ہائے احمدیہ سلطنت آصفیہ کے دوسو سے زائد احباب جماعت سے ملاقات فرمائی۔بعد ادائے نماز مغرب وعشاء سید حسین صاحب ذوقیؔ نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں ایک سلام (منظوم) حضور کی خدمت میں عرض کیا۔اس کے بعد حضور نے جماعت کے ساتھ لمبی دعا فرمائی اور مجلس برخاست ہوئی۔یہاں سے حضور

[1] ملک صلاح الدین صاحب ایم۔اے کا بیان ہے کہ الہ دین بلڈنگ میں پہنچنے کے بعد حضور نے دو کاروں میں حیدرآباد شہر کا چکر لگایا۔ہمیشہ حضور والا کی کار میں حضرت سید بشارت احمد صاحب وکیل، حضرت شیخ یعقوب علی صاحب اور حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب اور سیٹھ محمد اعظم صاحب لازماً ساتھ ہوتے تھے۔شہر کے چکر میں خاکسار اور دیگر احباب دوسری کار میں تھے۔حضور نے ایک دفعہ رؤیا دیکھی تھی کہ حضور نے اس شہر کا چکر لگایا ہے اور معائنہ کیا ہے۔اس بناء پر حضور نے یہ چکر لگایا تھا۔

مع خدام جناب سیٹھ محمد غوث صاحب سکریٹری بیت المال کے شہر والے مکان پر دعوتِ طعام میں تشریف لے گئے، جہاں اپنے خدام سے عام ملکی حالات پر تبادلہ خیال فرماتے رہے اور پھر حضور الہ دین بلڈنگ سکندرآباد تشریف لے گئے۔

دوسرے روز کی مصروفیات:

دوسرے روز دوپہر تک عام ملاقاتیں ہوتی رہیں۔پھر ایک بجے زبدۃ الحکما میر سعادت علی صاحب کے مکان چوک اسپان پر تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے۔اس کے بعد مولوی سید بشارت احمد صاحب کے ہاں "بشارت منزل" پر حضور تشریف لے گئے جہاں جماعت کی جانب سے حضور کی دعوت کا انتظام کیا گیا تھا اور جس میں علاوہ بلدہ کے اضلاع کی جماعتوں کے احباب بھی شریک تھے۔اثنائے تناول طعام میں جناب سید حسین صاحب ذوقی نے نظم "خوش آمدید"[1] سنائی جہاں ہرمز صاحب ایک حیدرآبادی شاعر نے قطعات مدحیہ عرض کئے جس میں حضور کی اس دعوت میں شرکت کی برجستہ تاریخ حیدرآباد کے سرکاری سال (فصلی) کی برآمد کی۔مصرع تاریخ ہے:

"مکانِ بشارت میں محمود مہماں"

۱۳۳۸ فصلی

خطبہ جمعہ و نکاح:

دعوتِ طعام کے بعد حضور کا فوٹو عہدہ دارانِ جماعت کے ساتھ لیا گیا، جس کے بعد نماز جمعہ کے لئے مکان انجمن موسومہ "احمدیہ لیکچر ہال" واقع بی بی بازار تشریف لے گئے، جہاں ایک ہزار مرد و خواتین کا مجمع تھا۔احباب جماعت کے علاوہ شہر کے رؤسا، نواب، جاگیردار و دیگر معززین بصد شوق و اخلاص تشریف لائے۔حضور نے ایک دل ہلا دینے والا حقائق و معارف سے لبریز خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا، جس میں صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثاریوں، قربانیوں کا نقشہ نہایت دلکش و دردانگیز پیرایہ میں کھینچا اور اسی جذبہ کو کامیابی و کامرانی کی کنجی قرار دیا۔اس

[1] یہ نظم "الحکم" ۷ اپریل ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۰ پر چھپ گئی تھی۔

کے بعد اپیل کی کہ اب بھی حب رسولؐ کے جذبہ کی ضرورت ہے۔ اپنے اعمال کو ہمیشہ دیکھ لیا کرو کہ آیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ہیں یا نہیں ۔ کچھ اس انداز میں یہ خطبہ ارشاد ہوا کہ سامعین بے تاب ہوگئے اور بعض کی چیخیں نکل گئیں اور وہ زار وقطار رونے لگے۔ نماز جمعہ وعصر جمع کرائی گئیں۔ اس کے بعد حضور نے تین اصحاب کے نکاحوں کا ایک مشترکہ خطبہ پڑھا، جس میں پھر خطبہ جمعہ کے خیالات کا عکس جلوہ گر ہوا۔ آپ نے تبلیغ کے متعلق اس قدر پراثر پیرایہ میں سامعین کو مخاطب فرمایا کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں ہوسکتا۔ آپ نے گمراہ مخلوق کو خدا تعالیٰ کے گمشدہ بچے قرار دیا اور فرمایا کہ یہ واقعہ مجھے سب سے بڑھ کر متاثر کرتا ہے جب میں سنتا ہوں کہ کسی کا بچہ گم ہوگیا۔ اگر کسی کا بچہ فوت ہوجائے تو ہوسکتا ہے کہ اسے چند دن کے بعد صبر آجائے، لیکن بچہ گم ہوجانے کا واقعہ اس قدر دردناک ہوتا ہے کہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ یہ خیالات سامنے ہوتے ہیں کہ نہ معلوم وہ کس بیدرد کے ہاتھ لگ گیا۔ معلوم نہیں وہ کس درجہ مصیبت وآفت میں مبتلا ہوگا۔ شاید وہ مار کھا رہا ہو یا بیمار ہو۔ اس کی بیکسی پر کسی دم نہ ماں کو چین آتا ہے نہ باپ کو۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے بڑھ کر قلق خدا تعالیٰ کو اپنے بچھڑے ہوئے بندوں کے متعلق ہوتا ہے جب گمشدہ بچہ ماں باپ کو مل جاتا ہے تو ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ اس سے بہت بڑھ کر خوشی خدا تعالیٰ کو ہوتی ہے، جب اس کا ایک بندہ اس سے آکر کہتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم خدا سے ملنے کا ذریعہ ہے، جو اس تعلیم سے آگا وہ خدا سے ملا۔ پس تم اٹھو، بیدار ہو، کوشش کرو کہ خدا کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو اس کے آستانہ پر لا ڈالو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے وارث بنو۔

اس خطبہ کے آخر میں حضور نے تحریک فرمائی کہ احباب جماعت ایک ایک ماہ کے لئے اپنے اوقات وقف کریں۔ اور یہ واقفین ریاست کے مختلف اضلاع میں پہنچیں اور حضور کے خطبہ کی روشنی میں تبلیغ کریں اور سب سے زیادہ توجہ اتحاد بین المسلمین پر دیں۔

اس اثر انگیز خطبہ کے دوران ہر شخص نے جان لیا کہ یہی نصب العین اس کے لمحات زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ غیر احمدی اکابرین نے ان خطبات کو سنا وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ ہمیں بڑا مغالطہ تھا۔ احمدیوں کی زبان سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے کسی اور کا گن گاتی ہی نہیں، ہم

باور نہ کریں گے کہ یہ جماعت اسلام سے ہٹی ہوئی ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عین اسلام ہے۔ ان باتوں کا چرچا وہ اپنے اور دوست احباب سے بھی کرنے لگے اور ایک عام خوشگوار رو چل پڑی۔

حضور نے خطبہ نکاح کے بعد درجن سے زائد زیر تبلیغ اصحاب کی بیعت لی۔ ان کے علاوہ اس بیعت میں وہ اصحاب بھی شامل ہوئے جنہیں حضور کے ہاتھ پر بیعت کا شرف اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ احمدیہ ہال رنگا رنگ کی جھنڈیوں سے مزین تھا اور ایک سرخ رنگ کے کپڑے پر ''آئے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما'' و'' اھلاً و سھلاً و مرحباً'' کے الفاظ لکھے تھے۔

نواب اکبر یار جنگ بہادر کی طرف سے عصرانہ:

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد نواب اکبر یار جنگ بہادر کی بیرون شہر کوٹھی واقع عنبر پیٹھ پر حضور تشریف لے گئے، جہاں حضور کے اعزاز میں نہایت وسیع پیمانہ پر پرتکلف عصرانہ دیا گیا اور شب میں دعوتِ طعام بھی تھی۔ احمدیہ لیکچر ہال سے حضور کے تشریف لے جانے کے بعد اسی مقام پر ایک اور عصرانہ کا انتظام تھا، جس میں جملہ احمدی مستورات نے حضور کے اہل بیت کا پرخلوص خیر مقدم کیا۔ جناب میر سعادت علی صاحب کی اہلیہ صاحبہ نے ایک مدحیہ نظم سنائی جسے فریم میں مزین کر کے پیش کیا گیا۔

عمائدین حیدر آباد کا اجتماع:

نواب اکبر یار جنگ بہادر کی طرف سے دی گئی دعوت میں عمائدین سلطنت وعہدہ دارانِ ذی شان وامراء جاگیردار و دیگر معززین ووکلائے ہائیکورٹ وغیرہ کی کثیر تعداد مدعو تھی جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) سر یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر (۲) نواب فخر یار جنگ بہادر صدر المہام فینانس (۳) نواب کاظم یار جنگ بہادر چیف سکریٹری پیشی اعلیٰ حضرت حضور نظام (۴) نواب رحمت یار جنگ بہادر کمشنر پولیس (۵) نواب صمد یار جنگ بہادر معتمد فوج[1] (۶) نواب عسکر نواز جنگ بہادر معتمد ومشیر قانونی سرکار عالی (۷) رائے بہادر بشیشر ناتھ صاحب جج ہائیکورٹ

[1] خسر جنرل اعظم خاں (پاکستان)۔

(۸) نواب ناظر یار جنگ بہادر جج ہائی کورٹ (۹) دیوان بہادر کشمٹا چاری سابق مشیر قانونی (۱۰) نواب بہادر یار جنگ بہادر صدر مجلس اتحاد المسلمین (۱۱) نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار (۱۲) مولوی سید ابوالحسن صاحب قیصر مددگار صدارت العالیہ (۱۳) سید سراج الحسن صاحب ترمذی وکیل ہائیکورٹ (۱۴) مولوی ابوالحسن سید علی صاحب معتمد مجلس اتحاد المسلمین (۱۵) محمد یامین صاحب زبیری ایڈوکیٹ (۱۶) اکبر علی صاحب اخبار صحیفہ دکن وغیرہم۔

ان اصحاب سے ہندوستان کے سیاسی و معاشی و زرعی مسائل پر حضور کی گفتگو ہوتی رہی۔ ہر مسئلہ پر حضور کی وسیع معلومات، اصابت رائے، انوکھے طرزِ استدلال و برمحل لطائف و ظرائف سے حاضرین مجلس ششدر و حیران ہوئے۔ کئی گھنٹوں کی مصروفیت کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور حضور اپنی فرودگاہ کو تشریف لے جاتے ہوئے سیٹھ محمد غوث صاحب کی بیرون شہر کی کوٹھی پر تشریف لے گئے اور وہاں سے چائے نوشی کے بعد گیارہ بجے شب واپس الہ دین بلڈنگ پہنچے۔

تیسرے روز کی مصروفیت:

تیسرے روز حضور نے اپنے رشتہ داروں میں کافی وقت صرف فرمایا۔ حیدرآباد و سکندرآباد کے اطراف و جوانب کے مقامات ملاحظہ فرمائے۔ حیدرآباد کے صنعتی علاقے اور عثمانیہ یونیورسٹی کی زیرِ تعمیر عمارات بھی دیکھیں۔

اس کے بعد حضور اپنے عزیزان مرزا حسین احمد بیگ صاحب اور نواب مرزا مقصود احمد خان صاحب کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر حضور سیٹھ مومن حسین صاحب سکریٹری امور خارجہ کے مکان واقع سعید آباد پر چند منٹ ٹھہرے۔ یہاں سے حضور نواب اکبر یار جنگ بہادر کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ حضور نے سیٹھ محمد اعظم صاحب کو ارشاد فرمایا تھا کہ وہ نواب رحمت یار جنگ بہادر کمشنر پولیس سے حضور کی ملاقات کا انتظام کریں چنانچہ سیٹھ صاحب نے اس ملاقات کا انتظام کیا تھا اور نواب رحمت یار جنگ بہادر نواب اکبر یار جنگ بہادر کی کوٹھی پر آکر حضور سے ملے۔ حضور نے ان سے ریاست کے حالات سے واقفیت حاصل کی اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے مسائل پر تخلیہ میں ان سے گفتگو فرمائی اور مشورے دیئے۔ دوپہر کا کھانا جناب

مکرم فدا حسین خان صاحب شاہ جہاں پوری کی نور منزل واقع کاچی گوڑہ پر تناول فرمایا، جہاں بہت سے معززین اور تمام اقرباء حضور مدعو تھے۔ اختتام طعام کے بعد مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ و جناب مرزا مقصود احمد خان صاحب و نواب اکبر یار جنگ بہادر اور فرحت اللہ بیگ صاحب انسپکٹر جنرل عدالتہائے حکومت نظام سے حضور مصروف گفتگو رہے۔

طبقات الارض، خواص زرعی، نسلوں کے ارتقاء، شاعری کے حسن و قبح وغیرہ پر نقادانہ بحث رہی۔ اس کے بعد حضور نے فدا حسین خاں صاحب کے ایک اور مکان دارالارشاد کو ملاحظہ فرمایا۔ جس کو صاحبِ موصوف جماعت کے لئے وقف کر چکے تھے۔

فرحت اللہ بیگ صاحب کی طرف سے دعوت:

حضور چار بجے چائے نوشی کے لئے ملک کے ممتاز ادیب جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب انسپکٹر جنرل عدالت ہائے حکومت نظام کے ہاں تشریف لے گئے، حضرت ام المومنینؓ کی طرف سے حضور کے رشتہ میں بعض ماموں حیدرآباد میں معزز عہدوں پر فائز تھے، مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم جو اس وقت انسپکٹر جنرل عدالت ہائے حکومت نظام تھے اور بعد میں وہ جج ہائیکورٹ ہو کر پنشن یاب ہوئے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نثر نگار ہونے کے علاوہ اعلیٰ شاعر بھی تھے۔ ان کے ہاں دعوت کے موقع پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنی ایک نعت خوش الحانی سے سنائی۔ اس کے بعد حضور کے ارشاد پر عطا محمد صاحب (پہریدار) خادم نے حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کی مشہور نعت ''علیک الصلوٰۃ علیک السلام'' خوش الحانی سے سنائی [1]

چوتھے روز کی مصروفیت:

چوتھے روز علی الصبح بعد نماز فجر قبل ناشتہ آپ مع متعلقین و خدام تاریخی مقامات کے

---

[1] مکتوب محررہ ۱۵؍ جولائی ۱۹۶۷ء۔

معائنہ کے لئے روانہ ہوئے۔ قلعہ گولکنڈہ[1] و شاہان قطب شاہی کے مقبرے ملاحظہ فرمائے۔ سلطان قلی قطب شاہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد حضور بالا حصار (قلعہ کی انتہائی بلندی) پر چڑھ گئے اور موجود الوقت خدام کے ساتھ لمبی دعا کی۔ قلعہ کے محل وقوع، مضبوطی و برمحل موزون فوجی ضروریات کا اس کی تعمیر میں جو لحاظ رکھا گیا ہے اس کے معائنہ سے حضور بہت متاثر ہوئے۔ اس معائنہ سے فارغ ہوکر حضور عثمان ساگر تشریف لے گئے، جو شہر حیدرآباد سے گیارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں حضور کے میزبان جناب خان بہادر احمد الہ دین المخاطب نواب احمد نواز صاحب او بی ای کی جانب سے ضیافت کا اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام تھا۔ بعد معائنہ تالاب آپ اپنی قیامگاہ پر تشریف لائے، جہاں احباب بکثرت ملاقات کے منتظر تھے۔ ملاقاتوں سے فارغ ہوکر آپ نے مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ کا معائنہ فرمایا جس کے بانی نواب ممتاز یار الدولہ بہادر ہیں۔ ایک مرتبہ قادیان شریف بھی تشریف لے گئے تھے۔ حضور نے مدرسہ کی عمارات اور اس کے محل وقوع و طالب علموں کی آسائش کے انتظامات ملاحظہ فرما کر انتہائی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور مدرسہ کی وزیٹرز بک میں تعریفی کلمات بھی تحریر فرمائے۔ دوپہر کے وقت والدہ نواب منظور جنگ بہادر کی دعوت طعام سے فراغت حاصل کر کے واپس ہوئے۔

زنانہ میں بعض خواتین کی حضور نے بیعت لی۔ پھر خان بہادر جناب احمد الہ دین صاحب او بی ای کا کارخانہ برف سازی اور اس کی مشینری کو ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعض حاضر الوقت خدام کی معیت میں حضور کا فوٹو لیا گیا۔ بعد نماز مغرب اسٹیشن نا مپلی (حیدرآباد) تشریف لے گئے۔

---

[1] ملک صلاح الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''وہاں قلعہ گولکنڈہ وغیرہ کے دیکھنے کے وقت اور ایک تالاب کے پاس تفریح کے وقت بلکہ ایسے تمام مواقع پر ہم ساتھ ہوتے تھے۔ قلعہ گولکنڈہ کی سیر کے موقع پر مکرم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل یادگیر جو مدرسہ احمدیہ کے تعلیم یافتہ تھے گلے میں پانی کی چھاگل لئے ہر وقت خدمت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔

واپسی:

بوقت روانگی اسٹیشن نا مپلی (حیدرآباد) پر جماعت حیدرآباد، سکندرآباد و اضلاع کے کثیر احباب موجود تھے۔ بعض دوست ریاست میسور سے بھی حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ ان کے علاوہ غیر از جماعت مسلمانوں کا خاصہ مجمع جوش و خروش کے ساتھ حضور کی ملاقات کے لئے بیتاب تھا۔ مصافحہ کے لئے ایک پر ایک سبقت کر رہا تھا، جب مجمع بے قابو ہونے کے درجہ تک پہنچنے لگا تو مولوی سید بشارت احمد صاحب کی درخواست پر حضور نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک مصروف دعا رہے۔ اس کے بعد جناب اعظم خان صاحب وکیل و معتمد انجمن اتحاد المسلمین ضلع پربھنی نے جنہوں نے حضور کے اسٹیشن میں داخلہ کے وقت مسلمانانِ حیدرآباد کی جانب سے حضور کو پھولوں کے ہار زیبِ گلو کئے تھے، خواہش کی کہ حضور اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے مسلمانانِ حیدرآباد کے نام کوئی پیغام دیں۔

حضرت امیر المومنین کا پیغام:

اس پر حضور نے نا مپلی اسٹیشن (حیدرآباد) پر ایک اہم پیغام دیا، جو حیدرآباد دکن کے تمام روزناموں میں بھی چھپ گیا تھا۔ اخبار ''رہبر'' دکن ۲۶؍اکتوبر ۱۹۳۸ء نے اس کا متن درج ذیل الفاظ میں شائع کیا۔ حضور نے فرمایا:

''میں آج اس بلدہ سے جارہا ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں اس موقع پر کوئی پیغام مسلمانانِ حیدرآباد کے نام دوں۔ اس مختصر سے وقت میں میں ایک ضروری بات کی طرف تمام احباب کو توجہ دلاتا ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ایسی ہے جیسے بتیس دانتوں میں زبان ہوتی ہے۔ اس جگہ کی حالت میں نے خود کسی قدر دیکھی ہے اور بہت سے لوگوں کی زبان سے سنا ہے، جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ کام جو ہمارے آباؤ اجداد نے اشاعتِ اسلام کے بارہ میں کیا

تھا، آج مسلمان اس سے غافل ہیں بلکہ اختلاف کا شکار ہو رہے ہیں۔ آج مسلمان قلت میں ہیں۔ ان کے پاس اسباب نہایت محدود ہیں اور ان کا مقابلہ ان لوگوں سے ہے جو بہت بڑی اکثریت رکھتے ہیں اور جن کی تنظیم نہایت اچھی ہے۔ اگر ان حالات میں بھی مسلمان یک جہتی سے کھڑے نہ ہوئے تو قریب زمانہ میں ان کی تباہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس لئے اپنی جماعت سے بھی اور دوسرے فرقہ والے دوستوں سے بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ان حالات میں اتحاد و اتفاق کی قیمت کو سمجھیں اور اختلافات کو اپنی تباہی کا ذریعہ نہ بنائیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان ایسے حالات میں سے گذر رہے ہیں جن میں جانور بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور لڑائی جھگڑے چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چڑیاں آپس میں لڑتی ہیں، لیکن جب کوئی بچہ انہیں پکڑنا چاہتا ہے تو لڑائی چھوڑ کر الگ الگ اڑ جاتی ہیں۔ اگر چڑیاں خطرہ کی صورت میں اختلاف کو بھول جاتی ہیں تو کیا انسان اشرف المخلوقات ہو کر خطرات کے وقت اپنے تفرقہ و اختلاف کو نظر انداز نہیں کر سکتا؟ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں موجودہ وقت میں یہ احساس بہت کم پایا جاتا ہے۔

اسلام جس کی عظمت کو اس کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں اور جس کی تعلیم کے ارفع و اعلیٰ ہونے کو مخالف بھی مانتے ہیں اس کی اشاعت و نصرت سے منہ پھیر کر ذاتی اختلافات میں وقت ضائع کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ موجودہ خطرات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ مسلمان باہمی اختلاف کو ایسا رنگ دیں، جس سے اسلام کے غلبہ اور اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو۔ سب مسلمانوں کا فرض ہے کہ پرچم اسلام کو بلند رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کریں۔ جنوبی ہند میں ہمارے بزرگوں نے اسلام کی شوکت کو قائم کیا۔ اس زمانہ میں ہمارا فرض ہے کہ اس عظمت کو دوبارہ قائم

کریں اور اس کے لئے تمام مسلمانوں کی متحدہ کوشش نہایت ضروری ہے۔

پس اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تحریک کرتا ہوں کہ ہندوستان کے جنوب میں مرکز اسلام کی حفاظت کے لئے جملہ مسلمان مل کر کوششیں کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہو"۔ [1]

حضور انور کا یہ پیغام عام طور پر گہری دلچسپی سے پڑھا گیا۔ حیدر آبادی مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن کے رُوحِ رواں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلمانوں کی آج کی مصیبت میں اگر کوئی کام دے سکتے ہیں تو وہ احمدی ہیں، جو امام جماعت احمدیہ کے تحت پورے منظم اور حالات سے باخبر ہیں۔ اس پیغام کے بعد ریل نے سیٹی دی۔ حضور "اللہ اکبر" و "امیر المومنین زندہ باد" کے فلک بوس نعروں میں براستہ بلہارشاہ آگرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ بعض احباب دور ایک جنکشن قاضی پیٹھ تک الوداع کہنے کے لئے آئے تھے، جہاں حضور نے نماز مغرب و عشاء جمع کروا کر پڑھائیں۔

خصوصی معاونین و مخلصین:

دورانِ قیام حضورؓ کے ہمراہ مولوی سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ حیدر آباد سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت احمدیہ سکندر آباد حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی، شیخ محمود احمد صاحب عرفانی، سیٹھ اعظم صاحب، سیٹھ معین الدین صاحب نیز مختلف مواقع پر دیگر خدام میں سے سیٹھ محمد غوث صاحب سکریٹری بیت المال، نواب اکبر یار جنگ بہادر، مولوی فضل حق صاحب ناظم عدالت ضلع، نواب غلام احمد خاں صاحب وکیل ہائی کورٹ، عبدالقادر صاحب صدیقی سکریٹری دعوۃ و تبلیغ، مولوی حیدر علی صاحب سکریٹری تالیف و تصنیف، مولوی محمد لقمان صاحب اور جناب حکیم میر سعادت علی صاحب بھی ساتھ رہے۔

خدام الاحمدیہ کے رضا کار:

حضورؓ کے استقبال و انتظامات آمد و رفت کے لئے خدام الاحمدیہ کے رضا کاروں کا

[1] "الفضل" ۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۷۔

انتظام زیرِ نگرانی مولوی محمد لقمان صاحب (حال لائل پور) کیا گیا تھا(۱)۔

ان خدام کے ذمہ یہ بھی ڈیوٹی تھی کہ شب و روز حضور کی قیامگاہ پر باری باری پہرہ دیں۔ ڈاکٹر میر احمد سعید صاحب سالار احمدیہ کور نے باوردی حضور کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیئے۔ ابو حامد صاحب اِن کے مددگار تھے۔ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔

حیدرآباد کی ایک اہم خصوصیت:

ریاست حیدرآباد کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے کئی ایک رشتہ دار دہلی اور لوہارو سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے ہیں اور جہاں وہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ ان میں سے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب (انسپکٹر جنرل عدالت ہائے حکومت حیدرآباد) نواب منظور جنگ بہادر (کلکٹر) نواب مرزا مقصود احمد خاں صاحب (گورنمنٹ کنٹریکٹر) مرزا منصور احمد خاں صاحب، مرزا حسین احمد بیگ صاحب جج ہائی کورٹ، مرزا سلیم بیگ صاحب، مرزا رفیق بیگ صاحب اور فدا حسین خاں صاحب سے ملاقات کے لئے حضور ان کے مکانوں پر تشریف لے گئے اور ان سب لوگوں نے حضور کے اعزاز میں پرتکلف دعوتیں دیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سکریٹری آثار قدیمہ جو بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے اور مرزا نصیر احمد بیگ صاحب بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے تھے۔ ان میں سے سوائے فدا حسین صاحب کے دوسرے تمام اصحاب جماعت احمدیہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ حضور کا پروگرام حیدرآباد میں تین دن ٹھہرنے کا تھا۔ چنانچہ تیسرے دن شام کی ٹرین سے روانگی کے لئے سیٹوں کی ریزرویشن ہو چکی تھی اس لئے مرزا سلیم بیگ صاحب کی دعوت کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ اس پر مرزا سلیم بیگ صاحب نے حضور سے عرض کیا کہ بزرگوں سے سنا تھا کہ آپ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر آپ کو اپنے ایک عزیز کی دعوت قبول کرنا ہوگی خواہ اس کے لئے ایک دن اور قیام کرنا پڑے۔ اس پر حضور نے نہایت خوشی سے اپنے قیام کی مدت

۱؎ "الفضل" ۲۹ نومبر ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۶ تا ۸۔
اور سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآبادی کی یادداشتوں سے ماخوذ۔

میں ایک دن کا اضافہ کر دیا اور ریزرویشن منسوخ کروا کر مرزا سلیم بیگ صاحب کی دعوت کو منظور فرمایا۔ اس طرح حضور نے اپنے ننھیالی رشتہ داروں کے جذبات و احساسات کا خاص خیال رکھا اور دوسروں کے لئے نمونہ قائم فرمایا۔

حضورؓ نے حیدرآباد کے قیام کے دوران حیدرآباد کی تہذیب و تمدن، وہاں کے لوگوں کے اخلاق، شائستگی، مہمان نوازی اور رواداری، ان کے لباس، رہن سہن، نفاست و صفائی اور شہر حیدرآباد کی عمارتوں کی خوبصورتی کی جو اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ بڑی تعریف فرمائی۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جمعہ کا دن تھا۔ اس دن نماز جمعہ کے وقت حضورؓ شہر کی مرکزی مسجد (مکہ مسجد) کے آگے سے گذرے اور وہاں سینکڑوں موٹر کاروں کو کھڑے دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ یہ ان لوگوں کی کاریں ہیں جو نماز جمعہ ادا کرنے آئے ہیں بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ امراء اور صاحب حیثیت لوگوں میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا یہ شوق بہت قابل تعریف ہے۔

حیدرآباد سے آگرہ تک:

حیدرآباد سے رخصت ہو کر حضرت امیر المومنینؓ آگرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ملک صلاح الدین صاحب ایم اے کا بیان ہے کہ آگرہ سے ایک دو اسٹیشن قبل حضورؓ نے فرمایا کہ چونکہ تاج محل کو چاندنی میں دیکھنا ہی اصل دیکھنا ہوتا ہے، اس لئے بہت جلد ٹیکسی کا انتظام کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہاں اترتے ہی خاکسار نے انتظام کر دیا۔ حضور مع خاندان تاج محل کو تشریف لے گئے اور خاکسار ایک ہوٹل میں سامان لے گیا اور حضور کے ارشاد کے مطابق کھانے کا آرڈر دیا اور پھر تاج محل پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے حضور قلعہ دیکھنے تشریف لے گئے۔ وہاں اتفاقاً احمد صاحب سکھروی (جو وہاں کاروبار کرتے تھے اور قادیان میں تعلیم پائی تھی) اور حضرت بابو اکبر علی صاحب انسپکٹر ورکس (ولد کرنل ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب) سے سامنا ہو گیا اور وہ مکرم سیٹھ اللہ جوایا صاحب آگرہ (جو آج کل ملتان میں مہاجر ہیں) قلعہ میں آ گئے اور قلعہ کے دیکھنے تک ساتھ رہے۔

پھر ہوٹل سے کھانا لیا اور تمام لوگ مع حضور فتح پوری سیکری ٹیکسیوں پر گئے اور ایک مسلمان بھی ساتھ لیا جس نے اس دوران میں ان لوگوں کے معمول کے مطابق ہر طرح کے قصے

بیان کرتا رہا۔ وہاں دیوانِ خاص وغیرہ کی عمارت کے اوپر ہی کھانا کھایا گیا۔ حضور نے حضرت سلیم چشتیؒ کے مزار پر دعا فرمائی اور مزار سے باہر نکل کر حضور کے فرمان پر ان مجاوروں کو چند روپے خاکسار نے دیئے۔ وہاں سے فارغ ہوکر حضور ہوٹل میں تشریف لائے، ظہر وعصر کی نمازیں پڑھائیں، جس میں مقامی احباب بھی شامل ہوئے اور ایک یا دو احباب نے بیعتیں بھی کیں۔ مجھے ارشاد فرمایا کہ پہلے جاکر حضور اور حضور کے خاندان کے لئے سیکنڈ کلاس میں سیٹیں دہلی کے لئے ریزرو کرالوں۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے جو مسلمان تھا وعدہ کیا اور گاڑی آنے پر حضور کے حسب منشاء انتظام کردیا''۔[1]

دہلی میں آمد:

حضرت امیر المومنینؓ آگرہ سے روانہ ہوکر ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو بوقت ساڑھے آٹھ بجے شب دہلی تشریف لائے۔ جماعت احمدیہ دہلی وشملہ نے نئی دہلی کے اسٹیشن پر حضورؓ پرنور کا استقبال کیا۔ حضورؓ نے گاڑی سے اتر کر تمام احباب کو جو ایک لمبی قطار میں کھڑے تھے، شرف مصافحہ بخشا اور پھر آنریبل چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کی معیت میں ڈاکٹر ایس اے لطیف صاحب کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضور پرنور کی دعوت طعام کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس دعوت میں پچاس کے قریب غیر احمدی معززین شہر اور اتنی تعداد میں احمدی بھی مدعو تھے۔ یہاں حضور نے نواح دہلی کے سرسپور گاؤں کے پچیس آدمیوں کی (معہ اہل وعیال) بیعت لی[2] حضور نے اس موقع پر بیعت کرنے والوں کو نماز سمجھ کر ادا کرنے کی تاکید

[1] مکتوب محررہ ۱۵ ر جولائی ۱۹۶۷ء۔

[2] نذیر احمد صاحب ہومیو گنگا پور چک ۱۵۴۱ اپنے مکتوب مورخہ ۴ ر جنوری ۱۹۵۸ء میں لکھتے ہیں: خاکسار موضع سرسپور...... دہلی کا مہاجر ہے اور میں نے ۱۹۳۴ء میں بیعت کی تھی۔ اسی وقت سے مخالفت شروع ہوگئی اور میرے گھر والوں نے بغیر کسی پیسے اور روپئے گھر سے الگ کردیا تھا۔ خاکسار نے مزدوری یا پھیری وغیرہ کرکے اپنا گذارہ کیا اور گھر والوں کو منع کرتا رہا۔ چار سال کی قربانی اور دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھر والوں کے دلوں میں احمدیت کی سچائی ظاہر کردی اور جس وقت حضور دہلی آئے، ۱۹۳۸ء...... کے موقع پر میرے والد صاحب اور میرے (باقی آئندہ صفحہ پر)

فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ جھوٹ کسی حالت میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔ یہ خطرناک بیماری ہے۔ بعدازاں حضور اپنے قیام کے لئے آنریبل چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔[1]

۲۸ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو حضور نے نماز جمعہ پڑھائی۔ اسی روز شام کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں دعوت ہوئی اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قریب مسجد نواب خاں حضور کا ایک گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا جس میں حضور کے ہمراہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں صاحب، شمس العلماء، خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی، مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ عمائد ومعززین موجود تھے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے بعد خان بہادر اکبر علی صاحب کے ہاں دعوت تھی جس میں بہت سے معززین شہر مدعو تھے۔ حضور کی ان ملاقاتوں کا دہلی کے معززین پر خاص اثر ہوا اور کئی لوگ سلسلہ احمدیہ میں بھی داخل ہوئے۔[2]

دہلی سے روانگی:

۲۸ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کی شب کو حضور فرنٹیر میل سے روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے چودھری محمد ظفر اللہ خاں صاحب، خان بہادر محمد سلیمان صاحب، خان صاحب ایس سی حسنین، شیخ رحمت اللہ صاحب انجینئر، جناب جوش ملیح آبادی، خان بہادر کے ایم حسن، شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج، چودھری بشیر احمد صاحب سب جج، چودھری نصیر احمد صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر ایس اے لطیف صاحب اور احباب جماعت دہلی وشملہ حاضر تھے۔

(سلسلہ) بھائیوں اور بھائیوں کی بیویوں اور رشتہ داروں نے حضور کے ہاتھ پر دہلی پہنچ کر ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کی کوٹھی میں بیعت کرنے کی اللہ تعالیٰ سے توفیق پائی۔ اس وقت حضور کھانا کھا چکے تھے، مگر اس وقت تک انہوں نے برتن اٹھائے نہیں تھے۔ دہلی کے بڑے بڑے امراء اور عہدیدار دعوت میں شامل تھے اور سب کی موجودگی میں...... ایدہ اللہ تعالیٰ نے بیعت لی تھی۔''

[1] ''الفضل'' ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ ص ۱۔ کالم ۲۔

[2] ''الفضل'' یکم نومبر ۱۹۳۸ء۔ ص۔ کالم ۲۔ [3] ایضاً۔

حضرت امیر المومنینؓ دہلی سے روانہ ہوکر اگلے روز ۲۹ / اکتوبر ۱۹۳۸ء کو مع خدام بخیریت دارالامان تشریف لائے۔[1]

تبلیغی نقطہ نگاہ سے سفر کے تاثرات:

یہ سفر دورِ خلافتِ ثانیہ کے ان تمام مشہور اور کامیاب سفروں میں نمایاں اور منفرد شان رکھتا ہے، جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت کے دوران اندرون ملک اختیار کئے اور جن کے دائمی نقوش تبلیغی اور علمی دونوں اعتبار سے حضور کے قلب و دماغ پر زندگی بھر قائم رہے۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تبلیغی نقطۂ نگاہ سے سفر حیدرآباد و دہلی کی نسبت حسب ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا:

"میرے دل پر ان گالیوں کی وجہ سے ایک ناخوشگوار اثر تھا جو احرار ایجی ٹیشن کی وجہ سے ہمیں ملتی رہی ہیں اور اب بھی مل رہی ہیں۔ کیونکہ گالیاں فتح اور شکست سے تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ گرا ہوا آدمی زیادہ گالیاں دیا کرتا ہے۔ بہرحال میری طبیعت پر یہ اثر تھا کہ مسلمانوں نے اس موقع پر ہمارے ساتھ اچھا معاملہ نہیں کیا اور مجھے ان کی طرف سے رنج تھا۔ شاید میرا گذشتہ سفر اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اسی غرض کے لئے تھا تا کہ میری طبیعت پر جو اثر ہے وہ دور ہو جائے۔ میں نے اس سفر میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ میرا اثر کہ مسلمان شرفاء بھی اس گند میں مبتلا ہیں اس حد تک صحیح نہیں جس حد تک میرے دل پر اثر تھا۔ مجھے اس سفر میں ملک کا ایک لمبا دورہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ پہلے میں سندھ گیا، وہاں سے ممبئی گیا۔ بمبئی سے حیدرآباد چلا گیا اور پھر حیدرآباد سے واپسی پر دہلی سے ہوتے ہوئے قادیان آگیا۔ اس طرح گویا نصف ملک کا دورہ ہو جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران میں نے شرفاء کے طبقہ کے اندر جو بات دیکھی ہے۔ اس سے جو میرے دل میں مسلمانوں کے متعلق رنج تھا وہ بہت کچھ دور ہو گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ شریف طبقہ اب بھی وہی شرافت رکھتا ہے جو

[1] "الفضل" یکم نومبر ۱۹۳۸ء۔ ص۔ کالم ۲۔

شرافت وہ پہلے رکھا کرتا تھا اور ان خیالات سے جو احرار نے پیدا کرنے چاہے تھے وہ متاثر نہیں کر سکے۔ بلکہ ان کی گالیوں کی وجہ سے وہ ہم سے بہت کچھ ہمدردی رکھتا ہے۔ اگر مجھے یہ سفر پیش نہ آتا تو شاید وہ اثر جو دیر تک میرے دل پر تھا کہ اتنے گند میں مسلمانوں کا شریف طبقہ کس طرح شامل ہو گیا، وہ اس سفر کی وجہ سے دور ہو گیا۔ حیدرآباد میں میں نے دیکھا کہ جس قدر بھی بڑے آدمی تھے، الا ماشاء اللہ تھوڑے سے باہر بھی رہے ہوں گے۔ وہ ان پارٹیوں میں شامل ہوتے رہے جو میرے اعزاز میں وہاں دی گئیں۔ ان لوگوں میں وزراء بھی تھے، امراء بھی تھے اور نواب بھی تھے۔ چنانچہ نواب اکبر یار جنگ صاحب بہادر نے جو پارٹی دی ،اس میں بہت سے نواب شامل ہوئے اور تمام سو دو سو کے قریب معززین ہوں گے، جو ان کی ٹی پارٹی میں شامل ہوئے۔ اسی طرح دوسری جگہوں میں بھی میں نے دیکھا کہ شرفاء، آفیسرز ،ججز اور بڑے بڑے امراء ان دعوتوں میں شریک ہوتے رہے اور میں دیکھتا رہا کہ ان کے دلوں میں یہ احساس ہے کہ احرار کی طرف سے ہم پر سخت مظالم توڑے گئے ہیں، بلکہ بہتوں نے بیان بھی کیا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں جماعت احمدیہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔ اسی طرح دہلی میں جو ایک دو تقریبات ہوئیں ان میں میں نے دیکھا کہ شہر کے ہر طبقہ کے لوگ اور بڑے بڑے رؤساء شامل ہوتے رہے۔ مسلمانوں میں سے زیادہ اور ہندوؤں اور سکھوں میں سے قلیل' اور یہ قدرتی بات ہے کہ جس شخص کے اعزاز میں کوئی تقریب منعقد کی جائے گی، اس میں وہی لوگ زیادہ بلائے جائیں گے جو اس کے ہم مذہب ہوں گے۔ پس ان دعوتوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوئے اور ان کی باتوں سے میں نے معلوم کیا کہ درحقیقت احرار کا یہ دعویٰ کہ ان کا مسلمانوں پر بہت بڑا اثر ہے اور یہ کہ وہ گند جسے شرافت برداشت بھی نہیں کر سکتی مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے اور اس طرح میرے ان خیالات کا ازالہ ہوا جو شرفاء کے متعلق میرے دل میں پیدا ہو چکے تھے اور میں نے سمجھا کہ اگر ان ایام میں

مسلمان خاموش رہے تھے تو محض مخالفت کی ہیبت کی وجہ سے نہ اس وجہ سے کے
احرار کا ان کے دلوں پر کوئی اثر ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے بدظنی کے گناہ
سے بچالیا۔ مجھے پرسوں اترسوں ہی حیدرآباد سے ایک معزز آدمی کا خط ملا ہے۔ وہ
لکھتا ہے میں خود آپ سے ملنا چاہتا تھا کہ دیکھوں آخر جس شخص کی اس قدر تعریف
اور اس قدر مذمت ہوتی ہے وہ ہیں کیسے خیالات کے۔ ہر شخص کے خیالات مختلف
ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے جو چاہے آپ کے متعلق کہہ لیا جائے، مگر اس سے کوئی
انکار نہیں کرسکتا کہ آپ کے اخلاق اور آپ کی محبت نا قابلِ اعتراض اور قابلِ تقلید
ہے۔ یہی اثر میں سمجھتا ہوں عام طور پر دوسرے لوگوں کے دلوں پر بھی تھا اور بجائے
اس کے کہ وہ اس گند سے متاثر ہوتے، سوائے چند لوگوں کے باقی تمام شرفاء
صورتِ حالات کو حیرت سے دیکھتے تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ ہم معلوم کریں یہ
کیسی جماعت ہے؟ اور اس کا امام کیسا شخص ہے؟ پس احرار کے گند سے مسلمانوں
کے شریف طبقہ میں صرف تجسس پیدا ہوا۔ ایک روحِ تحقیق کی پیدا ہوئی۔ اس سے زیادہ
انہوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اسی طرح میرے یہاں پہنچنے پر دو چار دن کے بعد
ایک مشہور مسلمان لیڈر نے جنہیں گورنمنٹ کی طرف سے سر کا خطاب بھی ملا ہوا ہے
مجھے لکھا کہ میں آپ کے سفر کے حالات اخبار میں غور سے پڑھتا رہا ہوں اور میں
اس دورہ کی کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں حالانکہ ان کا اس سفر سے کوئی واسطہ
نہ تھا، نہ ان شہروں میں سے کسی ایک میں رہتے تھے جہاں میں گیا، نہ وہ ان علاقوں
کے باشندے ہیں۔ دور دراز کے علاقہ میں وہ رہتے ہیں اور مسلمانوں کے مشہور
لیڈر ہیں۔ مگر انہوں نے بھی اس دورہ کی کامیابی پر مبارکبادی کا خط لکھنا ضروری
سمجھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرفاء کے دلوں میں ایک کرید تھی اور بجائے اس
گند سے متاثر ہونے کے شریف طبقہ ایک تجسس کی نگاہ سے تمام حالات کو دیکھ رہا تھا
اور اندرونی طور پر وہ ہم سے ہمدردی رکھتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، ان حالات میں
مسلمانوں کے متعلق میری بدظنی گناہ کا موجب تھی اور میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا

ہوں کہ اس نے مجھے اس سفر کا موقع دے دیا تا کہ وہ خیال جو ایک شکوہ کے رنگ
میں مسلمان شرفاء کے متعلق میرے دل میں پیدا ہو چکا تھا کہ انہوں نے وہ امید
پوری نہیں کی جو ان پر مجھے تھی وہ دور ہو جائے۔ چنانچہ مجھ پر اس سفر نے یہ بات
ثابت کردی کہ میرا پہلا خیال غلط تھا اور درحقیقت ان کی خاموشی صرف ہیبت کی وجہ
سے تھی ورنہ شریف دل شریف ہی تھے اور وہ اس گند کو پسند نہیں کرتے تھے جو احرار
کی طرف سے اچھالا گیا''۔[1]

عالم روحانی کا انکشاف:

جہاں تک علمی پہلو کا تعلق ہے اس سفر کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ حیدرآباد دکن اور
آگرہ کی قدیم تاریخی یادگاروں اور عمارتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد جب حضور نے دلی میں
غیاث الدین تغلق کا تعمیر کردہ قلعہ ملاحظہ فرمایا تو حضور پر گوتم بدھ کی طرح عالم روحانی کے انکشاف
کی ایسی زبردست تجلی ہوئی کہ آپ کے زبان پر بے ساختہ جاری ہوگیا۔

''میں نے پالیا۔ میں نے پالیا''

اس ایمان افروز واقعہ کی تفصیلات خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے مبارک
الفاظ میں درج کرنا ضروری ہے۔ حضورؓ فرماتے ہیں:

''حیدرآباد میں میں نے بعض نہایت ہی اہم تاریخی یادگاریں دیکھیں، جن میں
سے ایک گولکنڈہ کا قلعہ بھی ہے۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ کی نہایت اونچی چوٹی پر بنا ہوا
ہے۔ اور اس کے گرد عالمگیر کی لشکر کشی کے آثار اور اہم قابل دید اشیاء ہیں، یہاں
کسی زمانہ میں قطب شاہی حکومت ہوا کرتی تھی اور اس کا دارالخلافہ گولکنڈہ تھا۔ یہ
قلعہ حیدرآباد سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ایک نہایت اونچی چوٹی پر
بڑا وسیع قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ قلعہ اتنی بلند چوٹی پر واقعہ ہے کہ جب ہم اس کو دیکھنے
کے لئے آگے بڑھتے چلے گئے تو حیدرآباد کے وہ دوست جو ہمیں یہ قلعہ دکھانے کے

---

[1] ''الفضل'' ۲۴ر نومبر ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۴ و ۵۔

لئے اپنے ہمراہ لائے تھے اور جو گورنمنٹ کی طرف سے ایسے محکموں کے افسر اور ہمارے ایک احمدی بھائی کے عزیز ہیں، انہوں نے کہا کہ اب آپ نے اسے کافی دیکھ لیا ہے، آگے نہ جائیے۔ اگر آپ گئے تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ خود تو انہوں نے شریف لے لئے اور وہیں کھانے بیٹھ گئے۔ مگر ہم اس قلعہ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ جب میں واپس آیا تو دریافت کیا کہ مستورات کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ بھی اوپر گئی ہیں۔ خیر تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم کیوں گئی تھیں؟ وہ کہنے لگیں۔ انہوں نے ہمیں روکا تو تھا۔

(ماخوذ: تاریخ احمدیت۔جلد ۸۔حضرت امیر المومنینؓ کا سفر حیدرآباد)

افغانستان سے حیدرآباد تک پھیلی ہوئی جماعتوں کا ذکر

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب حیدرآبادیؓ ایک نہایت مخلص اور سلسلہ کے فدائی بزرگ تھے۔ ۱۴ رتبوک (ستمبر) کو اُن کی چھوٹی لڑکی (امۃ الحی صاحبہ) کی تقریب نکاح تھی جس کا اعلان حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے فرمایا۔ حضورؓ نے خطبۂ نکاح میں افغانستان سے لے کر حیدرآباد تک پھیلی ہوئی احمدی جماعتوں کا بڑی شرح و بسط سے ذکر کرتے ہوئے بعض مخلصین کی خاص طور پر تعریف کی۔ چنانچہ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کی سنت کے ماتحت جو قدیم سے ماموروں کے متعلق چلی آتی ہے اُس نے ہماری جماعت کو بھی مختلف علاقوں میں پھیلایا ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت ہے کہ الٰہی جماعتیں بطور بیج کے پھینکی جاتی ہیں۔ جس طرح ہم اگر ایک فٹ سے زمین پر دانے پھینکیں تو وہ تھوڑی سی جگہ میں پھیلیں گے لیکن اگر ایک بلند مینار پر سے پھینکیں تو دُور دُور گریں گے اور کسی بلند پہاڑ پر سے پھینکیں تو اور بھی دُور زمین پر پھیلیں گے۔ اسی طرح چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان آسمان سے پھینکا جاتا ہے وہ ساری دنیا پر پھیل جاتا ہے .... اسی پھینکنے میں مختلف علاقوں میں مختلف مدارج کے لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ افغانستان میں سید عبداللطیف صاحب۔

نعمت اللہ صاحب اور اَور کئی شہداء پیدا ہوئے۔ پھر کئی اُن میں سے قادیان آ گئے۔ اور اُن کے ذریعہ تمام علاقہ میں تبلیغ ہوگئی ورنہ کہاں ہندوستان اور کہاں افغانستان۔ ہمارے لئے تو سرحدوں پر تبلیغ کرنا مشکل تھا مگر یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ وہ ان لوگوں کو سرحدوں سے پار لے گیا تا کہ اس علاقہ میں تبلیغ ہو سکے ...... کسی کو بہار میں اور کسی کو بنگال میں اور کسی کو یوپی میں بیعت کی توفیق ہوئی' اور ان سب نے اپنی اپنی جگہ پر احمدیت کو پھیلانا شروع کر دیا۔ انہی میں سے ایک حیدرآباد کی جماعت ہے جو یہاں سے قریباً ڈیڑھ ہزار میل دُور ہے۔ بیچ میں ایک لمبا علاقہ ہے جہاں نام کو بھی کوئی احمدی نہیں۔ سی پی کا علاقہ بیچ میں ہے اُس میں جتنے احمدی ہیں وہ سب ملا کر بھی شاید شہر حیدرآباد کی جماعت کے برابر نہ ہوں۔ یوپی میں بھی بہت کم ہیں۔ اور ان سب علاقوں کو پار کر کے اللہ تعالیٰ نے حیدرآباد میں ایک جماعت پیدا کر دی اور وہاں ایسے مخلص احباب پیدا ہوئے جنھوں نے احمدیت کے لئے بہت قربانیاں کی ہیں اور ایثار سے کام کیا۔ وہاں جماعت مولوی محمد سعید صاحب کے ذریعہ قائم ہوئی۔ اڑیسہ میں ایک گاؤں سنبل پور سارے کا سارا احمدی ہے۔ اور وہ بھی دراصل حیدرآباد کی ہی پیدا شدہ جماعت ہے۔ سید عبدالرحیم صاحب وہاں کے رہنے والے حیدرآباد آ گئے تھے وہاں وہ مولوی محمد سعید صاحب سے ملے۔ مولوی صاحب نے انہیں تبلیغ کی اور بعض کتابیں بھی دیں جن کے مطالعہ سے وہ احمدی ہو گئے اور پھر اُن کے اثر کی وجہ سے یہ گاؤں سارے کا سارا احمدی ہوگیا۔ اس وقت میں جن کی لڑکی کے نکاح کا اعلان کرنے والا ہوں وہ حیدرآباد کے رہنے والے سیٹھ محمد غوث ہیں۔ وہ بھی اُن مخلصین میں ہیں جن کا دل خدمتِ سلسلہ کے لئے گداز ہے اور وہ اس بات کا بہت ہی احساس رکھتے ہیں۔ ہیں تو وہ پہلے سے احمدی مگر میرے ساتھ اُن کی واقفیت جو ہوئی تو وہ حج کو جاتے ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی۔ شاید اُن کو علم ہو کہ میں جا رہا ہوں یا شاید وہ تجارت کے سلسلے میں وہاں آئے ہوئے تھے۔ بہر حال اُن سے میری پہلی ملاقات وہاں ہوئی اور پھر ایسے تعلقات ہو گئے کہ گویا واحد گھر کی صورت پیدا ہوگئی۔ مستورات کے بھی آپس میں تعلقات ہو گئے۔ حج کے موقعہ پر عبدالحی صاحب عرب بھی میرے ساتھ تھے وہاں سے روانگی کے وقت سیٹھ صاحب نے اُن کو بعض چیزیں دیں جن میں ایک گلاس بھی تھا۔ وہ انہوں نے عبدالحی صاحب کو یہ کہہ کر دیا کہ

جب آپ اِس میں پانی پئیں گے تو میں یاد آ جاؤں گا اور اس طرح آپ میرے لئے دُعا کی تحریک کر سکیں گے ۔ غرض سیٹھ صاحب حیدر آباد کے نہایت مخلص لوگوں میں سے ہیں ۔ چندہ کی فراہمی کے لحاظ سے، جماعت میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لحاظ سے بہت اچھا کام کیا ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی وقفہ آئے مسلسل کیا ہے ۔ اور اُن کے اخلاص کا ہی نتیجہ ہے کہ اُن کو اولاد بھی اللہ تعالیٰ نے مخلص دی ہے ۔ بعض لوگ خود تو مخلص ہوتے ہیں مگر اُن کی اولاد میں وہ اخلاص نہیں ہوتا مگر سیٹھ صاحب کی اولاد بھی مخلص ہے ۔ ان کے بڑے لڑکے محمد اعظم صاحب میں ایسا اخلاص ہے جو بہت کم نوجوانوں میں ہوتا ہے ۔ تبلیغ اور تربیت کی طرف انہیں خاص توجہ ہے ۔ میں نے دیکھا ہے ریاستوں میں تبلیغ کرنے سے لوگ عام طور پر ڈرتے ہیں اور کوئی بات ہو بھی تو کوشش کرتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو اس کی اطلاع نہ ہو سکے ۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ محمد اعظم صاحب کو شوق ہے کہ ریاست میں کھلی تبلیغ اور اشاعت کی جائے ۔ اس کے متعلق وہ مجھ سے بھی مشورے لیتے رہتے ہیں اور وہاں بھی نوجوانوں میں جوش پیدا کرتے رہتے ہیں ۔ دوسرے لڑکے معین الدین ہیں وہ بھی بہت اخلاص سے سلسلہ کے کاموں میں حصہ لیتے اور خدام الاحمدیہ کی تحریک میں بہت جدوجہد کرتے ہیں ۔ ہاتھ سے کام کرنے کی تحریک کو مقبول بنانے کا بھی انہیں شوق ہے ۔ لڑکیوں میں سے اُن کی بڑی لڑکی کے تعلقات امۃ الحی مرحومہ کے ساتھ تھے ۔ پھر اُن کی چھوٹی لڑکی خلیل کے ساتھ بیاہی گئی جو تحریک جدید کا مجاہد ہے ۔ اس لڑکی کے امۃ القیوم کے ساتھ بہنوں جیسے تعلقات ہیں اور شروع سے اب تک اِس خاندان نے ایسے اخلاص کے ساتھ تعلق کیا اور اسے نبھایا ہے کہ اس میں کبھی بھی کمی نہیں آئی ۔ اللہ تعالیٰ ایسے مخلصین کے لئے ذرائع بھی خود مہیا کرتا ہے ۔ ان کے لڑکوں کی شادیاں بھی ایسے گھرانوں میں ہوئی ہیں جو بہت مخلص ہیں ۔ محمد اعظم کی شادی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مخلص اور فدائی صحابی حکیم محمد حسین صاحب قریشی موجد مفرح عنبری کی لڑکی سے ہوئی ہے ۔ قریشی صاحب بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ابتدائی صحابہ میں تھے اور ایسے مخلص تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ابتلاء سے انہیں بچالیا ۔ جب پہلے پہل خلافت کا جھگڑا اُٹھا تو خواجہ کمال الدین صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے لاہور کی جماعت کو جمع کیا اور کہا کہ دیکھو سلسلہ کس طرح تباہ ہونے لگا ہے ۔ یہ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی خلافت کا

زمانہ تھا جب میر محمد اسحاق صاحب نے بعض سوالات لکھ کر آپ کو دیئے تھے اور آپ نے جواب کے لئے وہ باہر کی جماعتوں کو بھجوائے ۔ اُس وقت لاہور کی ساری کی ساری جماعت اس پر متفق ہو گئی تھی کہ دستخط کر کے خلیفۂ اوّل کو بھجوائے جائیں کہ خلافت کا یہ طریق احمدیہ جماعت میں نہیں بلکہ اصل ذمہ دار جماعت کی انجمن ہے ۔ جب سب لوگ اس امر کی تصدیق کر رہے تھے قریشی صاحب خاموش بیٹھے رہے کہ میں سب سے آخر میں اپنی رائے بتاؤں گا ۔ آخر پر اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی اور کہا کہ یہ گستاخی ہے کہ ہم خلیفہ کے اختیارات معین کریں ۔ ہم نے اُن کی بیعت کی ہے اس لئے ایسی باتیں جائز نہیں ۔ وہ آخری آدمی تھے اُن سے پہلے سب اپنی اپنی رائے ظاہر کر چکے تھے مگر ان کے خلاصہ کا نتیجہ تھا کہ سب لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور خواجہ صاحب کے مؤید صرف وہ لوگ رہ گئے جو اُن کے ساتھ خاص تعلقات رکھتے تھے ۔ اسی طرح میری خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی غیر مبائعین سے مقابلہ کرنے میں بڑی تندہی سے حصہ لیا ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام انہی کی معرفت لاہور سے سامان وغیرہ منگوایا کرتے تھے ۔ حضور خط لکھ کر کسی آدمی کو دے دیتے جو اُسے حکیم صاحب کے پاس لے جاتا اور وہ سب اشیاء خرید کر دیتے ۔ گویا وہ لاہور میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایجنٹ تھے ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اُن سے بہت محبت رکھتے تھے اور لاہور کی احمدیہ مسجد بھی انہی کا کارنامہ ہے ۔ دوسروں کا تو کیا کہنا میں خود بھی اس کا مخالف تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ اتنا بڑا بوجھ ہے کہ جو لاہور کی جماعت سے اٹھایا نہ جاسکے گا مگر انہوں نے پیچھے پڑ کے مجھ سے اجازت لی اور ایک بڑی بھاری رقم کے خرچ سے لاہور میں ایک مرکزی مسجد بنادی ۔ سیٹھ صاحب کے دوسرے لڑکے کی شادی خانصاحب ذوالفقار علی خان صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے ۔ خانصاحب بھی مخلص آدمی ہیں اور گو بہت پرانے نہیں مگر پیچھے آ کر بھی انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنے تعلقات مضبوط کئے اور بڑھائے تو ان کے لڑکوں کے رشتے بھی اللہ تعالیٰ نے مخلص گھرانوں میں کرادیئے ۔ لڑکیوں کی شادیاں بھی وہ چاہتے تھے پنجاب میں ہی ہوں ۔ غرض امۃ الحفیظ کا نکاح تو خلیل احمد صاحب سے ہو گیا...... اور چھوٹی لڑکی امۃ الحی کے نکاح کا اعلان میں اِس وقت کر رہا ہوں جو خانصاحب ڈاکٹر احمد عبداللہ

صاحب کے ایک قریبی عزیز اور شاید بھانجے محمد یونس صاحب کے ساتھ قرار پایا ہے۔ اس رشتہ میں بھی سیٹھ صاحب نے اخلاص کو مدنظر رکھا ہے۔ تمدن کے اختلاف کی وجہ سے میں ان کو لکھتا تھا کہ حیدرآباد میں ہی رشتہ کریں۔ مگر اُن کی خواہش تھی کہ قادیان پنجاب میں ہی رشتہ ہوتا کہ قادیان آنے کے لئے ایک اور تحریک اُن کے لئے پیدا ہوجائے۔ محمد یونس صاحب ضلع کرنال کے رہنے والے ہیں جو دہلی کے ساتھ لگتا ہے مگر حیدرآباد کی نسبت قادیان سے بہت نزدیک ہے۔ سیٹھ صاحب کا خاندان ایک مخلص خاندان ہے اُن کی مستورات کے ہمارے خاندان کی مستورات سے ان کی لڑکیوں کے میری لڑکیوں سے اور ان کے لڑکوں کے میرے ساتھ ایسے مخلصانہ تعلقات ہیں کہ گویا خانہ واحد والا معاملہ ہے۔ ہم اُن سے اور وہ ہم سے بے تکلف ہیں اور ایک دوسرے کی شادی و غمی کو اس طرح محسوس کرتے ہیں جیسے اپنے خاندان کی شادی و غمی کو۔''

(الفضل ۲۸؍اگست ۱۹۴۱ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا ایک خواب

بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح کی وفات اور سقوط حیدرآباد کے مصائب

ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی وفات اور حیدرآباد (دکن) کی شکست کے پے درپے صدموں نے مسلمانانِ پاکستان میں ایک زلزلہ سا برپا کردیا۔ اس نازک موقع پر حضرت مصلح موعودؓ کو عالم رؤیا میں بتایا گیا کہ یہ تازہ مصائب پاکستان کی قوت و طاقت میں کمزوری کے بجائے اضافہ کا موجب بن جائیں گے۔

اللہ جل شانہٗ وعزاسمہٗ سے یہ بشارت ملنے پر حضورؓ نے ۲۱؍ظہور ۱۳۲۷/۱۹۴۸ء کے الفضل میں ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جس میں پہلے تو اپنی خواب بیان فرمائی ازاں بعد لکھا:

''اس رؤیا کی بناء پر سمجھتا ہوں کہ گویہ دونوں واقعات مسلمانوں کے لئے نہایت تکلیف دہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان صدمات کو چھوٹا کردے گا اور مسلمانوں کو ان کے بداثر سے محفوظ رکھے گا۔ اگر مسلمان خدا تعالیٰ پر توکل کا اظہار کریں اور کسی لیڈر کی وفات کا جو سچا ردِّعمل ہوتا ہے وہ

اپنے اندر پیدا کریں۔ یعنی اس کی نیک خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً مسٹر جناح کی وفات مسلمانوں کی تباہی کا موجب نہیں بلکہ مسلمانوں کی مضبوطی کا موجب ہوگی۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ جب فوت ہوئے ہیں اُس وقت میری عمر انیس سال کی تھی۔ اُن کی وفات اسی لاہور میں ہوئی تھی اور ان کی وفات کی خبر سنتے ہی شہر کے بہت سے اوباشوں نے اُس گھر کے سامنے شور وغوغا شروع کردیا تھا جس میں اُن کی لاش پڑی تھی اور ناقابل برداشت گالیاں دیتے تھے اور ناپسندیدہ نعرے لگاتے تھے۔ مجھے اُس وقت کچھ احمدی بھی اُکھڑے اُکھڑے نظر آتے تھے تب میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے سرہانہ جاکر کھڑا ہوگیا اور خدا تعالیٰ کو مخاطب کرکے یہ عرض کی کہ اگر ساری جماعت بھی مرتد ہوجائے تو میں اس مشن کو پھیلانے کے لئے جس کے لئے خدا نے انہیں مبعوث کیا تھا کوشش کروں گا اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔ خدا تعالیٰ نے میرے عہد میں ایسی برکت دی کہ احمدیت کے مخالف خواہ ہمارے عقیدوں کے متعلق کچھ کہیں یہ تو ان میں سے کوئی ایک فرد بھی نہیں کہہ سکتا کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی وفات پر جو طاقت جماعت کو حاصل تھی اتنی طاقت آج جماعت کو حاصل نہیں۔ ہر شخص اقرار کرے گا کہ اس سے درجنوں گنا زیادہ طاقت اس وقت جماعت کو حاصل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح کی وفات کے بعد اگر وہ مسلمان جو واقعہ میں ان سے محبت رکھتے تھے اور ان کے کام کی قدر کو پہچانتے تھے سچے دل سے یہ عہد کرلیں کہ جو منزل پاکستان کی اُنہوں نے تجویز کی تھی وہ اس سے بھی آگے لے جانے کی کوشش کریں گے اور اس عہد کے ساتھ ساتھ وہ پوری تندہی سے اس کو نبھانے کی کوشش بھی کریں تو یقیناً پاکستان روز بروز ترقی کرتا چلا جائے گا اور دُنیا کی مضبوط ترین طاقتوں میں سے ہوجائے گا۔

حیدرآباد کے معاملہ کے متعلق بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان حوصلہ سے کام لیں تو حیدرآباد کا مسئلہ کوئی ناقابل تلافی مصیبت نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حیدرآباد اپنے حالات کے لحاظ سے انڈین یونین میں ہی شامل ہونا چاہئے تھا جس طرح کہ کشمیر اپنے حالات کے لحاظ سے پاکستان میں ہی شامل ہونا چاہئے۔ میں تو شروع دن سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا رہا ہوں۔ اور میرے نزدیک اگر حیدرآباد اور کشمیر کے مسئلے کو اکٹھا رکھ کر حل کیا جاتا تو شاید اُلجھنیں

پیدا ہی نہ ہوتیں لیکن بعض دفعہ لیڈر عوام الناس کے جذبات سے اتنے مرعوب ہوتے ہیں کہ وہ وقت پر صحیح سمت اختیار کر ہی نہیں سکتے ۔ حیدرآباد کی پرانی تاریخ بتارہی ہے کہ حیدرآباد کے نظام کبھی بھی لڑائی میں اچھے ثابت نہیں ہوئے ۔

چونکہ میرے پردادا اور نظام الملک کو ایک ہی سال میں خطاب اور عہدہ ملا تھا اس لئے مجھے اس خاندان کی تاریخ کے ساتھ کچھ دلچسپی رہی ہے ۔ ۱۷۰۷ء میں ہی ان کو خطاب ملا اور ۱۷۰۷ء میں ہی میرے پردادا مرزا فیض محمد صاحب کو خطاب ملا تھا ۔ ان کو نظام الملک اور میرے پردادا کو عضد الدولہ ۔ اس وقت میرے پاس کاغذات نہیں ہیں ۔ جہاں تک عہدے کا سوال ہے غالباً نظام الملک کو پہلے پانچ ہزاری کا عہدہ ملا تھا لیکن مرزا فیض محمد صاحب کو ہفت ہزاری کا عہدہ ملا تھا ۔ اس وقت نظام الملک باوجود دکن میں شورش کے دلی میں بیٹھے رہے اور تب دکن گئے تھے جب دکن کے فسادات مٹ گئے تھے ۔ سلطان حیدرالدین کی جنگوں میں بھی حیدرآباد نے کوئی اچھا نمونہ نہیں دکھایا تھا ۔ مرہٹوں کی جنگوں میں بھی اس کا رویہ اچھا نہ تھا ۔ انگریزوں کے ہندوستان میں قدم جمنے میں بھی حیدرآباد کی حکومت کا بہت کچھ دخل تھا مگر جہاں بہادری کے معاملہ میں نظام کبھی اچھے ثابت نہیں ہوئے ۔ وہاں عام دُوراندیشی و انصاف اور علم پروری میں یقیناً یہ خاندان نہایت اعلیٰ نمونہ دکھاتا رہا اور اسی وجہ سے کسی اور ریاست کے باشندوں میں اپنے رئیس سے اتنی محبت نہیں پائی جاتی جتنی کہ نظام کی رعایا میں نظام کی پائی جاتی ہے ۔ انصاف کے معاملہ میں میرا اثر یہی رہا ہے کہ حیدرآباد کا انصاف برطانوی راج سے بھی زیادہ اچھا تھا ۔ ہندو مسلمانوں کا سوال کبھی نظاموں نے اُٹھنے نہیں دیا اور ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبول رہے ۔ لیکن جہاں یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد کا نظام خاندان کبھی بھی جنگی خاندان ثابت نہیں ہوا وہاں یہ بھی درست ہے کہ حیدرآباد کی رعایا بھی جنگی رعایا نہیں ۔ کوئی نئی رُوح ان کو جنگی بنا سکتی تھی مگر نواب بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد وہ نئی روح حیدرآباد میں نہیں رہی ۔ سید قاسم رضوی کے جاننے والے جانتے ہیں کہ بہادر یار جنگ والی رُوح ان میں نہیں ۔ بہادر یار جنگ علاوہ اعلیٰ درجہ کے مقرر ہونے کے عملی آدمی بھی تھے ۔ قاسم رضوی صاحب مقرر ضرور ہیں مگر اعلیٰ درجہ کے عملی آدمی نہیں ہیں ۔ شہزادہ برار کے اندر بھی کوئی ایسی رُوح نہیں ۔

شہزادہ برار نے آج سے اکیس سال پہلے بعض مہاسبھائی ذہنیت کے لوگوں سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا جس میں یہ اقرار کیا تھا کہ جب میں برسرِ حکومت آؤں گا میں فلاں فلاں رعایتیں ہندو قوم کو دوں گا ۔ یہ معاہدہ ان کے ایک مخلص مصاحب کے علم میں آ گیا اور اس نے ان کے کاغذات میں سے معاہدہ نکال کر مجھے پہنچا دیا اس وقت معلوم ہوا کہ شہزادہ برار کو جیب خرچ نہیں ملتا اور بعض ہندوؤں نے انہیں روپیہ دینا شروع کر دیا تھا جس کی بناء پر اُنہوں نے یہ معاہدہ کیا تھا ۔ میں نے اس معاہدہ کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا کو دی اور توجہ دلائی کہ اتنی بڑی سلطنت کے ولی عہد کو جیب خرچ نہ ملنا نہایت خطرناک بات ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے حکماً شہزادے کا جیب خرچ مقرر کروا دیا جو غالباً دس ہزار یا بیس ہزار روپے ماہوار تھا ایسے انسان سے کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اس نازک وقت میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر قوم کی راہنمائی کرے گا ۔ پس حیدرآباد کا واقعہ گو مسلمانوں کے لئے نہایت ہی تکلیف دہ ہے لیکن جو کچھ اس وقت ہوا ہے تاریخی واقعات کی ایک لمبی زنجیر کی آخری کڑی ہے ۔ بے شک آج مسلمان اس بات کا خیال کر کے بہت ہی شرم محسوس کرتے ہیں کہ تین دن پہلے مسلمانوں کے لیڈر حیدرآباد سے یہ براڈ کاسٹ کر رہے تھے کہ ہم دلی کے لال قلعہ کی طرف آ رہے ہیں اور تین دن کے اندر اندر انہوں نے ہتھیار بھی ڈال دیئے اور ان ساری امیدوں کو چھوڑ دیا جو ربع صدی سے اپنے دِلوں میں لئے بیٹھے تھے ۔ مگر میں سمجھتا ہوں یہ ابتلاء بھی اگر پاکستان کے مسلمانوں کے عزم کو بلند کرنے کا موجب ہو جائے تو بلاءِ زحمت نہیں بلکہ بلاءِ رحمت ہوگا ۔

خدا تعالیٰ عام دُنیاوی دروازے بند کر کے مسلمانوں کو بُلا رہا ہے کہ میری طرف آؤ ۔ خدا کی رحمت کا دروازہ اب کھلا ہے کاش مسلمان اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کی آواز پر لبیک کہیں ۔ اسلام کا جھنڈا سرنگوں نہیں ہو سکتا ۔ خدا کے فرشتے اس کو اونچا رکھیں گے ۔ ہمیں تو اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ خدا کے فرشتوں کے ہاتھوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ بھی اس جھنڈے کو سہارا دے رہے ہوں ۔ اے خدا تو مسلمانوں کی آنکھیں کھول کہ وہ اپنے فرض کو پہچانیں، تیری آواز کو سنیں اور اسلام پھر سے معزز اور موثر ہو جائے ۔ "

گوہر نایاب محترم نواب اکبر یار جنگ بہادر کا ذکر خیر

از قلم میاں عبدالرحیم صاحب بیرسٹرایٹ لا مالیرکوٹلہ

ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں چند دنوں کے لئے میں اپنے بزرگ عزیزوں اور دوستوں سے ملنے ربوہ گیا تھا۔ اس موقع پر مکرم سیٹھ اعظم صاحب حیدرآبادی جن سے میرے پرانے دوستانہ مراسم ہیں سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور موضوع گفتگو' بالخصوص سابق ریاست حیدرآباد کا شاندار اور نا قابل فراموش تہذیب وتمدن اور لائق احترام ہستیوں کے حسن اخلاق اور دیگر قابل تقلید خوبیوں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ ان صحبتوں میں سے جناب مولوی اکبر خاں صاحب مرحوم المخاطب بہ نواب اکبر یار جنگ بہادر سابق ہوم سکریٹری اور حیدرآباد ہائی کورٹ کے احباب کا ذکر بالخصوص ہوتا رہا۔

سیٹھ صاحب کی تحریک اور اصرار پر فی الحال نواب صاحب ممدوح کے قابل رشک محاسن اعلیٰ اخلاق اور ان کی بے مثال مہمان نوازی کی چند نہ مٹنے والی یادیں بطور ہدیہ تشکر و عقیدت پیش کر رہا ہوں۔

حیدرآباد میرے زمانہ ملازمت ۱۹۲۹تا۳۶ء میں ایک شاندار مقام تھا۔ لوگ کیسے میٹھے بول' خوش اخلاق نرم گفتار مہمان نواز مہذب شائستہ اور مروت کے پتلے تھے۔ میری جوانی کا زمانہ تھا' جس طرف نظر اٹھتی تھی شگفتگی و مروت کے مناظر دکھائی دیتے تھے' جس سے ملاقات ہوتی اس سے مل کر دل باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔ دل آج بھی ان پر لطف صحبتوں اور اس دلکش ماحول کا متلاشی ہے۔

میں ۱۹۰۳ء میں ممبئی سے پونا ہوتا ہوا سکندرآباد پہنچا۔ جہاں پر سیٹھ علی محمد صاحب ایم اے (اڈمبرا) جو حضرت سیٹھ عبداللہ بھائی الہ دین کے صاحبزادے ہیں رہا کرتے تھے۔ وہ میرے قیام انگلستان کے زمانے میں مسجد لندن کے مکان میں رہا کرتے تھے اور اس وقت ان کی عمر ۱۷۔۱۸ سال کی تھی اور میں انہیں پیار سے لٹل علی Little Ali کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ میں نے

انہیں پونا سے اطلاع دی کہ فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہوں اور یہ کہ آپ کے ہاں ٹھہروں گا۔ جب ریل سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سیٹھ عبداللہ بھائی الہ دین صاحب مولانا عبدالرحیم صاحب نیر اور سیٹھ علی محمد صاحب موجود تھے۔ نواب اکبر یار جنگ کی موٹر کار اسٹیشن کے باہر میرے لئے منتظر کھڑی تھی۔ بعد ملاقات ہر دو سیٹھ صاحبان تو پہلے رخصت ہو گئے اور مولانا نیر صاحب اور میں نواب صاحب مرحوم کی موٹر میں سیٹھ صاحب کے مکان پر بعد میں پہنچے جہاں ناشتہ کا انتظام تھا۔ اس وقت مولانا نیر صاحب نے مجھے بتلایا کہ میرے لئے نواب اکبر یار جنگ کے ہاں ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ اس وقت تک میں نواب صاحب سے بالکل ناواقف تھا۔ اس لئے وقتی طور پر کچھ گھبرایا اور شش و پنج کی حالت میں مولانا نیر صاحب کے ساتھ نواب صاحب کے در دولت پر پہنچا۔ اس وقت وہ اپنے ترپ بازار کے مکان کے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھے۔ مولانا نیر صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز تھے اور جب کبھی کوئی مہمان آپ کے ہاں آتا تو آپ فوراً دنبہ ذبح فرماتے۔ نواب صاحب کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی مہمان نوازی کا نمونہ مجھے نظر آیا۔ مجھ سے مل کر ان کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے ایسے آثار نمایاں ہوئے کہ گویا مجھ مہمان سے مل کر انہیں سب کچھ مل گیا۔ بڑے التفات سے پیش آئے۔ ملازم کو بلایا اور اپنے داماد سردار فضل حق خاں (ناظم عدالت ضلع) کو طلب کیا۔ فوراً آ گئے ان سے کہا کہ اوپر کے کمرے میں خالد صاحب کا سامان اپنی نگرانی میں رکھوا دو اور ملازم سے فرمایا کہ میرے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھے۔

نواب صاحب کے مکان کے بغل میں ایک خوبصورت باغ تھا' جس کے درمیان چپس سے بنا ہوا چبوترا تھا۔ ایک فوارہ عجیب رعنائی سے پانی بکھیرتا اور چبوترے کے اردگرد پانی بہتا رہتا تھا۔ ہر شام اس چبوترے پر کرسیاں بچھ جاتی تھیں اور شام کو بغرض ملاقات آنے والوں سے نواب صاحب وہیں ملا کرتے تھے۔ جب پہلی شام میں بھی وہاں پہنچا' اس وقت تک ملنے والوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا اور نواب صاحب کے ساتھ میں تنہا تھا۔ وہ وقت میں کبھی نہیں بھولا' نواب صاحب نے فرمایا کہ قائم گنج یوپی سے حیدرآباد صرف سات روپے لے کر آیا تھا' بعد میں میں نے سات سات ہزار سے بھی زائد کمائے ہیں۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے اگر تمہیں روپے

پیسے کی ضرورت ہوتو بلا دریغ مجھ سے لے لیا کرو میں نے ایسے الفاظ کسی اجنبی سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اس لئے میں بے حد گھبرایا' میرے اس احساس بے چینی کو فوراً بھانپ لیا اور اپنا سلسلہ کلام بدل دیا۔ نواب صاحب کے مجھ سے یہ بات کہنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں اس امر کا علم ہوگیا کہ میں اپنے والدین سے اجازت لئے بغیر حیدرآباد چلا گیا تھا۔ میرے والد محترم حضرت نواب محمد علی خاں صاحب کا اصرار تھا کہ میں وکالت ہی کروں' لیکن مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ یہ طویل قصہ ہے' جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ نواب صاحب سے گفتگو جاری تھی کہ مولانا نیر صاحب حسب وعدہ آگئے اور میں نے ان کی موجودگی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا خط جو میرے تعلق سے تھا' نواب صاحب کو دیا۔ پڑھنے کے بعد فرمانے لگے کہ اب میرا زیادہ فرض ہوگیا ہے کہ میں آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ یہاں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ کچھ پیچیدہ اور دشوار سا ہے ویسے جو مجھ سے ہو سکے گا دریغ نہ ہوگا البتہ اگر کسی چوٹی کے انگریز افسر کا سفارشی خط مل سکے تو معاملہ کو آگے بڑھانے میں آسانی رہے گی۔

نواب صاحب کے اس فرمان نے مجھے یہ بات یاد دلائی کہ ۱۹۲۷ء میں' میں مشرقی افریقہ گیا تھا۔ اس وقت وہاں یورپین اور ایشیائیوں خصوصاً ہندوستان میں بڑا تنازعہ تھا۔ اس کے حل کے لئے برطانوی حکومت نے پے کمیشن کو وہاں بھجوایا تھا' جس کے ایک ممبر جارج ششو تھے۔ انڈیا کی نمائندگی کے علاوہ ایک سیول سروس کے اعلیٰ عہدیدار کے کنور مہاراج سنگھ' جو اس زمانہ میں بنارس کے کمشنر اور بعد میں ممبئی کے گورنر جنرل رہے تھے۔ کنور صاحب مہاراجہ کپورتھلہ کے ایسے ہی قریبی عزیز تھے جیسے کہ ہم نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ہیں۔ ریاست کے لوگوں میں آپسی تعلقات ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ کنور صاحب میرے چچا سر ذوالفقار علی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ جب میں مشرقی افریقہ میں کنور صاحب سے ملا تھا' وہ نہ صرف مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آئے تھے' بلکہ میرا تعارف کمیشن کے دوسرے ممبران سے بھی کروایا تھا' جس میں ایک سر جارج ششو بھی تھے۔ جو میری آمد حیدرآباد کے وقت گورنر جنرل آف انڈیا کی ایگزیکٹیو کونسل میں فینانس ممبر کے عہدہ پر فائز تھے۔ جب نواب اکبر یار جنگ نے مجھ سے کسی چوٹی کے انگریز کے سفارشی خط کا ذکر کیا تھا تو میرا ذہن فوراً ان کی طرف گیا اور میں حیدرآباد سے شملہ آیا

جہاں ان دنوں میرے والد محترم جموں کاسل میں رہائش رکھتے تھے۔ میں سر جارج سے ملا اور انہوں نے مجھے سر چیونکس ٹرنچ ریونیو منسٹر حکومت حیدرآباد کے نام سفارش کا خط لکھ دیا۔ اس وقت حضرت مفتی محمد صادق صاحب جماعت کے کسی کام پر شملہ آئے تھے اور ان کے حسن توسط سے لارڈ آرون (وائسرائے ہند) کے پرائیویٹ سکریٹری سر جارج کنگھم کی پرائیویٹ ریڈیڈنٹ فیر حیدرآباد کے نام سفارشی چٹھی مجھے ملی۔ ان دونوں کے علاوہ سر مرزا محمد اسمٰعیل (دیوان ریاست میسور) نے سر امین بیگ صدر المہام پیشی حضور نظام اور سر ڈاکٹر محمد اقبال نے حیدرآباد کے وزیر اعظم سر یمین السلطنت مہاراج کشن پرشاد بہادر کے نام سفارشی خطوط مجھے لکھ کر دیئے تھے۔

میں ان سارے خطوط کو لے کر حیدرآباد واپس پہنچا اور نواب اکبر یار جنگ کو دکھلائے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ اب کسی اچھی خدمت کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوگئے ہیں۔ نواب صاحب نے میری ملازمت کے معاملہ کو بڑی شفقت اور پوری تن دہی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی کوشش سے اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ نہ صرف ملکی بلکہ عمر کی قید سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا۔ سر جیونکس ٹرونج اگرچہ صرف ریونیو منسٹر تھے' مگر اثر ورسوخ کے لحاظ سے حیدرآباد میں اس زمانے میں بے تاج بادشاہ تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کوٹھی پر بلوایا اور دریافت کیا کہ میں کس محکمہ میں ملازمت چاہتا ہوں۔ بعد گفتگو طے پایا کہ میرے لئے عدالت کا محکمہ زیادہ موزوں رہے گا۔ ایک دن نواب اکبر یار جنگ نے مجھے بتلایا کہ نظام کی کونسل کے سب وزرا میرے معاملہ میں ہمدردی سے غور کر رہے ہیں اور مجھے یقین دلایا کہ جلد ہی کسی اچھی خدمت پر میرا تقرر ہو جائے گا۔

میری بدقسمتی کہئے یا اتفاق کہ ان دنوں میں کسی سرکاری کارروائی کے سلسلہ میں نواب اکبر یار جنگ کا جو اس زمانہ میں ہوم سکریٹری تھے سر جیونکس ٹرنچ سے اختلاف ہوگیا اور وہ نواب صاحب سے ناراض ہوگئے تھے۔ اس زمانہ میں کسی انگریز سے بالخصوص اس حالت میں کہ وہ اعلیٰ افسر بھی ہو اختلاف کی جرأت نواب صاحب جیسا صاحب کردار شخص ہی کر سکتا تھا۔ ان دونوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ملکی افسروں نے سر چیونکس کو باور کیا کہ خالد نواب صاحب کا آدمی ہے اور انہی کے ہاں قیام پذیر ہے۔ چنانچہ سر چیونکس نے جو کئی مرتبہ صدر المہام

عدالت نواب لطف الدولہ سے میری سفارش کر چکے تھے۔ ان سے کہا کہ اب میری ملازمت کے معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ یہ صورت حال میرے لئے پریشانی کا باعث تھی‘ لیکن نواب صاحب نے یہ کہہ کر مجھے تسلی دی کہ اب تمہاری ملازمت کا معاملہ کافی آگے بڑھ چکا ہے اس لئے اب انکار تو نہیں ہوسکتا البتہ جس بڑی خدمت کا انتظام زیر غور تھا شاید اب وہ نہ مل سکے۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب نے اپنے اس خیال کا مجھ سے اظہار کیا کہ کسی سب ججی اور فرسٹ کلاس مجسٹریٹ پر پہلے منصرمانہ قائم مقامی تقرر ہوگا اور بعد میں مستقل کر دیا جاؤں گا۔ نواب صاحب کا یہ خیال درست ثابت ہوا اور دو تین منصرمیوں کے بعد ایک سال کے اندر میری ملازمت سب ججی پر مستقل کر دیا گیا تھا۔

حیدرآباد میں تمام عدالتی کارروائی اردو میں ہوا کرتی تھی‘ اس کا اس قدر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ میر عالم خاں (نواب عالم جنگ) جو بعد میں چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ ہوئے‘ انہوں نے اپنی ملازمت کے اوائل میں اپنا ایک فیصلہ انگریزی میں تحریر کر دیا تھا۔ ہائی کورٹ نے نہ صرف اس کو نامنظور کر دیا بلکہ ان کی اس جرأت پر تنبیہ بھی کی۔ اور ہدایت کی تھی کہ وہ فیصلہ دوبارہ اردو میں لکھیں چونکہ میں نے قانون انگلستان میں پڑھا تھا اور یوں بھی میں پنجابی تھا اس لئے اردو میں فیصلہ لکھنے میں مجھے خاصی دشواری تھی۔ مجھے پہلی منصرمی ”لاتور“ میں ملی نواب اکبر یار جنگ نے مجھے کئی ایک سفارشی خطوط ”لاتور“ کے ضلع عثمان آباد کے حکام کے نام لکھ دیئے۔ ان میں سے ایک خط مبارز الدین خاں کلکٹر اور دوسرا حیات الحسن ڈسٹرکٹ جج کے نام تھا۔ بالخصوص ضلع کے ان حکام نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا اور جب اختتام منصرمی پر حیدرآباد واپس لوٹا تو نواب صاحب کے روبرو اپنی اردو سے ناواقفی اور کچھ اپنی نالائقی پر رویا دھویا اور ان سے کہا کہ یہ ملازمت مجھ سے نہ ہوسکے گی۔ اللہ اللہ کس قدر ہمدرد اور شفیق شخص تھا‘ کتنے پیار اور کتنی محبت سے مجھے سمجھایا کہ گھبرانے اور دل برداشتہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر نئے آفیسر پر یہ بات بیتی ہے۔ تم جلد اردو لکھنا سیکھ جاؤ گے اور کام کی نوعیت کو بھی سمجھ جاؤ گے اور کہا کہ میری قانونی انگلش اور اردو لائبریری میرے داماد فضل حق خان کے ہاں ہے‘ تم روزانہ وہاں جا کر دو تین گھنٹے اسٹڈی کر لیا کرو‘ چنانچہ میں وہاں جاتا رہا۔ دو ڈھائی ماہ بعد کچھ مہارت حاصل کر لی ہوگی۔ اس خیال

سے میں نے تمہارے لئے عثمان آباد میں ایک دوسری منصرمی کا انتظام کروالیا ہے۔ تہیہ سفر کے لئے ایک ہفتہ کی مجھے مہلت ملی اور نواب صاحب نے ہر شام کھانا کھانے کے بعد مجھے پڑھانا شروع کیا۔ میری اس تدریس کے زمانہ میں ایک دن مرزا فرحت اللہ بیگ (اردو کے مشہور ادیب اور ہائی کورٹ کے جج) جو اس زمانے میں نواب صاحب کی ماتحتی میں ڈپٹی ہوم سکریٹری تھے۔ نواب صاحب سے ملنے آئے اور جب ہم کو اس حال میں دیکھا تو کہا کہ درس و تدریس ہو رہی ہے۔ تو نواب صاحب نے فرمایا کہ یہ بیچارے ایک دفعہ منصرمی کر کے بہت پریشان ہو کر آئے ہیں اور کافی دل برداشتہ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اس دفعہ ان کو ایسی مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے‘ تو مرزا صاحب نے کہا کہ انہیں میرے ہاں بھی بھجوا دیا کیجئے اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آئندہ ان کو مایوسی نہ ہوگی‘ چنانچہ میں ان کے ہاں بھی جاتا رہا۔ یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی حضرت اماں جان (ام المومنینؓ) سے قریبی عزیز داری تھی اور جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے‘ تو انہوں نے آپ کی نہایت پرتکلف اور شاندار دعوت کی تھی۔

مذکورہ واقعہ سے نواب اکبر یار جنگ کی ہمدردی اور شفقت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

بہرحال جب عثمان آباد گیا تو نواب صاحب کے درس و تدریس کی وجہ سے تقریباً ایک سال تک خوداعتمادی کے ساتھ وہاں کام کرتا رہا۔ میری اس منصرمی کے زمانہ میں نواب صاحب ہوم سکریٹری کے عہدے سے ہائی کورٹ کی ججی پر دوبارہ فائز ہوگئے تھے اور ان کے کورٹ میں میرے صادر کردہ بعض فیصلوں پر ناراضگی سے نگرانیاں کی گئیں تھیں اور جب میں اپنی منصرمی کے اختتام پر حیدرآباد واپس آ کر نواب صاحب سے ملا تو نواب صاحب نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے کام سے مطمئن ہوں‘ اس لئے میں نے چیف جسٹس کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ تمہیں پھر منصرمی پر بھجوا دیا جائے اور دو تین ماہ بعد مستقل کر دیا جائے‘ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کی توجہ اور کوشش سے میرا زمانہ وکالت بھی میری ملازمت کے زمانہ میں محسوب کیا گیا‘ جس کی وجہ سے گریڈ میں بھی اضافہ ہوا۔

اس کے علاوہ بیرسٹر ہونے کی بنا پر میری تنخواہ میں مزید اضافہ منظور کرا دیا۔ جہاں میرا

یہ تقرر ہوا تھا وہاں علاوہ مجسٹریٹ ہونے کے سب رجسٹرار بھی ہوا کرتا تھا اور سب رجسٹرار کو اس کام کا معاوضہ سرکاری رسوم (فیس) کا تیسرا حصہ بھی حکومت کا منظور کردہ تھا۔ اس مد سے بھی مجھے کافی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اگرچہ میں جونیئر آفیسر تھا' لیکن میری تنخواہ اتنی تھی کہ مستقل ہونے پر میں نے اپنی سواری کے لئے شورلیٹ کار خرید لی تھی۔

مجھے جب کبھی چھٹیاں ملا کرتی تھیں' تو میں حیدرآباد جاکر نواب صاحب کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ ان کے ہاں ٹھہرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ اپنے والد کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ اپنے حق کے طور پر جب چاہا جاؤں اور ٹھہروں اور ان کا سلوک بھی شفیق باپ ہی کا ہوتا تھا۔ وہ نہایت کشادہ پیشانی اور محبت کے ساتھ اپنے پاس قیام وطعام کا بہتر سے بہتر انتظام کرواتے۔

ایک مرتبہ میں بجائے ان کے ہاں ٹھہرنے کے حیدرآباد کے ایک معروف ہوٹل ویکا جی میں ٹھہرا' وہاں سے نواب صاحب کے ہاں ملنے گیا۔ بعد ملاقات جب میں اٹھنے لگا تو کہنے لگے کہ کھانا نہیں کھاؤ گے۔ قبل اس کے کہ میں جواب دیتا ان کے کسی عزیز نے کہہ دیا اس دفعہ یہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ یہ بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور کبیدہ خاطری کے ساتھ فرمایا کہ ہاں یہ صاحب بہادر ہیں ہمارا دیسی کھانا ان کو کہاں پسند آتا ہے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر اور ان کے الفاظ سن کر بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے معذرت کی اور کہا کہ اب یہاں سے نہیں جاؤں گا اور کھانا یہیں کھاؤں گا۔ ان کا دل آئینہ کی طرح صاف و شفاف تھا۔ میرے جواب پر ان کی کبیدہ خاطری ایک دم دور ہوگئی اور ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اپنے ڈرائیور کو اسی وقت بھیج کر میرا سامان ہوٹل سے منگوایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم صدر جمہوریہ ہند جو حال ہی میں دہلی میں فوت ہوئے ہیں۔ وہ نواب اکبر یار جنگ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ وہ ایک مرتبہ بحیثیت صدر جامعہ ملیہ دہلی حیدرآباد آئے اور نواب صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ ان دنوں میں بھی نواب صاحب کے ہاں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو اس برآمدے میں ٹھہرایا جو میرے کمرے اور نواب صاحب کے دفتر کے درمیان تھا اور مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں چند دنوں کے لئے ان کے بھائی اور ملک کی ایک عظیم المرتبت شخصیت کے لئے کمرہ منتقل کردوں۔ اس انتظام پر

ڈاکٹر صاحب نے بھی بالکل برا نہ مانا اور وہ کئی دنوں تک اس برآمدے میں ٹھہرے رہے اور مجھ سے نہایت اخلاق اور انتہائی فروتنی سے ملتے رہے۔ اس واقعہ سے دونوں ہستیوں کے اچھے اخلاق اور بلند حوصلگی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ کسی نے اس میں اپنی کوئی سبکی محسوس نہ کی اور ہر دوسرے نے اپنے مہمان کی عزت افزائی کو اپنے نہایت قریبی عزیز پر مقدم رکھا۔

نواب صاحب کو اپنے مہمان کے کھانے پینے کی عادت کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ میری مہمانی کے ابتدائی دور میں اس بناء پر کہ میں مرچ نہیں کھاتا' اس امر کا بالالتزام اہتمام ہوتا تھا اور علاوہ دوسری ڈشوں کے ایک بے مرچ کی ڈش میرے لئے تیار کروائی جاتی اور اپنی طویل ملازمت کے زمانے میں جب بھی حیدرآباد گیا' تو ان کے ہاں ہی ٹھہرا کرتا تھا اور بغیر یاد دہانی کے یہ بے مرچ کی ڈش بھی آیا کرتی تھی۔

پروفیسر ہارون خان صاحب شیروانی میرے عزیز ہیں۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات تھے اور بعد میں معروف تعلیمی ادارے نظام کالج کے پرنسپل ہوکر ریٹائرڈ ہوئے۔ انہوں نے ایک دفعہ شکوہ کیا کہ تم میرے ہاں کبھی نہیں ٹھہرے۔ ان دنوں میں ایک ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا تھا اور پندرہ دن نواب صاحب کی مہمانی میں گذر چکے تھے۔ شیروانی صاحب نے مجھ سے کہا کہ بقیہ پندرہ دن میں ان کے ہاں ٹھہروں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نواب صاحب سے اس کی اجازت لے لیجئے' چنانچہ وہ نواب صاحب سے ملے اور اپنا مدعا بیان کیا تو نواب صاحب نے جواب دیا کہ میں تو مکڑی کے مانند ہوں' ایک جال بنا ہے۔ اس میں مکھی آکر پھنس گئی ہے۔ اب اس کا جال سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ یہ تو ایک مذاق تھا' لیکن پھر بھی شیروانی صاحب کو مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کھانے کی میز پر امیر و غریب یکساں بیٹھا کرتے تھے۔ شام کا کھانا اکٹھا ہوا کرتا تھا۔ کھانا سادہ لیکن بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ خود نواب صاحب بھی وہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ روزانہ کھانے پر آنے والوں میں اگر کوئی کسی دن کسی وجہ سے نہ آتا تو ضرور دریافت کرتے تھے اور جس کا گھر قریب ہوتا تو آدمی بھجوا کر دریافت کرواتے کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ ایسے لوگوں میں سے سمیع میاں کا نام یاد رہ گیا ہے۔ کبھی وہ نہ آتے تو بار بار کہتے کہ

معلوم نہیں کہ وہ آج کیوں نہیں آئے۔

ایک بوڑھا آدمی کافی عرصہ سے نواب صاحب کے ہاں رہا کرتا تھا۔ نواب صاحب اپنے مہمانوں کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ تاہم انسان ہی تھے اور پھر بہت مصروف بھی۔ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب کہ وہ کچھ بیمار تھے اور اپنے کمرہ میں ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس بوڑھے غریب مہمان نے ایک دن نواب صاحب کے ملازم سے شکایت کی کہ میں بیمار ہوں، میرے دانت بھی نہیں ہیں۔ تم نے مجھ جیسے آدمی کو سوکھی روٹی اور باسی سالن دیا ہے، جس وقت وہ یہ شکایت ملازم سے کررہا تھا، اس وقت نواب صاحب اپنے مکان کے بالا خانے پر بیٹھے ہوئے تھے اور یہ شکایت خود اپنے کانوں سے سن لی تھی۔ اس وقت تو نواب صاحب نے کچھ نہیں کہا، لیکن جب کھانے کا وقت آیا اور نواب صاحب کا پرہیزی کھانا آیا اس بوڑھے آدمی کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ تم کو تکلیف پہنچی ہے اور میں نے تمہاری تکلیف کا حال اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔ میاں تم مجھے معاف کردینا انشاء اللہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ تم بیمار ہو میرا یہ پرہیزی کھانا میرے ساتھ بیٹھ کر کھالو۔ اس بوڑھے کو عزت کے ساتھ بٹھایا۔ اس نے بڑے تامل کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نواب صاحب کے حکم کی تعمیل کی کہ پھر آپ کیا کھائیں گے۔ اس کی اس بات کا انہوں نے یہ جواب دیا یہ میرا اپنا گھر ہے۔ میرے لئے کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ ایک عرصہ تک اس بوڑھے کے لئے بھی نواب صاحب کے ہمراہ پرہیزی کھانا پکتا تھا۔

اسی طرح ایک سرپھرا اچھی اچھی ڈگریاں لے کر اور سفارشی خط حاصل کرکے نواب صاحب کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا۔ اس کو یہ خبط تھا کہ وہ ہائی کورٹ کی ججی سے کم ملازمت قبول نہ کرے گا۔ نواب صاحب نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ بات ممکن نہیں۔ لیکن وہ اپنی بات پر مصر رہا۔ نواب صاحب کی موٹر کار پر سارا دن پھرتا رہتا اور نواب صاحب کو عامرہ (گورنمنٹ گیسٹ ہاوس) سے موٹر منگوا کر دفتر جانا پڑتا تھا۔ کئی ماہ وہ آپ کا مہمان رہا۔ ایک مرتبہ کسی وجہ سے ناراض ہوکر اپنا اسباب لے کر احمدیہ جوبلی ہال جا کر ٹھہر گیا۔ جب شام نواب صاحب کو اس کے چلے جانے کا علم ہوا تو اسی وقت خود احمدیہ جوبلی ہال جا کر اور اس سے معذرت چاہ کر اپنے ساتھ واپس لے آئے۔

مولانا محمود الحسن ریاست ٹونک کے رہنے والے ایک جید عالم اور فاضل تھے۔ انہوں نے ایک مستند کتاب **معجم المصنفین** عربی زبان میں بیس جلدوں میں تصنیف کی تھی۔ وہ اٹھارہ سال بطور مہمان نواب صاحب کے پاس ٹھہرے رہے اور اس طویل عرصہ میں ان کو مہمانی اور تواضع خاطری میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ مولانا کو ان کے علم و فضل کی عزت افزائی کے لئے نظام حیدرآباد نے تین سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کیا تھا، جو اس ارزانی کے زمانہ میں بہت معقول رقم تھی، لیکن اس کے باوجود نواب صاحب کے ہاں ہی رہا کرتے تھے۔ کھانے پر نواب صاحب مولانا کو شانہ بشانہ اپنے سیدھے بازو بٹھلاتے اور ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ مولانا بعض مرتبہ ایسی ایسی باتیں بھی نواب صاحب سے کہہ جاتے جو عام حالات میں ناگوار ہوتی تھیں، لیکن کچھ اکرام ضیافت اور کچھ مولانا کے علم و فضل کے احترام میں ان باتوں پر کبھی برا نہ مانا۔

نواب صاحب کی وسیع القلبی کی وجہ سے اختلاف عقائد کبھی بھی مولانا کے احترام و تکریم میں مانع نہ ہوئے۔ محمد صدیق ایک غریب غیور مسلمان میری موجودگی میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بلا تکلف کہا کہ میں اٹاوہ سے تلاش معاش میں آیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ہنر ہے، پارچہ بافی کا فن جانتا ہوں۔ آپ کچھ قرض اور اپنی مِلکی دین دکانوں میں سے ایک دکان کرایہ پر مجھے دے دیجئے۔ جب میرے پاس پیسے آئیں گے تو قرض کی رقم اور دکان کا کرایہ سب ادا کردوں گا۔ نواب صاحب نے بلا تامل اس کی دونوں باتوں کی تکمیل کردی اور اس بات کو بھی بھول گئے۔ تقریباً آٹھ یا نو ماہ بعد یہ شخص نواب صاحب کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور قرض کی رقم اور آٹھ نو ماہ کا کرایہ پیش کردیا۔ نواب صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا۔ تو اس متدین شخص نے ساری بات نواب صاحب کو یاد دلادی۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا میں نے تمہاری امداد کی تھی، تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں آپ کی شہرت سن کر آیا تھا اور اپنی ضرورت پر میں نے دو خواہشوں کا اظہار آپ سے کیا تھا اور آپ نے باوجود مجھ سے ناواقف ہونے کے میری منہ مانگی ضرورت کو پورا کردیا تھا۔ آپ کے اس احسان کا بدلہ میں کیا دے سکتا ہوں۔

یہ ایک واقعہ ہے جس کا میں شاہد ہوں ورنہ کتنے ہی لوگ ہیں، جن کی انہوں نے نہایت

خوش دلی سے مدد کی تھی۔ نامساعد حالات میں بھی اپنے امام وقت کے حکم کی تعمیل کی مثال پیش ہے۔ ایک مرتبہ میں نواب صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب نیر اور مولوی سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت حیدرآباد نواب صاحب کے ہاں آئے اور کہا کہ حضرت صاحب نے چندہ خاص کی تحریک کی ہے اور حکم صادر فرمایا ہے کہ ہر احمدی اس میں ایک ماہ کی تنخواہ دے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ میرے ہاں کوئی روپے نہیں ہیں۔ میری جو تنخواہ ہے اور جائیداد کی تھوڑی آمدنی ہے۔ ان دونوں سے بمشکل میرے اخراجات کی پابجائی ہوتی ہے اور میں مقروض بھی ہوں۔ ان حالات میں اگر میرے لئے استثنیٰ نہیں ہوسکتا ہے تو پھر میری موٹر کار لے جایئے اور اس کو فروخت کر کے میرا چندہ خاص ادا کر دیجئے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات موٹر کار لے گئے۔ موٹر کے اس طرح فروخت ہوجانے کی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک نواب صاحب عامرہ سرکاری گیسٹ ہاؤس کو موٹر میں ہائی کورٹ جایا کرتے تھے اور کافی مدت کے بعد آپ نے دوسری موٹر کار خریدی تھی۔

غلام احمد خاں، نواب صاحب کے بڑے فرزند تھے۔ سنا ہے کہ ان کے لئے ہائی کورٹ کی ججی کے احکامات حکومت ہند کی طرف سے صادر ہو چکے تھے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ان کی وفات گزشتہ ماہ مارچ میں ہوئی۔ ان کی شادی پر نواب صاحب بہت سارے عزیزان اور دوستوں کو اپنے ساتھ قائم گنج (یوپی) لے گئے تھے۔ نواب صاحب کے ڈبے میں علاوہ رفیع الدین، سشن جج ورنگل بھی تھے۔ رفیع الدین صاحب نواب صاحب کے ہم عمر اور لنگوٹیا یار تھے۔ حیدرآباد اور قائم گنج کا طویل سفر ان دونوں کی نہایت بے تکلفی، بلند پایہ اور شائستہ مذاق کی باتوں میں گذرا۔

نواب صاحب کی پہلو دار شخصیت کا ایک اور رخ جو مجھ پر واضح ہوا۔ نواب صاحب کے ماموں اور ان کی برادری کے دیگر افراد نے تو یہ کہہ کر اس شادی میں شرکت سے انکار کر دیا کہ غلام اکبر خاں (اکبر یار جنگ) کافر ہے۔ اس لئے ان سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا جائیز نہیں ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ مولانا محمود الحسن صاحب بھی قائم گنج گئے تھے۔ وہ ٹونک کے شاہی خاندان سے عزیز داری رکھتے تھے اور ٹونک والوں کی قائم گنج والوں سے رشتہ داری تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کے علم و فضل کا وہاں شہرہ تھا۔ چنانچہ مولانا صاحب، نواب صاحب کے

ماموں اور ان کی برادری کے دیگر افراد سے ملے اور ان سے کہا کہ میں خود بھی احمدی نہیں ہوں اور ان کے عقائد سے میرا شدید اختلاف ہے۔ اس کے باوجود میں غلام اکبر خاں کی نیکی اور بہترین اخلاق سے متاثر ہوں اور اس وجہ سے اس شادی میں شرکت کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ان کے اس افہام و تفہیم کے نتیجہ میں نواب صاحب کے ماموں اور برادری کے سارے افراد نے شادی میں شرکت کی اور وہ بڑی دھوم دھام سے شادی رچائی۔ اس تقریب میں نواب صاحب نے مجھے بھی سرحدی پٹھانوں کے لباس کا مکمل جوڑا دیا تھا، جو پٹھان شادی بیاہ کے موقع پر زیب تن کرتے ہیں۔

اس زمانے میں جبکہ میں محمد آباد بیدر میں تھا۔ نواب صاحب اپنے بچوں اور اپنے گہرے دوست رفیع الدین صاحب کے ساتھ آئے اور میرے ہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ بیدر کے تخمی آم بہت مشہور ہیں اور آنے کا ایک مقصد آم کھانا تھا۔ میں نے اپنی توفیق کے مطابق مناسب اور مہمانی کا اچھا اہتمام کیا تھا اور وہ میری مہمان داری سے بہت خوش خوش واپس لوٹے۔ میں نے صحن میں ایک شامیانہ لگوادیا تھا۔ اس میں مع اپنے بچے اور احباب کے باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور ان کا اپنے گھر پر بھی یہ دستور تھا اور میرے ہاں بھی اس کو برقرار رکھا گیا اپنے غیر از جماعت احباب اور ملنے والوں کے لئے یہ کہہ کر علیحدہ جائے نماز بچھواتے تھے۔ یہ بات ان کے اعلیٰ اخلاق کی ایک مثال ہے۔

نواب صاحب کو اپنی عزت نفس اور وضع داری کا اس قدر خیال تھا کہ زندگی بھر نہ کسی بڑے آدمی کی خوشامد کی۔ اور نہ کسی کے ہاں کوئی حاجت لے کر گئے، جب وظیفہ پر علیحدگی کا وقت آیا تو نواب سر اکبر حیدری و نواب حیدر نواز جنگ بہادر حکومت حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اگر نواب صاحب خود خواہش کریں تو ان کی ججی کی مدت میں مزید توسیع کر دی جائے، لیکن نواب صاحب نے ملازمت کے آخری مہینوں میں وزیر اعظم سے اس خیال سے ملنا بند کر دیا تھا کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ ملنے کا مقصد شاید توسیع ملازمت کی خواہش ہو۔

بہر حال ۱۹۳۷ء میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدگی پر نواب صاحب نے وکالت شروع کی اور اپنی غیر معمولی دماغی صلاحیت و قابلیت قابل رشک محنت و دیانت اور فرض شناسی کی وجہ

سے وہ مقام حاصل کرلیا جو شاذ ہی دوسروں کو ملا ہو۔ بارہا وہ سرتیج بہادر سپرو اور دیگر آل انڈیا شہرت کے وکلاء کے آگے عدالت میں پیش ہوئے اور اکثر مقدمات میں کامیاب ہوئے۔ ان کی وکالت شروع کرنے کے چار ماہ بعد میں حیدرآباد گیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے بہت لال سرخ اور صحت مند نظر آئے اور ان کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس کا ان سے ذکر کیا تو ہنس کر فرمانے لگے۔ میاں مجھے پہلے تنخواہ ہی کیا ملا کرتی تھی۔ وہ تو ایک سوکھے ہوئے گھاس کے مانند تھی۔ اب تو گھوڑے کو (وکالت کی صورت میں) ایک بڑا وسیع اور شاداب کنج (مرغزار) مل گیا ہے۔ نرم اور ملائم گھانس ملتا ہے اور وہ اپنی چاہت کے مطابق کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ گذشتہ ۴ ماہ میں ۷۲ ہزار روپے کمایا ہوں۔ یعنی ماہوار ۱۸ ہزار روپے اور اس زمانے میں روپے کی جو قیمت تھی اس کے حساب سے آج کے ۵۰، ۶۰ ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ چنانچہ ملازمت کے دوران آمدنی اور خرچ کے درمیان تفاوت کی وجہ سے جو قرض تھا وہ انہوں نے ادا کردیا اور فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں بے دریغ روپے خرچ کئے۔ واپسی میں قادیان گئے اور جو بچ گیا تھا وہ وہاں خرچ کر آئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی سال تک وکالت کی اور آمدنی اسی طرح روزانہ چلتی رہی جس قدر آمدنی ہوتی تھی اس کا بہت بڑا حصہ امداد میں خرچ کرتے جس میں بلالحاظ مذہب وملت اور فرقہ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ پائی پائی کا حساب کر کے اپنا حصہ آمد ادا کیا کرتے تھے اور دیگر طوعی جماعتی چندوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ ساری زندگی بےفکری سے بے نیاز رہے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھا۔

نواب صاحب کا حکومت اور وہاں کی سوسائٹی میں اعلیٰ قابلیت اور بے داغ زندگی کی وجہ سے جو اثر و رسوخ تھا وہ ان کے ملازمت سے علیحدہ ہوجانے کے بعد بھی ویسا ہی قائم رہا۔ ہائی کورٹ کے ججوں کے لفٹ میں دوسری منزل پر جانے کی ان کو خصوصی اجازت تھی اور ان کی عمر کی وجہ سے عدالت میں کرسی پر بیٹھ کر مقدمات میں بحث کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس اثر کی بناء پر ان کی وکالت کے زمانے میں بھی میں نے جب کبھی اپنا تبادلہ چاہا اور جہاں بھی چاہا ان کی حسن توسط سے کروالیا۔ یہی کیا کسی اور معاملہ میں بھی مجھ سے کسی قسم کی اخلاقی امداد سے دریغ نہ کیا۔ وہ کسی کی حاجت روائی میں اور خدمت کر کے ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔

میں جب ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوکر محبوب نگر سے حیدرآباد آگیا اور اپنے عزیز پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے پاس گیا اور نواب صاحب سے ملنے گیا تو فرمانے لگے کہ کسی دن میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ تو میں نے عرض کیا کہ یہ سب کھانے جو ابتدائے ملازمت سے آج تک مجھے ملتے رہے ہیں وہ سب آپ ہی کے تو تھے۔ بہر حال کھانے کے معاملے میں کسی کی معذرت قبول نہیں کرتے تھے، چنانچہ میں ایک مقررہ دن کھانے پر گیا۔ ان کا اصول تھا کہ مہمان خصوصی سے تعلق رکھنے اور ملنے والوں کو بھی دعوت میں مدعو کیا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ ان کے لڑکے غلام احمد خاں اور ان کے داماد سردار فضل حق خاں تھے۔

۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء میں دعوت کیا تھی اس دن ہمارے لئے مصیبت بنی رہی۔ بار بار ہم کو طلب کرتے اور کہتے کہ اب تک انتظام شروع نہیں کیا گیا۔ خالد کو بھوکا رکھو گے؟ اپنے میز خانے میں مختلف نوع کی پکی ہوئی کھانوں کے علاوہ شہر کے اعلیٰ ریسٹورنٹوں سے جہاں کوئی اسپیشل کھانا ملتا تھا وہ بھی منگوایا گیا۔ اس قسم کا اہتمام دوسروں کی دعوت کے لئے بھی ہوا کرتا تھا۔ غرض یہ کہ بڑے اہتمام کے ساتھ یہ دعوت ختم ہوئی تھی اور جب میں حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگا تو اپنے بچوں اور دامادوں کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن بھجوایا۔ ان کا یہ سلوک کس قدر پیارا تھا۔

مجھے اکثر یہ خیال تڑپاتا ہے کہ وہ زمانہ کس قدر اچھا اور لوگ کیسے محبت شعار، ملنسار، بلند اخلاق شائستہ اور بے لوث ہمدردی کرنے والے تھے۔ ان لوگوں میں، میں نے نواب اکبر یار جنگ کی شخصیت کو منفرد اور ممتاز پایا۔ اگرچہ کہ بہت لمبا زمانہ گذر چکا ہے، لیکن ان کی یاد ان کے حسن سلوک، ان کے تعلق خاطر اور محبت کو نہ میں نے بھلایا ہے اور نہ بھلاسکتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل فرمائے۔ آمین۔

ورق تمام ہوا مدح اور باقی ہے تاہم میں اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اقبال نے حیدرآباد ہی کے اپنے ایک ممدوح سریمین السلطنت مہاراج کشن پرشاد کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا اس کے آخری شعر کو اپناتے ہوئے کہتا ہوں ۔

شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے   مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کا واقعہ

مکرم اکبر یار جنگ بہادر اپنی قبولیت احمدیت کے بعد جو انہوں نے خلافت اولیٰ کے عہد میں کی تھی۔ خلیفۃ المسیح اولؓ کی وفات کے بعد وہ پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملنے کے لئے لاہور پہنچے۔ ان کو معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی صاحب اور دوسرے بڑے بڑے علمائے احمدیت نے انجمن کی مانگ کرتے ہوئے اپنی ایک الگ جماعت لاہور میں قائم کرلی ہے چنانچہ بعد میں یہ جماعت لاہوری جماعت کے نام سے یا پیغامی جماعت کے نام سے موسوم ہوئی۔

مکرم اکبر یار جنگ بہادر نے لاہور پہنچ کر محمد علی صاحب اور دوسرے علمائے لاہوری جماعت سے تبادلہ خیال کیا اور ان کے موقف سے مطمئن نہیں ہوئے۔ باوجود مولانا محمد علی صاحب کے روکنے کے آپ قادیان تشریف لائے جب آپ نے خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملاقات فرمائی تو آپ بے حد مایوس ہوگئے۔ اتنا کم عمر لڑکا جس کی عمر ۲۵‘۲۶ سال بھی نہیں ہے اور وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں ہے‘ بلکہ اس نے میٹرک بھی کامیاب نہیں کی وہ کیسے منصب خلافت اور اتنی بڑی جماعت کی سربراہی کرسکتا ہے۔ انہوں نے ارادہ کرلیا کہ عصر کی نماز کے بعد وہ قادیان سے واپس بغیر بیعت چلے جائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے عصر کی نماز مسجد مبارک میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی امامت میں ادا کرنے کے بعد وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے تب حضور خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے درس دینے کے لئے اپنا رخ بدلہ اور درس دینا شروع کیا۔ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے درس دینا شروع کیا اور مجھ پر کشفی حالت طاری ہوگئی۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک نورانی چہرہ جو حضرت مسیح موعودؑ کا تھا‘ جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے پیچھے نمودار ہوا۔ اور آہستہ آہستہ وہ نور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے وجود میں داخل ہوتے ہوئے تحلیل ہوگیا۔ نواب صاحب مزید فرماتے ہیں کہ درس ختم ہونے کے ساتھ ہی ان پر کشفی حالت ختم ہوگئی اور اس وقت نواب صاحب درس ختم ہونے کے ساتھ ہی خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے بیعت کر کے خلافت ثانیہ سے منسلک ہوگئے۔

وزراء اور رؤسائے حیدرآباد کا اجتماع اور ضیافت

محترم نواب اکبر یار جنگ صاحب بہادر و سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کی ملازمت کی توسیع سے متعلق ایک اعجازی نشان کا ذکر اس کتاب میں گذر چکا ہے۔ جناب نواب صاحب یوپی کے ضلع فرخ آباد کے قصبہ عثمان گنج کے اصل باشندہ اور افغانوں کے آفریدی قبیلہ کے ایک معزز فرد ہیں اور ایک عرصہ سے حیدرآباد میں بہ سلسلہ ملازمت اقامت کرتے ہیں۔ آپ کی قانونی قابلیت مسلمہ ہے۔ قانون دان ہونے کے علاوہ آپ دینی علوم کے ماہر‘ اخلاقِ فاضلہ میں نمونہ کے انسان اور مخلص خادم سلسلہ ہیں۔

۱۹۳۵ء کے قریب جب میں حیدرآباد میں تبلیغی اغراض کے تحت نواب صاحب محترم کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا تو ایک دن آپ نے ریاست کے معززین کو مدعو فرمایا۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد اور بہت سے دوسرے وزراء و امراء دعوت میں شریک ہوئے۔ جناب نواب صاحب نے سب معززین سے جن میں شاہی طبیب جناب حکیم مولوی مقصود علی صاحب بھی تھے۔ میرا تعارف کرایا اور میرے متعلق یہ ذکر کیا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں اور قرآنی حقائق و معارف کے متعلق اچھی واقفیت رکھتا ہوں۔ اگر کوئی دوست قرآن کریم کے متعلق کوئی استفسار کرنا چاہیں تو فرمالیں۔

اس موقع پر حکیم مولوی مقصود علی صاحب نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ سورہ الرحمان میں فبای الاء ربکما تکذبان کے تکرار میں کیا حکمت ہے۔ سب حاضرین نے اس استفسار پر خوشی کا اظہار کیا۔ خاکسار نے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب کے لئے توجہ کی اور سوال کا جواب حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ ذیل میں اس جواب کا خلاصہ تحریر کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور قانون قدرت اس کا فعل ہے۔ گویا قرآن کریم خدا تعالیٰ کی قولی کتاب ہے اور قانون قدرت اس کی فعلی کتاب اور قول کی صداقت کے ثبوت کے لئے بہترین شہادت فعل سے ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

جب ہم قرآن کریم کی قولی کتاب کے مقابل پر خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صفات وافعال الٰہیہ کے ظہور میں ہر آن تکرار کا سلسلہ نظر آتا ہے اور اگر اس تکرار کا فقدان فرض کیا جائے تو سلسلہ موجودات کا فقدان لازم آتا ہے اور فنا اور عدم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی وجود کی تخلیق میں تکرار کے مسلسل نظارے سامنے آرہے ہیں اور پھر انسانی جسم کے اندر کی باتوں کا بار بار تکرار اور صفت خَلق کے ذریعہ سے آیا ہے۔ ایسا ہی انسانی جسم میں دانتوں، پسلیوں، آنتوں اور انگلیوں وغیرہ کا بھی تکرار ہے۔ اسی طرح انسان کی ہر قوت اور حِس اپنے وظیفہ کو تکرار کے ساتھ عمل میں لا رہی ہے۔ یہ تکرار بے فائدہ اور عبث نہیں، بلکہ اپنے اندر بے شمار فوائد اور حسن کے پہلو رکھتا ہے۔ درختوں کے پتوں، پھولوں اور پھلوں کے تکرار سے یقیناً ان میں نفع اور خوبصورتی کی زیادتی ہوتی ہے۔ گلاب کے پھول کی ایک ایک پتی اپنے تکرار کی وجہ سے ہی خوشنما اور دلفریب نظر آتی ہے۔

پس جب خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب میں تکرار سے انواع واقسام کے محاسن پیدا ہوتے ہیں اور جس جگہ کسی عضو یا حصہ میں تکرار نہیں پایا جاتا، اس کے فعل میں تکرار ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً انسانی جسم میں بالوں اور دانتوں وغیرہ میں تکرار ہے، مگر منہ، زبان، سر، دل اور جگر کے عضو میں تکرار نہیں پایا جاتا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعضاء کے افعال میں تکرار پایا جاتا ہے۔

''سورہ رحمان'' پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فبای الاء ربکما تکذبان کے الفاظ اکتیس دفعہ وارد ہوئے ہیں۔ یہ سورہ مبارکہ ان آیات سے شروع ہوتی ہے:

الرحمن o علم القرآن o خلق الانسان علمه البيان o الشمس والقمر بحسبان o والنجم والشجر يسجدان o والسماء رفعها ووضع الميزان الا تطغوا فى الميزان o واقيموا الوزن بالقسط ولا تخسروا الميزان o والارض وضعها للانام o فيها فاكهةٌ والنخل ذات الاكمام والحب ذوالعصف والريحان o فباى الآء ربكما تكذبان o

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اس سورۃ کا آغاز خدا تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے اسم الرحمٰن سے فرمایا گیا ہے اور رحمٰن کا فیض اس رحم اور رحمت کے فیوض سے تعلق رکھتا ہے جن کا ظہور

بغیر کسی محنت، درخواست اور دعا کے خود بخود بلا کسی معاوضہ اور مبادلہ کے ہوتا ہے۔ اور اگرچہ صفت رحمانیت کا ظہور انواع واقسام کی مخلوقات میں ہو رہا ہے لیکن اس سورۃ میں رحمانیت کے اس افاضہ کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، جس کا تعلق انسان سے ہے۔ اس افاضہ کے ذریعہ سے اس کو قانون شریعت کا علم دے کر اس قانون کا حامل بنایا گیا ہے تا ایک طرف اُسے اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہو اور دوسری طرف مخلوقات کے ساتھ اس کے تمدنی ومعاشرتی تعلقات متوازن استوار ہوں اور وہ خدا تعالیٰ کی کامل محبت اور اطاعت اور عبادت سے اس کی خلافت کبریٰ کے منصب جلیل پر فائز ہو اور ان کا ہمدرد ومحسن ہونے سے مخلوق کی نمائندگی اور نیابت میں خلافت صغریٰ کی عزت وبرتری بھی حاصل کرے۔ اور آیت بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن کی رو سے اپنے خالق کا مسلم اور دلی فرمانبردار اور مخلوق کے لئے محسن اور دلی خیر خواہ بنے۔ انسان کو مخدوم العالمین ہونے کا شرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ معبود العالمین خدا کو اس کی شان الوہیت کے ہر مرتبہ میں واحد لاشریک یقین کرے اور اعتقادی اور عملی لحاظ سے اس یقین پر استوار ہو اور انفسی اور آفاقی طور پر اللہ تعالیٰ کی بے نظیر اور بے انتہا ذات کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔

انسان کے کفر وشرک یا فسق وفجور میں مبتلا ہونے کا اصل باعث اس کی علم صحیح سے محرومی ہے اور یہی جہالت کی ظلمت وتاریکی ہے جس سے انسان اپنی ہوا وہوس میں مبتلا ہو کر افراط وتفریط کی کجی اختیار کر لیتا ہے اور اعتدال سے بھٹک جاتا ہے۔ پس انسان کی اعلیٰ استعدادیں عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحمانی فیض سے علم صحیح اور اس کے حصول کے سامان عطا فرماتا ہے۔ ایک طرف اس میں علم حاصل کرنے کی قابلیت ودیعت کی جاتی ہے اور دوسری طرف معلم کی حیثیت میں اسے قوت بیانیہ اور ملکہ تقریر عطا کرتا ہے۔ یہ انسان کا ہی خاصہ ہے کہ وہ جو کچھ سیکھتا ہے اپنی قوت بیانیہ سے ہزار ہا دوسرے لوگوں کو سکھا سکتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے انبیاء وحی الٰہی سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ لوگ بھی علم صحیح سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

سورہ رحمان میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیہ کے فیوض کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔

انسان کی ابتدائی ضروریات عمومی رنگ میں چھ سمجھی جاتی ہیں۔ یعنی ماکولات، مشروبات، بول وبراز، ہوا اور نیند۔ ان ضروریات کے پورا نہ ہونے پر انسان تکلیف محسوس کرتا ہے، بلکہ انسانی زندگی کا قیام ان چیزوں پر ہے اور ان کی بار بار حاجت اور ضرورت پیدا ہوتی ہے اور وہ ہستی جو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ابتدائی طور پر مسبب الاسباب ہے۔ ہر دم شکریہ کی مستحق ہے اور اگر اسباب زیست پر غور کیا جائے خواہ وہ اسباب عناصر میں سے ہوں یا موالید سے یا اجرام سماویہ میں سے، تو معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات کا یہ تمام سلسلہ اسی منبع سے نکلا ہے جو ذات باری تعالیٰ ہے اور کائنات کی اصل علت اور سبب ہے۔ انسان جوں جوں معرفت کی نگاہ سے ان چیزوں پر غور کرتا ہے، اس پر راز منکشف ہوتا جاتا ہے اور علل و معمولات کا تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ پر ہی مبنی ہوتا ہے اور عالمین کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کی شان کا آئینہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیوض کے بے پایاں سمندر کو محبوب نگاہیں اس طرح بھی دیکھ سکتی ہیں کہ مثلاً ایک مخیرّ اور امیر آدمی لوگوں کو ایک عام ضیافت پر مدعو کرے اور اپنے سینکڑوں خدام کے ذریعہ دسترخوان پر انواع و اقسام کھانے چنے جانے کا انتظام کرے۔ اس وقت بے شک دسترخوان پر کھانا خدام کھلائیں گے اور مختلف نعماء سے مدعوین کو سیر کریں گے اور بظاہر ان ہی کا احسان مہمانوں پر ہوگا اور وہ قابل شکریہ بھی ہوں گے لیکن اگر اصل میزبان جو مہمانوں کو بلانے والا ہے دعوت کا انتظام نہ کرتا اور ان سینکڑوں خدام کو کھانا کھلانے پر مقرر نہ کرتا تو کوئی مہمان بھی کھانا نہ کھا سکتا۔ اس صورت میں اگر ضیافت کھانے والے صرف خدام کا شکریہ ادا کر کے ہی چلے جائیں اور اصل محسن اور میزبان کا شکریہ نہ ادا کریں تو یہ طریقہ یقیناً احسان شناسی کے منافی ہوگا۔

پس کامل درجہ معرفت کا یہ ہے کہ مخدوم اور خدام محسن اور احسانات، منعم اور نعماء میں فرق کو شناخت کیا جائے اور ان فیوض کو بھی جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت کے ماتحت حاصل ہوتے ہیں اور جن کے حصول میں بہت سے درمیانی اسباب و وسائط اور کوشش اور جدوجہد کا دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقین کیا جائے اور اپنی نگاہ کو اسباب قریبہ سے آگے لیجا کر خالق الاسباب کی طرف اٹھایا جائے۔

سورہ رحمان میں قرآنی علوم میں سے اس حصہ کی طرف جو روحانی فیوض سے تعلق رکھتا ہے خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ اس میں آیت **الشمس والقمر بحسبان** میں شمسی اور قمری مہینوں کو بطور گنتی اور حساب کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے، جس کی مزید تشریح سورۂ یونس کی آیت **ھو الذی جعل الشمس ضیاء** ......الخ میں کی گئی ہے۔ قمری مہینے ۲۹ یا ۳۰ دن کے ہوتے ہیں۔ اور شمسی مہینہ میں ۳۰ یا ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ گویا گنتی کے اعتبار سے مہینہ کی تکمیل ۳۱ کے ہندسے میں ہے اور آیت **فبای الاء ربکما تکذبان** بھی اس سورہ مبارکہ میں ۳۱ بار دہرائی گئی ہے۔ یہ تعداد اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کے رحمانی فیوض کا جو انسان کو متواتر اور بار بار حاصل ہوتے ہیں نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے اور انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ خدا جس نے اپنے رحمانی افاضات سے یہ نعماء تمہارے لئے پیدا کی ہیں جو تمہارا محسن آقا اور رب العالمین ہے اور اس نے تمہارے لئے جہانوں کے ذرہ ذرہ کو بطور فیوض ربوبیت تمہاری پرورش ترقی اور تکمیل کے لئے لگا رکھا ہے۔ کیا اس کی نعمتوں کی ناشکرگزاری کرو گے اور ان کو جھٹلاؤ گے۔ یہ نعمتیں تمہیں ہر آن مستفید اور متمتع کر رہی ہیں اور برکت اور فیوض کے ان دروازوں کے بند ہونے سے تمہاری زندگی ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ان حالات میں تمہارا ان نعمتوں کو جھٹلانا سراسر مجنونانہ فعل ہے۔

فبای الاء ربکما تکذبان کے بار بار تکرار سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت خوابیدہ کو بیدار کیا ہے، کیونکہ تکرار میں بھی ایک قوت موثرہ پائی جاتی ہے۔ مصفےٰ پانی کا کنواں یا چشمہ نکالنے کے لئے بھی پانچ یا دس ہاتھ کھدوائی کرنی پڑتی ہے۔ کبھی پندرہ یا بیس ہاتھ کھدوائی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح انسانی فطرت کو بیدار کرنے کے لئے کبھی ایک دفعہ کی تلقین کافی ہو جاتی ہے کبھی دو دفعہ اور کبھی بار بار تکرار کی ضرورت پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں اس آیت کا اکتیس دفعہ تکرار کر کے ماہ کامل کے ایام کی طرح مکمل طور پر فطرت انسانی کو ابھارنے کا طریق اختیار کیا ہے اور انسان کو رحمانی فیوض کے ماتحت نعماء کے لئے شکر ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس موقع پر میں نے **رب المشرقین و رب المغربین** کی تشریح کرتے ہوئے اس

بات کا بھی ذکر کیا کہ دو مشرقوں اور دو مغربوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اولیٰ اور بعثتِ ثانیہ کے زمانہ کے مشرق اور مغرب کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

میرے اس جواب پر حکیم مقصود علی صاحب نے اطمینان اور دوسرے حاضرین نے مسرت کا اظہار کیا اور مجلس کھانے کے لئے برخاست ہوئی۔ کھانے کے بعد نواب صاحب محترم کی کوٹھی برآمدہ میں مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب وزیر اعظم نے سورہ الم نشرح کی آیت ان مع العسر یسرا ان مع العسر یسر ا میں تکرار اور العسر کو دونوں دفعہ الف، لام کے ساتھ اور یسر کو بغیر الف ، لام کے ذکر کرنے کے متعلق بھی استفسار کیا، جس کا تفصیلی جواب خاکسار نے حاضرین مجلس کے سامنے عرض کیا۔

متشرع مخالف کی کوشش کہ کہیں حسرت نہ رہ جائے

یہ وہ زمانہ تھا کہ احمدیت کے مخالف علماء نے تحریر وتقریر کے ذریعہ سے احمدیت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے اپنی تمام تر طاقتیں اور صلاحیتیں وقف کر رکھی تھیں اور ہر مذہبی اور سیاسی پلیٹ فارم پر احمدیت کا گریبان تھا اور علماء کے ہاتھ تھے۔ یہ علماء بزعم خود اس یقین کی حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ احمدیت اب مٹا ہی چاہتی ہے۔ اور طرہ یہ کہ ہر وہ شخص جو کسی مذہبی درسگاہ سے فعل فعلوا کی گردان کر کے نکلتا تھا یہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے پہلوں نے پورا زور نہیں لگایا اور انہیں دلائل نہیں سوجھے، جن کے بل پر احمدیت کو پچھاڑا جاسکتا ہے۔ اور وہ اپنی طرف سے پورا زور لگاتا اور احمدیت کے خلاف زہر افشانی میں پہلوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔

لیکن چونکہ یکے بعد دیگرے ایسی تمام کوششیں بے سود ہوتی چلی گئیں اور کاروان احمدیت اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ اور ہر بستی اور قریہ سے نئے نئے مسافر اس کارواں میں شامل ہوتے چلے جارہے تھے۔ اس لئے معاندین نے اپنے بودے پن کو محسوس کر کے نئی نئی چالیں اختیار کرنی شروع کر دی تھیں اور انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی تحریرات میں کتر وبیونت کرنے میں بھی شرم محسوس نہ کی۔ اس خاص فن میں جن لوگوں کو ید طولیٰ حاصل رہا ان میں حیدرآباد (دکن) کے الیاس برنی صاحب کا نام سرفہرست ہے جن کی تصانیف کو تحریف و

تبدیل کا شاہکار کہا جاسکتا ہے اور شرافتِ انسانی چاک گریباں ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر اخلاقی طور پر جب انسان گراوٹ اختیار کرتا ہے تو اسفل السافلین میں چلا جاتا ہے۔

اسی سرزمین حیدرآباد دکن میں ہمارے ایک نہایت مخلص احمدی بزرگ جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر مرحوم کی کوٹھی میں ایک شخص سالہا سال مقیم رہا جو احمدیت کا شدید مخالف تھا اور زمرۂ علماء میں اپنے آپ کو شمار کرتا تھا اور لطف یہ ہے کہ احمدیت کا مخالف ہونے کے باوجود وہ نواب صاحب کی دیوڑھی میں سالوں پڑا رہا اور آپ اس کی پرورش بھی کرتے رہے۔ کیونکہ آپ بڑے فراخدل انسان تھے۔ اس غیر احمدی ملا کا نام محمود الحسن ٹونکی تھا۔ افغانی انسان ہونے کی وجہ سے بڑا وجیہہ اور بلند قامت انسان تھا۔ متشرع داڑھی رکھتا تھا اور ملا کہلاتا تھا۔

اسی ملا نے ''ختم نبوت'' کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو احمدیت کے خلاف تھی اور اس میں اس نے اپنا پورا زورِ علم وقلم صرف کیا۔ لیکن وہ اس کتاب کو شائع نہ کر سکا کیونکہ اس کے پاس طباعت واشاعت کے اخراجات نہ تھے۔ وہ اپنا مسودہ لے کر حضرت نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ یہ کتاب میں نے احمدیت کے خلاف لکھی ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے میرے پاس اخراجات نہیں ہیں۔ یہ کتاب بڑے بلند پایہ دلائل ومضامین پر مشتمل ہے۔ اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ شائع ہوسکتی ہے۔ اس کے اخراجات کا اندازہ پانچ سو روپے ہے۔ حضرت نواب صاحب نے کتاب کو ملاحظہ فرمایا اور پانچ سو روپے اس شخص کے حوالے کر دئے!

حیدرآباد کی جماعت احمدیہ کے احباب کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں سخت تعجب ہوا اور طبعاً صدمہ بھی پہنچا۔ اس لئے کہ جماعت میں نواب صاحب کے خلوص وتقوے کی بنا پر ایک بلند مقام حاصل تھا۔ بعض احمدی ایسے تھے جو اسے محض ایک افواہ سمجھتے تھے اور یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ نواب صاحب مخلص انسان احمدیت کے ایک شدید معاند کی اس قسم کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔ لیکن جنہیں یقین کی حد تک اطلاعات بہم پہنچ چکی تھیں، وہ اس افواہ کو انتہائی رنگ دیتے تھے۔

آخر یہ طے ہوا کہ ان شکوک وشبہات کے ازالہ کے لئے یا واقعہ کی تصدیق کے لئے خود حضرت نواب صاحب سے دریافت کیا جائے۔ چنانچہ ایک وفد ترتیب دیا گیا جو مقامی

جماعت کے معززین پر مشتمل تھا لیکن بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ یہ الزام اتنا بڑا سنگین تھا اور ادھر نواب صاحب مرحوم کی شخصیت کی یکجائی مسلمہ تھی اور نواب صاحب کی مذمت میں الزام کو پیش کرنا بڑی جرأت کا کام تھا لیکن دوسری طرف اس سے بھی بڑی مشکل درپیش تھی۔ اور وہ یہ کہ نہ صرف احباب جماعت میں کئی قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں بلکہ جماعت کے مخالفین بھی طعنے دینے لگے تھے۔ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اصلیت معلوم کی جائے۔

چنانچہ وہ وفد کافی تامل کے بعد حضرت نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وفد کے اسپیکر نے جھجکتے جھجکتے ایک تمہید باندھ کر اس افواہ کا اس رنگ میں ذکر کیا جن میں نرمی اور ملائمت تھی تا کہ نواب صاحب کی طبع نازک پر گراں نہ گذرے۔

نواب صاحب نے یہ سن کر بلا تامل بڑے وثوق سے فرمایا کہ آپ لوگوں تک جو اطلاعات پہنچی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ اور میں نے ہی اس کتاب کے اخراجات طباعت و اشاعت کے لئے پانچ سو روپے کی رقم اس ملا کو دی ہے۔

حضرت نواب صاحب کی طرف سے اس واقعہ کی تصدیق حقیقتاً ایک ایسا مرحلہ تھا کہ وفد کے اراکین سناٹے میں آگئے اور ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے۔ اور ان کے دلوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ افواہ واقعہ بن چکی تھی اور واقعہ خود نواب صاحب کی طرف سے تصدیق کیا جا چکا تھا۔ اور وفد کے اراکین پر حزن و ملال اور یاس کی سی کیفیت طاری تھی۔ اور ہر شخص بت بنا بیٹھا تھا۔

نواب صاحب نے فرمایا: آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ فرق محض نقطہ نگاہ کا ہے۔ وہ ملا ایک عرصہ تک اس کتاب کا مواد جمع کرتا رہا۔ اس نے بڑی ہی محنت کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا۔ اور جب وہ کتاب کا مسودہ میرے پاس لایا تو اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ملا اس یقین پر قائم ہے کہ اس سے پہلے جن لوگوں نے احمدیت کے خلاف کوئی لٹریچر شائع کیا ہے وہ پورا زور نہیں لگا سکے اور مضبوط دلائل نہیں دے سکے' ورنہ احمدیت کا وجود کب کا عدم میں چلا گیا ہوتا اور وہ ملا یہ سمجھتا تھا کہ اگر اس کی یہ کتاب شائع ہو جائے تو مذہبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے گا اور احمدیت کے لئے اس تختہ زمین پر کوئی جائے نہ رہے گی اور چند

سنتے ہی کہہ دیں گے کہ احمدیت کا وجود اپنے خاتمہ کے ساتھ تاریخ کے حوالہ ہو جائے گا۔

نواب صاحب نے مزید فرمایا یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ اس ملا نے میری ہی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر اور میرا ہی پروردہ ہو کر احمدیت کے خلاف ایک کتاب لکھی اور پھر اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اس کتاب کی اشاعت کے اخراجات کے لئے بھی میرے ہی پاس درخواست لے کر حاضر ہوا۔ اس زعم باطل کے ساتھ کہ اگر اس کی یہ کتاب شائع ہو جائے تو احمدیت کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ سکتا ہے۔

میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اللہ تعالیٰ کے وہ تمام وعدے میری آنکھوں کے سامنے آگئے جن میں احمدیت کے شاندار عروج اور بے مثال وسعت کی پیشگوئیاں موجود ہیں اور حضرت مسیح موعودؑ کی وہ تمام تحریرات میرے سامنے آگئیں' جن میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عظیم الشان پیشگوئیاں بیان ہوئی ہیں اور احمدیت کی گذشتہ تاریخ کے وہ تمام اوراق میری نگاہوں کے سامنے آگئے کہ کس طرح بڑے بڑے علماء احمدیت کے مقابل پر اٹھے اور خائب و خاسر ہوئے اور بڑی بڑی یلغاروں کے منہ پھر گئے۔

نواب صاحب نے فرمایا: یہ تمام کیفیات بیک وقت میرے سامنے آگئیں۔ تب میرے ایمان و یقین نے اس ملا کی جہالت پر ایک قہقہہ لگایا اور میں نے پانچ سو روپے اس کے حوالے کر دیئے محض اس خیال سے کہ اگر اس ملا کی کتاب اس لئے شائع نہ ہو سکی کہ اس کے پاس اخراجات نہیں تھے تو یہ ساری عمر اس حسرت میں جلتا رہے گا کہ اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو احمدیت کے لئے فنا کا پیغام بن جاتی اور یہ جس مجلس میں بیٹھے گا وہاں یہی ذکر کرے گا کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ جہاں دنیا بھر کے مخالف علماء اپنی اپنی حسرت نکال چکے ہیں اور احمدیت کے مقابل پر ناکام ہو چکے ہیں وہاں اس ملا کے دل میں بھی حسرت نہ رہ جائے۔ وہ حقیر جرثومہ احمدیت کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ نواب صاحب کی اس ایمان افروز دعوت مبارزت سے محظوظ ہو کر اراکین وفد واپس چلے گئے۔

از مکرم چوہدری فیض احمد صاحب گجراتی

(اخبار بدر قادیان، ۹ مئی ۱۹۶۳ء)

محترم اکبر یار جنگ بہادر کے فرزند

ڈاکٹر رشید الدین خان صاحب

ڈاکٹر رشید الدین خان صاحب پروفیسر وصدر شعبہ سیاسیات اور ڈین فیکلٹی آف سوشیل سائنس عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو صدر جمہوریہ ہند نے انڈین پارلیمنٹ کی راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب راجیہ سبھا کے ان بارہ ممبران میں سے ایک ہیں جنہیں صدر جمہوریہ دستور ہند کے تحت امتیازی قابلیت اور نمایاں خدمات کی بناء پر ہندوستان کے علمی اور سماجی حلقوں سے نامزد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید الدین خان، سابق مملکت حیدرآباد کے ایک ممتاز اور معروف احمدی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد مرحوم جناب مولوی غلام اکبر خان المخاطب بہ نواب اکبر یار جنگ بہادر سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم کے قریبی عزیز تھے۔ خود نواب صاحب کا شمار سابق مملکت آصفیہ حیدرآباد کے مشہور، نامور اور ممتاز وکلاء میں ہوتا تھا۔ چنانچہ انہیں ۲۶ سال کی عمر میں ہی حیدرآباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا تھا۔ اس عمر میں یہ اعزاز کم ہی افراد کو دیا جاتا ہے۔ وہ حکومت حیدرآباد ہوم سکریٹری، سکریٹری عدالت اور تعلیم کے عہدوں پر بھی فائز رہے اور اپنی خداداد قابلیت اور صلاحیت کی بناء پر حکومت وقت میں خاصہ اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ حکومت کی جانب سے قائم کردہ مختلف کمیشنوں کی اعزازی صدارت پر بھی مامور کئے جاتے رہے ہیں۔ قانون کے علاوہ ان کی علمی اور ادبی قابلیت وصلاحیت کی بڑی شہرت اور عزت تھی۔ ممتاز مقررین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ غرض کہ ان کی شخصیت بڑی پہلو دار اور فضل وکمال کی جامع تھی۔ ان کی دو تصانیف ''تصدیق احمدیت'' اور ''بشارت احمد'' جو بعض وجوہات کی بناء پر ایک دوسرے بزرگ کے نام سے شائع ہوئی تھیں حضرت سید ممتاز احمد صاحب شاہجہانپوری کی رائے میں بلحاظ زبان اور ادب کے ان کی کتابیں سلسلہ عالیہ احمدیہ کی بہترین تصانیف میں سے ہیں۔

ڈاکٹر رشید الدین خان کے بڑے بھائی جناب غلام احمد خان صاحب ہیں جو

آندھراپردیش ہائی کورٹ کے سینئر اور سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایڈوکیٹ ہیں۔ ان کے علاوہ تین چھوٹے بھائی سب کے سب علمی دنیا میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ایک حکومت ہند کے قائم کردہ نیم سرکاری علمی ادارہ واقع نئی دہلی کے رکن ہیں۔ دوسرے عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں۔ اور تیسرے ہمبرگ (مغربی جرمنی) میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر رشید الدین خان نے علمی دنیا میں جو نمایاں مقام حاصل کیا ہے اس میں علاوہ دل ودماغ کے اعلیٰ اوصاف کے جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں، ان کی پر اثر اور دلکش شخصیت اور ذاتی اکتساب کا بھی کافی دخل ہے۔ ان کی عمر اس وقت صرف ۴۵ سال ہے اور اس عمر میں وہ ہندوستان کے مختلف علمی اور تحقیقاتی اداروں، انجمنوں اور یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بیس سے زائد کل ہند سطح کے علمی اداروں اور تنظیموں کے اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ ان میں انڈین کونسل آف سوشل سائنس گرانٹس کمیشن اکاڈمی آف سوشل سائنس، ترقی اردو بورڈ وزارت تعلیم حکومت ہند، انڈین کمیٹی فار کوآپریشن یونیسکو، انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، آل انڈیا پولٹیکل سائنس ایسوسی ایشن، انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز، امریکن پولٹیکل سائنس ایسوسی ایشن (واشنگٹن) وغیرہ جیسے اہم اور علمی و تحقیقاتی ادارے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے بھی مختلف حیثیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندو بنارس یونیورسٹی، مدراس، مہاراشٹرا، دہلی، میسور اور کیرالا یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے رسالہ ''اسلامک کلچر'' (حیدرآباد)۔ حیدرآباد اکنامک اینڈ پولٹیکل ویکلی (ممبئی اور ''راجہ ودیا'' کی مجالس ادارت کے بھی ممبر ہیں۔

ایک اہم اعزاز جو ڈاکٹر رشید الدین خان کو حال میں حاصل ہوا ہے، وہ ان کا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چوبیسویں اجلاس کے لئے حکومت ہند کے وفد میں اسپیشل اڈویزر کم ممبر کی حیثیت میں انتخاب تھا۔ اس اعزاز کے فوری بعد راجیہ سبھا کے لیے ان کا انتخاب اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ موصوف نے اپنے وسیع مطالعہ اور سماجی خدمات اور غیر معمولی قابلیت کی بنا پر کم عمری میں ہی ایک قابل رشک اعزاز حاصل کیا ہے۔ اور ان کے لئے مزید خدمت وترقی کے روشن امکان ہیں۔

ڈاکٹر رشید الدین خان نے اپنی ملازمت کے زمانے میں بالخصوص اپنے ماموں مولانا سید بشارت احمد صاحب مرحوم امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد کی تحریک پر اپنی زندگی جماعت کے لئے وقف کی تھی۔ ان کی موجودہ بیوی (ہاجرہ بیگم صاحبہ) حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کی صاحبزادی، جن کی سالہاسال کی طویل علالت کے ضمن میں بہترین علاج معالجہ اور تیمارداری کا نمونہ پیش کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذاتی اور خاندانی شرافت کا قابل تقلید ثبوت دیا تھا۔

دعا ہے کہ ڈاکٹر رشید الدین خان کے لئے یہ اعزازات اللہ تعالیٰ ہر رنگ میں ان کو مبارک کرے۔ ہماری نیک تمنائیں ان کے اور ان کے اہل خاندان کے ساتھ ہیں۔

(سیٹھ اعظم صاحب حیدرآبادی حال مقیم ربوہ)

پیغامِ احمدیت۔ مملکت آصفیہ کے دو حکمرانوں کے نام

بہت کم احباب اس بات سے واقف ہیں کہ سب سے پہلے 1910ء میں حضرت مولانا حکیم الحاج نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاولؓ نے ایک رسالہ موسومہ ''صحیفہ آصفیہ'' کو جو اس وقت کے شاہ دکن میر محبوب علی خان صاحب بہادر کے نام ارسال فرمایا تھا۔ جس کو مولوی خواجہ کمال الدین صاحب نے مرتب فرمایا تھا جس کی ایک کاپی مؤلف کے ہاں موجود ہے اور یہ رسالہ 100 صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری مرتبہ حضرت الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے نظام سابع میر عثمان علی خان بہادر کے ہاں الموسومہ ''تحفۃ الملوک'' کو چھپوا کر ایک وفد کے ذریعہ شاہ دکن کے ہاں بھجوایا تھا۔ بغرض ثبوت ٹائٹل منسلک ہے۔ طوالت کی وجہ سے صرف ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا۔

(مؤلف سید جہانگیر علی)

اہلِ حیدرآباد کیلئے کتاب تحفۃ الملوک اور

شاہ دکن میر عثمان علی خان کا جماعت احمدیہ سے سلوک

از قلم: مکرم سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآباد

سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے آخری تاجدار ہز اگزالٹیڈ ہائی نس نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ نظام سابع کا سانحہ ارتحال گذشتہ ماہ فروری میں ہوا ہے۔ وہ ایک پہلودار۔ جامع اور عہد آفرین شخصیت کے مالک تھے۔ان کی مثالی زندگی علوم وفنون سے شغف احیاءِ انسانیت کی اساس پر اُن کی عوامی اور رفاہی خدمات۔ ان کی رواداری۔ انصاف و عدالت گستری اور رعایا پروری اس دور کی تاریخ میں ہمیشہ فکر ونظر سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہے گی۔ برصغیر ہندوپاکستان کا شاید ہی کوئی معروف ادارہ ہو جو اُن کی شاہانہ سرپرستی سے محروم رہا ہو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ہندو بنارس یونیورسٹی۔ شانتی نکیتن۔ جامعہ ملیہ دہلی۔ دیوبند۔ ندوہ۔ انجمن حمایت اسلام (لاہور) اور انجمن ترقی اُردو اور دیگر بے شمار تعلیمی اور سماجی ادارے ان کے تائید اور تعاون سے مالامال ہوتے رہے اور اُن کی معروف اور بے مثال دولت اندرونِ مملکت اور بیرونِ ملک۔تعمیری و اثباتی کاموں پر خرچ ہوتی رہی۔ وہ اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ مغلیہ تہذیب کی آخری یادگار تھے۔ اُن کی موت سے جو ہر انسان کی زندگی کا انجام ہے دکن کی تاریخ کا زرّین باب ختم ہوتا ہے۔ آج کے لوگ نظام سابع کی عظمت کا شاید صحیح اندازہ نہ لگا سکیں لیکن یقین ہے کہ مستقبل کا مورخ ان کے ساتھ پورا انصاف کرے گا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ ۱۹۱۴ء میں تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور اپنی خلافت کے ابتدائی ایام ہی میں حضرت نبی کریم ﷺ اور حضرت مسیح موعودؑ کی سنت وعمل کو پیش نظر رکھ کر بعض والیان ریاست کو تبلیغی خطوط تحریر فرمائے۔ چنانچہ حضور نے ایک خط نظام سابع کے نام لکھ کر

میر محبوب علی خان بہادر چھٹویں نظام حیدرآباد دکن

میر عثمان علی خان بہادر ساتویں نظام حیدرآباد دکن

میرے خسر مرحوم حضرت حکیم محمد حسین صاحب قریشی (لاہور) کے ذریعہ حیدرآباد بھجوایا اور اس میں تحریر فرمایا کہ آپ اپنی ایک رویا کی بنا پر یک علمی و تبلیغی تحفہ اُن کی خدمت میں بھجوانا چاہتے ہیں اور دریافت فرمایا کہ آیا وہ اس کو قبول کریں گے ۔ حضور کے اس خط کے جواب میں نظام سابع نے اپنے پولیٹکل سکریٹری مسٹر فریدون جی کے ذریعہ (جو بعد میں سر فریدون الملک کہلائے اور صدر اعظم کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے تھے) جواب دیا کہ وہ اس تحفہ کو قبول کرنے میں مسرت محسوس کریں گے ۔ چنانچہ وہ علمی اور تبلیغی تحفہ جو ''تحفۃ الملوک'' کے نام سے موسوم ہے حضرت سید محمد سرور شاہ صاحب اور حضرت مفتی محمد صادق صاحب کے ذریعہ نظام کو پہنچایا گیا ۔ جس کو انہوں نے کمال عقیدت اور اظہار تشکر کے ساتھ قبول کیا ۔

اس تحفہ کے اختتام پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ایک خوشخبری کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ '' جلد یا دیر سے میری یہ تحریر کوئی عظیم الشان نتیجہ ظاہر کرے گی جو اس ملک (دکن) کی قسمت میں ایک حیرت انگیز تغیر پیدا کردے گی ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی باتیں رائیگاں نہیں ہوتی ۔ خدا کرے کہ اس برکت میں جو نازل ہونے والی ہے جناب (نظام) کو بھی بہت سا حصہ ملے ۔'' تحفۃ الملوک کی اس عبارت میں جس ''عظیم الشان نتیجہ'' کی بشارت دی گئی تھی اس کا ''جلد'' رونما ہونے والا حصہ تاریخ احمدیت کے مصنف کی وقیع رائے میں یوں پورا ہوا کہ ''حضرت سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب نے ۹/اپریل ۱۹۱۵ء کو احمدیت کا پیغام قبول کیا ۔'' اور سیٹھ صاحب موصوف کے ذریعہ اسلام اور احمدیت کی تائید میں لٹریچر کی اشاعت کا عظیم کام سرزمین دکن سے سرانجام پانے لگا اور جو ''بدیر'' حیرت انگیز تغیر کی جو اطلاع دی گئی ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے ۔ بہرحال وہ تغیر آکر رہے گا ۔ انشاء اللہ ؎

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا　　　گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

جماعت احمدیہ حیدرآباد کے احمدی افراد میں سے جو اس وقت بقید حیات ہیں ان میں غالباً میں وہ آخری فرد ہوں جس کی حیثیت جماعت کے پہلے اور بعد کے دور کی درمیانی کڑی کی سی ہے ۔ گزشتہ ۴۵ سالہ دور کے حالات کا میں عینی شاہد ہوں اور سلسلہ کے ایک کارکن کی حیثیت سے ایک طویل عرصہ تک جماعت کی خدمت گذاری کی سعادت مجھے حاصل رہی ہے ۔ پرانے دور

کے اکثر حالات کا تذکرہ میں نے اُن بزرگوں سے سنا ہے جو ان واقعات اور حالات کے اہم کردار یا شاہد عینی تھے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جماعت حیدرآباد کی تاریخ کا ایک باب جس کا تعلق اہل حیدرآباد اور نظام سے ہے اس کو قلمبند کردیا جائے بشرط یہ کہ زندگی توفیق دے تاکہ دوسرے پہلوؤں پر بھی لکھنے کی کوشش کی جائے۔ انشاء اللہ۔

ریاست حیدرآباد ہمیشہ سے ایک مخصوص تہذیب وتمدن اور روایات کا گہوارہ رہی ہے۔ جس کی اصل تعلیماتِ اسلامی میں ملتی ہے۔ جہاں ہر مذہب وملت اور فرقوں کے لوگ آپس میں محبت و پیار۔ یگانگت اور بھائی چارگی کے جذبے کے ساتھ رہ اور بستے رہے ہیں اور مذہب وفرقہ کا اختلاف اُن کے درمیان کبھی بھی وجہ مخاصمت نہیں رہا۔ اس قسم کے ماحول اور روایات میں حیدرآباد میں احمدیوں کی کچھ مخالفت کبھی ہوئی ہے تو وہ نا قابل لحاظ ہے اور نہ لائق ذکر ہے اور پھر اس مخالفت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی جو بیرون ریاست حیدرآباد ہوتی رہی ہے۔ یہی حیدرآبادی رواداری تھی کہ غیر احمدیوں کی جانب سے انعقاد پذیر ہونے والے میلاد النبی ﷺ کے ایسے جلسوں میں جن میں پچاس پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ اور تقریر کے لئے جماعت احمدیہ کی طرف سے نواب اکبر یار جنگ بہادر حضرت روشن علی صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب نیر کو بار بار یاد کیا جاتا رہا ہے۔ مذاہب عالم (لندن) کانفرنس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد حضرت حافظ روشن علی صاحب حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر بھی غیروں کی جانب سے شہر حیدرآباد کے ایک وسیع سینما ہال میں اس غرض سے جلسہ منعقد کیا گیا تھا کہ حضرت حافظ صاحب نے جو تقریر اسلام اور...... کے عنوان پر لندن میں فرمائی تھی اس کا وہ اعادہ فرماویں۔ اس تقریر کے سننے کے لئے حکومت کے اعلیٰ حکام' ہائی کورٹ کے ججس' کالجوں کے پروفیسر اور ان کے علاوہ عوام کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ امت کے مشترکہ مفاد کے تحفظ کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنایا جائے اور اس غرض سے مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں تمام فرقہ ہائے اسلام کے ساتھ نہ صرف احمدیوں کو شریک کیا گیا بلکہ اس مجلس کے شریک معتمد جماعت حیدرآباد کے جنرل سکریٹری مولوی بشارت احمد صاحب منتخب ہوئے اور اس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن حضرت مولانا عبدالرحیم

صاحب نیر کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جاتا رہا۔ بعد کے سالوں میں یعنی ۱۹۳۲ء سے مسلسل چودہ سال تک مَیں اِس کی مجلس عاملہ کا رکن رہا۔ ۱۹۴۶ء میں جب کہ مولوی سید محمد قاسم رضوی صاحب مجلس کے صدر منتخب ہوئے تو ان کی جذباتی قیادت وسیاست کی وجہ سے میں نے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ ۴۱-۱۹۴۲ء میں ایک سال کے لئے مجلس کا شریک معتمد بھی رہا اور اس کے بعد کے سال مجھے معتمدی کی بھی خدمت پیش کی گئی اور میرے انکار پر کافی اصرار بھی کیا جاتا تھا۔ بہرحال ملت کی طرف سے اعتماد کے اظہار میں کبھی بھی میری احمدیت مانع نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد کے زمانے میں ریاست کی مجلس مقننہ کی رکنیت پر بھی مسلم حلقہ...... سے میرا بلا مقابلہ انتخاب ہوا تھا۔ اس کے بعد مسلم چیمبر آف کامرس کے نائب صدر کے طور پر میں دو سال تک کارگزار رہا۔

حیدرآباد میں سالہا سال سے آریہ سماج کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں بانیانِ جلسہ کی طرف سے یہ صورت کی گئی کہ تبادلۂ خیالات کی غرض سے مسلمانوں کو شنکھا سمادھان کی دعوت دی گئی۔ اس پر مجلس اتحاد المسلمین کی جانب سے جناب ناظر صاحب دعوۃ وتبلیغ قادیان سے درخواست کی گئی کہ وہ کسی عالم دین کو مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لئے بھجوائیں۔ چنانچہ مرکز نے قادیان سے مولانا ابوالعطا صاحب کو اس غرض سے بھجوایا تھا جب مولانا مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے آریہ سماج کے جلسے میں پیش ہوئے تو پنڈت دھرم بھکشو نے جو آریہ سماج کے نمائندے تھے کہا کہ تبادلۂ خیالات کے لئے مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے۔ جواب میں مولانا نے فرمایا کہ وہ مسلمان ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں اور تمام ارکان اسلام پر ایمان رکھتے اور اُن تمام شرائط کو پورا کرتے ہیں جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہیں۔ اس پر پنڈت دھرم بھکشو نے کہا "لیکن مسلمان آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔" اس پر مولانا ابوالعطا صاحب اُن علماء کی طرف پلٹے جو آپ کی اطراف میں مسلمانوں کے کثیر مجمع کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور اُن سے دریافت کیا کہ وہ انہیں کیا سمجھتے ہیں۔ اس پر مولانا سید محمد باشاہ حسینی صاحب معتمد علماء دکن نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ وہ مولانا کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اس کی تائید شیعہ فرقہ کے مجتہد مولانا سید بندہ حسن صاحب اور تائید مزید فرقہ بواہیر کے مقامی سربراہ مولانا ابوالفتح صاحب نے کی۔ اس کے دو گھنٹے تک مولانا ابوالعطا صاحب اور پنڈت دھرم بھکشو کے

درمیان مناظرہ ہوا۔ اس کے اختتام پر مسلمانوں کی خوشی اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ مسلمان مولانا سے شرف مصافحہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور ہاتھ چوم رہے تھے۔ بڑی مشکل سے مولانا کو جلسہ گاہ سے باہر موٹر پہنچایا گیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر اس جلسہ میں موجود تھے اور اپنی صحبتوں میں اس واقعہ کا ذکر تعریفی رنگ میں کیا کرتے تھے کہ مولانا ابوالعطا صاحب کا یہ کمال تھا کہ اپنے مسلمان ہونے کی تصدیق ہزارہا مسلمانوں کے مجمع میں علماء سے کروالی تھی۔

۱۹۳۱ء میں بھی آریہ سماجیوں نے اسی قسم کی دعوت مسلمانوں کو دی تھی۔ پچھلے سال کی کامیابی سے متاثر ہوکر مسلمانوں کی جانب سے اس سال علاوہ مولانا ابوالعطاء صاحب کے حضرت میر قاسم علی صاحب اور مہاشہ محمد عمر صاحب کو بھی قادیان سے بلوایا گیا تھا اور خود وہ پہلے سال سے زیادہ تعداد میں شریک جلسہ ہوئے اور اُن کی خوشی اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا۔ اس دفعہ آریہ سماجیوں کی جانب سے پنڈت رام چندر دہلوی پیش ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا ابوالعطاء صاحب اور مہاشہ محمد عمر صاحب۔

۱۹۳۱ء کے بعد کے سالوں میں تبادلۂ خیالات کے اس سلسلہ کو آریہ سماجیوں نے اپنی مصلحتوں کی بناپر بند کردیا۔ بہر حال مولانا ابوالعطاء صاحب کی اس قدر شہرت مسلمانوں میں ہوئی کہ انہیں دوسرے سال جلسہ میلادالنبی ﷺ میں تقریر کرنے کے لئے قادیان سے دعوت دے کر بلوایا گیا تھا۔ چنانچہ مولانا مسلمانوں کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے تھے اور تقریر بھی فرمائی تھی۔

غالباً ۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ حیدرآباد تشریف لائے اور آپ کا قیام وہاں ۹/۸ ماہ تک رہا۔ آپ کے روزانہ کے درس میں علاوہ عامۃ المسلمین کے بعض مرتبہ علماء ومشائخین بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس دوران میں نواب اکبر یار جنگ بہادر نے اپنے مکان واقع عنبر پیٹھ پر حیدرآباد کے چوٹی کے علماء مشائخین اور سجادہ نشینوں کو حضرت مولانا کی تقریر سماعت کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اور وہ بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا کی ایک گھنٹہ کی تقریر پورے انہماک اور توجہ سے سُنی گئی اور بعض نے علانیہ بڑی تعریف بھی کی۔

اگرچہ ۱۹۴۸ء کے سیاسی انقلاب کے بعد سماجی طور پر بھی بہت کچھ حالات بدل گئے ہیں اور پرانی روایات کی جگہ نئے اقدار نے لے لی ہے۔ پھر بھی پچھلی رواداری اور پرانی روایات کا کچھ اثر ہے کہ ماہ فروری ۶۷ء میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ گلبرگہ کے عرس پر جب کہ ایک لاکھ سے زیادہ عقیدت مند زائرین کے مجمع میں درگاہ سے متصل ''خواجہ بازار'' میں جماعت احمدیہ کا تبلیغی اسٹال جماعت یادگیر نے قائم کیا اور دوران عرس تقریباً ایک ہفتہ تک شب و روز احمدیہ لٹریچر کی تقسیم ہوتی رہی اور مؤثر تبادلۂ خیالات نہایت خوشگوار ماحول میں ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ درگاہ کی نشرگاہ سے احمدیہ اسٹال کی تعاونی تشہیر ہوتی رہی۔ اس پر مستزاد یہ کہ روضہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے سجادہ نشین نے احمدیوں کی دعوت چائے نوشی قبول کی اور اسٹال پر تشریف لائے۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ حضرت مصلح موعود حال ہی میں رحلت فرما چکے ہیں تو بے ساختہ اُن کی زبان سے انا للہ کے الفاظ نکلے اور اُنہوں نے دعائے مغفرت مانگی۔ یہ سب کچھ اس حال میں ہوا کہ اسٹال کے باہر عقیدتمندوں کا ہجوم سجادہ صاحب کے احترام میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔
(اخبار بدر ۲۳ر مارچ ۱۹۶۷ء)

جہاں تک نظام سابع اور اُن کے اسلاف کا تعلق ہے اُن کے انصاف اور رواداری اور رعایا پروری کے بارے میں حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی یہ نہایت وقیع شہادت ہے کہ ''عام دوراندیشی' انصاف اور علم پروری میں یقیناً یہ (نظام کا) خاندان نہایت اعلیٰ نمونہ دکھاتا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے کسی اور ریاست کے باشندوں میں اپنے رئیس سے اتنی محبت نہیں پائی جاتی جتنی کہ نظام کی رعایا میں نظام سے پائی جاتی ہے۔ انصاف کے بارے میں میرا یہ اثر ہے کہ حیدرآباد کا انصاف برطانوی راج سے زیادہ اچھا تھا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبول رہے۔'' (اخبار الفضل ۲۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء)

حضرت مصلح موعودؓ کے ان ارشادات کی تصدیق اُن بیانات سے بھی ہوتی ہے جو نظام کی وفات پر حکومت ہند کے ارباب حل وعقد اور مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں نے دیئے تھے۔

جماعت احمدیہ کا قیام ریاست حیدرآباد میں نواب میر عثمان علی خان نظام سابع کے

والدنواب میر محبوب علی خاں کے دورِ حکومت میں عمل میں آیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں جماعت کی تعداد بہت مختصر تھی لیکن اس ابتدائی دور میں جب کہ احمدی عقائد کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں تھیں جماعت کے بعض مخلصین اپنی قابلیت اور اہلیت کی بناء پر حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز رہے۔ اور اُن کی ملازمت میں ان کا مسلک کسی طرح مانع نہ ہوا۔ حضرت مولانا ابوالحمید صاحب آزاد (ناظم عدالت) حضرت سید صفدر حسین صاحب (تعمیرات) اور حضرت میر مردان علی صاحب (مددگار صدر محاسبی) ذمہ دارانہ عہدوں پر کارگذار رہے۔ حضرت سید محمد رضویؓ صاحب وحضرت سید ظہور علی صاحب کا شمار حیدرآباد کے سربرآوردہ وکلا میں سے ہوتا تھا اور وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت سید محمد رضوی صاحب کی شادی کی قبولیت احمدیت کے بعد نظام حیدرآباد کی حقیقی پھوپھی زاد بیوہ بہن سے ہوئی تھی۔ حضرت مولانا ابوالحمید صاحبؓ حضرت سید صفدر حسین صاحبؓ اور حضرت سید محمد رضوی صاحبؓ کا شمار حضرت مسیح موعودؑ کے ۳۱۳ اصحاب کبار میں ہے۔

نواب میر عثمان علی خان نظام سابع ۱۹۱۱ء میں سربراہ سلطنت ہوئے۔ ان کے دورِ حکومت میں بھی جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والے افراد نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نظام سابع نے اُن میں سے بعض کو نہایت اہم عہدہ پر فائز کیا تھا اور دوسروں کو دیگر شعبوں میں ترقی ملی۔ اور انہیں حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اس کے علاوہ اندرون اور بیرون ریاست کے کئی احمدیوں کو الطاف شاہانہ سے نوازا گیا اور جب بھی ضرورت پڑی انصاف کے تقاضے پورے کئے گئے۔

نظام سابع نے اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے میں اپنے دینیات کے اُستاد مولانا انوار اللہ صاحب المخاطب نواب فضیلت کو صدر الصدور۔ صدارت العالیہ (محکمہ امور مذہبی) مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی کتاب ازالہ اوہام کے جواب میں ایک کتاب ''ازالہ الفہام'' لکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ احمدیت کے مخالف علماء میں سے تھے۔ انہوں نے بحیثیت صدر الصدور جمعہ کے موقعہ پر احمدیوں کی نماز گاہ پر پولیس کے چند جوانوں کی تعیناتی کا حکم دیا تھا۔ سنا ہے کہ اُن کی یہ بھی تجویز تھی کہ احمدیوں کے اس اجتماع کو اس بہانے کہ دوسروں کو اشتعال ہوتا

ہے اور امن عامہ کو خطرہ ہے روک دیا جائے یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ جب یہ واقعات مجھ پر واضح ہوئے تو نواب صاحب کے ماموں اور ان کے برادری کے دیگر افراد نے یہ کہہ کر اس شادی میں شرکت سے انکار کر دیا کہ غلام اکبر خاں (اکبر یار جنگ) کافر ہے۔ اس لئے ان سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا جائز نہیں ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ مولانا محمود الحسن صاحب بھی قائم گنج گئے تھے۔ وہ ٹونک کے شاہی خاندان سے عزیز داری رکھتے تھے۔ اور ٹونک والوں کو قائم گنج والوں سے رشتہ داری تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کے علم وفضل کا بھی وہاں شہرہ تھا۔ چنانچہ مولانا صاحب نواب صاحب کے ماموں اور ان کی برادری کے دیگر افراد سے ملے اور ان سے کہا کہ میں خود بھی احمدی نہیں ہوں اور ان کے عقائد سے میرا شدید اختلاف ہے۔ اس کے باوجود میں غلام اکبر خاں کی نیکی اور بہترین اخلاق سے متاثر ہوں اور اس وجہ سے اس شادی میں شرکت کے لئے یہاں آیا ہوں اور ان کے افہام وتفہیم کے نتیجہ میں نواب صاحب کے ماموں اور برادری کے سارے افراد نے شادی میں شرکت کی اور وہ بڑی دھوم دھام سے منائی گی۔ اس تقریب میں نواب صاحب نے مجھے بھی سرحدی پٹھانوں کے لباس کا مکمل جوڑا دیا تھا۔ جو پٹھان شادی بیاہ کے موقعہ پر زیب تن کرتے ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ میں محمد آباد بیدر میں تھا۔ نواب صاحب اپنے بچوں اور اپنے گہرے دوست رفیع الدین صاحب کے ساتھ آئے۔ اور میرے ہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ بیدر کے تخمی آم بہت مشہور ہیں۔ اور آنے کا ایک مقصد آم کھانا تھا میں نے اپنی توفیق کے مطابق مناسب اور اچھا مہمانی کا اہتمام کیا تھا۔ اور وہ میری مہمان داری سے بہت خوش واپس گئے۔ میں نے صحن میں ایک شامیانہ لگوایا تھا۔ اس میں وہ اپنے بچے اور احباب کے ساتھ باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور ان کا خود اپنے گھر پر بھی یہ دستور تھا اور میرے ہاں بھی اس کو برقرار رکھا کہ اپنے غیر از جماعت احباب اور ملنے والوں کے لئے کہہ کر علیحدہ جائے نماز بچھواتے تھے۔ یہ ان کی وسیع القلبی کی ایک مثال ہے۔

نواب صاحب کو اپنی عزت نفس اور وضع داری کا اس قدر خیال تھا کہ زندگی بھر نہ کسی بڑے آدمی کی خوشامد کی اور نہ کسی کے ہاں کوئی حاجت لے کر گئے۔ جب وظیفہ پر علیحدگی کا وقت

آیا تو...... سر اکبر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ بہادر) حکومت حیدرآباد کے وزیراعظم تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اگر نواب صاحب خود خواہش کریں تو ان کی ججی کی مدت میں مزید توسیع کر دی جائے لیکن نواب صاحب نے ملازمت کے آخری مہینوں میں وزیراعظم سے اس خیال سے ملنا بند کر دیا تھا کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ ملنے کا مقصد شاید توسیع ملازمت کی خواہش ہو۔

بہرحال ۱۹۳۷ء میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدگی پر نواب صاحب نے وکالت شروع کی اور اپنی غیر معمولی دماغی صلاحیت وقابلیت قابل رشک محنت و دیانت اور فرض شناسی کی وجہ سے وہ مقام حاصل کر لیا جو شاذ ہی دوسروں کو ملا ہو۔ بارہا وہ سر تیج بہادر اور دیگر آل انڈیا شہرت کے وکلاء میں عدالت میں پیش ہوئے۔ اور اکثر مقدمات میں کامیاب ہوئے۔ ان کی وکالت شروع کرنے کے چار ماہ بعد میں حیدرآباد گیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے بہت لال سرخ اور صحت مند نظر آئے اور ان کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اور میں نے اس بات کا ان سے ذکر کیا تو ہنس کر فرمانے لگے۔ میاں مجھے پہلے تنخواہ ہی کیا ملا کرتی تھی۔ وہ تو ایک سوکھے ہوئے گھاس کے مانند تھی۔ اب تو گھوڑے کو (وکالت کی صورت میں) ایک بڑا وسیع اور شاداب کنچھ (مرغزار) مل گیا ہے۔ نرم اور ملائم گھانس ملتا ہے۔ اور وہ اپنی چاہت کے مطابق کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ گذشتہ ۴ ماہ میں ۷۲ ہزار روپے کمایا ہے۔ یعنی ماہوار ۱۸ ہزار روپے اور اس زمانے میں روپے کی جو قیمت تھی۔ اس کے حساب سے آج کے ۵۰، ۵۰ ہزار روپے ماہوار سے ان کی کم نہ تھی چنانچہ ملازمت کے دوران آمد اور خرچ کے درمیان تفاوت کی وجہ سے جو قرض تھا وہ انہوں نے ادا کر دیا اور فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں بے دریغ روپے خرچ کیا۔ واپسی میں قادیان گئے۔ اور جو بچ رہا تھا وہ وہاں خرچ کر آئے۔ انہوں نے کئی سال تک وکالت کی اور ان کی آمدنی اسی طرح روز افزوں رہی جس قدر آمدنی ہوتی تھی اس کا بہت بڑا حصہ اپنی بے مثال مہمان نوازی غریبوں کی امداد میں خرچ کرتے، جس میں مذہب و ملت اور فرقہ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا اس احساس کے ساتھ کہ مزید خدمت کا موقع نہ ملے۔ پائی پائی کا حساب کر کے اپنا حصہ آمد ادا کیا کرتے تھے اور دیگر طوعی جماعتی چندوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے وہ ساری زندگی فکر فردا سے بے نیاز رہے۔ اور

ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھا۔

نواب صاحب کا حیدرآباد کی حکومت اور وہاں کی سوسائٹی میں ان کی اعلیٰ قابلیت اور بے داغ زندگی کی وجہ سے جو اثر و رسوخ تھا وہ ان کے ملازمت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی ویسا ہی قائم رہا۔ ہائی کورٹ کے ججوں کے لفٹ میں دوسری منزل پر جانے کی ان کو خصوصی اجازت تھی۔ اور ان کی عمر کی وجہ سے عدالت میں کرسی پر بیٹھ کر وہ مقدمات میں بحث کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس اثر کی بناء پر ان کی وکالت کے زمانے میں بھی میں نے کبھی اپنا تبادلہ چاہا اور جہاں بھی چاہا ان کے حسن توسط سے کروا لیا۔ کسی اور معاملہ میں بھی انہوں نے مجھ سے کسی قسم کی اخلاقی امداد سے کبھی دریغ نہ کیا۔ اور وہ کسی کی حاجت روائی میں اور خدمت کر کے ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔

میں جب ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو کر محبوب نگر سے حیدرآباد گیا۔ اور وہ اپنے عزیز پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے پاس گیا۔ اور نواب صاحب سے ملنے گیا تو فرمانے لگے کہ کسی دن میرے ساتھ کھانا کھاؤ تو میں نے عرض کیا کہ یہ سب کھانے جو ابتدائے ملازمت سے آج تک مجھے ملتے رہے ہیں وہ سب آپ ہی کے تو تھے۔ بہرحال وہ کھانے کے معاملے میں کسی کی معذرت قبول نہیں کرتے تھے چنانچہ میں ایک مقررہ دن کھانے پر گیا ان کا اصول تھا کہ ہمہمان خصوصی سے تعلق رکھنے اور ملنے والوں کو بھی دعوت میں مدعو کیا کرتے تھے اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ ان کے لڑکے غلام احمد خاں اور داماد سردار افضل خاں ...... نے مجھے بتلایا کہ دعوت کیا تھی بس ہمارے لئے مصیبت بنی رہی بار بار ہم کو طلب کرتے اور کہتے کہ اب تک انتظام شروع نہیں کیا گیا...... رکھو گے؟ اپنے دسترخوان پر مختلف نوع کی پکی ہوئی کھانوں کے علاوہ شہر کے اعلیٰ ریسٹورنٹوں سے جہاں کوئی اسپیشل کھانا ہوتا۔ وہ بھی منگوایا گیا۔ اس قسم کا اہتمام دوسروں کی دعوت کے لئے ہوا کرتا تھا۔ غرض یہ کہ بڑے اہتمام کے ساتھ یہ دعوت ختم ہوئی اور جب میں حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگا تو اپنے بچوں اور بچیوں کو مجھے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن بھجوایا۔ ان کا یہ فعل کس قدر پیارا تھا۔

مجھے اکثر خیال آتا اور تڑپا جاتا ہے۔ وہ زمانہ کس قدر اچھا اور وہ لوگ کیسے محبت شعار،

بلند اخلاق شائستہ اور بے لوث ہمدردی کرنے والے تھے ۔ ان لوگوں میں میں نے نواب اکبر یار جنگ کی شخصیت کو منفرد اور ممتاز پایا ۔ اگرچہ بہت لمبا زمانہ گذر چکا ہے لیکن ان کی یاد ان کے حسنِ سلوک ان کے تعلق خاطر اور محبت کو نہ میں نے بھلایا ہے اور نہ بھلا سکتا ہوں ۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پُر فتوح پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل فرمائے ۔ آمین ۔

ورق تمام ہوا ۔ مدح اور باقی ہے تاہم میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں ۔ اقبال نے حیدرآباد ہی کے اپنے ممدوح شریمن السلطنت مہاراج کشن پرشاد کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا اُس کے آخری شعر کو اپناتے ہوئے کہتا ہوں ؎

شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے　　مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

میں اس مضمون کو ایک اہم مسئلہ کی وضاحت پر ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ باوجود نظام کے انصاف اور اُن کی ریاست کی معروف مذہبی رواداری کے حیدرآباد میں مسجد احمدیہ کی تعمیر نہ ہوسکی تھی ۔ یہ معاملہ تشریح طلب ہے اور جب تک اس پس منظر کا علم نہ ہو حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ۔ واقعات یہ ہیں کہ مملکت آصفیہ حیدرآباد میں ملکی مصالح اور تحفظ کی خاطر ایک صدی قبل عربوں کی ایک خاصی تعداد کو ملک عرب سے لاکر بسایا گیا تھا ۔ ان عربوں نے بعض مقامی شوریدہ عناصر سے مل کر شیعوں کی اذان پر اعتراض کیا ۔ اور اُن کی مسجد (جعفری) پر ناجائز قبضہ کرلیا تھا ۔ یہ ۸۰۔۸۵ سال پہلے کا واقعہ ہے جب کہ نظام سابع کے والد نواب میر محبوب علی خاں کا جو نابالغ اور کم عمر تھے دورِ حکومت تھا اور نواب سر سالار جنگ بہادر مدار المہام (وزیر اعظم) تھے ۔ جن کا تعلق شیعہ جماعت سے تھا ۔ جب یہ معاملہ بغیر کسی ضروری کارروائی ان کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے اس وقت کے مصالح کے تحت یا اور کسی وجہ سے باوجود خود شیعہ ہونے کے یہ فیصلہ لکھا کہ ریاست کا مذہب سنّت الجماعت ہے اس لئے آئندہ یہاں صرف اہل سنت الجماعت کی مساجد کی تعمیر ہوسکتی ہیں ۔ اس زمانے میں حیدرآباد کے دستور کے تحت مدار المہام کا فیصلہ بھی قانون سمجھا جاتا تھا ۔ بہرحال اس فیصلہ کے ذریعہ سوائے اہل سنت الجماعت کے دوسرے تمام مسلمان فرقوں کی مساجد کی تعمیر کو آئندہ کے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا اور یہ فیصلہ اس زمانے کا ہے جب کہ جماعت احمدیہ کا حیدرآباد میں قیام عمل میں نہیں آیا تھا ۔ اس لئے احمدیوں

کی تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی فرقہ نے اس فیصلہ کو بدلوانے کی کوشش نہیں کی ۔

غالباً ۱۹۲۳ء میں جماعت احمدیہ حیدرآباد نے شہر حیدرآباد کے پرانے حصہ میں محلہ زیر تالاب میر جملہ ایک زمین مسجد کی تعمیر کی غرض سے خریدی اور اس کی اجازت کے لئے محکمہ امور مذہبی میں درخواست دی ۔ محکمہ متعلقہ نے نواب سالار جنگ بہادر کے مذکورہ بالا فیصلہ کی بنا پر مجوزہ مسجد کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کیا اور نیز دیکھا کہ یہ جگہ شیعوں کی مسجد جعفری کے بہت قریب ہے اس لئے بھی اجازت نہیں دی جاسکتی ۔ جماعت نے محکمہ امور مذہبی کے اس فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی ۔ اور نہ یہ معاملہ صدر اعظم (وزیر اعظم) یا خود نظام سابع کے آگے پیش کیا بلکہ اپنی خرید کردہ زمین پر حکومت کی اجازت سے ایک ہال موسومہ احمدیہ لیکچر ہال تعمیر کرلیا جو ۱۹۲۴ء سے سالہا سال تک مسجد ہی کا کام دیتا رہا ۔

دسمبر ۱۹۴۵ء کو جلسہ سالانہ قادیان کے موقعہ پر جب حیدرآباد کی جماعت بغرض ملاقات حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت میں پیش ہوئی تو مکرم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل مرحوم نے حضور سے اس قانونی مشکل کا ذکر کیا جو حیدرآباد میں مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں درپیش تھی ۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر صحیح رنگ میں کوشش کی جاتی تو مشکل کا حل نکل آتا اور آپ لوگوں کو اجازت مل جاتی اور ساتھ ہی فرمایا کہ آپ لوگ یقین رکھیں کہ آپ کے موجودہ امیر کے زمانے میں مسجد کی تعمیر نہ ہوسکے گی ۔ حضورؓ کا یہ ارشاد کہ صحیح رنگ میں اب تک کوشش نہیں کی گئی ۔ میرے لئے مہمیز ثابت ہوا اور قادیان سے حیدرآباد واپس جاکر محترم مولوی مومن حسین صاحب ، نواب غلام احمد خاں صاحب ، محمد عبداللہ صاحب بی ایس سی اور اپنے بھائی محمد معین الدین صاحب کے حسن تعاون اور نواب اکبر یار جنگ بہادر کے مشورے سے تعمیر مسجد کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی ۔ حسن اتفاق سے ان ہی دنوں محترم چودھری محمد ظفر اللہ خاں صاحبؓ حیدراباد تشریف لائے تھے اور اُن کے حسن تعاون سے سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب وزیر اعظم سے بھی اجازت کا زبانی وعدہ لے لیا گیا تھا ۔ اجازت تعمیر کی درخواست مرتب ہوئی جس میں کسی خاص جگہ کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی ۔ بلکہ لکھا گیا تھا کہ حکومت احمدیوں کے اس حق کو تسلیم کرے

کہ وہ ریاست میں اپنی مسجد تعمیر کر سکتے ہیں ۔ جب یہ درخواست امیر جماعت کے ہاں ان کے دستخط کے لئے پیش ہوئی تو انہوں نے مرتبہ درخواست میں تبدیلی کردی اور لکھا کہ احمدیہ لیکچر ہال کو مسجد کی شکل میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے ۔ ان کا اصرا تھا کہ مسجد کو قدیمی جگہ بننا چاہئے نیز ان کا خیال تھا کہ احمدیہ لیکچر ہال کا سنگ بنیاد حضرت میر محمد سعید صاحبؓ (جو علاوہ صحابی ہونے کے وہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کی مسجد معتمدین کے بھی رکن تھے اور جن کے زمانہ امارت میں جماعت کی بہت ترقی ہورہی تھی) کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ اور پھر ۱۹۳۹ء میں حضرت مصلح موعودؓ نے اسی جگہ نماز جمعہ پڑھائی تھی ۔ بہرحال یہ مرتبہ درخواست محکمہ امور مذہبی میں پیش ہوئی اس کا جواب محکمہ مذکور نے یہ دیا کہ مجوزہ مسجد کی اجازت شیعوں کی مسجد کی قربت کی وجہ سے نہیں دی جاسکتی اور کسی دوسری جگہ جو موزوں ہو تعمیر کی اجازت طلب کی جائے تو اس پر مناسب غور کیا جاسکتا اور منظوری دی جاسکتی ہے ۔ میں نے اپنے بھائی محمد معین الدین صاحب کے تعاون سے ایک موزوں جگہ کا جو سدی عنبر بازار کے مرکزی مقام پر واقع تھی انتخاب کیا لیکن امیر جماعت اس پر راضی نہیں ہوئے اور ان کا یہ اصرار قائم رہا کہ جب بھی حیدرآباد میں مسجد احمدیہ کی تعمیر ہوگی تو اسی قدیم جگہ پر ہوگی ۔ کیونکہ ان کے خیال میں جماعت کی تاریخ کا ایک حصہ اس سے وابستہ ہے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ملک میں جو سیاسی انتشار اور انقلاب پیدا ہوا اس نے اس امر کا موقعہ نہ دیا کہ اس معاملہ کو آگے بڑھایا جاتا ۔ اور اس کے بعد معاشی حالات پیدا ہوئے ان حالات نے باوجود تقریباً بیس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے جماعت کو موقعہ نہ دیا کہ وہ اپنی دیرینہ خواہش کی صورت گری کا انتظام کرتی بہرحال حکومت نظام نے کسی دوسری جگہ مسجد کی تعمیر کے لئے نشاندہی کے لئے ہدایت کر کے اصولاً یہ تسلیم کرلیا تھا کہ احمدیوں کو یہ حق حاصل ہے۔

یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ریاست حیدرآباد کی ایک دوسری احمدی جماعت نے نظام کے بھی اور حکومت میں جدوجہد کر کے مسجد کی اجازت حاصل کرلی اور ایک خوبصورت مسجد کی تعمیر بھی کرلی تھی ۔ اسی طرح شہر حیدرآباد میں جماعت اہل حدیث نے بھی اپنی مسجد بنالی تھی ۔ الغرض نظام سابع اور اُن کے اسلاف کی رواداری اور عدل گستری نے جن کا منبع

دراصل اسلام کی تعلیمات ہیں حیدرآباد میں ایک مثالی تہذیب کو فروغ دیا اور پروان چڑھایا تھا جس میں باوجود اختلاف مذہب و مسلک کے لوگ آپس میں محبت و پیار اور بھائی چارہ کی پُر فضاء ماحول میں رہتے اور بستے رہے ۔ اس میں کیا شک ہے کہ نظام کے قلب وفکر کی بھی خوبیاں تھیں کہ ہر طبقہ میں مقبول رہے اور جب وہ رحلت فرمائے تو اُن کے جنازے کے جلوس میں ہر مذہب وملت کے پانچ لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی ۔ ہر آنکھ اشکبار ۔ ہر چہرہ متاثر اور غمگین اور ہر زبان پر اُن کے لئے تعریفی کلمات تھے ۔ یقیناً وہ ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے ۔ اُن کے اسلاف کے تعلق سے اقبال نے جن منظوم خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بدرجہ اتم نظام سابع پر صادق آتے ہیں ۔ اُن میں سے دو شعروں پر اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

دل ہمارے یادِ عہد رفتہ سے خالی نہیں　　اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور　　ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

(ماخوذ از بدر قادیان ۱۴/اور ۲۱/ستمبر ۱۹۶۷ء)

صحابی ڈاکٹر ظہور اللہؓ صاحب کے خودنوشت حالات

میں ۱۲۷۵ھ میں بمقام مدراس پیدا ہوا۔ میرے والد حضرت سید ضیاء اللہ احمد صاحب مرحوم ایجنٹ کمپنی آف انڈیا منجانب نواب غلام غوث خاں صاحب بہادر مرحوم نواب کرناٹک تھے۔ نواب صاحب موصوف اور والد صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد میرے دادا اور نانا محترم سید امام علی صاحب نے میری پرورش فرمائی۔ تقریباً بارہ سال کی عمر تک مدرسہ اعظم مدارس (مدراس) میں انگریزی تعلیم پاتا رہا۔ فارسی اور اردو حضرت دادا صاحب شاہ عقیل صاحب قادری مشائخ کے پاس پاتا رہا۔ حضرت دادا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد میرے چھوٹے چچا سید اللہ احمد صاحب اور میرے چچا سید امر اللہ احمد صاحب تخلص امیر شاعر فارسی جو پہلے سے حیدرآباد میں مقیم تھے' نے مجھ کو یہاں بلوالیا۔ میرے چھوٹے چچا صاحب نواب مکرم الدولہ بہادر کے انگریزی استاد اور مدرسہ شافیا اسکول کے جس کا نام آج کل سٹی ہائی اسکول ہے کے ٹیچر تھے اور نواب صاحب ممدوح کی انگریزی خط و کتابت ریذیڈنسی وغیرہ سے کیا کرتے تھے اور بڑے چچا صاحب جب مرافعہ کا محکمہ جسے اب ہائی کورٹ کہا جاتا ہے قائم ہوا' جس کے میر مجلس میر احمد علی صاحب خلف مولوی اکبر صاحب واعظ تھے۔ اس محکمہ کے منتظم ہیں۔ ان دنوں میرے ہر دو چچاؤں نے میری تعلیم و تربیت میں مدد دی اور مجھ کو میڈیکل اسکول میں داخل کروادیا۔ آٹھ سال تعلیم پانے کے بعد ۱۲۹۰ فصلی میں سند ڈاکٹری حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی حسب قواعد دواخانہ افضل گنج میں ایک سال پروبیشن سے عملی کام کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد مجھے اضلاع میں متبدل و متعین کیا گیا۔ ابتداءً ۱۳۹۱ فصلی میں دواخانہ کوئل کنڈہ ضلع محبوب نگر بھیجا گیا' جہاں تقریباً پانچ سال تک کام کرتا رہا۔ پھر وہاں سے ۱۲۹۶ فصلی میں قصبہ ناندیڑ ضلع کے دواخانے پر تبادلہ کیا گیا اور اسی طرح یہاں بھی پانچ سال تک کام کرتا رہا۔ یہاں سے ۱۳۰۱ فصلی میں یہاں تنہا کام کرتا تھا اس لئے ...... جو حال احمد پور کے نام سے موسوم ہے ۱۳۱۸ فصلی تک رہا۔ پھر یہاں سے دواخانہ دیودرگ پر کام کرتے ہوئے ۱۳۲۴ فصلی میں وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔

سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخلہ کے واقعات بیان کرنے سے پہلے اولاً یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں مذہب کے متعلق کیسے پلٹے کھاتا رہا۔ پہلے میں خاندانی سنت والجماعت اور مشائخی طریقہ پر تھا۔ اس کے بعد صحبت کے اثر سے سر سید احمد خان کے گروہ یعنی ''نیچریت'' کے خیال سے پُر ہوگیا جب میرا تبادلہ ۱۲۹۴ فصلی میں ناندیڑ پر ہوا تو وہاں ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کے خیالات سے متاثر ہوکر نیچریت کا رہا سہا برائے نام خدا کا اقرار بھی خیر باد کرنا پڑا۔ یہی خیالات لے کر جب میں عادل آباد پہنچا تو اس وقت پورا ایتھسٹ (Ethiest) تھا' یعنی وہ فرقہ جو خدا کا قائل نہیں ہے۔ جس کے خیالات یہ ہیں کہ ''خدا'' کا لفظ مادہ اور ارواح کے جملہ کا ایک نام ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ جیسا کہ انسان اور جانوروں کے نام ''ذی روح'' ہے اور اسی طرح نباتات اور جمادات وغیرہ کے مجموعہ کا نام ''مادہ'' ہے۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے قویٰ جو رہ جاتے ہیں ان کو مادہ کے ساتھ جمع کرنے کے بعد ایک ہونا چاہئے اور وہ ''خدا'' ہے۔ نعوذ باللہ۔ یہی میرے عقائد تھے۔

میری جائے متبدلہ یعنی عادل آباد کا حال یہ ہے کہ پہلے تو ایک کوردہ یعنی جہاں پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ قریباً معدوم (بیش ازیں نیست) کہ عمل وار مہتمم کوتوائی' امین وغیرہ سے چند افراد کے اور وہاں کے باشندوں میں دو چار اشخاص کے سوا سب دہقانی نہ وہاں کوئی علم کا چرچہ نہ مدارس اور نہ کوئی ایسی سوسائٹی کہ جو کسی قسم کے تبادلہ' خیالات کے لئے جمع ہوں۔ ایسی حالت میں جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا پرزور اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان بندوں میں ہوں جن کو بغیر کسی استاد اور شخصی ذریعوں کے خود ایک اپنے فضل و رحم و کرم سے خدا تعالیٰ خود دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عادل آباد ضلع میں ایک مدرسہ اردو تحتانیہ سرکاری تھا جس میں ایک کوثر حسین مولوی صاحب تھے۔ ان کے پاس شاید انجمن جماعت الاسلام نگلور سے ماہوار ایک رسالہ آیا کرتا تھا جس میں تناسخ کی بحث ہندوؤں سے ہوا کرتی تھی۔ چونکہ میں شروع سے بحث مباحثوں کے حسن قبح اچھی طرح سمجھنے کی عادت رکھتا تھا اس لئے میں ایڈیٹر کو نہایت لایق اور قابل خیال کرنے لگا۔ لیکن میرا یہ خیال چند ماہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کیونکہ میں نے ایک

رسالہ میں یہ لکھا ہوا پایا کہ جو کچھ اس رسالے میں لکھا گیا ہے وہ فیروز الدین مدرس ڈسکہ کے چند تالیفات کے اقتباسات ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ میرا وہ خیال جو ایڈیٹر کی نسبت تھا فیروز الدین کی جانب منتقل کرنا پڑا۔ میں نے فیروز الدین کو ایک خط لکھا کہ جو کچھ تالیفات آپ کے ہیں وہ بذریعہ وی پی میرے ہاں روانہ کریں۔ جب انہوں نے چند کتب میرے پاس روانہ کردیئے جب میں نے ان کا مطالعہ شروع کردیا تو پہلے سے بھی زیادہ مجھ کو ان کی قابلیت اور بحث ومباحثوں کی زبردست لیاقت کا معترف ہونا پڑا۔ جب میں ان کی مرسلہ کتب کا مطالعہ کرتے کرتے آخری حصے پر پہنچا تو انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی تصانیف سے اخذ کیا ہے اور مرزا صاحب موصوف جو اس وقت اسلام کی حمایت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں تیرہ سو برس میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ مرزا صاحب موصوف کا دعویٰ ہے کہ وہ منجانب اللہ اس زمانہ کے لئے مامور ہیں اور مثیل مسیح اور مہدی معہود کی خدمت پر مقرر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جس سے لوگ مشتعل ہو کر آپ کو برا بھلا کہتے ہیں اور میں بھی ان کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتا تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ تیرہ سو برس بعد یہ ہی ایک شخص ہے جنہوں نے اسلام کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر ان کے دعوے قبول کریں یا نہ کریں ان کو برا بھلا بھی نہ کہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

اب میں کیا بیان کروں کہ میرے دل میں کس قدر آپ کے تصانیف دیکھنے کا شوق و ولولہ پیدا ہوا۔ آپ کی لیاقت کا تو میں پہلے ہی معترف ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مہدی اور مسیح جیسا کہ آبا واجداد سے میں سنا کرتا تھا کہ عیسیٰؑ آسمان سے آئیں گے اور مہدی زمین سے پیدا ہوں گے اور کافروں اور دجال و یاجوج ماجوج سے خوب جنگ کریں گے۔ 'یہ ہوگا اور وہ ہوگا' اور یہاں ان سب پر پانی پھر جاتا ہے۔ ایک زبردست لہر دل میں یہ پیدا ہوئی کہ کیا اس قدر لیاقت کا شخص ان پہلوؤں اور قصوں سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ اگر جھوٹ موٹ بھی اپنے کو بتاتا ہے تو کیا تیرہ سو برسوں کی باتوں کو لوگوں کے دلوں سے یوں ہی خالی خولی دعووں سے محو کرسکتا ہے۔ جھوٹ کے لئے بھی کچھ تھوڑی سی گنجائش ضروری ہوتی ہے۔ یہاں تو کوئی ایسی گنجائش نہیں۔ تمام دنیا فوراً کہہ اٹھے گی کہ یہ بالکل جھوٹا ہے۔ یہ بات کوئی بھاری سے بھاری

دروغ گو بھی نہیں کہہ سکتا۔ ایک ایسا قابل اور لائق شخص اس قدر موٹی بات کو سمجھ نہ سکے اور اپنی قابلیت اور لیاقت کو سارے جہاں کے پرانے خیالات اور عقیدوں کے سیلاب میں بہا دے؟

الحاصل میں نے فوراً فیروز الدین صاحب کو لکھا کہ حضرت مرزا صاحب کی اور کون کون سی تصانیف ہیں اور وہ کس قدر قیمت میں مل سکتے ہیں اور کس پتہ پر، براہ کرم مطلع فرمادیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ اس وقت تک کچھ زیادہ قیمت کے تصانیف نہیں ہیں اور اس سے زیادہ نہیں کہ تمام ہی پندرہ بیس روپیہ میں آجائیں گے۔ اور پتہ سے بھی اطلاع کردی۔ اس جواب کے حصول پر میں نے حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ جو کچھ بھیجنا ہے میرے نام اور پتہ پر ذریعہ وی پی بھیج دیئے جائیں۔ اس پر حضرت صاحب نے چند کتب ارسال فرماکر یہ تحریر فرمایا کہ 'براہین احمدیہ' کتاب گھر میں ختم ہوگئی تھی، اس لئے آپ کے لئے ایک دوست کے پاس سے لے کر بھجوائی ہے۔ غرض ان کتابوں کی تفصیل یہ ہے۔ براہین احمدیہ، آئینہ کمالات اسلام، ازالہ اوہام، توضیح المرام اور فتح اسلام اور ان کتب کے علاوہ وقتاً فوقتاً جیسے جیسے تصانیف طبع ہوا کرتے تھے میرے معروضے کے مطابق حضرت صاحب میرے ہاں خود ہی روانہ فرمادیا کرتے تھے۔

ان کتب سے پہلے میں نے ''براہین احمدیہ'' کا مطالعہ بغیر کسی کے علم میں لائے اپنے آپ شروع کردیا اور جیسے جیسے میں اس کو دیکھتا گیا ویسے ویسے میرے تمام ملحدانہ اور نیچری خیالات مثل شبنم کے جو آفتاب کے نکلنے پر ہوا ہوجاتی ہے ناپید ہوگئے۔ یا مجھ کو یہ کہنا چاہئے کہ میں بمصداق

مسلماں را مسلماں باز کردند

گو میں مسلمان اور بزرگ خاندان کی اولاد سے تو ضرور تھا، لیکن عملاً اور اعتقاداً میں خود مسلمان نہ تھا اور اب خدا تعالیٰ کے فضل اور مامور وقت کے صدقے میں نے از سرنو اسلام کو پالیا۔

اپنے آپ دو مرتبہ براہین احمدیہ کے مطالعے کے بعد میں اس قابل نہ رہا کہ میں اپنے سینے میں ہی اس علم کو چھپائے رکھوں اور میں نے وہاں کے بعض عہدیداران ضلع اور دو تین خاص باشندوں کو مغرب کے بعد سے جمع کرکے جس میں وہ مدرس صاحب مذکرہ صدر بھی شامل تھے، ان کو براہین احمدیہ پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ پھر اس کتاب کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے کتب

بھی اسی طرح سنا دیئے۔ جس کے نتیجے میں بعض لوگوں نے اس سے بڑی دلچسپی لی۔ بجز ایک دو صاحبان کے جن میں مدرس صاحب بھی شامل تھے مخالفت کرتے رہے۔ آخر میں یہ تجویز قرار پائی کہ سلسلہ احمدیہ کے مخالفین کے اعتراضات وغیرہ بھی دیکھیں چونکہ یک طرفہ فیصلہ درست نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں نے حضرت صاحب ہی سے آپ کے مخالفین کے بحث ومباحث اور اعتراضات کے ملنے کا پتہ دریافت کر کے یعنی غیروں سے ان کے رسائل طلب کیئے جن میں محمد حسین بٹالوی کے رسالہ اشاعت السنۃ بھی شامل تھا۔ ان تمام کا مطالعہ بھی کیا' لیکن یہ بات یہاں کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان مخالفین اور معترضین کے رسالے دیکھنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ براہین احمدیہ کے پڑھنے کے بعد ہی تقریباً ۱۹۰۱ء میں تحریری بیعت سے مشرف ہوگیا۔

اب ہمیشہ یہ سوچ لگی رہی کہ خود حاضر خدمت ہوکر دیدار پرانوار سے مشرف ہو جاؤں' لیکن بوجہ ملازمت رخصت نہ مل سکی۔ بالآخر ۱۹۰۶ء میں بماہ اپریل رخصت لے کر قادیان شریف پہنچا اور حضرت صاحب سے مشرف نیاز حاصل کیا۔

جب میں بٹالہ اسٹیشن پر اتر کے بہ سواری بگھی قادیان شریف کے قریب جارہا تھا کہ یکہ کا پہیہ ایک گڑھے میں گر کر الٹ گیا۔ ہم چار آدمی اس وقت ہم سفر تھے اور اسی یکہ میں سوار تھے' جن میں ایک میرا چھوٹا بھائی سید نعیم اللہ مرحوم اور عابد حسین صاحب جو ایک ممتاز شیعہ خاندان کے فرد ہیں اور جو تنہا بغرض تجارت ہمارے ساتھ ہوگئے تھے' مگر بفضل خدا ہم میں سے کسی کو ذرا سی بھی خراش تک نہ آئی' حالانکہ وہ تانگہ بہت بری طرح الٹا تھا۔ پھر ہم سنبھل سنبھلا کر گرد وغیرہ جھاڑتے ہوئے پیدل جانے لگے۔ ادھر سے ایک بارات جن میں تقریباً چالیس پچاس افراد تھے وہ ہمارے گرنے اور تانگہ الٹنے کا تماشہ دیکھتے ہوئے ہمارے قریب پہنچی اور انہوں نے ہم پر یہ آواز کسا کہ کیوں جناب مرزا صاحب کی پہلی منزل پر ہی کرامت دیکھ لی؟ کہ آپ لوگ اوندھے منہ گر پڑے۔ اس کا میں نے یہ جواب دیا کہ واقعی یہ ایک بڑی کرامت ہمارے لئے ظاہر ہوئی کہ ہم بصحت وسلامتی حضرت مرزا صاحب سے ملنے کے لئے جارہے ہیں اور باوجود تانگہ الٹا ہوجانے کے ہم کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ پھر اس پر ان لوگوں نے کہا کہ ضرور آپ لوگوں میں کوئی ولی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ غالباً بوقت سہ پہر دارالامان قادیان میں داخل ہوئے۔ ابھی

ہم اس تلاش میں تھے کہ کہاں جائیں اور حضرت صاحب سے کہاں ملیں۔ اتنے میں ایک صاحب جن کا نام غالباً میر احمد علی صاحب ہے وہ آکر ہمارے یکہ سے اسباب اتروائے اور ایک مکان کی جانب ساتھ لے کر چلے اور یہ مکان سلطان معتمد صاحب کا تھا اور اس کے اوپر بنگلہ تھا اور ہم نیچے' نعمت خانہ میں اتارے گئے جس کے ایک جانب ایک کمرہ تھا جس میں دو پلنگ پڑے تھے۔ ایک پر مولوی محمد احسن صاحب امروہی تشریف رکھتے تھے اور دوسرے پر ایک اور صاحب تھے جن کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں ہے لیکن وہ کسی انجینئری محکمہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ من اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ اس کے بعد محمد علی صاحب نے ہم سے دریافت کیا کہ آپ لوگ چاول کھانے کے عادی ہیں یا روٹی کے اور چائے وغیرہ بھی استعمال کرتے ہیں یا نہیں؟ اس پر ہم نے جواب دیا کہ چاول اور روٹی دونوں ہم استعمال کرتے ہیں اور چائے بھی دو وقت پیا کرتے ہیں' لیکن آپ کے اس تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔ اس پر احمد علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت صاحب کی ہم خادموں کو تاکید ہے کہ میرے مہمان کے ساتھ ان کی رہائش اور خورد ونوش کا ایسا انتظام کیا کریں کہ وہ ایک ہفتہ کے لئے آئے ہوں تو دو ہفتہ تک قیام کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دو ہفتے کے لئے آئے ہوں اور اکتا کر ایک ہی ہفتہ میں واپس ہو جائیں۔ غرض صاحب موصوف نے یہ کہہ کر چائے بسکٹ سے ہماری تواضع فرمائی۔

اس کے بعد وضو کر کے ہم نے عصر اور مغرب کی نمازیں مسجد مبارک میں حضرت صاحب کی اقتداء میں ادا کیں۔ مسجد مبارک بنگلے پر واقع ہے اور اس کی سیڑھیاں باہر سے ہیں اور یہ عرض میں کم اور طول میں زیادہ ہے۔ دوسرا راستہ زنانہ خانہ میں سے ہے جدھر سے حضرت صاحبؑ مسجد میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ مسجد میں کثرت احباب کی وجہ سے مصافحہ کا موقع بھی نہ مل سکا' صرف دیدار پرانوار کا شرف حاصل ہوا۔

دوسرے روز چٹھی جو خواجہ صاحب نے دی تھی ہم نے مولوی محمد علی صاحب کو دے دی۔ مولوی صاحب موصوف نے ہم کو اس مقام پر لے جا کر بٹھلایا جہاں حضرت مسیح موعودؑ ہر نماز کے وقت زنانہ دروازہ سے تشریف لا کر ایک حجاب میں جو بنگلے کے ایک سرے میں واقع تھا قیام فرماتے تھے۔ ظہر کی اذاں کے ساتھ ہی حضور علیہ السلام اسی حجرے میں تشریف فرما ہوگئے اور اس

کے بعد میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ اس پر حضرت صاحبؑ نے دریافت فرمایا کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضورؑ ہم لوگ حیدرآباد سے حاضر ہوئے ہیں۔ اس طرح الحمد للہ کہ ایک مدت دراز کی آرزو اور دلی تمنا پوری ہوگئی۔ حضورؑ نے میرا نام دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا نام سید ظہور اللہ احمد ہے۔ تو حضورؑ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے بزرگوں نے آپ کا نام بہت اچھا رکھا ہے۔ جواب بطور فال پورا ہوا ہے۔ میں اس وقت حضورؑ کے ارشاد کا منشاء یہی سمجھا کہ ''احمد'' کی مناسبت خاص حضور سے متعلق ہے۔ اسی سلسلے میں میں نے اپنے ساتھیوں کا بھی تعارف کروادیا۔ اس کے بعد حضورؑ نے ملازمت دریافت فرمائی جس کا جواب ادباً دیا گیا' پھر حضورؑ کے دست مبارک پر بیعت صوری سے مشرف ہوا۔ اس سلسلے میں میرے ساتھی بھی شریک تھے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز حضورؑ کے ساتھ ادا کیا اور بعد نماز حضورؑ واپس تشریف لے گئے اور ہم لوگ اپنے مقام مسکونہ پر واپس آگئے۔ اور ہر نماز میں دیدار کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ اور ہم لوگ آٹھ روز تک قادیان میں مقیم رہے۔

ایک روز بوقت صبح نماز فجر کے بعد ہی ہمارے مقام مسکونہ کے ایک جانب سیڑھیوں والا دروازہ کھلا اور اس میں سے حضرت صاحبؑ تشریف فرما ہوئے۔ اس وقت ہم لوگ سردی کے سبب سکڑے ہوئے لحاف اوڑھے ہوئے اپنی اپنی چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضورؑ ایکدم سیڑھیوں سے اتر کر تشریف فرما ہوگئے۔ ہم چاہتے تھے کہ لیکن آپ دری پر ہی چھارزانو نشست فرمائے۔ خبر نہیں کہ لوگوں کو کس طرح پتہ چل گیا کہ حضورؑ یہاں تشریف فرما ہیں۔ بس اس کے ساتھ ہی جس طرح شہد پر کھیاں یا شمع پر پروانے ہر طرف سے جمع ہوجاتے ہیں یہاں لوگ اسی طرح جمع ہوگئے اور حضورؑ دینی اور سلسلے کے اذکار فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں ڈاک آئی اور ملاحظہ عالی میں پیش ہوئی اور خاص طور پر ایک خط سنایا گیا' جس میں ایک سخت مخالف کے طاعون سے ہلاک ہونے کا ذکر تھا اور وہ شخص غالباً کشمیر یا جموں کا رہنے والا تھا اور جس نے حضرت کے مقابل بددعا کی تھی کہ مرزا صاحب ابتر ہوکر طاعون کا شکار ہوں گے۔ اس پر حضرت صاحبؑ نے اہل عملہ کو حکم دیا کہ اس کی مثل لائیں۔ حسب الارشاد اس کی تعمیل اسی وقت ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ ایک سال کا عرصہ گذرا تھا کہ وہ شخص آخر سال خود ابتر ہوکر معہ اہل وعیال کے طاعون سے ہلاک

ہوگیا ہے۔ اس پر حضرت صاحبؑ کے چشم مبارک سے آنسو روانہ ہونے لگے اور فرمایا کہ کیوں لوگ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔

اس کے بعد کوئی اور تذکرے پر میں نے عرض کیا کہ حضورؑ نے ملکہ وکٹوریہ وغیرہ کو دعانامہ بخیر فرمایا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہمارے شاہ دکن میر محبوب علی خان کو بھی ایک دعانامہ تحریر فرمایا جاتا۔ اس پر حضورؑ نے ارشاد فرمایا کہ ملکہ وکٹوریہ وغیرہ کو جو میں نے تبلیغ کی ہے ان کو میں جانتا ہوں کہ وہ علم دوست ہیں۔ آج وہ چھوٹے ہیں کل یہی اسلام کے بڑے شاندار بچے ہوں گے۔ آپ کے نظام کو اگر میں کوئی دعانامہ لکھوں تو فوراً وہ سمجھ جائیں گے کہ میں کچھ مانگنے کے لئے لکھا ہوں۔ پھر حضورؑ نے ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے رویاء میں دیکھا ہے کہ میں ایک اونچی چٹان پر بیٹھا ہوں اور میرے اطراف بڑا گھنا کوسوں پر پھیلا ہوا جنگل ہے اور میرے سامنے نیچے ایک مست جانور جو ہاتھی سے مشابہ ہے بیٹھا ہے اور ایک طرف جنگل میں گھستا ہے اور وہاں سے ایک چیخ وغل کی بڑی آواز اٹھتی ہے اور ہڈیاں چبانے کی آواز آتی ہے اور پھر وہ جانور میرے سامنے آکر دوزانوں بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کسی اور طرف جاتا ہے اور یہی آوازیں آتی ہیں۔ اور بیٹھ جاتا ہے اور زبان حال سے کہتا ہے کہ کیا کروں کہ مجھ کو یہی حکم ہے۔

اس کے بعد کچھ نئے آئے ہوئے لوگوں کی بیعت ہوئی بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ حضرت صاحب کی تشریف آوری جو ہماری عزت افزائی کا باعث ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی عادت مبارک میں۔ یہ داخل تھی کہ ہر مہمان کو اس کی فروکشی کے مقام پر تشریف فرما ہوکر اس کی عزت افزائی فرمائی جاتی جس سے ہم لوگ بھی متمتع فرمائے گئے۔

جب تک ہمارا وہاں قیام رہا ہر جلسہ میں جو نمازوں کے وقت ہوا کرتا تھا اس میں جو کچھ ارشاد ہوتا وہ سب دین سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے رشوت کے متعلق حضرت سے دریافت کیا کہ میرا پیشہ ڈاکٹری ہے۔ لوگ جب صحت مند ہوجاتے ہیں تو اپنی خوشی سے کچھ تحفے' ہدیہ اور نذر میرے پاس پیش کرتے ہیں۔ تو کیا یہ چیزیں رشوت کی تعریف میں داخل ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ حضورؑ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ دیکھو ہم تم کو ایک گُر بتاتے ہیں جس سے تم ہر موقعہ پر اس کا تصفیہ کرسکتے ہو۔ وہ یہ ہے کہ تم کو جو بھی چیز کوئی دے تم اپنی ضمیر سے یہ دریافت کرلو۔ کہ سرکار پر وہ

ظاہر ہو جائے تو تمہیں جھوٹ بولنا نہ پڑے۔ اور سچ بولنے پر سرکار کی گرفت میں نہ آئیں۔

ہمارے چند روزہ قیام میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ لوگ باوجود کئی مرتبہ کسی حکم کو سن پانے کے' ایک اور نئے شخص کے ذریعہ سے وہ بات دریافت کرواتے ہیں۔ اسی طرح مجھ سے بھی یہی کہا گیا کہ حضورؑ سے یہ دریافت کریں کہ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ میں اس بات کو ان لوگوں کے کہنے میں آکر کیوں کہ میں اس سے قبل لوگوں کی زبانی سن چکا تھا کہ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی' لیکن پھر بھی ان لوگوں کی باتوں میں آکر حضورؑ کے حکم پانے کا متمنی ہو کر حضرت سے عرض کیا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنے سے متعلق کیا ارشاد ہے۔ حضورؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مضبوط انجن اپنے پیچھے کی کئی گاڑیوں کو کھینچ کر منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے لیکن جس انجن میں جابجا رخنے پڑے ہوئے ہوں جس سے اس کی بھانپ چوطرف سے خارج ہو رہی ہو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ خود کوئی فاصلہ طے کر سکے چہ جائیکہ پیچھے کی گاڑیوں کو لے کر جائے بلکہ وہ پیچھے کی گاڑیوں کے لئے رکاوٹ ہو جائے گا۔

اس نعمت خانے کی ایک جانب جس میں ہم فروکش تھے ایک کمرہ تھا جس میں مولوی محمد احسن صاحب امروہی اور ایک انجینئر صاحب فروکش تھے۔ میں نے انجینئر صاحب موصوف سے ملاقات کی۔ وہ بے چارے گردوں کے عوارض اور ان کی تکالیف میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے یہ معلوم کیا کہ میں ڈاکٹر ہوں تو اپنی بیماری کا حال بیان کیا اور کہا کہ اصل مرض کی تکلیف اس روز بڑی شدت کی ہو جاتی ہے جس روز دربار رسول اللہ نصیب نہیں ہوتا۔ اثناء گفتگو انہوں نے بیان کیا کہ میں روڑکی یا کسی مقام پر انجینئری کام پر مامور ہوں۔ جب میں نے حضرت صاحب کے دعاوی کو سنا تو میں سخت مخالف ہو گیا اور دل میں ٹھان لیا کہ میں خود رخصت لے کر جاؤں اور حضرت صاحب کی خوب خبر لوں۔ اس غرض سے میں رخصت لے کر قادیان تشریف لایا اور بحیثیت مہمان کے فروکش ہو گیا اور مجھ میں غیظ و غضب بھرا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ کل حضرت صاحب سے مل کر اپنی غرض پوری کروں' شب میں' میں خواب دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا عالی شان روشنی سے چمکتا ہوا کمرہ ہے اور دونوں بازو پر تکلف کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور بیچ میں ایک شاندار تخت ہے جس پر دو ہم شکل و صورت نورانی چہرے کے' صاحب جلالی حضرات تشریف فرما ہیں

اور دونوں جانب کرسیوں پر بھی بڑے بڑے نورانی شکل کے اصحاب متمکن ہیں اور دروازے پر دربان کھڑے ہوئے ہیں۔ میری جرأت نہ ہوئی کہ میں دروازہ میں قدم رکھوں۔ دربان کے پاس کھڑا ہو گیا اور دریافت کیا کہ یہ دربار کن کا ہے اور یہ دو ہمشکل صاحبان کون ہیں؟ اور کرسی نشین اصحاب کے کیا عہدے ہیں؟ تو دربان نے مجھ سے کہا کہ یہ دربار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ہم شکلوں میں جو سیدھے جانب ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جو بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہیں وہ غلام احمد ہیں اور کرسی نشین صاحبان قطب الاقطاب اور بڑے بڑے اولیاء اللہ ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھی کہ یکبارگی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میری جانب پڑی تو آپؐ نے بائیں جانب کے غلام احمد سے کچھ دریافت فرمایا' جس پر غلام احمد صاحب نے کرسی نشینوں میں سے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے ان کے ذریعہ مجھے اندر بلوالیا اور میں تخت کے پاس حاضر ہو کر تخت کو بوسہ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام احمد صاحب سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ ان سے واقف ہیں' تو غلام احمد صاحب نے خواب میں فرمایا کہ حضور میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ غلام کا مہمان ہے۔ اس بندے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تو ہمارے پاس حاضر ہوا کر'' میں اس خواب سے بیدار ہو کر' شکر خداوندی ادا کرنے کے بعد اس خواب کو میں نے ایک کاغذ پر من و عن لکھ دیا اور ایک چٹھی حضرت صاحب کی خدمت میں روانہ کی کہ اس خادم نے ابھی ابھی ایک خواب دیکھا ہے چاہتا ہوں کہ حضرت کی خدمت میں آکر عرض کروں۔ تو آپ نے اسی چٹھی پر جواب دیا کہ تو نے جو خواب دیکھا ہے میں بھی دیکھا ہوں۔ میں اس کو قلمبند کر لوں گا اور تو بھی اس کو لکھ لے۔

صحابی حضرت مسیح موعودؑ مولوی محمد صفدر حسین صاحبؓ کے حالات

بلحاظ سنہ ہجری آج سے کوئی ایک دو سال قبل یعنی سن ۱۳۱۰ ہجری میں مولوی محمد صفدر حسین صاحب مرحوم و مغفور نے ایک مختصر سا رسالہ ''سفرنامہ قادیان'' شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے سفر قادیان دارالامان اور حضرت مسیح موعودؑ سے ملاقات کا تفصیلی ذکر شائع کرتے ہوئے اپنے تاثرات اور اس زمانے کے مخالفین احمدیت کے اعتراضات و سوالات کے مختصر جوابات بھی شائع کئے ہیں۔ یہ نادر و نایاب کتاب خاکسار کے پاس ہے اور اس کے چند اہم اقتباسات ایک صد سال قبل کے ایمان افروز واقعات' حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرۃ اور مصروفیات اور آپ کے ملنے والوں کے تاثرات ظاہر کرتے ہیں اور خود صاحبِ خبر کے عقائد کا بھی اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت مولوی محمد صفدر حسین صاحب مرحوم قصبہ سنگاریڈی ضلع میدک کے رہنے والے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علماء میں آپ کا شمار تھا اور پیری مریدی، فلسفہ اسلامی اور اہل اسلام میں جاری بحث عقیدہ و فلسفہ وحدت الوجود اور دیگر علمی مباحث پر یہ گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور صاحب قلم تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی ایک تصنیف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں بھی بغرض رائے روانہ کی تھی اور حضرت مسیح موعودؑ نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ اپنی رائے بھی روانہ فرمائی تھی۔ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کے اُس خط کی نقل بھی اس کتابچے میں شائع کی ہے۔ سفر قادیان اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ملاقات کے بعد اس علاقے کے علماء اور مشائخین نے جو اعتراضات حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور عقاید احمدیت پر کئے ہیں۔ انہوں نے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں جس سے ان کے عقائد صحیحہ کا پتہ چلتا ہے اور انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔

اپنی کتاب کی وجہ اشاعت بیان کرتے ہوئے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''اے میرے احباب' مرزا صاحب کا جو کچھ حال میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے

یا جس قدر کہ میں نے اپنے آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو کچھ میری اصل رائے اور سچا خیال ہے بے کم و کاست اس کو یہاں لکھ دیا ہوں تا کہ ہر ایک میرے مختلف الخیال احباب کو اپنے اپنے مذاق کے موافق ان مختلف مضامین سے دلچسپی حاصل ہو اور مجھے بار بار ان حالات کے بیان کرنے کی زحمت سے خلاصی ہو۔''

ورود و قیام قادیان ۱۲ محرم (۱۳۱۰ ہجری) کو بٹالہ سے بذریعہ تانگہ روانہ ہوکر ایک بجے دن کے قادیان میں داخل ہوئے۔ اس وقت نماز ظہر ہورہی تھی۔ میں اس میں شریک ہوگیا۔ بعد نماز ظہر مرزا صاحب نے بہت تپاک سے ملاقات فرمائی۔ بنگلہ کا ایک حجرہ خالی کروایا۔ سامان ضروری رکھوا دیا۔ کھانے کے لئے فرمایا چونکہ میں کھانا کھا چکا تھا لہٰذا چائے تیار کروائی گئی غرض کہ نہایت عنایت کے ساتھ تھوڑے وقت تک حالات دریافت فرماتے رہے اور مہمانداری کے تعلق سے انتظام کے لئے اپنے لوگوں کو تاکید کردی۔ اگرچہ میرا قصد وہاں تین دن سے زیادہ رہنے کا نہ تھا۔ دوسرے دن جب مرزا جی کو معلوم ہوا تو وہ مانع ہوئے۔ جمعہ تک رہنے کے لئے فرمایا۔ آخر کار ایک مہینے تک مجھے وہاں رہنا پڑا۔

چونکہ مرزا صاحب اکثر اپنے ضعف دماغ کی وجہ سے دردسر سے علیل رہتے ہیں۔ خصوصاً اس عرصہ میں اس کا دورہ بھی تھا۔ قطع نظر اس کے کہ کتاب ''دافع الوساوس'' کی طبع کا کام بڑے اہتمام سے جاری ہے۔ خود مطبع مکان پر منگوایا گیا ہے۔ لہٰذا اور بھی کم فرصتی تھی کیونکہ ساتھ ہی ساتھ مسودہ لکھا جاتا ہے اور طبع ہوتا رہتا ہے اور رہے گا۔ اس کے چاروں طرف سے خطوط کی بوچھاڑ ہے۔ ان کا جواب دینا ہی ایک آدمی کا کام ہے۔ باوجود ان وجوہ قلت فرصت کے اکثر مرزا صاحب بعد نماز صبح و عصر اپنے مہمانوں سے بہ کشادہ پیشانی ملتے رہتے ہیں۔ اور مہمانوں کی بھی کثرت رہتی ہے۔ روزانہ دس پانچ مہمان ہمیشہ رہتے ہیں۔ دسترخوان کشادہ ہے۔

منجملہ ان مہمانوں کے مولوی برہان الدین صاحب جہلمی کی ملاقات سے میں نہایت محظوظ ہوا۔ وہ ایک لایق متقی باوفا شخص ہیں۔ انہوں نے مولوی نذیر حسین صاحب سے علم حدیث کو تمام کیا ہے۔ ان کا نام عمل الحدیث کے ترویج دینے والے پیشواؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے اور ان کے بھائی مولوی لقمان صاحب کی وجہ سے صوبہ پنجاب میں عمل بالحدیث ترویج پایا اور

بڑے بڑے معرکے رہے۔ آخر زمانے میں ان کو اکثر اہل اللہ صوفیوں سے سابقہ پڑا۔ ان کے حالات اور خوف عادات کے مشاہدہ سے اس فرقہ کے ساتھ ان کو حسن ظن پیدا ہوگیا۔ سات آٹھ سال بیشتر جب کہ مرزا صاحب کے کچھ حالات سنے' انہوں نے جب تنہائی اختیار کی تھی اور ہوشیار پور چلے گئے تھے مگر اپنے مقام سے گھر والوں کو بھی اطلاع نہیں دی تھی ۔ غرض مولوی صاحب ان کی تلاش میں ہوشیار پور گئے اور بڑی کوشش سے ان کو پایا۔ اور کئی دنوں تک ان کے نزدیک رہے۔ مولوی صاحب موصوف طالب بیعت ہوئے تو مرزا صاحب نے عذر کیا کہ ابھی میں اس امور پر مامور نہیں ہوا ہوں۔ اسی عرصہ میں مرزا صاحب نے ان کے نسبت ایک جملہ الہام کا سنایا تھا جو خود ایک طرح کی ان کے حق میں بطور بشارت کے پیش گوئی تھی۔ غرض مولوی صاحب موصوف چند روز بعد جہلم کو واپس ہوگئے ۔ بعد میں انہوں نے مرزا صاحب کی نسبت مختلف افواہ سنتے رہے۔ آخر کار دوبارہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے جو مرزا صاحب کے سخت مخالف ہیں ایک فتویٰ کفر کا بعد دستخط چند مولوی صاحبان کے مولوی برہان الدین صاحب کے پاس جہلم بھیج دیا تاکہ وہ بھی دستخط کریں اور پھر اس پر وہ مولوی صاحبان اطراف و اکناف لوگوں کے لے کر واپس کریں۔ مولوی برہان الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں اس معاملے میں سخت مشکل میں پڑ گیا کیونکہ جب مرزا صاحب سے ملا تھا تو ان کی حالت عمدہ تھی۔ چونکہ ان کو مرزا صاحب کی کوئی کتاب بھی نہ ملی تھی' جس سے وجوہ کفر کے بھی دریافت کئے نہیں جا سکتے تھے۔ آخرش انہوں نے اس فتوے میں جو حقائق بتلائے گئے تھے اس کے قایل اور مہر کردی اور اس پر بہت سی دستخطیں بھی ثبت کردی گئیں۔ اس کے بعد ہی مولوی برہان الدین صاحب کو مرزا صاحب کا رسالہ ''ازالہ ادہام'' مل گیا تو اس میں ان وجوہ تکفیر کو جو فتوے میں بیان کئے گئے تھے نہ پایا تو اب تکفیر کی مخالفت پر گفتگو ہونے لگی۔ بعض تو ان کے شریک حال رہے اور بعض مخالف آلہ کار محفل بنے خود مولوی صاحب مرزا صاحب سے ملے اور حقیقت حال دریافت کیا۔

چنانچہ وہیں کے رہنے والے ایک تاجر نے جن کا نام میں اب بھولتا ہوں مولوی صاحب کو خرچ بھی دیا اور خود بھی ان کے ہمراہ قادیان پہنچے۔ یہ صاحب تین سال پیشتر ایک خواب دیکھے تھے اور مولوی برہان الدین صاحب سے کہا بھی تھا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ خواب میں

ایک گاؤں پر پہنچے کوئی ان سے یہ کہتا ہے کہ یہاں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ وہ گاؤں میں آئے اور حضرت سے ملے اور کہنے والے نے خواب میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ گاؤں ساری دنیا میں مشہور ہوجائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب مع اس تاجر کے قادیان کے نزدیک پہنچے تو تاجر نے کہا کہ پیشتر کے خواب میں جو گاؤں کہ میں نے دیکھا تھا اسی طرح کا تھا۔ یہ باغ اور یہ راستہ اور یہ مکان وغیرہ ویسا ہی ہے جبکہ مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے تو مرزا صاحب مغرب رویہ دروازے سے باہر آئے اور ان سے مل کر مشرق رویہ دروازے سے مکان میں داخل ہوگئے۔ حالانکہ خواب میں بھی اسی طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تھی۔ غرض اس واقعہ سے ہر دو صاحبوں کا اعتقاد واضح ہوگیا اور مولوی برہان الدین صاحب مرزا صاحب کے بڑے زبردست معتقد بن گئے اور اب تک یہیں مقیم ہیں۔

مرزا صاحب کے یہاں جلال الدین صاحب میر منشی رسار نگال سیالکوٹ سے آئے ہوئے موجود تھے۔ وہ بھی پہلے مرزا صاحب سے بیعت کے طالب ہوئے تھے لیکن مرزا صاحب نے وہی عذر عدم ماموریت کا فرمایا تھا۔ بعد میں چند ایک احباب کے بیعت لینے لگے تو انہوں نے آکر بیعت کی۔ یہ تیسرا وقت تھا جو مرزا صاحب کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی بھی اکثر واقعات سنے گئے۔

اسی عرصہ میں مولوی حافظ نور الدین صاحب تشریف لائے تھے۔ وہ ایک ایسے مشہور شخص ہیں کہ اس وقت اکثر مخالف مولوی صاحبان بھی ان کی علمی لیاقت وفہم وذکاوت کی تعریف کرتے ہیں۔ فی الحال مولوی نور الدین صاحب درجہ اول کے معتقد ومحبّ وممد مرزا صاحب کے ہیں۔ مرزا صاحب کے لائق مخالف کو بھی تعجب ہے کہ مولوی نور الدین صاحب جیسے ذی علم شخص کیوں مرزا صاحب کے معتقد بن گئے ہیں اور مولوی نور الدین صاحب کا ماننا تو یہ ہے کہ میں نے بہت سی نامور تفسیریں دیکھیں۔ ہند وعرب پھرا' علم ادب و حدیث اور تفسیر حاصل کیا۔ مگر حقائق و معارف قرآنی مرزا جی کے بطفیل جو مجھ پر عیاں ہوئے ہیں وہ ایسے حقائق و معارف ہیں کہ نہ میں نے کبھی سنے تھے اور نہ کہیں دیکھے ہیں۔ اگر کوئی علم قرآن کا حاصل کرنا چاہے تو مرزا جی ہی سے حاصل کرے۔ اور وہ یہی کہتے تھے کہ اگر کوئی مرزا جی کی ابتدائی حالت تعلیم اور

ان کے اکتسابی علم پر نظر ڈالے اور پھر ان کے اردو و فارسی و عربی تحریرات اور قرآن مجید کے اسرار و نکات اور ان کے بیانات پر غور کرے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا علم من اللہ اور ان کو انشراح صدر ہے۔

الحاصل، جمعہ کے دن میں قادیان سے نکلا۔ جناب مرزا صاحب نے اپنے وسیع اخلاق کو کام میں لایا اور آبادی کے باہر تک آ کر رخصت کر گئے۔

بعض استفسارات اور ان کے جواب:

۱۔ آپ نے ان کے معتقدین و مریدین کو کس طرح پایا اور ان کے یہاں بیعت وسلوک کا کیا طریقہ ہے اور معارف کا ارشاد کس طرح کیا جاتا ہے؟

جہاں تک مجھے معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ جملہ ارکان اسلامی کی پابندی کی نصیحت کے ساتھ نماز کی سخت تاکید کرتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے معنیٰ کے ملاحظہ کا ارشاد ہوتا ہے۔ نماز تہجد و کثرت درود و استغفار و تلاوت قرآن مجید پر سخت زور دیا جاتا ہے۔ تقویٰ کی تاکید اور تہذیب اخلاق کی نصیحت ہر وقت رہتی ہے اور بیعت کا طریق بھی بہت سادہ ہے۔ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول پر دست بہ دست وعدہ لیا جاتا ہے۔

مولوی برہان الدین صاحب نے سند توحید کے متعلق کچھ مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ان سے کچھ کہا تھا تو منشی جلال الدین صاحب نے مرزا صاحب سے عرض کیا تھا کہ کچھ سعادت توحید کی نسبت ارشاد فرمائیں۔ ان کے جواب میں مرزا صاحب نے فرمایا کہ اطاعت کا ارشاد نہایت ضروری ہے اور اہم ہدایت تقرب الٰہی ہے لیکن اس کا حصول بطریق حال کے چاہئے نہ کہ بطریق قال کے۔ اور اس معرفت الٰہی کا حال بھی تقویٰ کے حامل ہوتا ہے۔ پہلے تم تقویٰ کے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ انشاء اللہ ایک نور پیدا ہوگا اور وہی ہدایت کرے گا۔ فقط (یہاں مرزا صاحب نے اس نصیحت میں گویا قولہ تعالےٰ و اتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ کی تفسیر فرمائی ہے)۔

ابتدائی دور کے مخلص احمدی محمد عظیم الدین صاحب

یہ عاصی محمد مقیم الدین احمد صفہ دارالقرر دنبدل محکمہ صدر نظامت کوتوالی اضلاع سرکار عالی مکونہ بیرون پرانا پل روبروئے باغ راجہ کرن بیرون بلدہ حیدرآباد دکن کے واقعات و حالات سلسلہ احمدیہ میں داخل ہونے کے حسب ذیل ہیں۔ عالی جناب مولانا مولوی سید حسین صاحب المتخلص ذوقی سے عاجزانہ التماس ہے کہ ان کو اپنی تالیف موسومہ شاہ نامہ احمدی میں درج فرما کر عنداللہ ماجور ہوں عاصی کو ممنون و مشکور فرمائیں۔

اشھد ان لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ ۔ یہ عاجز خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناظر جان کر حسب ذیل واقعات و حالات عرض کیا ہے۔ تسلسل حالات کے لئے یہ عرض کرنا بھی مفید ہے کہ اس عاجز کی ۱۴ یا ۱۵ سال کی عمر کے زمانے میں میرے والد ماجد حضرت محمد خیر الدین احمد صاحب مرحوم (غیر احمدی) ایک روز نصیحتاً فرما رہے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ جب آسمان سے نازل ہوں گے اس وقت بڑے بڑے علماء بھی ان کا انکار کر کے ان کو کافر اور کذاب کا فتویٰ دیں گے اور ان کے متبعین کو سخت تکالیف دیں گے۔ چنانچہ والدین کے انتقال کے مابعد یہ عاصی سلسلہ احمدیہ کے مقاصد سے بالکل ناواقف اس وجہ سے تھا کہ میرے مسکونہ محلّہ اور اس کے قرب و جوار کوئی احمدی نہ تھے اور نہ کسی احمدی سے میری ملاقات تھی۔ اس لئے جتنے اہل محلّہ یا دوست واحباب تھے وہ سب غیر احمدی تھے۔ وہ سب سلسلہ احمدیہ کے خلاف کچھ ایسے عقاید بیان کرتے تھے کہ وہ عقاید اسلام کے عقائد سے بہت مخالف پائے جاتے تھے۔ اگر میں کبھی کسی صاحب سے سن پاتا کہ فلاں صاحب احمدی ہیں تو بخوف خیالات ساعیہ میل جول سے دور رہتا بلکہ کبھی سلسلہ کے عقائد کو دریافت کرنا بھی دل نہ چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ میرے محلّہ بازار عنبر قدیم اندرون حیدرآباد میں اور قرب محلّہ نہار خانہ میں کچھ عرصہ تک حضرت قبلہ مولانا میر محمد سعید صاحب احمدی امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن سکونت پذیر بھی رہے مگر میں بوجہ خیالات ذہن نشین برکات سلسلہ عالیہ احمدیہ سے محروم رہا۔ اللہ تعالیٰ میرا یہ گناہ معاف فرمائے۔ آمین

کچھ عرصہ کے بعد جب میں تعلیم و تدریس کی غرض سے حضرت موصوف کے دولت خانہ واقع بی بی بازار پر حاضر ہوتا رہا۔ وہاں جو احباب احمدی اور غیر احمدی حضرت سے سلسلہ احمدیہ کی نسبت گفتگو فرماتے تھے۔ اس کو سننے کے بعد حضرت موصوف کے ارشاد مبارک کو اسلامی عقائد کے موافق پاکر متحیر ہو جاتا۔ قرآنی درس میں بحمد اللہ مخالفانہ ذہن نشین خیالات کا صفایا ہو گیا اور حضرت موصوف کی پاک اور بے لوث زندگی اور کلمات کا اثر روز افزوں ہونے لگا۔ ادھر زمانے کی مخالفانہ روش سخت تھی اور ادھر مجھ عاصی کو شوق بیعت ہوتا رہا۔ مگر مصلحت کو اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ تین سال تک حضرت موصوف نے مجھ سے بیعت نہ لی۔ دوسرے احباب کی بیعت لے لی جاتی تھی اور مجھ عاصی کے پے درپے اصرار و التجا پر فرماتے رہے کہ آپ بیعت میں داخل ہیں۔ اس تین سال کے عرصہ میں یہ عاصی جو اکثر خواب میں دیکھا۔

۱۔ ایک روز میں درس قرآن کے بعد حضرت قبلہ کے پاس سے اپنے گھر واپس مکہ مسجد میں سے آرہا ہوں کہ پیچھے سے ایک صاحب فقیرانہ لباس پہنے ہوئے میرا سیدھا بازو ہلائے اور سلام علیک کے بعد دریافت فرمائے "تو مجھے جانتا ہے میں کون ہوں" سلام کا جواب ادا کرنے کے بعد تعارف سے لاعلمی ظاہر کرنے پر ارشاد فرمایا کہ میں عیسیٰ ابن مریم ہوں۔ میں مر گیا ہوں، زندہ نہیں ہوں۔ یہ سن کر میں اپنے گھر کا رخ کرکے پھر پلٹ کر دیکھا، وہ صاحب غائب تھے۔

۲۔ ایک وسیع جنگل ہے اور وہاں چند قبور مٹی کے اہل اسلام کے ہیں اور ایک قبر کھدی ہوئی زیر تالاب ہے۔ اس کھدی ہوئی قبر میں ایک لاش کفن پہنی ہوئی رکھی ہوئی ہے اور میں بھی قبر میں ہوں۔ اس لاش کا منہ قبلہ رخ کر رہا ہوں اور تن تنہا ہوں۔ اچانک سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ وحشی انسانی صورت شکل بے لباس کمر میں پٹکہ اور اس پر گھنگھرو لگے، ہاتھ میں ہر ایک کے لوہے کا گدر اٹھائے ہوئے گویا مجھ پر پھوڑنا چاہتے ہیں۔ مگر ایک صاحب عمر رسیدہ نورانی چہرہ، نحیف الجثہ، مشرع، سفید ریش ولباس وعمامہ قبر پر تشریف فرما ہیں، دست مبارک اٹھا کر گدر کو روکے ہوئے سختی سے ارشاد فرما رہے ہیں کہ خبردار یہ میرا ہے۔ اس ارشاد کو سنتے ہی وہ دونوں غائب ہو گئے اور حضرت بھی غائب ہو گئے۔ قبر سے اوپر نکلتے ہی خدا کی قسم میرا دل

اس وقت اسی حالت میں کہہ اٹھا کہ یہ صاحب حضرت نبی کریمؐ ہیں۔

۳۔ ایک جنگل میں شمال کی جانب جا رہا ہوں جہاں کچھ دور نشیب ہے اور بعد ایک ٹیلا اور پھر نشیب ہے اور بعد ٹیلا ایسے تقریباً ساتھ آٹھ ٹیلے ان کے بعد سامنے دور سے نظر آرہا ہے کہ وہاں زمین پر سفید فرش بچھا ہوا ہے۔ میں وہاں جا کر دیکھا کہ حقیقتاً سفید فرش بچھا ہوا ہے اور فرش پر ایک تخت ہے۔ تخت پر بھی فرش سفید ہے۔ تخت کے قریب ایک صاحب تقریباً پچاس سال عمر نورانی کھڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، ابرو کشادہ اور گہرے، گندم رنگ، عمامہ پنجابی وضع باندھے ہوئے۔ قوی الجثہ، متشرع، سفید عریض ولباس وعمامہ با ادب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور تخت کے سامنے جب صاحبین متشرع نورانی چہرے سفید لباس وعمامہ...... آداب مجلس چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی خاموشی سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی تخت نشین صاحب کے آمد کا انتظار ہے۔ میرا اس نظارہ کو ختم کرنا ہی تھا کہ شمال کی جانب سے ایک صاحب نمودار ہوئے جو نہایت ہی عمر رسیدہ نورانی چہرہ، نحیف الجثہ، متشرع، باریش ولباس وعمامہ ہے فرش پر تشریف فرما ہوتے ہی اہلیان مجلس سر وقد جھکائے ہوئے تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور وہ ان صاحب کو تخت کے قریب میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے ان کا سیدھا بازو پکڑ کر تخت پر لے جا کر کھڑے ہو کر سب کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا کہ مسیح موعود یہ ہی ہے۔ بس مجلس وغیرہ یک لخت غائب ہو گئی۔ اس وقت خدا کی قسم دل بول اٹھا کہ یہ مجلس صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی ہے اور وہ حضرت نبی کریم صلعم اور یہ حضرت مسیح موعودؑ ہیں۔

۴۔ ایک مرتبہ حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت کے لئے عاصی اپنا مسئلہ ترقی تنخواہ کو معیار اس طرح بنایا کہ میں خدمت صلہ واری نوع مواجبی (پندرہ روپے) پر کارگذار تھا اور ایک صاحب جو معمولی نوشت و خواند سے واقف اور سرامری جوانان فوج میں معمولی حاضری نویس تھے۔ مولوی خواجہ کمال الدین صاحب بی اے مبلغ لندن کے بوقت تشریف آوری بلدہ حیدرآباد دکن ان کو خدمت گزیٹیڈ صوبیداری نوع مواجبی (بیس روپے) یک لخت دینے کی سفارش پر فوجی خدمت گزیٹیڈ میں رہنے کا حکم بھی ہو چکا تھا۔ یہ عاصی بھی اپنی ترقی کو حضرت مسیح موعودؑ کی معیار صداقت مقرر کرکے ذریعہ درخواست وہی گزیٹیڈ خدمت صوبیداری فوج مواجبی (بیس روپے) کی استدعا کرنے پر میری نسبت حکم ہو گیا کہ خلاف موازنہ ان کی صوبیدار منیہ

داری؛ بجائے پندرہ روپے کے بیس روپے قرار دی جائے اور وہ صاحب ایک پائی کی بھی ترقی سے محروم رہے۔

چوں کہ میں روزانہ حضرت قبلہ مولانا محمد سعید صاحب مرحوم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور واقعات جو کچھ مجھ پر گذرتا وہ عرض کرتا رہتا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے کامل عقائد اسلام ہی کے عقائد ہیں۔ اس لئے میں حضرت موصوف سے؛ باوجود شدید مخالفت زمانہ کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت لینے کے لئے عاجزانہ عرض و اصرار کرنے پر ارشاد فرمایا کہ آٹھ روز میں بیعت لی جائے گی۔ مگر اندرون آٹھ یوم پھر یہ عاصی خواب دیکھا کہ

۵۔ ایک آباد شہر ہے جس کے فصیل اور دروازے بھی ہیں۔ ایک دروازے کے قریب عدالت کا مکان ہے۔ میں اس عدالت کے آمد و رفت کی گلی میں بہت دور پیشاب کی غرض سے ابھی بیٹھنے ہی پایا تھا کہ سرکاری جوان نے مجھے ہاتھوں ہاتھ اسی عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے میں نہایت شرمندہ کھڑا رہا۔ عدالت نے مجھے بلا دریافت جرم سرزد نہ ہونے کی وجہ سے بلا کسی الزام کے رہا کر دیا۔ میں نہایت پشیمانی و شرمندہ و منفعل ہو کر عدالت کے باہر آ کر ابھی اس گلی سے کچھ دور جانے نہ پایا تھا کہ ایک صاحب پنجابی لباس شملہ؛ قمیص؛ و تہمد پہنے؛ مشرع؛ کھڑا چہرہ؛ بلند بینی؛ کشادہ پیشانی ابر و کشادہ گہرے میرا سیدھا بازو پکڑ کر ارشاد فرمائے کہ یہ چھوٹی سی عدالت اور چند لوگوں میں تجھ کو اتنا شرمندہ ہونا پڑا۔ کل قیامت میں خدا تعالیٰ کے سامنے اور اتنے مجمع میں کتنی شرمندگی ہوگی۔ یہ کہہ کر میرا بازو چھوڑتے ہی میں بیدار ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ صاحب حضرت قبلہ غلام احمد مسیح موعودؑ ہیں۔ اور علی الصبح حضرت موصوف کے دولت خانہ واقع بی بی بازار حاضر ہو کر تمام واقعہ کہنے کے بعد عرض کیا کہ میں بہت بے چین ہوں اور بقیہ دن مجھ پر بہت سخت ہیں۔

اس پر حضرت موصوف نے تعین وقت بیعت فرما کر غریب خانہ واقع بازار عنبر قدیم اندرون بلدہ حیدر آباد تشریف فرما کر مجھ عاصی اور اہلیہ اور لڑکے کو ۲۳ فصلی میں داخل بیعت فرمایا۔ واضح ہو کہ میری اہلیہ سلسلہ کے کتب عوام کی غلط بیانی عقاید اور احمدی صاحبان کے خلاف سختی اور

اختلاف اخلاق برتاؤ کو اور نیز احمدی عقائد کو ہمیشہ سنا کرتی تھی وہ بھی بخوشی داخل بیعت اپنے عزیز رشتہ دار بھائی و محبّ کے سامنے ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس وقت اس عاصی کی اہلیہ اور بچے ہمشیرہ اور برادر نسبتی اور ان کی اہلیہ جو ایک ہی مکان میں ہم سب رہا کرتے ہیں۔ سب کے سب بفضل الٰہی احمدی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آئندہ نسل کو اهدنا الصراط المستقيم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور غير المغضوب عليهم ولا الضالين سے بچائے۔ الٰہی آمین ثم آمین یا رب العالمین۔

م ۳۰/۹/۴۱ ف م ۲۰/۳/۵۱ ھ شرح دستخط (محمد عظیم الدین احمد)

ابتدائی دور کے مخلص احمدی محترم سیٹھ محمد غوث صاحبؓ

از قلم حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب کا انتقال ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو بعمر قریباً ۷۰ سال ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں ان کی زندگی کے مختصر حالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر مشیت ایزدی نے مجھے موقعہ نہ دیا کہ میں اس کی تکمیل کر سکوں چنانچہ اب پندرہ برس بعد جب ان کی وفات ہوئی تو میں نے چاہا کہ سردست ایک مختصر تذکرہ ان کا اس محبت اور اخلاص کے شکریہ میں جو وہ خاکسار سے محض للّٰہ رکھتے تھے شائع کر کے اذکروا موتاکم بالخیر کے ارشاد نبویؐ پر عمل کی توفیق پاؤں۔

میں ایک عرصہ سے اخبار میں کچھ نہیں لکھتا۔ میرا یہ دستور تھا کہ قریباً ہر اس مرنے والے بھائی کا تذکرہ لکھ دیتا جو سلسلہ میں اپنے اخلاص و وفا کے لحاظ سے اپنی زندگی دوسروں کے لئے قابل نمونہ رکھتا ہو۔ لیکن اب کچھ تو اپنی پیرانہ سالی اور اعصابی ضعف کی وجہ سے اور کچھ بعض دوسرے علائق نے مجھے کوتاہ قلم کر دیا ہے۔

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب کی وفات نے میرے دل و دماغ میں پھر ایک تحریک کی اور میں تذکرہ لکھ رہا ہوں؛ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو حضرت سیٹھ حسن صاحب اور سیٹھ محمد غوث

دار، بجائے پندرہ روپے کے بیس روپے قرار دی جائے اور وہ صاحب ایک پائی کی بھی ترقی
سے محروم رہے۔

چوں کہ میں روزانہ حضرت قبلہ مولانا محمد سعید صاحب مرحوم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا
رہتا تھا اور واقعات جو کچھ مجھ پر گذرتا وہ عرض کرتا رہتا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ سلسلہ
عالیہ احمدیہ کے کامل عقائد اسلام ہی کے عقائد ہیں۔ اس لئے میں حضرت موصوف سے
باوجود شدید مخالفت زمانہ کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت لینے کے لئے عاجزانہ عرض و اصرار
کرنے پر ارشاد فرمایا کہ آٹھ روز میں بیعت لی جائے گی۔ مگر اندرون آٹھ یوم پھر یہ عاصی
خواب دیکھا کہ

۵۔ ایک آباد شہر ہے جس کے فصیل اور دروازے بھی ہیں۔ ایک دروازے کے قریب عدالت کا
مکان ہے۔ میں اس عدالت کے آمد و رفت کی گلی میں بہت دور پیشاب کی غرض سے ابھی
بیٹھنے ہی پایا تھا کہ سرکاری جوان نے مجھے ہاتھوں ہاتھ اسی عدالت میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ
کے سامنے میں نہایت شرمندہ کھڑا رہا۔ عدالت نے مجھے بلا دریافت جرم سرزد نہ ہونے کی
وجہ سے بلاکسی الزام کے رہا کر دیا۔ میں نہایت پشیمانی و شرمندہ و منفعل ہو کر عدالت کے باہر
آ کر ابھی اس گلی سے کچھ دور جانے نہ پایا تھا کہ ایک صاحب پنجابی لباس شملہ، قمیص، وتہد
پہنے، مشرع، کھڑا چہرہ، بلند بینی، کشادہ پیشانی ابرو کشادہ گہرے میرا سیدھا بازو پکڑ کر
ارشاد فرمائے کہ یہ چھوٹی سی عدالت اور چند لوگوں میں تجھ کو اتنا شرمندہ ہونا پڑا۔ کل قیامت
میں خدا تعالیٰ کے سامنے اور اتنے مجمع میں کتنی شرمندگی ہوگی۔ یہ کہہ کر میرا بازو چھوڑتے ہی
میں بیدار ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ صاحب حضرت قبلہ غلام احمد مسیح موعودؑ ہیں۔ اور علی الصبح
حضرت موصوف کے دولت خانہ واقع بی بی بازار حاضر ہو کر تمام واقعہ کہنے کے بعد عرض کیا
کہ میں بہت بے چین ہوں اور بقیہ دن مجھ پر بہت سخت ہیں۔

اس پر حضرت موصوف نے تعین وقت بیعت فرما کر غریب خانہ واقع بازار عنبر قدیم
اندرون بلدہ حیدر آباد تشریف فرما کر مجھ عاصی اور اہلیہ اور لڑکے کو ۲۳ فصلی میں داخل بیعت فرمایا۔
واضح ہو کہ میری اہلیہ سلسلہ کے کتب عوام کی غلط بیانی عقاید اور احمدی صاحبان کے خلاف سختی اور

اختلاف اخلاق برتاؤ کو اور نیز احمدی عقائد کو ہمیشہ سنا کرتی تھی وہ بھی بخوشی داخل بیعت اپنے
عزیز رشتہ دار بھائی و محبّ کے سامنے ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس وقت اس عاصی کی اہلیہ اور بچے ہمشیرہ اور برادر نسبتی
اور ان کی اہلیہ جو ایک ہی مکان میں ہم سب رہا کرتے ہیں۔ سب کے سب بفضل الٰہی احمدی
ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آئندہ نسل کو اھدنا الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور
غیر المغضوب علیھم ولاالضالین سے بچائے۔ الٰہی آمین ثم آمین یا رب العالمین۔

م۳۰/۹/۴۱ف م۲۰/۳/۵۱ھ شرح دستخط (محمد عظیم الدین احمد)

ابتدائی دور کے مخلص احمدی محترم سیٹھ محمد غوث صاحبؓ

از قلم حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب کا انتقال ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو بعمر قریباً ۷۰ سال ہوگیا۔
انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں ان کی زندگی کے مختصر حالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا
مگر مشیت ایزدی نے مجھے موقعہ نہ دیا کہ میں اس کی تکمیل کر سکوں چنانچہ اب پندرہ برس بعد جب
ان کی وفات ہوئی تو میں نے چاہا کہ سردست ایک مختصر تذکرہ ان کا اس محبت اور اخلاص کے
شکریہ میں جو وہ خاکسار سے محض للہ رکھتے تھے شائع کر کے اذکروا موتاکم بالخیر کے
ارشاد نبویؐ پر عمل کی توفیق پاؤں۔

میں ایک عرصہ سے اخبار میں کچھ نہیں لکھتا۔ میرا یہ دستور تھا کہ قریباً ہر اس مرنے والے
بھائی کا تذکرہ لکھ دیتا جو سلسلہ میں اپنے اخلاص و وفا کے لحاظ سے اپنی زندگی دوسروں کے لئے
قابل نمونہ رکھتا ہو۔ لیکن اب کچھ تو اپنی پیرانہ سالی اور اعصابی ضعف کی وجہ سے اور کچھ بعض
دوسرے علائق نے مجھے کوتاہ قلم کر دیا ہے۔

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب کی وفات نے میرے دل و دماغ میں پھر ایک تحریک کی
اور میں تذکرہ لکھ رہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو حضرت سیٹھ حسن صاحب اور سیٹھ محمد غوث

صاحب کے کسی قدر تفصیلی حالات جداگانہ بھی میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ ان حضرات کی زندگیاں اپنے اندر بہت سے سبق رکھتی ہیں۔

ابتدائی حالات!

سیٹھ محمد غوث صاحب ایک تجارتی پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور خاندانی روایات اور دوسرے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کسی دور میں ان کے بزرگ عرب سے ہی آئے تھے۔ اور اقوام کے عروج و زوال کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ایک تاجر خاندان کی حیثیت سے ریاست حیدر آباد میں مقیم ہوگئے۔ سیٹھ غوث صاحب حضرت سیٹھ حسن صاحب احمدی کے چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت سیٹھ حسن احمدی اس خاندان کے سلسلہ احمدیہ کے آدم تھے۔ سیٹھ غوث صاحب نے اپنی آنکھیں اس دنیا میں ایک یتیم کی حیثیت سے کھولی تھیں۔ ان کے تایا نے اپنے بیٹے کی طرح ان کو رکھا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو فطرت سلیم اور بلند ہمتی دی تھی۔ ان میں صحابہ کا ایک رنگ تھا کہ وہ کسی دوسرے پر بوجھ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ابھی بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے کہ یادگیر سے چل کر حیدر آباد آئے اور محلہ حسینی علم میں (جہاں ان ایام میں یادگیر کے بہت سے لوگ رہتے تھے) مقیم ہوئے۔ ایک بے سروسامان نوجوان حیدر آباد میں آیا بے شک اس کے پاس چاندی سونے کے سکے نہ تھے' مگر وہ اس گراں بہا دولت کا مالک تھا۔ جس کے ہوتے ہوئے کوئی آدمی بے زر نہیں رہ سکتا۔ وہ تھی ہمت' جفاکشی کا جذبہ' مستقل مزاجی' خودداری۔

ایک تاجر نے جوان کے خاندان سے واقف نہ تھا' ان کو اپنے پاس ٹھیرنے کی جگہ دی۔ سیٹھ محمد غوث صاحب جوان ایام میں تیرہ برس کے تھے۔ یہ پسند نہ کیا کہ ان پر بار ہوئیں اس لئے ان کے چھوٹے موٹے کام کاج کرنے میں انہوں نے عار نہ سمجھا۔ اس کا معاوضہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ کھانا کھالیتے اور سر رکھنے کو جگہ تھی۔ وہ تاجر بھی خودغرض انسان نہ تھا۔ اس نے دو ہفتے کے بعد سیٹھ صاحب سے کہا کہ آپ تاجر خاندان کے فرد ہیں' میری غیرت پسند نہیں کرتی کہ میں اس طرح پر اپنے خانگی کاروبار کے لئے رکھوں۔ آپ اپنا انتظام کریں۔ سیٹھ صاحب تو خود اسی خیال میں تھے۔ وہ آمادہ ہوگئے اور خدا تعالیٰ نے سامان پیدا کر دیئے۔ اس تاجر نے ان کو کہا کہ

آپ گیس کے تیل کا ایک ٹین لے کر پھر کر فروخت کرو۔ قیمت مجھے دیدینا نفع تم لے لینا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام شروع کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت دی۔ ایسی برکت کہ کل تک جو چھوکرا گلیوں میں پھر کر مٹی کا تیل فروخت کرتا تھا وہ بالآخر حیدر آباد میں مٹی کے تیل کا بادشاہ بن گیا۔ یہ ابتدا تھی اس کمپنی کی جو اعظم معین الدین کے نام سے حیدر آباد میں تیل کی سپلائی کرتی ہے۔ اس مختصر تذکرہ میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔

یہ واقعہ میں نے اس مقصد سے لکھا ہے کہ سلسلہ کے نوجوانوں کو توجہ دلاؤں کہ وہ آپ اپنی روزی پیدا کرنے کے لئے کسی کام کو عار نہ سمجھیں اور ہمت بلند رکھیں۔ صحابہ کی زندگیوں میں ہمیں یہ حیرت انگیز نظارے نظر آتے ہیں۔

مکی زندگی کے سابقون الاولین میں جماعت کا بڑا حصہ ان لوگوں کا تھا جو غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر یہ وہ غلام تھے جن کے ایمان و اخلاص ایثار و وفا پر دنیا کی آزادیاں اور سلطنتیں قربان کی جاسکتیں ہیں۔ اور آج اسلامی دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ان کا نام ادب و احترام سے لینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

مدنی زندگی میں جب ہجرت کر کے آنے لگے تو وہ اپنی روزی آپ پیدا کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ کوئی گھاس کاٹ کر لاتا' کوئی لکڑیاں لے کر بیچتا۔ آج ان پیشوں کا نام گھسیارے اور لکڑ ہارے رکھا جاتا ہے' مگر یہ وہ لوگ تھے' جن کی اس مجاہدانہ زندگی نے انہیں تاج و تخت کا وارث کر دیا۔

ذوق سخن مجھے دوسری طرف لے گیا۔ سیٹھ غوث صاحب کی زندگی میں وہی روح نظر آتی ہے۔ انہوں نے کسی پر بار ہونا پسند نہ کیا اور نہ کسی محنت سے عار کیا۔ اور اس کا پھل انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھا۔ اور اس پھل کے دائمی ثمرات اب وفات کے بعد اولاد اس دنیا میں اور وہ اس دوسرے جہاں میں دیکھ رہے ہوں گے۔

حصولِ علم کا جذبہ:

ظاہر ہے کہ سیٹھ غوث صاحب دنیا میں آتے ہی یتیم ہوگئے اور تھوڑے عرصہ بعد والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ملک میں تعلیمی شوق مفقود ہو چکا تھا اور انہیں ہوش سنبھالتے ہی اپنی

معاش کی فکر کرنی پڑی۔ ایسا موقعہ انہیں میسر نہ آیا کہ وہ تعلیم حاصل کرتے، لیکن ان میں یہ جذبہ موجود تھا جس طرح حصول معاش کے لئے انہوں نے اپنے نفس پر اعتماد کیا اور محنت سے جی نہ چرایا۔ حصول علم کے لئے بھی اپنی سمجھ کے موافق پوری کوشش کی۔ وہ دن بھر تو اپنے اس تجارتی دھندے میں مصروف رہتے اور رات کو بازار کی روشنی میں لکھتے پڑھتے۔ لوگوں سے ایک ایک سبق لیتے اور اسے یاد کرتے۔ آج جب کہ حصول علم کے ذرائع عام ہیں اور ہر قسم کی آسانیاں حاصل ہیں۔ یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ کس طرح ایک نوجوان سر راہ کی روشنی میں کھڑا ہوا راہ رو سے سبق لے رہا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے۔ اور اس کے بیان کرنے میں میرے دل میں سیٹھ غوث صاحب کے لئے عزت واحترام کے جذبات میں اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تحصیل علم ہر مسلم اور مسلمہ کا فرض ہے۔ آپ اس فرض کی تکمیل کے لئے دن بھر کی محنت اور کوفت کے بعد بھی آرام کو قربان کرتے ہیں۔ اس لئے کچھ عرصہ میں انہوں نے اپنی ضرورت کے موافق لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سیکھ لیا۔ یہ دوسرا واقعہ ہے جوان کی ہمت بلند اور طلب صادق اور علم روشنی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

غرض اس طرح ان کے دن رات بسر ہوتے تھے۔ اپنی کاروباری زندگی میں ایک خوش معاملہ تاجر تھے۔ تاجرانہ ہیرا پھیری سے نفرت تھی۔ وہ تجارت کی کامیابی کا سارا دارومدار معاملہ کی صفائی اور دیانت سمجھتے تھے۔ اور اس کے لئے محنت اور جفاکشی ضروری یقین کرتے تھے۔

اس مختصر تذکرہ کا اصل موضوع تو ان کی احمدیت میں زندگی کا دستور العمل ہے۔ اس لئے دوسرے واقعات اور حالات کو تذکرہ غوثیہ کے لئے چھوڑ کر میں احمدیت کے متعلق ابتدائی تحریک کا ذکر کرتا ہوں۔

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب اب تک پھیری کر کے تجارت کرنے والے نوجوان کی حیثیت سے بہت آگے نکل چکے تھے اور متاہل زندگی رکھتے تھے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔

حضرت سیٹھ شیخ حسن احمدیؓ اس خاندان کے احمدیت میں آدم ہیں۔ وہ احمدی ہو چکے تھے اور حضرت سیٹھ صاحب نے بھی ان کے ذریعے گھر میں اور حیدرآباد میں احمدیت کے شہرت کی وجہ سے سلسلہ احمدیت کا ذکر سنا۔ اس لئے دعوے کو سن کر قدرتی طور پر انہیں تعجب ہوا کہ آبا

واجداد اور عام مسلمانوں میں متعارف عقیدہ کے خلاف ایک اور آواز پنجاب سے بلند ہوئی ہے اور اس آواز پر بعض لوگ لبیک بھی کہہ رہے ہیں۔ اور مخالفت کا طوفان بھی اٹھ رہا ہے۔ یہ بالکل الگ تھلگ رہ کر اس پر غور کرنے لگے۔ قبول احمدیت میں یا تکذیب احمدیت میں جلدی نہیں کی۔ بلکہ زیادہ وضاحت سے یہ کہنا چاہئے کہ تکذیب اور مخالفت کا خیال کبھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ پکارنے والے کی دعوت بالکل خاص رنگ کی تھی۔ مرد مومن کی طرح انہوں نے مخالفانہ خیالات کو اڑنے نہیں دیا۔ البتہ صبر و استقلال سے اس دعوت کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ وہ اپنے بھائی حضرت سیٹھ شیخ حسن احمدی کو دیکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں ایک صادق مسلم اور غیور مومن کے آثار نمایاں پاتے تھے۔ ان کے تقویٰ طہارت نفس کو علی وجہ البصیرت جانتے تھے اور دیکھتے تھے کہ سلسلہ احمدیہ میں داخل ہو کر ان کی خوبیاں اور نیکیاں ایک جلا حاصل کر رہی ہیں۔ اور ایمانی قوتوں میں نشوونما ہو رہا ہے۔ اور دوسرے احمدی احباب جو حیدرآباد میں تھے ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور دوسرے مسلمانوں سے مقابلہ کرتے تو انہیں ایک امتیاز اور فرقان نظر آتا تھا۔ اور نفرت یا مخالفت کا خیال تو پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ محبت و اخلاص کا بیج اندر ہی اندر بڑھتا گیا۔

اسی غور وفکر میں مہینے اور سال گذر گئے یہاں تک خدا کے رسول و مامور کا بھی وصال ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیٹھ صاحب جب کسی صحابی سے ملتے تو ان کا جسم پیکر بکا ہو جاتا تھا۔ جس سے ان کی اس حسرت کا اندازہ ہوتا تھا' جوان کے اندر ایک طوفان پیدا کرتی تھی کہ کیوں میں نے حضرت مسیح موعودؑ کو ان کی زندگی میں قبول کر کے ان کو نہ دیکھ لیا۔ وہ اس دولت رفتہ کے لئے تڑپتے تھے مگر میرا اپنا ذوق یہ ہے کہ یہ تڑپ و اضطراب اور حسرت و اندوہ جو زندگی بھر ان کو بے تاب رکھتا رہا۔ ان بہت سے لوگوں سے بہتر اور افضل ہے جنہوں نے خدا تعالیٰ کے مرسل و مامور کو دیکھا' ان کی صحبت کا بھی کچھ حصہ پایا مگر انہوں نے اس سعادت سے حصہ نہ لیا جو اس وجود پاک کے ذریعہ تقسیم ہو رہی تھی۔ اور وہ معلوم کر کے سب کچھ محروم ہو گئے ہیں کہ مصداق ہو گئے۔ اللھم لا تجعلنا منھم۔ آمین

غرض حضرت سیٹھ صاحب اس یاد سے بے تاب اور مضطرب رہتے تھے۔ حضرت

اقدس کے وصال کے بعد حضرت خلیفہ اولؓ ہوئے۔ حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ ہمیشہ اپنے عمل وکردار سے ان کو دعوت دیتے رہے اور ایک خاموش عملی تبلیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی مرتبہ طاعون کا شدید حملہ حیدرآباد پر ہوا۔ اس سے پہلے موسیٰ ندی کی طغیانی کے ہولناک عذاب کو مشاہدہ کرچکے تھے۔ اور یہ علم تو ان کو ہوچکا تھا کہ یہ انذاری نشان حضرت مسیح موعودؑ کی تائید میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ جب حیدرآباد پر طاعون کا حملہ شدید ہوا اور طاعون جارف کی صورت میں نمودار ہوئی تو نیکی اور سعادت کی قوتیں سیٹھ صاحب میں پورے طور پر نمایاں ہوئیں۔ اور قبول حق کی ایک زبردست تحریک ان کے قلب میں پیدا ہوئی۔ خدا تعالیٰ کی اس قہری تجلی نے اس دبی ہوئی چنگاری کو سلگادیا اور انہوں نے اپنے اندر ایک روشنی محسوس کی جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کردیتی ہے۔ ان ایام میں آپ اپنے اہل وعیال سمیت یادگیر میں حضرت سیٹھ شیخ حسنؓ کے پاس تھے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے سعادت کی راہیں آپ پر کھول دیں۔ بلا توقف اپنے اہل وعیال سمیت حضرت مولوی محمد سعید صاحبؓ کے ہاتھ پر احمدی سلسلہ میں بیعت کرلی۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحبؓ کو بیعت لینے کی اجازت تھی۔

خدا تعالیٰ کا خاص فضل:

سلسلہ کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ بعض دوستوں کو قبول احمدیت کی وجہ سے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں سے مختلف قسم کی ایذائیں پہنچیں۔ کہیں باپ غیر احمدی تھا، بیٹا احمدی ہوگیا۔ اور وہ ہر قسم کی اذیتوں کا نشانہ ہوا۔ کہیں بیوی غیر احمدی تھی۔ اس نے اختلاف عقیدہ کی وجہ سے زندگی کو دوزخ بنانے کی کوشش کی۔ غرض احمدیت تو ایک کٹھالی ہے جس میں کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہوجاتا ہے۔ اور صادق اور وفادار نمایاں ہوتے ہیں۔ مگر سیٹھ صاحب پر خدا تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ قبول احمدیت میں اس قسم کا کوئی ابتلاء پیش نہیں آیا۔ خاندان کے بزرگ حضرت سیٹھ شیخ حسن اپنے خاندان اور کنبہ کے ایک مخلص اور سرگرم احمدی ہوچکے تھے۔ کسی دوسرے نے بھی مخالفت نہیں کی بلکہ تبلیغ احمدیت کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔

یہ سچ ہے کہ اس طریق سے تو کوئی ابتلاء انہیں نہیں آیا، مگر خدا تعالیٰ نے ابتلا وامتحان کا

ایک ہی طریق تو نہیں رکھا، اس کی سنت مستمرہ میں تو یہ امر داخل ہے کہ مومنوں کا امتحان لازمی ہے۔ جیسا کہ فرمایا **حسب الناس ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون**۔ یعنی کیا مومن گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف مومن کہلا کر امتحان سے بچ جائیں گے۔ مومنین پر ابتلاؤں کا آنا نہایت ضروری ہے۔ یہ ابتلاء ان کی روحانی تربیت اور ان کی ترقیات کے لئے لازمی امر ہے۔

ابتلاء:

پس اس کلیہ سے حضرت سیٹھ صاحب بھی باہر نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے لئے ایک دوسرا ابتلاء مقدر تھا۔ جو آیا اور بڑی طاقت سے آیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال تھا کہ سیٹھ صاحب اس امتحان میں پورے اترے۔ وہ ابتلاء کاروباری رنگ کا ابتلا تھا۔ حضرت سیٹھ صاحب ایک گیس کمپنی میں ۱۹۰۵ء میں حصہ دار تھے۔ اور آج کل کے طریق تجارت میں تجارتی لین دین میں سود کا دخل ہے۔ سود لیتے بھی ہیں، دیتے بھی ہیں۔ سیٹھ صاحب احمدیت سے پہلے اس کا احساس نہیں رکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے مروجہ طریق عمل تو تھا ہی بعض علماء نے تجارتی کاروبار میں سودی لین دین کے جواز کے فتوے بھی دیئے ہوئے ہیں مگر احمدی ہوجانے کے بعد سیٹھ صاحب کو اندر ہی اندر ایک خلش پیدا ہوئی کہ اس کاروبار میں جس میں سود کا دخل ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

اس لئے یا تو اس کاروبار کو بند کردینا چاہئے یا اس سے مجھے الگ ہوجانا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی آمدنی کا سارا دارومدار اسی کاروبار پر تھا۔ اور یہی واحد ذریعہ معاش تھا۔ پھر یہ کاروبار ایک دن کا نہیں، ایک سال کا نہیں، سات سال کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ چلتے ہوئے اور معاش کے واحد ذریعہ کاروبار پر لات مارنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لئے اس قوت ایمانی کی ضرورت ہے جو پہاڑوں سے ٹکرا کر ان کو پاش پاش کردیتی ہے۔ اور مومن کا مقام ایسا نہیں کہ مصائب اور مشکلات اسے جنبش دے سکیں۔ وہ طوفان میں ایک چٹان ہوتا ہے، جس سے ابتلاؤں کے طوفان اور لہریں آ کر ٹکراتی ہیں۔ اور ناکام واپس چلی جاتی ہیں۔ کاروبار کا بند کرنا تو ان کے اختیار میں نہ تھا۔ وہ یہ کرسکتے تھے کہ خود اس سے الگ ہوجائیں، چنانچہ انہوں نے نتائج اور عواقب سے بے پروا ہو کر اپنے دوسرے شرکاء کو زبانی اطلاع دی کہ میں آئندہ اس سودی

کاروبار میں شریک نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اپنے اس فیصلہ پر اپنے قلوب میں ایک سکون محسوس
کیا کہ میں اس آگ سے نکل آیا' لیکن یہ تو ابتلا کی ابتداء تھی۔ وہ ایک نہایت خوبصورت شکل میں
ان کے سامنے آیا اور اپنی کامیابی پر انہیں خوشی ہوئی۔ لیکن یہ امتحان کا پہلا پرچہ تھا۔

حضرت سیٹھ صاحبؓ نے اس زبانی اطلاع کو اپنی سادگی اور مومنانہ سادگی سے کافی
سمجھا۔ قانوناً حد کافی نہ تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ باقاعدہ نوٹس دیتے۔ جو عندالضرورت
ان کی علیحدگی کا ثبوت ہوتا۔ انہوں نے اپنی ایمانداری کے نقطۂ نظر سے سمجھا کہ یہ شرکاء سے الگ
ہونے کو قانونی علاحدگی کیوں نہیں سمجھیں گے۔ یہ خیال درست نہ تھا۔ چند ماہ کے بعد کمپنی ٹوٹ
گئی۔ اس لئے کہ اس میں فعال وجود تو یہی تھے۔ کمپنی کے ساہوکاروں نے شرکاء کمپنی پر ساٹھ ستر
ہزار کا دعویٰ کر دیا۔ اور سیٹھ صاحب بھی ایک مدعیٰ علیہ قرار دیئے گئے۔

یہ مقدمہ ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ گویا سترہ برس کا ایک لمبا ابتلا تھا۔ مگر اس عرصہ میں سیٹھ
صاحب کی ثبات قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں جب میں پہلی مرتبہ آیا' تو سیٹھ صاحب اکثر
میرے پاس منٹگمری ہوٹل میں آتے تھے اور بعض اوقات وہ ایک ایک گھنٹہ سے بھی زائد قیام
کرتے۔ حضرت مسیح موعودؑ کا نام آتے ہی ان پر ایک قسم کا لرزہ اور گریہ جاری ہو جاتا۔ اور بار بار
اس کا اظہار کرتے کہ میں ان کو دیکھ نہ سکا۔ اس قسم کے جماعت میں اور بھی لوگ ہوں گے۔

اسی رنگ کے ایک بزرگ کو میں نے انگلستان کے نومسلموں میں دیکھا۔ اس کے قلب
میں حضرت مسیح موعودؑ کی محبت کا ایک سمندر موجیں مارتا تھا۔ اور جب مجھ سے پوچھتا کہ کیا آپ
نے ان کو دیکھا ہے اور میرا جواب ہاں سن کر اس پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ غرض
ان ایام میں بھی وہ اس ابتلا میں تھے' مگر میں نے دیکھا کہ کامل انشراح صدر سے وہ رضا بالقضا پر
عامل تھے۔ اس پر انہیں ایک کثیر رقم ادا کرنی پڑی۔ یہ ابتلا معمولی قسم کا نہ تھا۔ مالی ابتلاؤں میں
جب تک خدا تعالیٰ پر کامل ایمان اور اس کی قضا کے ساتھ مصالحت نہ ہو بڑے بڑے شیخیاں
بگھارنے والوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور اکثر خودکشیاں کر لیتے ہیں۔

اس خصوص میں حضرت سیٹھ عبدالرحمٰن حاجی اللہ رکھا تاجر مدراس کا نمونہ قابل رشک
ہے۔ مالی ابتلاؤں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر اس کامل مومن کا قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔ اللہ تعالیٰ پر

ایمان اور اس کے قائم کردہ سلسلہ کے لئے مالی قربانیاں ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ بہرحال یہ ابتلا
سیٹھ صاحب پر آیا اور حال جیسا کہ مومن کی شان ہے انہوں نے خدا تعالیٰ پر ایمان کا ایک عمدہ
نمونہ پیش کیا۔ ان ایام میں ان کا معمول تھا کہ وہ ہر دوسرے دن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ
اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کو دعا کے لئے خط لکھتے اور مقامی طور پر حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کو بھی
تحریک دعا کرتے رہتے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے
رہتے۔ اور یہ وہ نسخہ تھا جو انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کے کلام سے سیکھا تھا۔

اندریں وقت مصیبت چارۂ ما بیکساں جز دعائے بامدار و گریہ اسحار نیست

حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ ان ایام میں اپنے ہاتھ سے سیٹھ صاحب کو تسلی کے خطوط
لکھتے اور ان کے خطوط کا جواب دیتے۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعودؑ حضرت سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب کو
لکھا کرتے تھے (یہ مجموعہ مکتوبات میں نے چھاپ دیا ہے) سیٹھ صاحب کا ایمان ان خطوط کو
پڑھ کر ایمانی قوت پاتا تھا۔

سیٹھ صاحب کی زندگی کا یہ واقعہ نہایت عجیب ہے جو ایک طرف ان کی ایمانی قوت کا
مظہر ہے اور یہ کہ اُن کو دعاؤں کی قبولیت پر کس قدر یقین تھا۔ دوسری طرف اس سے حضرت امیر
المومنین ایدہ اللہ کی دعاؤں کی قبولیت کا وہ ایک زندہ نشان تھے۔

ابتلا نقص من الاموال کے رنگ میں آیا اور اتنا لمبا ہوا کہ سترہ برس گذر گئے۔ جس
عرصہ میں ایک بچہ پیدا ہو کر جوان بلکہ صاحب اولاد ہو سکتا ہے۔ مگر اس ابتلاء نے سیٹھ محمد غوث پر
کیا اثر کیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل سے مال کی ایمان سوز محبت کو فنا کر دیا اور اس کی جگہ سلسلہ
کے لئے اموال کی قربانی کو ان پر آسان اور لذیذ بنا دیا۔ جیسا کہ ان کے بعد کے طرز عمل سے
ثابت ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے مفلس اور قلاش نہیں ہو گئے۔ بلکہ اللہ
تعالیٰ نے ان کے اموال ان کی اولاد میں برکت پر برکت رکھ دی۔ وہ شخص جو ایک دن حیدرآباد
میں اس حیثیت سے آیا تھا کہ اس کو سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ آج اس کی چھت کے نیچے بہتوں کو
آرام اور سکون حاصل ہے۔ وہ جو اکیلا تھا آج ایک وسیع خاندان اپنے پیچھے چھوڑ کر گیا ہے۔ ان
کا وجود ثبوت تھا۔ اس امر کا کہ وہ جو خدا کے لئے کچھ کھوتا ہے وہ ضائع نہیں کرتا بلکہ بہت کچھ پاتا

ہے۔اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کے مخلصین ابتلاؤں کی بھٹیوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر اس
لئے نہیں کہ وہ تباہ کردیئے جائیں بلکہ اگر وہ لوہا ہوں تو فولاد بن جائیں سونا ہوں تو کندن
ہوجائیں۔ان کی ترقیات روحانی باکمال ہوجائیں۔

از مکرم جناب شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ
(ہفت روزہ بدر قادیان، ۳۱/اکتوبر ۱۹۹۱ء)

حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب حیدرآبادی

حضرت سیٹھ صاحب ایک تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔آپ حضرت سیٹھ شیخ
حسن صاحبؓ احمدی صحابی یادگیر کے چچازاد بھائی تھے اور انہیں کی تحریک وتبلیغ سے خلافت اولیٰ
میں احمدیت سے منسلک ہوئے۔حضرت سیٹھ صاحب نے بیعت کے بعد جس احساس واضطراب
کو اپنے اندر پایا وہ حضرت مسیح موعودؑ کے عصر سعادت کو پانے کے باوجود اس کی برکات سے محروم
رہ جانے کا کرب تھا۔یہ احساس انہیں ہر وقت بے قرار رکھتا۔یہی عاشقانہ جذبہ ان کو صحابہ مسیح
موعودؑ سے بیتاب کردیتا اور جیسا کہ حضرت شیخ یعقوب علی عرفانیؓ نے ان کی مفصل سوانح عمری میں
لکھا ہے' اس خصوص میں ان کی حالت حضرت منشی اروڑے خان صاحبؓ سے ملتی ہے جو بعد
وصال مسیح موعودؑ سونے کے سکے نذر کرنے کے لئے آئے تھے اور بیتاب ہوگئے تھے۔

حضرت سیٹھ صاحبؓ نے اپنے ایمان کی ترقی اور اس متاع گم گشتہ کو پانے کے لئے
حضرت مسیح موعود کے اہلِ بیت خصوصاً حضرت مصلح موعودؓ سے محبت اور اخلاص اور فدائیت و
شیدائیت میں یہاں تک ترقی کی اور اپنے مخلصانہ تعلق کو اس قدر بڑھایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح
الثانی مصلح موعودؓ اور دوسرے افرادِ خاندانِ مسیح محمدی نے انہیں اپنے خاندان ہی کا فرد سمجھا اور بارہا
اپنی تقریروں اور مختلف تقریبوں میں اس کا اظہار فرمایا۔

حضرت مصلح موعودؓ نے ۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو نماز جمعہ کے بعد آپ کا جنازہ غائب پڑھایا
اور خطبہ ثانیہ میں آپ کی نسبت فرمایا''حضرت خلیفہ اولؓ کے زمانہ میں میری ان سے واقفیت ہوئی

اور میں جب حج کے لئے گیا تو ان کو ممبئی میں دیکھا کہ اس وقت انہوں نے ایسے اخلاص اور محبت
کا ثبوت دیا کہ اس وقت سے ان کے تعلقات میرے ساتھ خانہ واحد کے تعلقات ہوگئے۔
میں اپنے سامان کی تیاری کے لئے جہاں جاتا وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہتے اور
جہاز تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ان کا اخلاص اتنا گہرا تھا کہ عبدالحی صاحب عرب جن کو میں اپنے
ساتھ بطور ساتھی لے گیا تھا ایک دفعہ پانی پینے کے لئے ایک خوبصورت گلاس نکالا۔میں نے ان
سے پوچھا یہ پہلے تو آپ کے پاس نہیں تھا' اب آپ نے کہاں سے لے لیا' تو انہوں نے مجھے
بتایا کہ مجھے سیٹھ صاحب نے لے کر دیا تھا۔جب آپ اس میں پانی پئیں گے تو میں یاد آجاؤں
گا۔اس وقت ان کو میرے لئے دعا کے لئے یاد کرادینا۔

دوسری دفعہ جب میں ممبئی گیا تو سیٹھ صاحب پھر ممبئی پہنچ گئے حالانکہ ممبئی سے حیدرآباد
بارہ چودہ گھنٹے کا راستہ ہے لیکن پتہ چلتے ہی فوراً وہاں پہنچ گئے اور آخری دن تک ساتھ رہے' بلکہ
مجھے ان کا ایک لطیفہ اب تک یاد ہے وہ ایسے ساتھ ہو لئے کہ ان کا ساتھ دینا گراں گزرنے لگا۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم جہاں جاتے کھانے کا وقت آیا وہ اسی جگہ کسی اچھے ہوٹل سے تمام قافلے
کے لئے کھانے کا انتظام کردیتے۔آخر میں میرے دل میں خیال آیا کہ اب تو حد سے زیادہ
مہمان نوازی ہوگئی ہے۔ایک دن میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آپ لوگ سیٹھ صاحب کو
کیوں اپنے ساتھ لیتے ہیں۔وہ جہاں جاتے ہیں وہیں کھانے کا انتظام کردیتے ہیں۔اب تو
مہمان نوازی بہت لمبی ہوچکی ہے چنانچہ جب یہ طے ہوا کہ آج وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی یہاں
سے نکل جائیں تاکہ سیٹھ صاحب آئیں تو ان کو ہمارے متعلق علم نہ ہوسکے۔ہم لوگ موٹروں میں
بیٹھ کر دو گھنٹے پہلے ہی گھر سے روانہ ہوگئے۔کچھ دور جاکر پھر ہم ریل میں سوار ہوگئے' جب ریل
اس اسٹیشن پر جاکر کھڑی ہوئی جہاں ہم نے اترنا تھا میں نے دیکھا کہ سیٹھ صاحب بھی وہاں
کھڑے ہیں۔جب ہم اترے تو انہوں نے آتے ہی السلام علیکم کہا اور کہا کہ چلئے کھانا تیار
ہے۔ہم حیران ہوئے کہ ان کو ہمارے پروگرام کا کس طرح علم ہوگیا۔اس کے بعد مجھے جب
بھی ممبئی جانے کا اتفاق ہوا سیٹھ صاحب بھی ممبئی پہنچ جاتے اور قیام کے دوران میرے ساتھ ان
کی بیویوں کے' میری بیویوں سے ان کی بچیوں کے میری بچیوں سے اور میرے بچوں کے ان کے

حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ صحابی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام

بچوں سے خوشگوار تعلقات ہو گئے اور آہستہ آہستہ یہ تعلقات ایک گھر کی مانند ہو گئے۔ اللہ کے فضل سے ان کے بچوں اور بچیوں میں بھی بہت اخلاص ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو سلسلہ کی خدمت کی توفیق دے رہا ہے۔ ان کے بڑے لڑکے محمد اعظم صاحب سکریٹری مال ہیں اور جماعت کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' دوسرے بیٹے معین الدین ہیں اور حیدرآباد میں خدام الاحمدیہ کے قائد ہیں اور تیسرا بچہ ابھی چھوٹا ہے اور تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ان کی لڑکیوں کے میری بیوی امۃ الحی سے بہت مخلصانہ تعلقات تھے۔ حاشیہ (۱) الفضل۔ (۲) ہجرت مئی ۱۹۴۷ء ۱۳۲۶' صفحہ ۲

حضرت سیدنا مصلح موعودؓ نے آپ کے بارے میں ۱۲ تبلیغ فروری ۱۹۵۱ء ۱۳۳۰ھ کے خطبہ میں یہ واقعہ بھی بیان فرمایا تھا۔

ایک جلسہ پر میں نماز پڑھانے لگا عموماً لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ نماز میں میرے ساتھ کھڑے ہوں۔ سیٹھ غوث مرحوم یہ حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔ نہایت مخلص احمدی تھے' ان کے بیٹے سیٹھ محمد اعظم بھی نہایت مخلص نوجوان ہیں اور جماعت احمدیہ حیدرآباد کے سکریٹری مال ہیں ان کا وطن قادیان سے تقریباً ۱۲۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہ جب بھی جلسہ پر آتے ہیں تو نماز میں میرے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں تا کہ انہیں دعائیں کرنے کا زیادہ موقعہ مل سکے۔

اس جلسہ کے موقع پر بھی وہ میرے ساتھ کھڑے تھے کہ گجرات کے ایک احمدی آگے بڑھے اور انہیں پیچھے دھکیل کر کہنے لگے آپ لوگوں کو تو یہ موقعہ روز ملتا ہے ہم لوگ دور سے آتے ہیں' ہمیں بھی حضور کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع دیں۔ اب گجرات قادیان سے ۷۰' ۸۰ میل پر واقع ہے اور حیدرآباد دکن اور قادیان کے درمیان ہزار' بارہ سو میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن انہوں نے اپنا حق سمجھ لیا۔

الفضل ۱۹ شہادت اپریل ۱۹۶۱ء ۱۳۴۰ ۔ (الفضل ۲ جنوری ۱۹۳۴ء الفضل ۲ ہجرت ۱۹۴۷ء ۱۳۲۶ صفحہ ۲۔)

(۱) الفضل ''شہادت اپریل و ۵ وفا جولائی ۱۹۴۷ء ۱۳۲۶ھ مضمون شیخ یعقوب علی عرفانیؓ۔

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ احمدیت جلد ہشتم صفحہ ۶۱۹ و تاریخ احمدیت جلد نہم (۹) صفحہ ۲۴۲۔

حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ کے مختصر حالات

مولوی شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ۲۹ نومبر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم ایک دیہاتی مدرسہ میں ہوئی۔ اور نومبر ۱۸۸۱ء کو ان کو مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ اپنی جماعت میں وہ ہمیشہ اول رہا کرتے تھے۔ پرائمری کورس ختم کرنے کے بعد ان کو مڈل اسکول بھیج دیا گیا اور انہیں بورڈنگ میں رکھا گیا۔ انہیں سنسکرت کے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے مڈل اسکول میں سنسکرت کورس صرف ۹ ماہ کے اندر مکمل کرلیا۔ یہ زمانہ ۱۸۸۶ء سے لیکر ۱۸۸۸ء تک کا تھا۔ غرض ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۸۹۱ء تک وہ لدھیانہ میں رہے۔ اس زمانے میں تبلیغ اسلام کے لئے ایک رسالہ انوار احمدیہ عیسائی مذہب کی تردید اور اسلام کی تبلیغ کے لئے شائع کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ انتظام منشی احمد جان صاحب کے مریدوں نے ایک انجمن احمدیہ بنا کر کیا تھا اور اس رسالے کا ایڈیٹر انہیں بنایا گیا تھا۔ جہاں انہوں نے ایک سال تک کام کیا۔ انہیں بیعت کی سعادت ۱۸۸۹ء میں نصیب ہوئی تھی۔

۱۸۹۲ء میں ہنری مارٹن کلارک نے ایک نالش حضرت مسیح موعودؑ کے خلاف کردی۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ نے اس مقدمے کے حالات جنگ مقدس کے نام سے لکھے' اس وقت سلسلہ کی ضروریات کے اعلان اور اظہار کے لئے اور اس پر جو اعتراضات سیاسی اور مذہبی پہلو سے کئے جاتے تھے ان کے جوابات کے لئے ایک اخبار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں الحکم جاری کیا۔ اس وقت برٹش گورنمنٹ پریس کے خلاف تھی اور پریس ایکٹ کے تحت جو پاس ہوجاتا تھا وہی شائع کرنا پڑتا تھا۔ تاہم ان مشکلات میں امرتسر سے انہوں نے الحکم جاری کردیا۔ اس وقت انہوں نے اخبار الحکم کو ۱۸۹۷ء کے آخر میں قادیان منتقل کردیا۔ سب سے پہلے الحکم کے ذریعہ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی تقریروں کو محفوظ کرنے کا کام شروع کیا اور ہر تقریر قلم بند ہوکر شائع ہونے لگی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعودؑ کی پرانی تحریروں اور خطوط کو جمع کرنے کا کام بھی الحکم کے ذریعہ کیا گیا۔ یہ حالات ۱۹۱۲ء تک جاری رہے۔ ۱۹۱۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح

اولؓ کا انتقال ہونے پر عظیم تفرقہ ہوا۔ تو حضرت شیخ صاحبؓ نہایت اخلاص کے ساتھ خلافت ثانیہ سے وابستہ رہے اور الحمد للہ اس پر اپنے خاتمہ تک قائم رہے۔ آپ ۱۹۲۴ء میں سفر یورپ کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ساتھ بھی تشریف لے گئے اور آپ مسجد فضل لندن کے افتتاح کے موقع پر بھی موجود تھے۔ جون ۱۹۲۵ء میں آپ بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے لئے روانہ ہوئے اور دو سال تک یورپ اور بلاد اِسلامیہ کی سیاحت کی۔ آپ اسی دوران حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں حج کے تعلق سے ایک کتاب الحج تصنیف فرمائی۔ واپسی کے بعد اپنا سفر نامہ مشاہدات عرفانی کے نام سے شائع فرمایا۔ آپ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک کئی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان قادیان سے ممبئی منتقل ہوگئے اور وہاں ایک رسالہ سالار کے نام سے شائع کیا۔ اس دوران ان کی ملاقات حیدرآباد کے ایک نواب سید محمد رضوی صاحب سے ہوئی۔ جو احمدی تھے اور حضور نظام کی پھوپی کے داماد تھے۔ ان کو حضور نظام نے احمدی ہونے اور ان کی پھوپی کی لڑکی سے بغیر اجازت شادی کرنے کی علت میں شہر بدر کردیا۔ نواب صاحب اپنی بیوی کے ساتھ ممبئی منتقل ہوگئے اور وہاں ایک عالی شان عمارت تعمیر کروائی اور رہائش پذیر ہوئے' جس کا نام لیاقت منزل رکھا۔ یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حضرت سید محمد رضوی صاحب ابتدائی دور کے احمدی ہیں اور یہ حضرت مسیح موعودؑ کے ۳۱۳ صحابہ میں شامل ہیں۔

چنانچہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ کی ملاقات ممبئی میں حضرت سید محمد رضوی صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے حصہ کی جاگیر اور لیڈی وقار الامراء کی جائیدادیں جو حضور نظام نے ضبط کرلی تھیں' اُن کی پیروکاری کے لئے بہت کوشش کی۔ اس زمانے میں کوئی حیدرآباد کا وکیل لیڈی وقار الامراء اور سید صاحب کا مقدمہ عدالت میں لے جانے پر تیار نہیں ہوا اور حضور نظام کے عتاب سے بچنے کے لئے انکار کردیا۔ سید محمد رضوی صاحب نے عرفانی صاحبؓ کو اپنا مقدمہ عدالت میں دائر کرنے کے لئے ساڑھے بائیس سو روپے ماہوار تنخواہ' موٹر' ڈرائیور' سکندرآباد کے ایک ہوٹل مونٹ مونگمری میں ان کی رہائش کا انتظام کیا۔ سکندرآباد چونکہ انگریزوں کی چھاؤنی تھی' یہاں پر عثمان علی خان کا قانون نہیں چلتا تھا۔ شیخ صاحب موصوف نے الٰہ آباد کے ایک مشہور وکیل سر تیج بہادر کو مقرر کیا اور یہ مقدمہ جیت گئے۔ اس پر نظام کی حکومت نے

پریوی کونسل لندن میں مُرافعہ دائر کیا۔ اس میں عرفانی صاحب کو نواب صاحب نے پیروکار لندن اور خواجہ کمال الدین صاحب ایڈوکیٹ کو اپنے مقدمہ کی وکالت کے لئے مقرر فرمایا۔ چنانچہ پریوی کونسل میں بھی لیڈی وقار الامراء کی جیت ہوئی۔

حضرت مولوی شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ ۱۹۳۲ء سے ستمبر ۱۹۵۷ء اپنی وفات تک سکندرآباد میں مقیم رہے۔ ۱۹۵۰ء سے لیکر ۱۹۵۷ء تک کئی کتابیں لکھیں۔ جن کی تفصیل طوالت کی وجہ سے اجازت نہیں دیتی۔ انشاء اللہ جب ان کی سوانح مرتب کی جائے گی' ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔ البتہ ان کی مشہور تصنیف حیات احمد جو چار پانچ جلدوں پر مشتمل ہے وہ بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو سیرت اور سوانح حضرت مسیح موعودؑ پر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ صالح محمد الٰہ دین صاحب ان کے خاص شاگرد تھے' حافظ صاحب کو قرآن مجید بھی انہوں نے ہی حفظ کروایا تھا۔ موصوف کے چار لڑکے جن کے نام یہ ہیں: (۱) مکرم داؤد احمد عرفانی۔ (۲) مکرم یوسف احمد عرفانی (۳) محمود احمد عرفانی (۴) ابراھیم احمد عرفانی ہیں۔

مکرم محمود احمد عرفانی صاحب جن کی دو مشہور تصانیف (۱) قادیان دارالامان ہے اور (۲) نصرت جہاں بیگم صاحبہ (سیرت وسوانح دو جلدوں میں ہے)۔ ان کی وفات کم عمری میں ہی ہوگئی۔ انہوں نے جامع ازہر میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ جماعت احمدیہ کے پہلے جرنلسٹ رہے۔ اپنی زندگی میں صرف اخبار الحکم ہی نہیں نکالا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ احمدی خواتین کے لئے ایک رسالہ احمدی خاتون بھی جاری کیا۔ ممبئی سے ایک اخبار سالار بھی جاری کیا اور ایک رسالہ امدادِ باہمی کے نام سے بھی نکالا تھا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران وفادار نامی رسالہ بھی جاری فرمایا تھا۔ دیگر تصانیف کے علاوہ قرآن شریف کی تفسیر بھی شروع کی تھی جو چند سیپاروں پر مشتمل رہی۔

جب ان کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ حالت بہت نازک ہوگئی۔ اس وقت وہ جامع عثمانیہ کے قریب سیٹھ محمد اعظم کے باغ جو آج کل ناچارم کے نام سے موسوم ہے مقیم تھے' وہیں پر پانچ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی اور ان کی تدفین بہشتی مقبرہ قادیان میں خطہ صحابہ میں عمل میں آئی۔

اس تعلق سے ایک وضاحت بیحد ضروری یہ ہے کہ آپ مدرسہ احمدیہ قادیان کے پہلے ہیڈ ماسٹر بھی مقرر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے۔ درجات بلند فرمائے۔ جنت کے اعلیٰ مقام میں جگہ دے۔ آمین۔ بیان کرتے ہیں کہ مولانا صاحب کی نعش بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن کے لئے لیجانے کی توفیق ۱۹۵۸ء میں ملی۔

حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی الکبیرؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۱۸۹۹ء میں پہلی بار جلسہ سالانہ قادیان کی باقاعدہ رپورٹنگ کی اور اُس کو اُنھوں نے شائع کیا۔ رسالہ الحرا اب برموقع صد سالہ جلسہ سالانہ عالمگیر مجلّہ امان اللہ کراچی بھی مرتب کی۔

نوٹ: مدرسہ احمدیہ قادیان ۱۸۸۷ء میں پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے (الفضل لندن انٹرنیشنل ۱۹۹۵ء)

مولانا بہاء الدین خان صاحب کے مختصر حالات

مولانا بہاء الدین خان صاحب میر محمد سعید صاحب کی تبلیغ سے احمدی ہوئے۔ انہوں نے مدرسہ نظامیہ سے مولوی فاضل کیا۔ مدرسہ نظامیہ کے مولوی فاضل احمدی علماء مکرم میر اسحاق علی صاحب ایڈوکیٹ اور اُن کے بھائی مکرم منیر الدین صاحب ملازم صدر محاسبی وغیرہ تھے۔ بعد حصولِ تعلیم مولوی بہاء الدین خان صاحب نے اپنی تبلیغی کاوشوں کے ذریعے ضلع محبوب نگر کے اسحاق علی صاحب کو اور اُن کے بھائی منیر الدین صاحب کو احمدی بنایا اور ایک اُن کے ہم مکتب دوست وزیر محمد خان کو بھی اپنی کاوشوں کے ذریعہ احمدیت میں داخل کیا اور جڑچرلہ ضلع محبوب نگر کے ایک گاؤں میں دو بھائی مکرم محمد اسمٰعیل صاحب اور مکرم بندے علی صاحب کو بھی انہی کے ذریعہ قبول احمدیت کی توفیق حاصل ہوئی۔

مولانا بہاء الدین خان صاحب کو اُردو و فارسی اور عربی کی استعداد غیر معمولی تھی چنانچہ انہوں نے ایک قصیدہ بغیر نقطوں کا شاہِ دکن میر عثمان علی کی شان میں لکھ کر شاہ کی خدمت میں پیش فرمایا جب بادشاہ نے ملاحظہ فرمایا اور اپنے خصوصی فرمان کے ذریعہ اُن کو مدرسہ دارالعلوم کالی کمان

گلزار حوض میں فارسی اور عربی کی درس و تدریس کے لئے تقرر فرمایا۔ اس مدرسے میں اُس زمانے کے کئی احمدی بچے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ جن میں محمد صادق صاحب، محمد شمس الدین صاحب، احمد غوری صاحب مرحوم، میر احمد صادق صاحب اور کریم الدین خان صاحب قابل ذکر ہیں۔ مولانا کے تعلق سے بیان کیا جاتا ہے کہ شعلہ بیان مقرر تھے۔ ان کی تقریر سننے کے لئے احمدی تو آتے ہی تھے غیر احمدی حضرات بھی دور دور سے احمدیہ مسجد افضل گنج تشریف لاتے اور اُن کی تقریر سے محظوظ ہوتے تھے۔ اکثر مولانا صاحب اور مکرم سید بشارت احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد' یادگیر' محبوب نگر' چنتہ کنٹہ اور اوٹکور دورہ ذوقی مرحوم (مصنف شاہ نامہ احمد

مولانا کی زندگی کے حالات باوجود تگ و دو کے کہیں سے حاصل نہیں ہوسکے۔ البتہ ایک قصیدہ دستیاب ہوا ہے جو مولانا نے حضور نظام میر عثمان علی خان بہادر کی شان میں بغیر نقطوں کا لکھا اور پڑھ کر سنایا تھا' جس پر حضور نظام دکن نے ان کی ادبی تخلیق اور عربی صلاحیت سے متاثر ہوکر مدرسہ دارالعلوم گلزار حوض کالی کمان کا بحثیت صدر مدرس کے ترقی کے احکام صادر فرمائے۔ یہی وہ عربی قصیدہ ہے۔

جملہ ہائے معترضہ قابل تحریر ہیں۔

بضمن سفر دہلی و پنجاب جو ہمارے والد صاحب نے کیا تھا بطور خاص لاہور کا واقعہ یہ بیان کیا کہ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کو بچشم خود دیکھا۔

فرماتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت صاحب مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ اور اُن پر عوام پتھر برسا رہے تھے۔ والد صاحب کے دریافت پر معلوم ہوا عوام نے حضرت اقدسؑ کے حالات اور مخالفت کا ذکر کیا اور یہ بھی والد صاحب نے کہا کہ حضرت اقدس کے معتقد حضرت اقدس پر چھروں کا سایہ کئے ہوئے تھے۔

علاوہ اس کے ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے والد صاحب کے دوست جو ایک جید عالم جو منطقی تھے، جن کا نام گرامی میر صادق علی صاحب تھا، جو نواب وقار الامراء کے اسٹیٹ میں متفرقات کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ غالباً یہ عالمِ قدیم صحابی میر صفدر حسین صاحب و میر مردان علی صاحب مددگار صدر سرکارِ عالی کی تبلیغ سے احمدیت کے معتقد ہوئے تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو چھوٹی سائز کی کتاب ازالہ اوہام بغرض مطالعہ دی اور والد صاحب نے یہ کتاب مجھے بغرض مطالعہ دے دی۔ اس وقت میں بالکل ابتدائی اردو سے واقف تھا۔ ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مطالعہ کے بعد خاکسار نے کتاب والد صاحب کو واپس کردی۔ والد صاحب نے فرمایا کہ یہ کتاب وہی غلام احمد صاحب قادیانی کی ہے جن کو میں نے لاہور میں دیکھا تھا۔ بہر حال اس کا ذکر اور مطالعہ کتاب سے میرے کان مجملاً تذکرۂ حضرت اقدس سے کافی حد تک آشنا ضرور ہوئے۔

والد صاحب کو اگرچہ کہ حضرت اقدس کی رویت تو نصیب ہوئی، جس کا تذکرہ اوپر کردیا گیا ہے، لیکن افسوس والد صاحب کو توفیق بیعت نہ ہوئی۔ اللہ مغفرت کرے۔ والد صاحب دینی علم و شغف سے مانوس نہ تھے اور نہ زیادہ پڑھے تھے، صرف معمولی اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس پر خاندان کے علماء اور دوسرے احباب جو ذی اثر تھے، ان کے سدِ راہ بھی ہوئے اور اصل سبب یہ بھی ہوا کہ یہ زمانہ حیدرآباد میں ترقی احمدیت کا نہ تھا اور جماعت قلیل تھی۔ زمانہ بالکل خاموشی سے بسر ہو رہا تھا۔ صرف مولوی میر محمد سعید صاحب آہستہ آہستہ تبلیغ اور ترقی احمدیت میں کوشاں تھے۔

پس بفضلہٖ تعالیٰ ہر دشواری و رکاوٹ کے ہوتے ہوئے مجھے خدا تعالیٰ نے استقامت عطا کی اور مولوی صاحب کے آغوش تربیت اور صحبت میں احمدیت ترقی کرتی گئی۔ خدا کے فضل سے مولوی صاحب کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی بھی شخصی بیعت نصیب ہوئی۔

اگرچہ کہ اس خاکسار کو اب احمدیت میں بفضلہٖ تعالیٰ استقامت ہو چکی تھی مگر ایک اور ابتلا تمام جماعت احمدیہ پر آیا۔ وہ یہ کہ یہاں علماء اور عوام بہ استقامت سیٹھ قائم الہ دین صاحب برادر خورد حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب نے جو اہلحدیث تھے، مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری اہلحدیث کو حیدرآباد میں بغرض مناظرہ و بغرض تردید دلائل و صداقت سلسلہ عالیہ مدعو کیا۔ پس اس مولوی کے آتے ہی حیدرآباد میں جھوٹا پروپگنڈۂ مخالفت کا آغاز ہوا۔ اس مولوی نے اپنی تقاریر میں تصنع و ریاکاری کا ایک جال پھیلا دیا، جس کے مویئد حیدرآباد کے اعلیٰ عہدیدار، حکام و ذی اثر حضرات ہو گئے۔

خصوصاً حکیم مقصود علی خان ابن مکرم منصور علی خان اس مولوی (ثناء اللہ امرتسری) کے پیش پیش تھے۔ بلکہ حیدرآباد کے صدر اعظم سر کشن پرشاد یمین السلطنت بھی اس اہلحدیث کی مجلس کی زینت بنے رہے اور جماعت کی جانب سے عبدالرحمٰن مصری صاحب اپنی جوابی تقریر میں دندان شکن جواب دیتے رہے۔ اس کا اثر عوام پر بہتر ہوا۔ اور اہلحدیث مولوی کو ہر موقع ندامت و پشیمانی اٹھانی پڑی۔ یہ خاکسار بھی اپنے متعدد دوست و اقارب کو اہلحدیث کی مجلس میں لے گیا اور اس کے خلاف واقعہ دلائل کو سننے کا موقع دیا۔ ہمارے احباب سلسلہ احمدیہ میں داخل تو نہیں ہوئے لیکن مولوی ثناء اللہ کی مجلس میں شریک ہو کر بے ہودہ بکواس سے متنفر ضرور ہوئے اور یہ کہا کہ اس مولوی نے ہماری کوئی تشفی و تسلی نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ مولوی صاحب کے اخلاق بے حد گرے ہوئے تھے اور اپنی شہرت کے متمنی تھے۔ جب کہ حیدرآباد میں یہ غوغائے بے ہنگام برپا تھا۔ مولوی میر محمد سعید صاحبؓ نے یہ فرمایا کہ مولوی نے مخالفت کا ایک طوفان مچا رکھا ہے میں تم سب کے لئے دعا کر رہا ہوں۔ بفضل تعالیٰ حضرت کی دُعا نے اس مولوی کے طوفان کا کسی احمدی پر کوئی مضر اثر نہ ہونے دیا۔ اگرچہ کہ بہی خواہان ثناء اللہ نے جھوٹا پروپگنڈہ پھیلایا۔ کہ اکثر احمدی

مرتد ہو گئے۔ بلکہ اخباروں میں ایک شخص مسمی مزمل لکھوادیا۔ جو بالکل بے اصل ولغو تھا بفضل
تعالیٰ بالغ تو کیا ایک کمسن لڑکا بھی اس اہلحدیث کے پروپگنڈہ سے متاثر نہ ہوا۔ بلکہ اس مولوی
کے آنے سے کمزور اشخاص کو استقامت نصیب ہوئی خصوصاً سیٹھ احمد الدین صاحب المخاطب بہ
احمد نواز جنگ جو اس اہلحدیث کے مجالس میں ہمیشہ شریک ہوا کرتے تھے' ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور
صاحب موصوف ہمیشہ سلسلہ عالیہ کے معتقد و مالی امداد کے مؤید رہے۔

اس کے بعد اب کچھ وہ حالات درج کئے جاتے ہیں جو ہر احمدی کے لئے موجب
استقامت ہوئے۔ جس میں یہ احقر بھی شامل ہے وہ یہ کہ حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کی صحبت
ہر ملنے والے کے لئے ایک اکسیر اعظم تھی' یوں تو ہروقت و ہرلحظہ حضرت موصوف سے کشف و
کرامات سننے اور مشاہدہ میں آتے رہے اور یہ کرامات و پیشین گوئیاں ہر ایک کے لئے مشعل
ہدایت ثابت ہوئے اور صحبت میں اعتقاد رہنے والے کے لئے موجب استقامت ہوئے۔ جس
میں سے مختصراً جو خاکسار کے موجب یقین ہوئے اور جن کو احقر کے دل نے باوجود سالہا سال
ہونے کے بھلا نہ سکا درج ذیل ہیں اور کئی پیشین گوئیاں تحریر میں اس لئے نہیں لایا کہ ممکن ہے
عرصہ دراز ہونے سے اختلاف بیان واقع ہو یا یقین سے کسی حد تک دور ہی ہو اور دوسروں کے
لئے موجب ٹھوکر بنے۔ ان حالات کے لکھنے کا مقصد ایک یہ بھی ہے کہ اس ضمن میں حضرت
مولوی صاحب ممدوح کے کچھ حالات بطور یادگار ذکر ہو جائیں اور آنے والی نسلوں کے لئے
موجب ہدایت و موجب عبرت ہوں۔

مولوی سید عمر صاحب کی وفات:

مولوی صاحب کی خوشدامن صاحبہ جو خاکسار کی حقیقی دادی کی علاتی ہمشیرہ ہوتی تھیں'
میری دادی صاحبہ کے گھر میں چند دن کے لئے کسی ضرورت کے سبب مقیم تھیں۔ حضرت مولوی
صاحب بغرض ملاقات خوشدامن صاحبہ ہمارے گھر میں تشریف لاتے تھے۔ یہ زمانہ تقریباً ۱۹۱۱ء کا
تھا۔ حیدر آباد میں اس سن مرض طاعون کا شدید زور تھا اور یہ مرض ۱۹۱۱ء کے وسط سے شروع ہو کر
چھ سات ماہ تک رہا۔ ان ایام میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ آخر طاعون
میں تین اشخاص میں سے جن کے ناموں کے سرحرف الف و میم و ع ہیں' ان میں سے ایک شخص

مرض طاعون سے ضرور ہلاک ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو میں جھوٹا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت الف و
میم و ع سے کون لوگ مراد ہیں۔ فرمایا کہ الف سے مراد مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ استاد حضور
نظام میر عثمان علی خان اور میم سے مراد مولوی عبدالمقتدر صاحب لیکچرار عثمانیہ یونیورسٹی اور ع سے
مراد مولوی سید عمر صاحب قادری عالم و مرشد سلسلہ قادریہ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت انوار اللہ
صاحب اور سید عمر صاحب بیشک سلسلہ کے مخالف ہیں اور ہمیشہ ان کی جانب سے مخالفت میں
ٹریکٹ شائع ہوتے رہتے ہیں' لیکن عبدالمقتدر صاحب کیوں ہلاک ہوگا۔ فرمایا کہ یہ شخص حضرت
اقدس (مسیح موعودؑ) کو گالیاں بہت دیتا ہے۔ اس لئے اس کے دو ماہ بعد جبکہ بموجب مولوی
صاحب کے فرمانے کے مرض طاعون کا آخر زمانہ تھا۔ ۲۰ صفر ۱۳۳۰ ہجری م ۱۹۱۲ء مولوی سید عمر
صاحب مرضِ طاعونِ شدید سے فوت ہو گئے اور یہ پیشن گوئی لفظ بہ لفظ بوجہ احسن پوری ہوگئی۔
اگرچہ بہ یادگار سالانہ ان کے معتقدین عرس مناتے ہیں اور اس سے ہم احمدیوں کے لئے حضرت
ممدوح کی پیشن گوئی کی یاد ہر سال تازہ ہوتی ہے۔

مظفر جنگ صاحب کی وفات:

ایک وقت مولوی صاحب کو کچھ غنودگی سی تھی۔ اس احقر کو ملاقات کا موقعہ نصیب ہوا'
فرمانے لگے کہ مظفر جنگ مر گئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت وہ تو بہتر حالت میں زندہ ہیں اور
اس وقت تک مرے نہیں۔ فرمانے لگے مجھے بتلایا گیا ہے کہ وہ مر گئے۔ ان کی موت کے تین معنیٰ
ہیں۔ یا تو مظفر جنگ ہمارے سلسلہ میں آجائیں گے جو غیر احمدیت کی موت ہے۔ یا اب جو
ہمارے مخالف ہیں اس مخالفت میں اور ترقی ہو جائے گی۔ یہ بھی ایک موت ہے۔ یعنی ان کی
روحانیت پر ہو جائے گی یا پھر طبعی موت آجائے گی۔ پس اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد غالباً
مرض طاعون سے مظفر جنگ بھی فوت ہو گئے اور یہ پیشن گوئی بھی پوری ہوگئی۔

عبدالباقر خان صاحب کی وفات:

ایک وقت فرمایا کہ ایک شکرا ایک کبوتر کے پیچھے بغرض شکار دوڑ رہا ہے اور بہت دور
تک پیچھا کرتے ہوئے جا کے کبوتر کو پکڑ لیا۔ اس کبوتر سے مراد عبدالباقر خاں صاحب وکیل
ہے۔ پس حضرت کے فرمان کے بموجب یہ وکیل باشندہ حیدر آباد کسی غرض سے کلکتہ کو گئے ہوئے

تھے۔ وہاں فوت ہوگئے۔ یہ صاحب سلسلہ کے بے حد مخالف تھے۔ (موت نے حیدرآباد سے ان کا پیچھا کیا اور کلکتہ میں حیدرآباد سے بہت دور ان کو جا دبوچا)

نواب یوسف علی خان صاحب سالار جنگ کی برطرفی:

ایک وقت فرمایا کہ نواب یوسف علی خان صاحب المخاطب بہ سالار جنگ جو اس وقت صدر اعظم حیدرآباد تھے، حضرت مولوی صاحب نے ان کو عالم کشف میں ہجڑے کی شکل میں ناچتا ہوا دیکھا اور ان کے سر کی ٹوپی جو کارچوبی تھی، اس کو کسی نے دھکا مار کر گرادیا۔ لہٰذا اب یہ بہت جلد وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہوجائیں گے۔ پس تھوڑے سے ہی عرصے بعد وہ وزارت عظمیٰ سے علیحدہ و سبکدوش کردیئے گئے (اور ساری زندگی مجرد رہے اور لاولد مرے۔ حیدرآباد میں کسی کو نامرد کہنا ہوتو اس زمانے میں سالار جنگ کہا کرتے تھے، پیشگوئی کا یہ قصہ بھی پورا ہوا) یہ صاحب تعمیر احمدیہ مسجد کے سخت مخالف تھے اور پیش گوئی بھی پوری ہوگئی۔

مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ کی وفات:

ایک وقت فرمایا، مجھے دکھایا گیا ہے کہ مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ استاد نظام کی پشت پر کسی فرشتے نے زور سے ہتوڑا مارا۔ اس صدمے سے مولوی صاحب کے کانوں سے ایک بجلی نکلی۔ میں نے بنظر ہمدردی اس فرشتے سے کہا کہ یہ میرے دوست ہیں۔ فرشتے نے کہا کہ اس کے اعمال مخالف ہیں۔ بہت بد ہیں تم نہیں جانتے۔ پس اس کے تھوڑے دن کے بعد مولوی صاحب کی پشت پر بڑا پھوڑا ہوا اور آپریشن سے موت واقع ہوئی اور حضرت ممدوح کا کشف پورا ہوگیا۔

پس یہ ایسے دلکش واقعات چشم دیدہ تھے کہ میرا اب سلسلہ عالیہ احمدیہ سے دور رہنا ممکن نہ تھا۔ میں نے حضرت مولوی میر سعید صاحبؓ سے حضرت مسیح موعودؑ کی کتب دینے کی استدعا کی اور حضرت سے متعدد کتبِ حضرت اقدس لے کر باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا اور بعد اطمینان ۱۳۳۰ ہجری میں بیعتِ حضرت میں داخل ہوگیا اور تھوڑے عرصے کے بعد احقر کی اہلیہ بھی داخل سلسلہ عالیہ ہوگئیں۔ اب میں بفضلہٖ تعالیٰ معہ اپنی اہلیہ اور دولڑکے مسمیان محمد موسیٰ خان و سردار خان کے احمدی ہوں اور الحمد للہ یہی نہیں بلکہ میری بہو صاحبہ بھی احمدی ہیں اور میرے ایک بھائی محمد شفیع

الدین خان صاحب بھی اس احقر کی تبلیغ سے احمدی ہیں۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

الرقوم ۱۵/امرداد ۱۳۴۱ف م ۵/صفر ۱۳۵۱ بروز جمعہ شرح دستخط خاص (محمد عبدالرشید خان)

حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ جس زمانے میں اپنے حکیم محمد عبداللہ خاں صاحب مرحوم کے مکان واقع محلّہ مستعد پورہ میں (جو خاکسار کے رشتہ کے دادا تھے) مقیم تھے۔ اس وقت میں تخمیناً ۱۰ یا ۱۱ سال عمر کا تھا۔ اس زمانے میں مولوی محمد عظمت اللہ خان صاحب جو حضرت میر محمد سعید صاحب کے ماموں خسر تھے۔ ان کی زبانی اکثر حالات و واقعات سلسلہ احمدیہ اور خصوصاً حضرت محمد سعید صاحب کے بطرزِ شکایت سننے میں آتے تھے کیونکہ مولوی صاحب موصوف اس وقت تک سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ نیز خاکسار کی حقیقی دادی صاحبہ و نیز والدہ صاحبہ وغیرہ کی اکثر اوقات بطور مہمان بلحاظ رشتہ داری حکیم صاحب مرحوم کے مکان میں آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ ان کی زبانی ہی لفظ قادیانی سے آشنائی ہوئی اور یہ خاکسار بھی کبھی کبھی احمدیہ سلسلہ سے صرف دور کی سلام وعلیک سے مستفید ہوجایا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد میں صرف چند ہی خوش نصیب احباب کا تعلق سلسلہ عالیہ سے تھا اور بالکل قلیل جماعت حضرت کے ساتھ تھی اور میری یہ حالت تھی کہ نہ مجھے سلسلہ عالیہ کے حالات سے واقفیت تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ یہ جماعت بھی اسلام میں کوئی جماعت ہے۔ میرے خیال میں یہ حالت عام طور پر اس زمانہ میں سارے بلدہ (حیدرآباد) میں تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف اعلیٰ طبقہ یا مذہبی حضرات ہی اشتہارات حضرت مسیح موعودؑ کی وجہ سے سلسلہ کے حالات سے واقف ہوں۔

اب جبکہ خاکسار کی عمر تقریباً ۲۲ سال ہوگئی اور وہ دور احقر کے تعلیمی زمانے کا تھا۔ ایک مولوی محمد اسد اللہ بیگ صاحب سے جو حضرت میر محمد سعید کے شاگرد رشید تھے اور بعد میں حضرت کے رشتہ دار بھی ہوگئے تھے۔ ان سے بضمن تعلیم دوستی ہوگئی تھی، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ''مدرسہ فخریہ آسمان جاہی'' میں حضرت مولوی محمد یٰسین صاحب کے پاس، میں جماعت منشی میں تعلیم پاتا تھا اور مولوی اسد اللہ بیگ صاحب بھی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مولوی یٰسین صاحب کے یہاں روزانہ تشریف لاتے تھے اور تعلیمی سلسلہ کی وجہ سے روزانہ ملاقات لازماً ہوتی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مولوی محمد اسد اللہ بیگ صاحب سے رشتہ اتحاد مستحکم ہوگیا۔ مجھے یہ

بخوبی علم تھا کہ مولوی محمد اسداللہ بیگ صاحب حضرت میر محمد سعید صاحبؓ کے شاگرد ہیں اور احمدی بھی ہیں۔ اس لئے گاہے گاہے یہ احقر محمد اسداللہ بیگ صاحب سے بغرض معلومات سلسلہ عالیہ کے حالات پوچھ لیا کرتا تھا اور موصوف کی علمی باتیں احقر کو بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ خصوصاً وفات مسیح کا مسئلہ بمقابلہ عوامی عقیدہ ۔ صحیح اصول پر معلوم ہونے لگا۔ کیونکہ اب بوجہ شرکت جماعت منشی و مطالعہ کتب درسی وغیرہ کافی استعداد مذہبی باتوں کے سمجھنے کی توفیق ملی۔ اور مختلف صحبتوں میں بیٹھنے سے اور نئے نئے لوگوں کے ملنے سے اور ان سے مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے سے حوصلہ استعداد روزانہ مذاکرہ مباحثہ کی ترقی پذیر ہوتی گئی اور بعض اوقات مولوی اسداللہ بیگ صاحب کے ارشادات سلسلہ عالیہ بھی احقر کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر رہے تھے اور یہی ارشادات آئندہ کمترین کے ادخال سلسلہ میں ممد و معاون ہوئے۔ جب احقر جماعت منشی میں کامیاب ہوگیا اور مولوی اسد اللہ بیگ کے ایماء پر ارادہ تعلیم کر کے منشی فاضل کی تعلیم شروع کردی تو اب مولوی اسداللہ بیگ صاحب سے رشتہ اتحاد بے حد مستحکم ہوگیا کیونکہ منشی فاضل کی اکثر کتب مولوی اسداللہ بیگ صاحب سے حاصل کی گئی تھیں۔

بالآخر اس روزانہ ملاقات اور اتحاد باہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت میر محمد سعید صاحب کے مکان موقوعہ بی بی بازار میں اکثر آمد و رفت شروع ہوگئی اور حضرت قبلہ سے بھی بلحاظ رشتہ داری تعارف بڑھتا گیا اور حضرت کے اخلاق حسنہ دل میں گھر کرتے گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ غیر احمدیوں سے دل میں کراہت ہوتی گئی اور احمدیت سے دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔ اب شوق اس قدر بڑھا کہ حضرت میر محمد سعید صاحب کی صحبت سے ایک لحظہ دور رہنے سے مانع ہوتا تھا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درس قرآن شریف جو حضرت قبلہ کے مکان میں روزانہ شب کو ہوا کرتا تھا باقاعدہ شریک ہونے لگا۔

اب حضرت مولوی صاحب قبلہ سے اس کمترین کو سلسلہ کے اکثر واقعات خصوصاً مسیح موعودؑ (جو اس وقت زندہ تھے) کے روزانہ کے حالات اور مخالفین کی شکستیں سننے میں آنے لگیں اور یہ شراکت غیر از اوقات معینہ میں بوجہ رشتہ داری مکان میں بہ عقیدت آمد و رفت شروع ہوگئی اور روزانہ کی بیٹھک میں حضرت ممدوح کے مکاشفات و کرامات کے دیکھنے و سننے کا موقعہ ملتا گیا

اور ایسے ہی واقعات کی کثرت احقر کے ازدیاد ایمان کا موجب اور سلسلہ عالیہ میں بخلوص داخل ہونے کی توفیق ہوئی۔ عبدالرزاق صاحب نے جو مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی کے بڑے بھائی تھے ۱۹۰۸ء میں گھر کی مستورات و بچوں کو طغیانی سے بچانے میں گراں بہا مدد کی اور مولوی صاحب مرحوم اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے بھائی صاحب مرحوم کی خدمات کا کھلے عام اعتراف فرمانے لگے تھے۔

حیدرآباد میں یہ زمانہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں' یوں کہنا چاہئے کہ یہاں احمدیت کی تخم ریزی ہو رہی تھی یا احمدیت کا آفتاب اپنی آب و تاب سے طلوع ہو رہا تھا یا یہ کہ احمدیت طفل نوزائیدہ تھا یا ایک نوخیز پودا تھا جس کو جڑ سے اکھاڑنے اور کچل دینے کی سعی بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ ایک طرف مولوی سید عمر صاحب مشہور واعظ مکہ مسجد اپنے مواعظ میں تردید احمدیت کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے تو دوسری طرف استاد شاہ مولوی انوار اللہ خان صاحب بانی جامعہ نظامیہ صدر الصدور محکمۂ امورہ بھی اپنی عالمانہ تصانیف سے شیش محل میں بیٹھ کر احمدیت کی مضبوط چٹان پر سنگباری کر رہے تھے۔ عوام میں قادیانیوں کے تعلق سے زبردست شور و فتنہ برپا تھا۔ ہر طرف لعنت و پھٹکار اور لاحول کے اوراد نہایت شدت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے اور مجھے معلوم ہے کہ حضرت مولوی صاحب اور ان کے رفقاء حضرت مولوی عبدالکریم صاحب جو میرے خسر بھی ہوتے ہیں اور بھائی صاحب کو بعض وقت سخت مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن ان اصحاب کا ہی دل گردہ تھا کہ اس طوفان بے تمیزی میں اپنے اعتبارات کو مٹنے نہ دیا اور ایسی جدوجہد جاری رکھی کہ آج کے موجودہ جماعت کو ان ہی حضرات کی کاوشوں اور قربانیوں کا ثمر شیریں کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

غرض بھائی صاحب مرحوم کا بہترین کارنامہ یہی ہے کہ حضرت مولوی صاحب کے کاموں میں ممد و معاون رہے اور ان کے تکمیل پانے تک اپنی بہترین کوششیں اور توجہات صرف فرماتے رہے۔ بمقام ناندیڑ ہیضہ سے انتقال کیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

''ایسے ہوتے ہیں جواں مرد۔ دستخط' عبدالقادر صدیقی

مولوی محمد عبدالقادر صاحب صدیقی نے ۱۵ امرداد ۱۳۴۱ف دوشنبہ بعد مغرب تشریف

لاکر یعنی سہ شنبہ کی شب غریب خانہ پر قیام فرمایا۔ ایک بجے رات تک واقعات زریں کو اپنے قلم سے تحریر فرما کر زحمت فرماتے رہے۔

۱۶ امرداد کی صبح میرے اصرار پر اپنے وسیع القلبی سے تکلیف گوارا فرما کر اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالرزاق صاحب کے واقعات بھی قلمبند فرما کر مجھے ممنون فرمایا۔

دستخط محمد عبدالرشید خان احمدی

المرقوم ۱۱؍جولائی ۱۹۶۰ء ساکن قاضی پورہ حیدرآباد دکن

ابتدائی دور کے احمدی مولوی مومن حسین صاحب سعید آباد

خاکسار کو اوائل عمری سے اخبار بینی کا شوق ہے۔ سلسلہ عالیہ کے قدیم اخبار الحکم والبدر حضرت سیٹھ شیخ حسنؓ صاحب احمدی جو خاکسار کے خالہ زاد خسر ہوتے ہیں ان کی معرفت اخبارات دیکھنے میں آتے تھے۔ اس طرح کا سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ اس کے بعد سیٹھ صاحب موصوف یادگیر چلے گئے اور وہیں کاروبار شروع کئے۔

۱۹۱۲ء میں بزمانہ پلیگ حضرت مولوی میر محمد سعید صاحبؓ یادگیر سیٹھ صاحب کے یہاں تشریف لائے جہاں خاکسار بھی تھا۔ مولوی صاحب موصوف کی روحانی باتیں احمدیت کے متعلق سن کر بیعت کرلیا۔ ہاں یہ ناشکری ہوگی کہ میں ...... اخویم جناب سید بشارت احمد صاحب کا ذکر خیر نہ کروں۔ ان کی ملاقات کا بھی میرے پر اچھا اثر ہوا تھا اور اکثر وہی مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ بیعت کے بعد حضرت مولوی میر محمد صاحبؓ کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں بزمانہ خلافت حضرت مولانا نورالدین صاحب قبلہ قادیان جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں غالباً دس روز کا قیام رہا۔ وہاں سے واپس حیدرآباد آکر میں اپنی ملازمت کا کام کرتا رہا۔ اپنی ملازمت سے رات کے دس بجے گھر کو جاکر عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہوکر حضرت مسیح موعودؑ کی کتب اخویم سیٹھ محمد خواجہ صاحب مرحوم کو سنایا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک سال کے قریب تک جاری رہا۔ کتب حضرت اقدسؑ کو سن کر ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی سلسلہ عالیہ میں داخل ہوگئے۔

اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں حضرت مولانا نور الدین صاحبؓ قبلہ کا وصال ہوا۔ بعد

تدفین جماعت میں اختلاف ہوا۔ اس اختلاف میں خاکسار نے لاہوری جماعت کا ساتھ دیا۔ اس اختلاف کے زمانے میں حضرت مولوی میر محمد سعید صاحب اور حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحب اور مولوی سید بشارت احمد صاحب اور سیٹھ محمد خواجہ صاحب کا میرے ساتھ برتاؤ نہایت عمدہ رہا ہے۔ باقی لوگوں کا ناقابل برداشت عمل رہا۔ ۱۹۲۶ء میں اخویم محمد خواجہ صاحب کا انتقال ہوا۔ اس کے دوسرے روز ہی سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی نے تحریک کی کہ بیعت خلافت کرلو۔ ان کے فرمانے پر میں جو پہلے ہی سے ان کے حسن سلوک وغیرہ کے باعث جلد ہی بیعت خلافت کا خط لکھ دیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس کو قبول فرما کر خاکسار کو قادیانیوں میں داخل فرمالیا۔ جس کی وجہ سے خاکسار کو بڑی مسرت ہوئی۔

زمانہ اختلاف میں خاکسار کے کچھ مخالفین خلافت ثانیہ کے خلاف میں کچھ لکھے تھے، لیکن حضرت خلیفۃ المسیح ثانی نے اپنی خداداد اور اولوالعزمی سے اس کا کوئی خیال نہیں فرمایا اور بیعت میں داخل فرمالیا جس کا خاکسار ممنون ہے۔ اور مجھے تھوڑی بہت جو مسائل کے متعلق کمزوری تھی وہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب نیرؓ کی وجہ سے دور ہوگئی۔ والحمد للہ علی احسانہ۔ اخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مختصر حال محمد خواجہ صاحب

محمد خواجہ صاحب برادر حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ احمدی کو خاکسار راتوں میں کتب حضرت اقدس مسیح موعودؑ سنایا کرتا تھا۔ جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ بیعت سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوگئے۔ وہ حضرت مولانا میر محمد سعید صاحبؓ کے ہاتھ پر بزمانہ خلافت حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ قبلہ بیعت کئے۔ بعد وفات حضرت خلافت ثانیہ سے کچھ اختلافات بھی رہے۔ لیکن بعد میں حضرت سیٹھ شیخ حسن احمدیؓ نے ان کو بیعت خلافت ثانیہ سے مشرف کرادیا۔ مرحوم پر بیعت سلسلہ عالیہ احمدیہ کا بڑا خاص اثر ہوا اور ان میں بڑی خاص تبدیلی ہوگئی تھی۔ مرحوم بڑے سنجیدہ اور خاموش آدمی تھے۔ بہرحال آج سے چار سال قبل ان کا انتقال ہوا اور آخر وقت ان کا نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ خاتمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ فقط

خاکسار۔ شرح دستخط (مومن حسین) احمدی

ابتدائی دور کے احمدی مولوی عبدالقادر صدیقی صاحب

محترم جناب ذوقی صاحب کا بہ اصرار ارشاد ہے کہ خاکسار اپنے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہونے کے حالات قلمبند کرے۔ بہ تعمیل حکم عرض ہے کہ ہیچمدان نے ۱۹۱۲ء میں امتحان مڈل پاس کیا۔ چونکہ پیدائش سے رہائش نارائن پیٹھ ضلع محبوب نگر میں تھی اور یہیں کے مدرسہ وسطانیہ سے مڈل کامیاب ہوا تھا' لہٰذا مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے میں اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالرزاق صاحب کے پاس آ گیا جو اس وقت حضرت قبلہ مولوی محمد سعید صاحب قدس سرہ کے ہاں اقامت گزیں تھے۔ جب میں یہاں پہنچا تو حضرت مرحوم کی شفقت وعنایت نے میری تعلیم کا راستہ کھول کر مجھے قادیان روانہ کرنے کا فیصلہ کر کیا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۱۷ سال ہوگی۔ ۱۹۱۳ء میں میں قادیان پہنچ گیا۔ وہاں کی نیک صحبت و ہمدردی و مہربانی، علمی ذوق کی روشنی میں صداقت احمدیت کے پرزور دلائل نے بالآخر مجھے بیعت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اسی سال میں سلسلہ احمدیہ میں حضرت مولانا نور الدین صاحب خلیفۃ المسیح الاولؓ کے دست مبارک پر بیعت سے مشرف ہوا۔ الحمدللہ۔

مارچ ۱۹۱۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کا وصال ہوا اور حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ منتخب ہوئے۔ تاریخ سلسلہ میں یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس سے عظیم الشان انقلاب وابستہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ اولؓ کا دور خلافت جماعت کی تربیت اور ترویج علوم قرآنی میں گذر گیا اور خلافت ثانیہ کے دور نے تبلیغ کے ایک رکے ہوئے سمندر کو پھر جاری کر دیا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ تمام جہان میں احمدی مشنوں کا قیام عمل میں آیا اور باقاعدہ مبلغ کرام ملک کے مختلف مراکز میں اشاعت اسلام کا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کی وفات پر اختلاف عظیم رونما ہوا لیکن اس خیال میں زیادہ صداقت نہیں پائی جاتی۔ اور یہ کام حضرت موصوف (حضرت خلیفہ المسیح اولؓ) انتہائی جزا و احتیاط کے ساتھ انجام دیتے رہے تھے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے حضور کے قرآنی حقائق و معارف سنے ہیں۔ آپ اس بات پر

بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے کہ خلفاء اللہ تعالیٰ بنایا کرتا ہے۔ اس میں انسانی تصرف کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وفات حضرت مرحوم پر پیغامیوں کا جو فتنہ عظیم صورت میں اٹھا' اس میں حضرت موصوف کی تعلیم نے مشعل ہدایت کا کام دیا اور بہت سوں کو ٹھوکر کھانے سے بچا لیا۔

غرض جب ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو حضور نور الدین صاحب کا وصال ہوا۔ ہمیں یہ خبر معلوم کر کے سخت رنج اور افسوس ہوا۔ ہم سیدھے حضرت محمد علی خان صاحب مالیر کوٹلہ کی کوٹھی پر جہاں حضرت کی نعش تھی پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ ایک دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور نعش کو دیکھ کر باحسرت واندوہ دوسرے دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ بعض لوگ حضرت کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بھی پائے گئے۔ چوطرف جماعتوں کو تاریں دی گئیں کہ حضرت کا وصال ہو گیا ہے۔ پھر کھچڑی پکنے لگی کہ خلیفہ کون ہو؟ اندر ہی اندر اکابر جماعت برابر مشورے کر رہے تھے کہ صورتحال کیا ہو۔ ہمیں معلوم ہوا کہ دو پارٹیاں ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ایک حضرت مرزا محمود احمد صاحب اور علامہ حافظ روشن علی صاحب و مولوی مسعود شاہ صاحب وغیرہم کی تھی اور دوسری مولوی محمد علی صاحب' مولوی صدر الدین صاحب و مرزا یعقوب بیگ صاحب و رحمت اللہ صاحب مالک انگلش ویرہاؤز وغیرہم کی تھی۔ خواجہ کمال الدین صاحب بحکم خلافت اولیٰ لندن میں تبلیغی کام کر رہے تھے۔

ان دونوں پارٹیوں میں آپس میں تبادلہ خیال ہوا کہ حضرت مرزا محمود احمد اور ان کے رفقاء ہر اس شخص کو خلیفہ ماننے کے لئے تیار ہوں گے جسے جماعت احمدیہ بہ اتباع سنت نبوی انتخاب کریں گے۔ جو پارٹی مولوی محمد علی صاحب کی سرکردگی میں تھی' وہ یہ کہتی تھی کہ اب خلافت کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے صدر انجمن احمدیہ کو خلیفہ کا جانشین فرمایا ہے۔ حضرت خلیفہ المسیح اولؓ کی حیثیت بلحاظ بزرگی و علم و فضل بالکل ممتاز تھی اور آپ کو خلیفہ ماننے میں کسی کو انکار نہ تھا اور اب کوئی شخص اس پائے کا موجود نہیں ہے لہٰذا اب انتخاب خلیفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پارٹی کی جانب سے شنبہ کے روز یعنی دوسرے ہی دن جبکہ ابھی انتخاب خلیفہ عمل میں نہیں آیا تھا ایک ٹریکٹ بڑا طویل اور عریض شائع کیا گیا کہ صدر انجمن احمدیہ حضرت مسیح موعودؑ کی جانشین ہے۔ حضرت مولانا نور الدین اعظم کا وصال ہو چکا ہے اور اب کسی خلیفہ کی ضرورت

نہیں ہے۔ البتہ اغراض بیعت کے لئے سلسلہ کے پاک نفس بزرگ جن پر چالیس افراد اپنا اعتماد رکھتے ہوں حضرت مسیح موعودؑ کے نام پر لوگوں سے بیعت کریں۔ اس ٹریکٹ کی تیاری اور طباعت کے وقت کی گنجائش کا خیال کریں تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کارستانی حضرت خلیفہ اولؓ کی زندگی میں ہی جب کہ وہ ہنوز بستر مرگ پر تھے تیار کر لی گئی تھی اور وقت کے منتظر تھے کہ جونہی موقع ملے وقت کو ضائع کئے بغیر پروپگنڈہ شروع کر دیا جائے۔

بہر حال ہر دو خیال کے مقتدر اصحاب الرائے لوگوں نے باہمی مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہاں تک بھی سننے میں آیا کہ حضرت محمود احمد نے فرمایا کہ اگر مولوی محمد علی صاحب خلیفہ منتخب ہوں گے تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہ انشراح صدر ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ لیکن مولوی محمد علی صاحب قطعی راضی نہ ہوئے۔ اس پر حضرت محمود نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کی کہ خلافت کا تسلیم کرنا قانون اساسی کا ماننا ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا جو خلیفہ ہوگا ہم اسے مانیں گے۔

۱۴ مارچ ۱۹۱۴ء روز شنبہ کو اطراف و اکناف کی جماعتوں کے لوگ آ گئے۔ ان میں مولوی محمد احسن صاحب فاضل امروہی کی آمد قابل ذکر ہے۔ لوگ مسجد نور میں جمع ہوئے۔ حضرت نواب محمد علی خان صاحب نے حضرت خلیفہ المسیح اولؓ کی وصیت بہ آواز بلند پڑھ کر سنائی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرا جانشین وہ ہوگا جو عالم باعمل ہو۔ حضرت مسیح موعودؑ کے پرانے احباب سے نیک سلوک یا درگذر کرنے والا ہو۔ مولوی محمد احسن صاحب امروہیؓ نے بذریعہ تفسیر فرمایا کہ میاں محمود احمد صاحب اس منصب کے بہت اہل ہیں۔ اس کے بعد حضرت محمودؓ نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں تقویٰ پر زور دیتے ہوئے ایسے موقعوں پر اللہ تعالیٰ کی سنت کا تفصیل سے ذکر کیا اور خلافت کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ ہر طرف سے آوازیں آئیں۔ محمود، محمود، شملے پھینکے گئے۔ کئی ہزار کے مجمع نے شملوں پر ہاتھ رکھ کر بیعت خلافت ثانی کی۔ اس میں خاکسار بھی شامل تھا۔ بیعت لینے کے بعد حضرت خلیفہ المسیح الثانی نے حضرت خلیفہ المسیح اولؓ کا نماز جنازہ پڑھایا اور شام تک تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔

خاکسار نے قادیان میں ایک رویا دیکھی تھی، اس میں کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر

مسیح موعود کو دیکھنا ہو تو مرزا محمود احمد کو دیکھ لے۔ اس خواب کی تعبیر یہ سمجھ میں آئی کہ حضرت موصوف حضرت مسیح موعودؑ کے قائم مقام ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ نے حضرت امۃ الحی مرحوم کے ساتھ نکاح کیا۔ یہ نکاح ہمارے سامنے مسجد اقصیٰ میں عمل میں آیا۔ حضور نے اس نکاح کا سبب یہ بیان فرمایا کہ مرحومہ عورتوں میں درس قرآن جاری کرنے کے بارے میں اپنے والد مرحوم کی ہدایت کے ماتحت یاد دہانی کرتی ہیں اور اکتساب علوم دینی سے خاص شغف و تعلق ظاہر کرتی تھیں۔ کیوں نہ ہو فاضل باپ کی فاضلہ صاحبزادی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

۱۹۱۵ء میں خاکسار نے انٹرنس کا امتحان دیا اور حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ کی اجازت حاصل کر کے حیدر آباد دکن واپس آیا۔ نتیجہ نکلنے پر معلوم ہوا کہ خاکسار نے اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی ہے۔

حضرت قبلہ میر محمد سعید صاحبؓ مجھ پر خاص طور پر مہربان تھے اور میری دینی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ میں حضرت مرحوم کے درس قرآن و حدیث میں شریک رہتا اور علمی بحث و مباحثہ میں حصہ لیا کرتا تھا۔ حضرت ممدوح نے مجھے اور فضل احمد مرحوم کو شرح سفر السعادت کا درس دیا ہے اور جماعت مولوی کا کورس ختم کرا کر امتحان دلوایا ہے جس میں الحمدللہ کامیاب ہوا۔ حضرت موصوف نے ایک دفعہ مجھے اور قاضی عبدالکریم مرحوم اور مولوی عبدالقادر صاحب مچھلی بندری کو دہریت کی تردید میں مضامین لکھنے کا ارشاد فرمایا تھا۔ جوابات سنانے پر حضرت نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا تھا اور حضرت نے مضامین کے نام بھی تجویز فرمائے تھے لیکن وہ اس وقت حافظے میں نہیں ہیں۔ حضرت کے ارشاد کے ماتحت نوجوانان جماعت تقریر کی مشق کیا کرتے تھے جن میں میں بھی شامل ہوتا تھا۔ موصوف نماز جمعہ کے بعد تنہا تشریف فرما ہوتے اور چند نوجوان اپنی تقریر سنا دیا کرتے۔ حضرت کی محض شفقت تھی کہ باتیں، تقاریر اور مضامین کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے اور تعریفی الفاظ استعمال فرماتے تھے۔ میں ان الفاظ کو مبارک فال سمجھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس بزرگ کے کلمات طیبات کا

مصداق بنائے۔ آمین ثم آمین۔

حضرت قبلہ مولوی صاحب مرحوم نے تیر ۱۳۲۵ فصلی میں میری شادی مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم صیغہ دار صدر محاسبی کی صاحبزادی سے کرائی۔ میں ۱۳۲۶ء فصلی میں ملازم ہوا۔ یہ میری اہلی زندگی کا آغاز ہے۔ ۱۳۳۴ فصلی میں حضرت مولوی صاحب مرحوم کے ارشاد پر خاکسار، عبدالقادر صاحب مچھلی بندری، غلام حسن خاں صاحب، حیدر علی صاحب اور سید بشارت احمد صاحب امتحان جوڈیشنل میں شریک ہوئے اور بحمد اللہ سب کے سب کامیاب ہوئے۔

ان ہی دنوں میں حضرت موصوف کو تعمیر مکان مردانہ برائے عبادت و ملاقات و لکچر کی بے حد فکر دامنگیر تھی۔ چنانچہ اس تعمیر کے لئے حضرت نے بعض مخصوص احباب کو اعانت فنڈ کے لئے تحریک کی۔ خاکسار بھی یاد کیا گیا اور ہدایت کی گئی تھی کہ مبلغ ایک صد روپیہ اس فنڈ میں دوں۔ چنانچہ میں نے یکصد روپیہ سے کچھ زائد ہی رقم دی۔ جس پر حضرت نے خاکسار کی کشائش رزق و مال میں برکت و دیگر ادعیہ خیر فرمائے۔ میں اس واقعہ کا ذکر تحدیث نعمت کے طور پر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لئے خاکسار کو بھی منتخب کیا اور ایک بزرگ عالم ربانی سے میرے لئے دعا کروائی۔ **فالحمد للّٰہ علی ذالک**

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری وارد حیدرآباد ہوئے اور ایسی تفسیریں کیں جن سے عوام احمدیوں کے خلاف سخت بھڑک اٹھے۔ احمدیوں کی آبرو سخت خطرہ میں پڑ گئی۔ ایسے وقت میں مجھے بعض احباب کے ساتھ سلسلہ کی جانب سے حکم ہوتا تھا کہ ثناء اللہ صاحب کے جلسوں کی روئیدادیں لائیں۔ یہ ایسا نازک وقت تھا کہ اگر باتیں نوٹ کی جائیں تو لوگ احمدی سمجھ کر علانیہ گالی گلوچ پر اتر آتے اور لکھنے نہ دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم لوگ خاموشی کے ساتھ چپ چاپ سنتے اور نوٹس قلمبند کرتے اور ہمارے علماء کو پیش کر دیتے۔ اسی زمانے میں کئی ایسے مواقع بھی آئے جن میں ہم پٹتے پٹتے بچے اور اللہ تعالیٰ نے ہماری ہر میدان میں نصرت فرمائی۔

میں اور عبدالقادر صاحب مچھلی بندری جب تک وہ حیدرآباد میں تھے مل کر ہر جمعہ کو شام میں صدر مسجای...... پادریوں سے گفتگو کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اب بھی خاکسار جاتا

ہے اور اپنا کام کر آتا ہے۔

مجلس مشاورت قادیان میں جماعت حیدرآباد کی طرف سے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۱ء میں نمائندہ منتخب کیا جا کر روانہ کیا گیا تھا۔ قریباً چھ سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ جماعت نے مجھے اسسٹنٹ سکریٹری تبلیغ مقرر فرمایا اور اس کے بعد قریباً ایک سال سے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری کے فرائض میرے ذمہ تفویض ہیں۔

میری عمر اس وقت ۳۷ سال کی ہے۔ دفتر نظامت علاج حیوانات سرکار عالی میں نائب منتظم ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے مجھے ایک وسیع قلب اور وسیع حوصلہ عنایت ہوا ہے اور جانتا ہوں کہ میرے خالق و مالک نے مجھ پر عام احسانات کے علاوہ مخصوص احسانات کئے ہیں جن کا میں ہرگز اہل و مستحق نہ تھا۔ ادائی چندہ سے مجھے خاص الفت ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس سے آمدنی میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے اور بہت سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ سچ فرمایا ہے حضرت امیر نے ۔

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا   ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا

اگر کوئی شخص فی الحقیقت چاہے کہ اس پر مالی مصائب و معاشی تنگیاں نہ آئیں تو اس کا فرض ہے کہ اس نسخے کو آزمائے اور فائدہ اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو یقیناً کامیابی ہمرکاب ہوگی۔ **وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔**

(مولوی صاحب ۱۹۶۰ء میں پاکستان منتقل ہوگئے)

شرح دستخط خاص۔ عبدالقادر صدیقی ۱۶/امرداد ۴۱ فصلی

جناب محمد علی صاحب ولد حاجی شیخ داؤد صاحب کا ایک خواب

حاجی شیخ داؤد صاحب مرحوم سعودی عرب کے رہنے والے تھے۔ یہ صاحب مملکت آصفیہ میں تلاش روزگار میں آئے۔ یہیں انہوں نے شادی کی ان کو چار لڑکے ہوئے بڑے لڑکے مکرم محمد علی صاحب۔ محمد عمر صاحب۔ محمد عثمان صاحب۔ محمد صدیقی صاحب۔ مکرم محمد علی داؤدی صاحب نے ایک خواب دیکھا اور اس خواب کو اپنے بھائی محمد عمر صاحب کو سنایا۔ انہوں

نے فرمایا احمدیت کی صداقت یوں ہوتی ہے ۔ پھر محمد علی صاحب داؤدی نے بیت کا خط ان کے بھائی محمد عمر صاحب نے حضور کی خدمت میں لکھا جواباً حضور نے بیعت کی قبولیت کا جواب دیا۔

محمد علی صاحب کے تین لڑکے منصور احمد صاحب ۔ بشیر احمد صاحب ۔ نذیر احمد صاحب تھے دو لڑکے فوت ہو گئے نذیر احمد صاحب بقید حیات ہیں ۔

محمد عمر صاحب کو صرف ایک لڑکی ہوئی جو منظور احمد صاحب اکاؤنٹس آفیسر تھے ان کو بیاہی گئی ۔ محمد عثمان صاحب کو پانچ لڑکے ہوئے ۔ مکرم حاجی مولوی عبداللہ صاحب بی ایس سی حکیم عبدالصمد صاحب مولوی فاضل سابق سپرنٹنڈنٹ دواخانہ یونانی طیبہ چار مینار ۔ تیسرے عبدالسلام صاحب ملازم طیبہ کالج چار مینار ۔ محمود احمد صاحب ربوہ ۔ محمد احمد صاحب ربوہ ۔ محمد صدیق صاحب ایک لڑکا تھا حاجی عبدالرحیم بدر صاحب مولوی فاضل قادیان تھے مدرسہ بلارم کے ہیڈ ماسٹر رہے ۔

یہ خواب جس وقت ہوا میری عمر تقریباً بیس سال کی تھی ۔ اب اس وقت میری عمر ۵۳ سال ہے ۔ میری تعلیم و تربیت کا بڑا ذریعہ میرے بھائی مولوی محمد عمر صاحب ہیں ۔ میں ان کی ہدایت کو بہت مانتا ہوں ۔ چونکہ مجھے جو کچھ علم حاصل ہوا انہیں کی طفیل ہوا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا بہت کچھ ادب میرے دل میں تھا ۔ یہ بھونگیر ضلع نلگنڈہ کے مدرس تھے ۔ اور میں سوریا پیٹھ ضلع نلگنڈہ کا مدرس تھا ۔ حضرت بھائی صاحب کو مولوی بہاؤ الدین صاحب احمدی صدر مدرس کے ذریعہ سلسلہ احمدیہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا ۔ لوگوں نے مجھے خبر دی کہ تمہارے بھائی صاحب عیسائی ہو گئے ہیں ۔ اس لفظ کا سننا ہی تھا کہ میرے بدن میں لرزہ پیدا ہو گیا ۔ اور میں غور کرنے لگا کہ یہ کیا غفلت ہو گئی ۔ ایک عالم اور فاضل دین اسلام سے واقف ہو کر عیسائیت کی تردید کرنے والا خود عیسائی کیونکر ہو گیا ۔ آخر ہمارا کیا حشر ہوگا ۔ اس ششش و پنج میں میں رنگم پیٹھ ان کے مقام متبدلہ پر پہنچا ۔ بوجہ ادب اور بزرگی کوئی بات زبان سے نہ نکالی بلکہ یہ خیال کیا کہ ان کے حرکات وسکنات سے ان کا اندازہ لگایا جائے اور رائے قائم کی جائے ۔ بھائی صاحب کی یہ عادت تھی کہ ہفتہ واری نماز ادا کرتے ۔ اب جو غور کرتا ہوں تو پنجوقتہ نماز ادا کرنے کے بعد تہجد نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں ۔ نماز بھی وہ نہیں جو پہلے پڑھی جاتی تھی ۔ ہر نماز میں گریہ وزاری ہو رہی ہے ۔ یہ ایک ہی پابند نہیں ہیں ۔ بلکہ میری والدہ صاحبہ ۔ ہمشیرہ صاحبہ و ہر دو بھاوج

صاحبین بھی پابند نماز ہیں ۔ تین روز تک یہ مشاہدہ دیکھتا رہا ۔ اور مجھے نہایت شرم محسوس ہونے لگی کہ یہ سب لوگ تو پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں اور میں ہوں تارک النماز اور پڑا سوتا رہا ہوں ۔ کچھ خوفِ خدا ہوا ۔ اور کچھ لوگوں سے حجاب ہوا ۔ الحمدللہ میں نے بھی نماز شروع کر دی ۔ الشاکر مستحق المزید ۔ اس خدا کا شکر ہے کہ آج تک نماز کا سختی سے پابند ہوں ۔ اور دعا ہے کہ دم واپسیں تک اس راہِ مستقیم پر ثابت و پابند رہوں ۔ بھائی صاحب کا معمول تھا کہ صبح دو بجے اُٹھ کر چار بجے صبح تک تہجد میں لگے رہتے ۔ اس کے بعد نمازِ فجر سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف رہتے ۔ اس کے بعد براہین احمدیہ پڑھتے ۔ آخر جرأت کر کے بھائی صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا کتاب ہے جو آپ پڑھتے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ یہ سلطان القلم مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح و مہدی کی کتاب ہے ۔ بھائی صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی نے نہ چھیڑا تو وہ کچھ نہیں کہتے ۔ اگر چھیڑا تو ابتداء سے انتہاء تک کے واقعات سنانے میں کمی نہیں کرتے ۔ انھوں نے آلِ عمران سے لے کر حضرت مریم کی پیدائش سے لے کر حضرت عیسیٰ کے صلیب کے واقعات بیان کرتے ہوئے کشمیر میں مدفون ہونے تک کے واقعات بیان کئے اور جو میرے اعتراضات ہوتے گئے ان کا کافی و تشفی بخش جواب دیتے رہے ۔ کیونکہ انہی کے کہنے پر میرے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں ۔ اور آخری زمانہ میں جب دجال نکلے گا اور لوگوں کو خدائی منوائے گا ۔ اس وقت آسمانی حضرت عیسیٰ آ کر مہدی سے ملیں گے ۔ اور دجال کا اور اُن کا مقابلہ ہوگا ۔ دجال کو شکست ہوگی ۔ پھر اسلام کا غلبہ ہوگا ۔ اس کے خلاف یہ باتیں سن کر میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی ۔ اور دل میں کہنے لگا کہ پہلے جو عقائد تھے وہ کسی دلیل پر نہ تھے ۔ اب ان عقائد کو دیکھتا ہوں تو بموجب قرآن و حدیث ہیں ۔ آخر مجھے کیا کرنا چاہئے ۔ مانوں یا انکار کر دوں ۔ چونکہ میں نے بھی نماز شروع کر دی تھی ۔ میری نماز بھی وہ پہلی کی سی نماز نہ تھی ۔ دیکھا دیکھی نماز میں گڑگڑا کر دعا کرنے کا موقعہ ملا ۔ اور یہ دُعا دل سے نکلنے لگی ۔ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر یہ دعا کرتا ہوا سو گیا کہ یا اللہ یہ سلسلہ تیرا قائم کردہ سلسلہ ہے اور تیری طرف سے ہے تو تو مجھے سچا راستہ دکھا ۔ اگر اس وقت تو میری رہنمائی نہ فرمائے گا اور میں غلط راستہ پر رہا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہوگی ۔ میں نے ذیل کا خواب دیکھا ۔ (اس وقت تک قادیان کیا چیز ہے ۔ احمدی کس کو کہتے ہیں ۔ اسٹیج کیا ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا تھا

) میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر اپنا خواب تحریر کرتا ہوں کہ جو میں نے بمقام رنگشائی پیٹھ ضلع ورنگل تقریباً ۱۳۱۵ھ ۲۳ سال قبل دیکھا تھا۔ اور جس کی بناء پر مجھے سلسلہ احمدیہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اگر میں نے اس خواب کو بناوٹی بنایا ہو تو خدا مجھے عذابِ الیم میں مبتلا کرے۔ اور رسوائی کی موت نصیب کرے۔

خواب:

ایک بہت بڑا صاف ستھرا میدان ہے۔ درمیان میں ایک گول چبوترا بنا ہوا ہے اور اس پر ایک اونچی کرسی پر ایک بہت بڑے شان کے بزرگ ہیں۔ ان کے اطراف لوگوں کا ہجوم ہے اور سب نہایت سفید لباس میں ملبوس ہیں۔ اور سب کے سروں پر سفید پگڑیاں ہیں۔ اور میں شمالی جانب راستہ میں کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا ہوں۔ اتنے میں ایک اور بزرگ گھوڑے پر سوار ہیں۔ اور ان کا لباس بھی سفید ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ اور دائیں بائیں کچھ آدمی رکاب تھامے چلے آ رہے ہیں۔ اس شان کو دیکھ کر میں نے فوراً راستہ چھوڑ دیا۔ اور بازو ہٹ کر دریافت کرنا چاہا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ اور یہ دربار کس بزرگ کا ہے؟ ایک صاحب نے نہایت شان سے کہا کہ دربار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور یہ بزرگ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود ہیں۔ جو شریک جلسہ ہو رہے ہیں۔ اتنے میں نیند سے بیداری ہوئی۔ دل میں ایک فرحت محسوس ہوئی۔ علی الصبح اُٹھ کر نماز کے بعد حضرت بھائی محمد عمر صاحب کو سُنایا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ احمدیت کی صداقت یوں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت کی بیعت کا کیا طریق ہے؟ انہوں نے کہا' جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دور سے خط کے ذریعے سے بیعت ہو سکتی ہے۔ ابھی تم کو کافی معلومات حاصل کرنا ہے اس کے بعد بیعت کرنا ایسا نہ ہو کہ کوئی اعتراض کرے اور تم جواب نہ دے سکو۔ میں نے کہا کہ اب میرے دل کو کافی اطمینان ہو چکا ہے۔ اب زیادہ انتظار کرنا بے سود۔ عمر کا اعتبار نہیں۔ بھائی صاحب نے میری بیعت کا خط حضور کی خدمت میں لکھا۔ ایک ہفتہ کے اندر حضور کا جواب آیا کہ بیعت قبول ہوگئی۔ خدا استقامت بخشے۔ (از چٹھی مرقومہ ۲۸ر جولائی ۱۹۳۹ء)

(ماخوذ: بشارات رحمانیہ) نقل نویس محمد علی داؤدی' تعلقہ چنور ضلع عادل آباد

مرشد گھرانے کے احمدی سید حضرت اللہ پاشا صاحب

محترم سید حضرت اللہ پاشا صاحب جن کا تعلق بیجاپور کے تاریخی شہر سے ہے جو آجکل صوبۂ کرناٹک میں واقع ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ سب علاقہ دکن میں شمار ہوتا تھا۔ اور یہ عادل شاہی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ تقسیم ملک سے قبل موصوف ممبئی میں مسلم لیگ کے سرگرم رکن رہے۔ آپ نہایت مستجاب الدعا تھے۔ صاحب رویا و کشوف بزرگ تھے۔ اور بے حد اسلامی غیرت رکھتے تھے۔ خلافت ثانیہ کے دور میں امریکہ میں قیام کے دوران قبول احمدیت کی سعادت ملی اور پھر خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں دامادی کا شرف پا کر سونے پر سہاگہ والی کیفیت ان میں پیدا ہوگئی۔ ان کے ایمان افروز حالات مشتمل نوٹ ان کے صاحبزادے محترم سید حمید اللہ نصرت پاشا کی طرف سے اخبار ہفت روزہ بدر قادیان کی اشاعت ۲۴ر جون ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ (مؤلف سید جہانگیر علی)

''میرے والد'' سید حضرت اللہ پاشا صاحب سے میری آخری ملاقات ۲۳ فروری ۲۰۰۱ء کو ہوئی جبکہ میں مغربی افریقہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ اس ملاقات سے قبل کئی مرتبہ والد صاحب مجھ سے یہ ذکر کر چکے تھے کہ ان کی وفات کا وقت قریب ہے۔ اور یہ ذکر انہوں نے ہمیشہ بڑے اطمینان اور قرار کے ساتھ کیا۔ ایک سے زائد بار مجھ سے کہا کہ ''بس اب دو سال کی بات ہے۔'' والد صاحب نے اپنی ایک رویا کے حوالہ سے جس میں انہیں آسمان پر چار چاند دکھائے گئے تھے اور تفہیم دی گئی تھی کہ یہ نظارہ ان کی عمر کے تعلق سے ہے' مجھ سے کہا کہ ''میری وفات خلافت رابعہ میں ہوگی۔'' ان کی یہ تعبیر سچی ثابت ہوئی۔ چار خلفاء کی روشنی دیکھی۔ حضرت خلیفہ اول کا زمانہ اگرچہ نہیں پایا لیکن آپ کی روشنی سے استفادہ ضرور کیا۔ یہ خواب ایک پہلو سے اس طرح بھی پوری ہوئی کہ اپنی آخری علالت کے دوران بیداری میں ایک نظارہ دیکھا اور میری والدہ صاحبہ سے کہا کہ ''مجھے چاروں خلفاء نے آ کر بشارت دی ہے۔''

یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے مجھے ایک روز خیال آیا کہ والد صاحب کے حالات زندگی ان کے اپنے الفاظ میں قلم بند کرلوں۔ اپنی دلچسپی کی وجہ سے یہ واقعات اس سے قبل بھی میں نے ان سے سنے ہوئے تھے لیکن اس مرتبہ میری خواہش پر وہ بیان کرتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ چنانچہ یہ مضمون کسی قدر والد صاحب کے اپنے بیان کردہ حالات و واقعات پر اور کسی حد تک میرے ذاتی مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ہیں۔

سید حضرت اللہ پاشا صاحب کی ولادت ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ آپ ہندوستان کے شہر بیجاپور کے ایک معروف اور متدین سنی گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ نسب کے اعتبار سے حسینی سید تھے۔ اور آپ کے والد کا نام سید صاحب حسینی اور والدہ کا نام حافظہ بی بی تھا۔ پاشا آپ کے اجداد کو لقب کے طور پر دیا گیا تھا جو بعدازاں نام کا حصہ بن گیا۔ ہندوستان میں آپ کے جداعلیٰ سید محمد مہابری تھے جو ایران کے ایک شہر مہابر سے ہجرت کر کے ہندوستان آ کر آباد ہوئے۔

ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے کے باوجود جو بنیادی طور پر مذہبی تھا' والد صاحب کی طبیعت میں بچپن ہی سے اندھی تقلید کی بہ نسبت منطقی تحقیق کا مادہ غالب تھا۔ والد صاحب کے اس استدلالی مزاج کے سبب میرے دادا کو یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ یہ بے دین نہ ہو جائیں۔ اور اس اندیشہ کا اظہار وہ ان سے کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب میرے والد احمدی ہوگئے تو میرے دادا نے ان سے پوچھا کہ ''آخر کیا وجہ ہے کہ دین کے معاملات میں منطقی فکر رکھنے والے یا تو احمدی ہوجاتے ہیں اور یا پھر دہریہ؟ میرے دادا کے اس سوال میں غالباً یہ اشارہ مضمر تھا کہ احمدیت اور دہریت میں کچھ قدر مشترک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں ہمارے دادا کے خیالات بہت حد تک بدلے اور حضرت مسیح موعود کے مداح ہوگئے۔ بہرحال ان کے اس وقت کے استفسار پر والد صاحب نے جواب دیا کہ

''جنہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایمان نصیب ہوجائے وہ تو احمدی ہوجاتے ہیں۔
اور جنہیں نصیب نہ ہوسکے وہ اس وجہ سے دہریہ ہوجاتے ہیں کہ وہ مروجہ عقائد کو
خلاف عقل پاتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کا والد صاحب پر یہ احسان عظیم تھا کہ منطقی سوچ کے ساتھ ساتھ انہیں ابتداء

سے ذوق دعا بھی عطا فرمایا۔ انہوں نے بچپن سے دعا کو حصول مراد کے علاوہ حصول رہنمائی کے لیے بھی ایک مجرب نسخہ پایا۔ والد صاحب نے اپنی طالب علمی کے دور کا ایک دلچسپ واقعہ مجھے سنایا۔

ایک روز ہاکی کھیل کر گھر پہنچے تو ٹانگیں سخت درد کر رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ میں لیٹ گیا اور دعا کی کہ'' خدا میرے پاس تو کوئی خادم نہیں۔ تیرے پاس بے شمار فرشتے خدمت گار ہیں۔ انہی میں سے کسی کو بھیج دے جو میرے پاؤں دبا دے۔'' اسی دعا کی کیفیت میں انہوں نے دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص دائیں طرف اور ایک بائیں طرف موجود ہے۔ جو ان کی ٹانگیں دبا رہے ہیں۔ اور چند لمحوں میں وہ درد غائب ہوگیا۔ والد صاحب نے جب یہ واقعہ سنایا تو مجھے خیال آیا کہ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو اس کشفی نظارہ کے بغیر بھی انہیں شفا دے سکتا تھا لیکن اس نے اپنے بندے سے اس کے ظن کے مطابق سلوک فرمایا۔

حصول مراد کے علاوہ حصول رہنمائی کے لئے بھی وہ دعا کو ایک یقینی ذریعہ مانتے تھے۔ اور دعا کے ذریعہ حاصل شدہ رہنمائی پر عمل بھی کرتے۔ ۱۹۴۹ء میں والد صاحب ایگریکلچر کالج سندھ میں بطور لیکچرار معاشیات کام کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی تنخواہ ۱۲۰ روپے ماہوار تھی۔ ان ہی دنوں میں ایک معروف تاجر نے اپنی کمپنی میں والد صاحب کو چار ہزار روپے ماہوار تنخواہ پر ملازمت پیش کی۔ تب ایک رؤیا کے ذریعہ والد صاحب کو یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ ٹھیک نہیں چنانچہ والد صاحب نے وہ پیشکش مسترد کردی۔ ایک شخص جسے اپنی موجودہ آمد سے قریباً ۳۰ گنا زیادہ تنخواہ کی پیشکش ہو وہ فقط ایک منذر خواب کی بنا پر ایسے سنہری موقع کو اسی صورت میں رد کرسکتا ہے جبکہ اسے ربانی ہدایت کے جاری نظام پر پختہ یقین ہو۔

قیام پاکستان سے قبل والد صاحب مسلم لیگ کے سرگرم کارکن رہے اور ممبئی میں بیجاپور کے نمائندے کی حیثیت سے کام کیا۔ طلباء کے نمائندہ کی حیثیت سے قائداعظم سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ احمدیت سے تعارف سے معاً قبل والد صاحب نے ایک رات خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وضو فرما رہے ہیں۔ نبی کی ذات چونکہ آئینہ کامل ہوتی ہے اس لئے دراصل اس وجود کے آئینہ میں والد صاحب کو اس الٰہی نظام کی بشارت دی گئی جس میں

انہوں نے داخل ہونا تھا۔یعنی سلسلہ احمدیہ۔

۱۹۴۸ء میں والد صاحب پاکستان آئے۔اگرچہ پاکستان آنے سے قبل والد صاحب کو سلسلہ احمدیہ سے تعارف حاصل ہو چکا تھا لیکن پہلی مرتبہ کسی مربی سلسلہ سے ملاقات ۱۹۴۸ء میں کراچی میں ہوئی۔اس ملاقات میں انہیں مربی صاحب سے ثناء اللہ امرتسری والے مباہلہ کے موضوع پر بحث کا موقع ملا اور مربی صاحب نے والد صاحب کو بالکل لاجواب کر دیا۔

امریکہ میں قبول احمدیت:

۱۹۵۱ء میں والد صاحب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے امریکہ چلے گئے۔اسی سال واشنگٹن ڈی سی میں پاکستانی سفارتخانہ کی سیڑھیوں پر والد صاحب کی ملاقات مربی سلسلہ محترم خلیل احمد ناصر صاحب سے ہوئی۔احمدیہ مشن سے رابطہ رہنے لگا۔اور جماعت کی کتب کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا گیا۔اس عرصہ میں ایسے متعدد مواقع پیدا ہوئے کہ جہاں اسلام پر کئے جانے والے حملوں کے جواب کی ضرورت پیدا ہوئی۔دین کے لئے غیرت اور جوش کے سبب خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن تھا۔جہاں پر اپنی عقل سے دفاع کیا وہاں بھی بالآخر اپنے استدلال کی توفیق حضرت مسیح موعودؑ کی تحریرات سے پائی۔بعض اور مراحل پر احمدیہ لٹریچر کو Consult کر کے جواب دینے کی صورت پیدا ہوئی۔صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر الٰہی تھی کہ وہ ایسی منازل سے بار بار ہمکنار ہوں۔ہر منزل پر پہنچ کر والد صاحب کو یہ احساس ہوا کہ حضرت مسیح موعودؑ کا سہارا لئے بغیر بات بنتی نہیں۔مثال کے طور پر دو واقعات پیش کرتا ہوں۔ایک مذاکرے میں ایک بہائی خاتون نے امت مسلمہ کی زبوں حالی اور عقائد میں بگاڑ کو بنیاد بناتے ہوئے ایک نئی شریعت کا جواز پیش کیا۔والد صاحب نے اس خاتون کو جواب دیا کہ آپ کی دلیل سے جدید دین کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی بلکہ دین کی تجدید کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔اس وقت والد صاحب ابھی احمدی نہیں تھے۔

دوسرا واقعہ جو والد صاحب کی زندگی میں ایک بہت اہم سنگ میل ثابت ہوا۔وہ یہ تھا کہ کلیسا کی ایک شاخ Prebyterian church کے ایک پادری صاحب کے ساتھ والد صاحب کا مناظرہ ہوا۔موضوع تھا ''اسلام بمقابلہ عیسائیت'' اس مناظرہ میں والد صاحب نے شروع

سے آخر تک حضرت مسیح موعودؑ کے بیان فرمودہ دلائل پیش کئے۔یہ مناظرہ ۱۹۵۳ء میں امریکہ کی ریاست Taxes کے شہر Austin کے YMCA ہال میں منعقد ہوا۔پادری صاحب ان دلائل کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور والد صاحب فاتح قرار پائے۔اس واقعہ کے بعد والد صاحب کی سوچ پر یہ سوال حاوی رہا کہ جب اسلام کا دفاع حضرت مرزا صاحب کے بغیر ممکن نہیں تو آپ کے دعاوی کیسے غلط ہو سکتے ہیں۔اس سوال نے والد صاحب کو بے چین رکھا حتیٰ کہ ایک روز ان کی نظر سے حضرت مسیح موعودؑ کا وہ اشتہار گزرا جس میں حضور فرماتے ہیں کہ جسے آپ کی سچائی پر شک ہو وہ خالی الذہن ہو کر باقاعدہ ۱۴ روز تک استخارہ کرے۔ہدایت کے مطابق استخارہ شروع کیا۔استخارہ کی پہلی یا دوسری رات والد صاحب کو یہ غیبی آواز آئی ''مسلمان قوم میں محمود نام کا اس شان کا کوئی نہیں گزرا'' یہ زمانہ سیدنا محمود المصلح الموعودؓ کی خلافت کا تھا۔اور یہ غیبی آواز صریحاً اس وقت کے خلیفہ کی شان کی طرف نشاندہی کر رہی تھی۔

اسی تسلسل میں پھر ایک رات یہ غیبی آواز آئی ''ہم نے اس کو اس لئے نبوت بخشی کہ وہ فنافی الرسول تھا'' ان الفاظ نے والد صاحب کے تمام شبہات دور کر دیئے۔اس آواز نے مہدیت کی حقیقت انہیں سمجھا دی۔اس مختصر لیکن پر شوکت فقرے نے ان پر یہ حقیقت بھی خوب کھول دی کہ ماموریت بخشنا صرف اللہ کا کام ہے کسی اور کا نہیں۔اور وہی جانتا ہے کہ کون اس کے لائق ہے اور کیوں ہے۔ستمبر ۱۹۵۳ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں بیعت کا خط لکھ کر والد صاحب جماعت احمدیہ میں داخل ہو گئے۔الحمد للہ اس وقت آپ کی عمر میں (   ) برس تھی۔

والد صاحب نے ایسی طبیعت پائی تھی کہ جو عدم معقولیت سے صلح نہ کرتی۔یہ بھی خدا کا فضل ہی تھا کہ اس طبیعت کے ساتھ دین کے لئے شدید غیرت تھی۔اور انہیں ایک زندہ ضمیر بخشا گیا۔

والد صاحب ایک پر جوش داعی الی اللہ تھے۔دعوت حق کے لئے ہر حال میں مستعد رہتے تھے۔حتیٰ کہ اپنے مرض الموت کے دوران بھی غیر از جماعت عیادت مندوں کو حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت سمجھاتے رہے۔ان کا ایک معالج ڈاکٹر خاص طور پر حضرت مسیح موعودؑ کے اشعار سن کر بے حد متاثر ہوا۔میں نے صدہا بار دیکھا کہ گھر آنے والے غیر احمدی احباب کو والد صاحب نے بہت دل نشین انداز میں پیغام پہنچایا۔اگر بحث ہوئی بھی تو مہمان کا دل توڑے بغیر

اس کی دلیل کو توڑا۔ احمدی ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے والد، بھائی بہنوں اور دیگر اقارب کو دعوتی خط لکھے۔ ابتدا میں بہت شدید ردعمل تھا۔ لیکن رشتہ داروں کی طرف سے قطع رحمی کی ہر کوشش کا جواب والد صاحب نے صلہ رحمی سے دیا۔ میرے دودھیالی عزیزوں کے سلوک اور میرے والد کے رویہ کا رشتہ آگ اور پانی کا رہا۔ بیعت سے وفات تک قریباً نصف صدی کا طویل عرصہ بھی والد صاحب کے حوصلے اور تحمل کو تھکا نہ سکا۔

اختلاف اگرچہ قائم رہا لیکن مخالفین دھیرے دھیرے کمزور ہوتے گئے۔

والد صاحب نے ایک مرتبہ میرے دادا سید صاحب حسینی کو حضرت مسیح موعودؑ کی تصنیف ''کشتی نوح'' پڑھنے کو دی۔ ایک خاص عبارت کو پڑھ کر وہ رہ نہ سکے اور بے ساختہ والد صاحب سے کہا ''واہ تمہارا مرزا تو ولی تھا'' والد صاحب انہیں حضور کی ملفوظات پڑھ کر سناتے اور وہ بھی بہت انہماک سے سنتے لیکن بیعت نہ کی۔ میرے دادا کی وفات کے بعد والد صاحب بڑی حسرت سے کہتے تھے ''ابا جان بہت قریب آکر بھی رہ گئے'' میرے ایک دودھیالی رشتہ دار خاتون نے تھک ہار کر بالآخر کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے والد صاحب سے کہا ''جس عقیدہ سے انسان خود راضی ہو وہ ہی ٹھیک ہے'' کلام کی اسی روانی میں والد صاحب نے جواب دیا ''جس عقیدہ سے خدا راضی ہو وہی ٹھیک ہے۔''

والد صاحب کی بیعت کے بعد ان کے پاکستان پہنچنے سے قبل ہی ان کے احمدی ہونے کی خبر سرکاری حلقوں میں گردش کر رہی تھی۔ سرکار نے انہیں امریکہ اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اقتصادیات میں ایم اے کریں۔ سو وہ انہوں نے بحسن وخوبی ۱۹۵۳ء میں کرلیا۔ لیکن اس خبر کے ساتھ دوسری خبر کہ وہ احمدی ہو کر واپس آرہے ہیں۔ اس نے بعض مخفی تعصبات کو بے نقاب کردیا۔ پاکستان واپسی کے بعد والد صاحب کا تقرر مختلف حیلوں سے مؤخر کیا جاتا رہا اور ۹ ماہ تک انہیں بغیر تقرر اور بغیر تنخواہ کے رہنا پڑا، تاہم اس عرصہ میں والد صاحب کو حضرت مسیح موعودؑ کی کتب اور تفسیر کبیر کے بغور مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ اسی عرصہ میں ایک روز نماز کے دوران حالت قعدہ میں والد صاحب نے بطور کشف اپنی تقرری کا خط دیکھا جس پر ۲۵ مئی ۱۹۵۵ء کی تاریخ درج تھی اور تقرر بحیثیت Statistical Officer درج تھی لیکن بعد میں رویت ہلال کے سبب عام تعطیل کی

تاریخیں تبدیل ہوگئیں۔ والد صاحب ۲۵ مئی کو جب دفتر پتہ کرنے گئے تو اس وقت کی تقرری کا خط ٹائپ ہو رہا تھا۔ خط پر ۲۵ مئی ۱۹۵۵ء ہی کی تاریخ تھی اور تقرر بحیثیت Statistical Officer ہی تھا۔

حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ سے والد صاحب کو بہت خاص لگاؤ تھا۔ اگرچہ تمام خلفاء سے گہری محبت اور عقیدت تھی لیکن حضرت مصلح موعودؓ کے بارہ میں کہا کرتے تھے ''وہ میرا عشق اول تھا۔'' حضرت مصلح موعود پر قاتلانہ حملہ سے کچھ عرصہ قبل والد صاحب نے خواب میں دیکھا کہ حضور ان سے کہتے ہیں ''ہاں اے محسن یہ لوگ ستاتے ہیں۔''

آپ کی شادی:

۱۹۶۰ء میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے ایک بزرگ کی حیثیت سے ان کا رشتہ میری والدہ سیدہ امۃ الرفیق صاحبہ بنت حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ سے تجویز کیا۔ اس رشتہ پر حضرت مصلح موعودؓ نے اور حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ نے براہ راست والد صاحب سے اپنی دلی شادمانی کا اظہار کیا۔ ۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو میرے والدین کی شادی ہوئی۔ والد صاحب نے خدا کی خاطر اپنے خاندان کی قربتوں کو کھویا تھا۔ ''خدا نے انہیں حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ کی دامادی میں لاکر حضرت مسیح موعودؑ کے خاندان کی صورت میں نئی رشتہ داریاں عطا کیں۔ ''ترک رضائے خویش پئے مرضی خدا'' کے شیریں ثمرات میں سے یہ بھی ایک ثمر تھا جو والد صاحب کو اسی جہاں میں مل گیا۔ جو نئے رشتے میری والدہ کے حوالہ سے قائم ہوئے۔ انہیں والد صاحب نے آخر تک پورے قلبی لگاؤ کے ساتھ نبھایا۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک والد صاحب دوبارہ امریکہ میں مقیم رہے اور مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی سے ایگریکلچر اکنامکس میں ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اس قیام کے دوران بھی والد صاحب نے مختلف چرچوں میں جا کر احمدیت پر تعارفی لیکچر دیئے۔

قرآن کریم کا مطالعہ نہایت تدبرانہ انداز سے کرتے اور حاشیہ نگاری کرتے جاتے۔ کتابوں سے بالعموم اور حضرت مسیح موعودؑ کی تصانیف سے والد صاحب کو خاص انس تھا۔ بارہا گھر

میں ایسا ہوا کہ حضرت مسیح موعودؑ کی کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے والد صاحب اچانک کہتے "سنو" اور پھر وہ عبارت پڑھ کر سناتے۔ پھر سر دھنتے ہوئے کہتے "کیا بات ہے"

اکثر رات ۲ بجے کے قریب بیدار ہوجاتے اور فجر تک اپنا وقت نماز اور مطالعہ میں گزارتے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ "میرا دمہ بڑا مبارک مرض ہے۔ مجھے تہجد کے لئے اٹھا دیتا ہے۔ گھر میں گھر والوں کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے اور بہت دل نشیں تلاوت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ذکر الٰہی کے حوالہ سے بات چلی تو کہنے لگے "جس دم غافل اس دم کافر" اب میں سوچتا ہوں کہ اگر کفر کی یہ تعریف مدنظر رکھی جائے تو شاید کسی اور کو کافر قرار دینے سے قبل انسان کو اپنا کفر نظر آجائے۔ والد صاحب جس زمانہ میں حکومت سندھ کے جوائنٹ چیف اکانومسٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے دفتر جانے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ ان کے میز پر بچھے شیشہ کے نیچے ایک کاغذ پر ہاتھ سے لکھی یہ تحریر ہوتی تھی "خدا داری چہ غم داری"

شگفتہ طبیعت:

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو ایک تبسمی چہرے کے ساتھ ایک شگفتہ طبیعت بھی عطا فرمائی تھی۔ زندہ دلی اور ظرافت ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ایک مرتبہ ہم کراچی کے علاقہ صدر سے گزر رہے تھے۔ والد صاحب ڈرائیو کررہے تھے اور میں ساتھ بیٹھا تھا۔ ٹریفک کی بھیڑ کے سبب گاڑی رکی ہوئی تھی۔ ہماری دائیں طرف سے ایک نوجوان سائیکل چلاتا ہوا سیدھا ہماری سمت آرہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر مجھے خیال گزرا کہ یہ اب بریک لگائے کہ اب۔ بہرحال موصوف نے کسی وجہ سے بریک نہ لگائی اور اپنی سائیکل والد صاحب کی طرف دروازے میں دے ماری۔ والد صاحب نے بڑے اطمینان سے دروازے کا شیشہ نیچے کیا اور مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہا "میاں! یہ ذرا دوبارہ کرکے دکھائیے۔"

ایک مرتبہ ناشتہ کے دوران میری والدہ، والد صاحب کو دو شخصیات کا مکالمہ سنا رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ قصہ کچھ ایسی شکل اختیار کرگیا "ایک نے اس سے یہ کہا والد صاحب نے ناشتہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں امی سے کہا:

"بی بی! آپ ضمائر میں بات کرتی ہیں۔"

اداسی حالت میں ان کے چہرے پر اطمینان عیاں ہوتی تھی۔ ان کی زبان سے کئی بار ایک رباعی سنی ؎

کیا بھلا ہوا میری مرضی کے خلاف — جو کہ حسب مرضی دلبر ہوا
کیا ہوا کیسے ہوا کیونکر ہوا — جو ہوا اچھا ہوا بہتر ہوا

میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ یہ رباعی کس کی ہے۔ کہنے لگے کہ ایک اجنبی شخص ان کے پاس آکر بیٹھا یہ رباعی سنائی اور چلا گیا۔ نہ اس شخص سے تعارف ہوسکا نہ یہ پتہ لگ سکا کہ رباعی کس کی ہے۔ بہرحال یہ رباعی انہیں یاد رہ گئی اور اسے اکثر پڑھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور فقرہ جو میں نے والد صاحب کی زبان سے کئی مرتبہ سنا ہے یہ ہے "ہر چہ از یار خوب است" یعنی جو بھی اس یار کی طرف سے ہے اچھا ہے۔

والد صاحب اپنی عائلی زندگی میں جہاں خیر کم خیر کم لا ھلہ کی تصویر تھے وہاں اکرموا اولادکم پر بھی ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ سرزنش کے بجائے نصیحت کا انداز اختیار کئے رکھا۔ تحسین میں بہت فراخ دل تھے اور تنقید بہت نپی تلی ہوتی۔ بہت زود حس لیکن بہت صابر تھے۔ بہت اچھے سامع تھے اور بچوں کی بات توجہ سے سنتے۔ ہماری دلچسپیوں میں دلچسپی لیتے۔ انتہائی سنجیدہ مضامین سے لے کر کسی ٹی وی ڈرامہ کی تازہ قسط پر تبصرہ تک ہر موضوع پر ہمارے برابر کی سطح پر آکر بات کرتے۔ اپنے قول سے بڑھ کر اپنے عمل سے انہوں نے ثابت کیا کہ وہ فی الواقعہ بہوؤں کو بیٹیاں اور داماد کو بیٹا جانتے تھے۔ گھر میں تبادلہ خیال کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ خود بھی مدلل بات کرتے اور اچھی دلیل کو سراہتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دادا بھی بنایا اور نانا بھی۔ اور دونوں حیثیتوں میں وہ سراپا شفقت تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو کئی پہلوؤں سے خدمت دین کی توفیق بخشی۔ قائد ضلع وعلاقہ اپنی وفات سے کچھ دن قبل انہوں نے میری والدہ سے کہا کہ "جو ہوگا عید سے پہلے ہوگا۔" والد صاحب نے ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ء کو وفات پائی۔ یہ دن ۸ رمضان المبارک کا تھا اور یوں جو ہونا تھا عید سے پہلے ہوا۔ قبول احمدیت کے ایک سال بعد ہی اللہ تعالیٰ سے انہیں نظام وصیت میں شامل

ہونے کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ اب بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہیں۔ مرحوم کے ہی الفاظ میں کہتا ہوں کہ ''ہر چیز از یار خوب است''

از سید حمید اللہ نصرت پاشاہ

(ہفت روزہ بدر قادیان، ۲۴ر جون ۲۰۰۳ء)

مجلس اتحاد المسلمین کے معروف رکن مولوی سید جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ

تفسیر کبیر کے مبارک اثرات کا چوتھا واقعہ جناب سید جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ حیدرآبادی کا ہے جو حیدرآباد کی مشہور تنظیم اتحاد المسلمین کے معروف کارکن تھے، اور اسی کی پاداش میں ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء کو نظر بند کردیئے گئے۔ سکندرآباد جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں تفسیر کبیر پڑھنے کا موقع ملا جس کے مطالعہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جیل کے اندر مارچ ۱۹۶۱ء میں بیعت کا فارم بھی پر کردیا اور اپنی زندگی بھی اسلام و احمدیت کے لئے وقف کردی (۱)۔ ۹ر جون ۱۹۶۱ء کے دن رہا ہوگئے جس کے بعد آپ نے اولین فرصت میں یہ کام کیا کہ اخبار ''صدق جدید'' کے ایڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو اپنے حلقہ بگوش احمدیت ہونے کی اطلاع کے لئے ایک مختصر مکتوب لکھا جو مولانا صاحب نے ''صدق جدید'' (لکھنؤ) کی ۲۰ر اپریل ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں ''ایک صدق خواں کا قبول احمدیت'' کے عنوان سے مع تعارفی نوٹ کے شائع کردیا جس کا متن یہ تھا:

---

(۱) تاریخ ولادت ۱۵ر ستمبر ۱۹۱۷ء۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایڈ کی تکمیل کی۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کی تحریک پر مستقل طور پر قادیان ہجرت کرکے آگئے۔ ۳ر مئی ۱۹۶۸ء کو حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثالث حضرت حافظ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے ارشاد پر صدر انجمن احمدیہ کے مشیر قانونی مقرر کئے گئے اور اب تک اسی منصب پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ حضور ایدہ اللہ کی اجازت سے صلح رجنوری ۱۳۴۷ھ ۱۹۶۸ء سے مشرقی پنجاب میں وکالت بھی کررہے ہیں۔

''دکن کے ایک بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ کا جو سالہا سال انجمن اتحاد المسلمین کے بڑے پرجوش رکن رہے اور اسی سلسلہ میں جیل بھی گئے اور صدق سے بھی مخلصانہ تعلق برسوں قائم رکھا، تازہ مکتوب صرف ان کے اور سابق مستقر کے خدمت کے بعد:

حیدرآباد دکن ۲۸ر مارچ ۱۹۶۲ء

حضرت قبلہ: السلام علیکم

دارالسلام مجلس اتحاد المسلمین کے سلسلے میں گورنمنٹ آندھراپردیش نے مجھے ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۰ء کو نظر بند کیا اور حال میں میری رہائی ہوئی۔ ان دنوں میرا مستقر جیل تھا۔ جیل لے جانے والے عہدیداروں سے میں نے درخواست کی کہ (مجھے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تھا جبکہ ایک پیشی کرکے...... گھر واپس ہورہا تھا) مجھے گھر لے جاکر قرآن کریم ساتھ لینے کی اجازت دیں۔ پولیس کے عہدیدار بڑے شریف مزاج تھے۔ اپنی حراست میں مجھے گھر لے گئے......

...... میرے ایک دوست تھے جنہوں نے مجھے حضور خلیفہ صاحب جماعت احمدیہ کی لکھی ہوئی تفسیر کبیر کی جلد دی تھی۔ مجھے پڑھنے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب میں کھانے کے لیے آفس سے گھر آیا تو بیوی نے دسترخوان چننے میں کچھ دیر کی۔ تفسیر کبیر کی جلد میز پر بازو میں تھی۔ میں نے اٹھالی اور چند اوراق الٹ کر دیکھنے شروع کئے۔ یہ والعادیات ضبحاً کی تفسیر کے صفحات تھے۔ میں حیران ہوگیا کہ قرآن مجید میں ایسے مضامین بھی ہیں۔ پھر میں نے قادیان خط لکھا اور تفسیر کبیر کی جملہ جلدیں منگوائیں۔ لیکن پڑھنے کا مجھے وقت نہ ملتا تھا۔ جیل کو روانگی کے وقت میں نے یہ جلدیں ساتھ رکھ لیں اور نو ماہ کے عرصے میں جب کہ میں جیل میں تھا متعدد بار صرف یہی تفسیر پڑھتا رہا۔ جیل ہی میں میں نے بیعت کرلی اور جماعت احمدیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ آپ بھی دعا فرمائیں (۱)۔''

سید جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ نے اس مختصر مکتوب کے بعد ایک مفصل مضمون بھی اخبار ''صدق جدید'' کو بھجوایا جس میں انہوں نے تفسیر کبیر کے مبارک اثرات اور قبول حق کے حالات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ مضمون ''صدق جدید'' کے دو نمبروں میں قسط وار

---

(۱) بحوالہ ''الفضل'' ۵/ہجرت مئی ۱۳۴۱ھ م ۱۹۶۲ء

(۸۔۱۵ جون ۱۹۶۳ء) شائع ہوا۔ اس اہم مضمون کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

''حصول دارالسلام کی جدوجہد میں مجھے جب جیل پہنچایا گیا تو تیسرے دن مجھے وجوہات نظربندی تحریری شکل میں مہیا کئے گئے۔ جن میں میری گذشتہ تین چار برسوں کی تقریروں کے اقتباسات تھے اور الزام یہ تھا کہ میں ہندوستان کی حکومت کا تختہ الٹ کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ میں حیران تھا کہ مجھ جیسا چھوٹا آدمی اور یہ پہاڑ جیسا الزام۔ لیکن مجھے آہستہ آہستہ محسوس ہوا کہ میری تقریروں سے کچھ ایسا ہی مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں بھٹکا ہوا مسافر تھا جس کی منزل تو متعین تھی لیکن راستہ کا پتہ نہ تھا۔ مسلمانوں کی انجمن اتحادالمسلمین ہو یا کوئی اور جماعت ان سب کی حالت یہی ہے۔

دوسرے دن سے میں نے تفسیر کبیر کا مطالعہ شروع کیا جو میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا تو مجھے اس تفسیر میں زندگی سے معمور اسلام نظر آیا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھ کو تلاش تھی۔ تفسیر کبیر پڑھ کر میں قرآن کریم سے پہلی دفعہ روشناس ہوا جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے ۔ اپنا مسلک چھوڑ کر احمدیہ جیسی جماعت میں داخل ہونا جس کو تمام علمائے اسلام نے ایک ہوا بنا رکھا ہے۔ کچھ معمولی بات نہیں لیکن حق کے کھل جانے کے بعد یہاں خطرات کی پروا بھی کسی کو نہ تھی تاہم سجدہ میں گر کر شب و روز دعائیں کیں کہ یا اللہ مجھے صراط المستقیم دکھا۔ کئی ماہ اسی حالت میں گذر گئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری سجدہ کی زمین آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ میری دعائیں قبول ہوئیں کیونکہ احمدیت کو سچا سمجھنے کے عقیدے میں مستحکم ہو گیا اور قادیان سے حضرت میاں مرزا وسیم احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط کے ذریعے سے میں نے درخواست کی کہ میں بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں ایک بیعت فارم آیا جو آپ کے لئے منسلک ہے۔

میری قید کا بڑا حصہ سکندرآباد جیل میں گذرا۔ وہاں کے جیلر ایک مسلمان اور علم دوست بھی تھے۔ قیدیوں کی پوری خط و کتابت ان لوگوں کے علم میں رہتی ہے کیونکہ ان کے دستخط کے بعد ہی قیدیوں کے خطوط روانہ یا حوالہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات کچھ اچھی نہ تھی لیکن جرأت کی

کمی کے باعث میری یہ کوشش رہتی تھی کہ قادیان کو لکھے ہوئے میرے خطوط حکام جیل کے علم میں نہ آنے پائیں۔ مجلس اتحادالمسلمین حیدرآباد ایک بڑی ہی ہردلعزیز جماعت ہے۔ جیل کا عملہ جمعیت حتیٰ کہ جیل کے سارے ہی قیدی مجھ سے بڑی محبت اور عقیدت سے پیش آتے تھے۔ اگرچہ پہرہ والوں کے سوا مجھ سے کوئی نہ مل سکتا تھا۔ اس کے باوجود حکام کے علم میں آئے بغیر میرے خطوط قادیان کو پوسٹ ہوجاتے تھے، لیکن جو خط قادیان سے آتا تھا وہ بہرصورت جیلر کے علم میں آتا تھا۔ جب قادیان سے بیعت کا فارم آیا تو جیل میں بڑی گڑبڑ ہوئی۔ راز باقی نہ رہ سکا۔ کمرہ کی صفائی کرنے والے قیدی، کھانا پہنچانے والے، اخبار لانے والے کسی نہ کسی بہانے آتے اور مجھ سے پوچھتے کہ کیا آپ قادیانی ہوگئے ہیں؟ میں انہیں غلط نہ کہہ سکتا تھا، لیکن ابھی چونکہ میں نے بیعت نہیں کی تھی، اس لئے میں ان سے کہتا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بالآخر جیلر میرے پاس آئے اور میرا خط معہ بیعت فارم کے جوان کے پاس تھا مجھ سے بڑی ہی ہمدردانہ گفتگو کی کہ یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ قرآن کی اس تفسیر کو چھوڑیئے میں آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کی تفسیر قرآن دیتا ہوں، آپ کے خیالات ٹھیک ہوجائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے وہ تفسیریں لا دیں جو اصل میں ترجمہ تھے اور کہیں کہیں تفسیر تھی۔ بیعت کا فارم تکمیل کرکے بھیجنے سے قبل میں نے ان دونوں تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ تفسیر کبیر کے طالب علم میں اتنی اہلیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ دیگر تمام تفاسیر پر تنقید کرسکے، چنانچہ میں نے جیلر صاحب کو بتلایا کہ ان دونوں تفاسیر میں کون کون سے مقامات مبہم ہیں، کہاں کہاں ترجمہ کی غلطی ہے اور کہاں کہاں معنی محدود ہیں۔ مجھے ایسا کرنے میں آسانی اس لئے ہوئی کہ تفسیر کبیر میں لغت قرآن بھی موجود ہے۔ لا یمسہ الا المطهرون۔ صرف مطہر لوگ ہی قرآن کریم کے مطالب کو سمجھ سکیں گے۔

جیلر صاحب ۲۴ گھنٹے اپنے سرکاری فرائض میں مشغول رہتے۔ قرآن کریم کو دیکھنے کا بھی انہیں موقع نہ ملتا۔ میری بات میں انہوں نے دلچسپی نہ لی۔ پھر میں نے جیلر صاحب کو تفسیر کبیر کی پہلی جلد دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ کم از کم اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ جو بہ مشکل (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ لے گئے لیکن چند دن کے بعد یہ کہہ کر واپس کرگئے کہ مجھے تو پڑھنے کی فرصت نہ ملی۔ البتہ میری خوشدامن صاحبہ یہ کتاب دیکھ چکی ہیں وہ

اس کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ میں نے بیعت کا فارم پر کر کے بھیج دیا۔

یہ تفصیل آپ کی خدمت میں اس لئے لکھی کہ مجھ پر سے یہ الزام دور ہو جائے کہ میں نے بیعت میں عجلت کی۔ بیعت کا فارم بھیج کر میں دعاؤں میں لگ گیا کہ میری بیعت قبول ہونے میں کچھ رکاوٹیں ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو دور فرمائے۔ میرا اندیشہ غلط نہ نکلا۔ میری بیعت قبول کرنے سے پہلے حضور خلیفہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ ایک احمدی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حکومت وقت کا بھی وفادار رہے اور قانون کے اندر رہ کر کام کرے۔ میں نے جواب دیا کہ حضور کی تفسیر نے یہ ساری باتیں میرے دل پر نقش کر دی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد قادیان سے مجھے معلوم ہوا کہ میری بیعت قبول کر لی گئی تو میں سجدہ میں گر گیا۔

تفسیر کبیر میں ایک مقام پر میں نے پڑھا تھا کہ خلیفہ جو مصلح موعود ہوگا وہ اسیروں کی رہائی کا باعث ہوگا۔ میں نے حضور سے درخواست کی کہ وہ میری رہائی کے لئے دعا فرمائیں۔ حضور خلیفہ صاحب نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی رہائی کے سامان کرے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد میں رہا ہو گیا۔ خلیفہ موعود کی نسبت یہ پیشن گوئی کہ وہ اسیروں کی رہائی کا باعث ہوگا، میں اس کا زندہ ثبوت ہوں۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب

فینانس سکریٹری ریاست حیدرآباد (دکن)

حیدرآباد کے مستند و معروف علمائے کرام کی طرف سے

جماعت احمدیہ کے بارے میں تاثرات

مولوی چراغ علی صاحب کے جد امجد اصل سری نگر کشمیر کے رہنے والے تھے ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے وہاں سے میرٹھ چلے آئے۔ مولوی چراغ علی صاحب کے والد مولوی محمد بخش صاحب میرٹھ میں ملازم ہوئے پھر تبادلہ ہو کر سہارن پور چلے آئے۔ ۱۸۴۹ء محکمہ بندوبست میں داخل ہوئے۔ جب سارے پنجاب پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ مولوی محمد شمس بخش صاحب کے حالات اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہو سکے اور عین عالم جوانی میں جب وہ غالباً ۳۵ سال کے تھے۔ ۱۸۵۶ء کی فوجی سازش سے ٹھیک ایک سال قبل وفات پا گئے۔ مرحوم نے چار اولادیں چھوڑیں جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی صاحب تھے اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال سے زائد نہیں تھی۔

مولوی چراغ علی صاحب نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر تربیت میرٹھ میں تعلیم حاصل ی لیکن یہ تعلیم معمولی تھی اور سوائے معمولی اُردو۔ فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی ر نہ کوئی امتحان پاس کیا۔ چنانچہ کشمیری گورکھ پور کے خزانہ میں منشی گری پر بیس روپے ماہانہ پر ر رہوا۔

مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انہیں ابتداء سے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی اب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیمات اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے نور محمدی۔ مخبر صادق لکھنو میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں مشہور انجینئر

اس کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ میں نے بیعت کا فارم پر کر کے بھیج دیا۔

یہ تفصیل آپ کی خدمت میں اس لئے لکھی کہ مجھ پر سے یہ الزام دور ہو جائے کہ میں نے بیعت میں عجلت کی۔ بیعت کا فارم بھیج کر میں دعاؤں میں لگ گیا کہ میری بیعت قبول ہونے میں کچھ رکاوٹیں ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو دور فرمائے۔ میرا اندیشہ غلط نہ نکلا۔ میری بیعت قبول کرنے سے پہلے حضور خلیفہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ ایک احمدی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حکومت وقت کا بھی وفادار رہے اور قانون کے اندر رہ کر کام کرے۔ میں نے جواب دیا کہ حضور کی تفسیر نے یہ ساری باتیں میرے دل پر نقش کر دی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد قادیان سے مجھے معلوم ہوا کہ میری بیعت قبول کر لی گئی تو میں سجدہ میں گر گیا۔

تفسیر کبیر میں ایک مقام پر میں نے پڑھا تھا کہ خلیفہ جو مصلح موعود ہوگا وہ اسیروں کی رہائی کا باعث ہوگا۔ میں نے حضور سے درخواست کی کہ وہ میری رہائی کے لئے دعا فرمائیں۔ حضور خلیفہ صاحب نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی رہائی کے سامان کرے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد میں رہا ہو گیا۔ خلیفہ موعود کی نسبت یہ پیشن گوئی کہ وہ اسیروں کی رہائی کا باعث ہوگا، میں اس کا زندہ ثبوت ہوں۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب

فینانس سکریٹری ریاست حیدر آباد (دکن)

حیدر آباد کے مستند و معروف علمائے کرام کی طرف سے جماعت احمدیہ کے بارے میں تاثرات

مولوی چراغ علی صاحب کے جد امجد اصل سری نگر کشمیر کے رہنے والے تھے ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے وہاں سے میرٹھ چلے آئے۔ مولوی چراغ علی صاحب کے والد مولوی محمد بخش صاحب میرٹھ میں ملازم ہوئے پھر تبادلہ ہو کر سہارن پور چلے آئے۔ ۱۸۴۹ء محکمہ بندوبست میں داخل ہوئے۔ جب سارے پنجاب پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ مولوی محمد شمس بخش صاحب کے حالات اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہوسکے اور عین عالم جوانی میں جب وہ غالباً ۳۵ سال کے تھے۔ ۱۸۵۶ء کی فوجی سازش سے ٹھیک ایک سال قبل وفات پا گئے۔ مرحوم نے چار اولادیں چھوڑیں جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی صاحب تھے اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال سے زائد نہیں تھی۔

مولوی چراغ علی صاحب نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر تربیت میرٹھ میں تعلیم حاصل کی لیکن یہ تعلیم معمولی تھی اور سوائے معمولی اُردو۔ فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کیا۔ چنانچہ کشمیری گورکھ پور کے خزانہ میں منشی گری پر بیس روپے ماہانہ پر تقرر ہوا۔

مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انہیں ابتداء سے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیمات اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے منشور محمدی۔ مخبر صادق لکھنو میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں مشہور انجینئر

مولوی احمد ذکریا صاحب سہارن پور (بستی) میں محکمہ انجینئری مقرر ہو کر آئے۔ چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور ان کے خاندان سے قدیم تھے کچھ دنوں بعد مولوی ذکریا صاحب بستی خدمت سے مستعفی ہو کر لکھنو چلے گئے۔ اور ایک اچھی خدمت پر ان کا تقرر ہو گیا۔ انہوں نے مولوی چراغ علی صاحب کو اس کی اطلاع دی کہ آپ کے والد صاحب کے ایک محسن مسٹر گوراوسلی یہاں اڈیشنل کمشنر ہیں۔ آپ یہاں آئیں امید اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے چنانچہ ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء مولوی چراغ علی صاحب لکھنو گئے اور گوراوسلی سے ملے جو اڈیشنل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصری پر تقرر ہو گیا۔ بعد میں مستقل ہو گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد سیتاپور تبادلہ ہو گیا۔

مولوی چراغ علی صاحب کا کاروباری میلانِ طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا۔ انہوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہب اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ وحدت ذوق سرسید سے ان کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اور ان کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے۔ چنانچہ سرسید جب لکھنو آئے تو مولوی چراغ علی صاحب سیتاپور سے لکھنو گئے۔ کچھ عرصہ ریاست حیدرآباد کا ترجمہ کا کام وغیرہ جو سرسید صاحب کے پاس آیا تو انہوں نے مولوی چراغ علی صاحب سے اس کام کو انجام دینے کیلئے منتخب کیا اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لے کر علی گڑھ گئے۔ ایک سال بعد ۱۸۷۷ء میں سالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک مرحوم) سرسید سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید نے مولوی چراغ علی صاحب کو منتخب کیا اور مولوی چراغ علی صاحب حیدرآباد تشریف لائے اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے اور نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کے خطاب سے نوازے گئے۔

مولوی چراغ صاحب کی انگریزی دانی سے نہ صرف ہندوستان کے انگریزی دان بلکہ انگلینڈ کے انگریزی دان بھی معترف تھے۔ ان سے قبل انگریزی زبان میں یورپین مصنّفین کے جوابات سرسید اور مولوی سید امیر علی نے دیئے تھے ان کے بعد مولوی چراغ علی صاحب نے ان کے حریف ریورنڈ کینن میکالی نے ان کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ مولوی صاحب باوجود

اس کے نہایت بے تعصب اور کسی مذہب و ملت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ایک مثال مردم شماری کے وقت انہوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھ دیا۔ لیکن اپنے بیٹوں کے اور اپنے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیئے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے اور وہ اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام تفرقوں کو فضول سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کی سوانح عمری مرتب کرتے وقت ان کے کاغذات میں (مولوی عبدالحق صاحب) لکھتے ہیں کہ:

''چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی چراغ علی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پرزور کتاب براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد طلب کی تھی چنانچہ مرزا صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:

آپ کا افتخار نامہ محبت امود......عزورود لایا۔

اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت و حقیقت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی۔ مگر جناب کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعال شعلہ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازدیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی اور دنیوی تہ دل سے حامی ہؤ اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہئے جزاکم اللہ نعم الجزاء...... ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں۔''

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کے مضمون اثبات نبوت کا اب تک میں نے انتظار کیا' پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہونچا۔ اس لئے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں۔

اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علے حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کردوں اور اپنے مختصر کلام سے ان کو ایک زیب وفضیلت بخشوں ۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرمائیں اور جہاں تک جلد ہوسکے مجھ کو مضمون مبارک سے ممنون فرمائیں ۔"

اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور وشغب اور عداوت اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

"دوسری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے اور امید کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت دیانند کی وید بھاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں اور ان کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے ۔ لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوتے ہیں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہیں ان اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے اپنے مضمون کے بھیج دیں ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مُسلمہ آریہ سماج کے صرف وید اور اسمرت ہے اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں ۔ میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنود کے وید اور ان کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کئے جائیں ۔ کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلاف حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کئے جائیں اپنے دین کی طرفداری سے باز نہیں آتے' اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گذارہ کرلیں گے ۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیق اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کردوں ۔"

ایک اور خط مورخہ ۱۹ر فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"فرقان مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث

ممنونی ہے نہ موجب ناگواری ۔ میں نے بھی اس بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کردیا ہے اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہوجائے گا ۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے دل پر ایقان ہوں میرے پاس بھیج دیں' تا اُسے رسالہ میں حسب موقع درج کیا جائے یا سفیر ہند میں ...... لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانہ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں' کہ منقولات مخالف پر حجت قویہ نہیں ہوسکتیں ۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عند العقل اُس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہئے ۔ بہرصورت میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی ۔ آپ بہ مقتضا اس کے کہ الکریم اذا وعد وفا مضمون تحریر فرماویں ۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہوجائے ۔ اور آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دندان شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں' **ولا حول ولاقوۃ الا باللہ** "

اس کے بعد دوسرے خط مورخہ ۱۰ر مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"کتاب (براہین احمدیہ) دیڑھ سو جز ہے جس کی لاگت تخمیناً نوسو چالیس روپے ہے اور آپ کی تحریر محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہوجائے گی ۔"

ان تحریروں سے ایک یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب (مرحوم مولوی چراغ علی صاحب) نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہوگی ۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت اور حفاظت اسلام کا کس قدر خیال تھا ۔ یعنی خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے ۔ چنانچہ مولوی احمد حسن امروہی نے اپنی کتاب تاویل القرآن شائع کی تو مولوی صاحب مرحوم نے بطور امداد کے سو روپے مصنف کی خدمت میں بھیجے ۔ اس طرح جو لوگ حمایت اسلام میں کتابیں شائع کرتے تھے ان کو کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کتابوں کی خرید فرماتے تھے' چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب پیغام محمدی کی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کردیں ۔

وفات:

مرحوم کو ذیابیطس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی اب اس کے اثر سے ایک گلٹی دہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرہ کے نیچے نمودار ہوئی ڈاکٹر ہیراُن کے فیملی ڈاکٹر تھے اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن کی یہ رائے ہوئی کہ عمل جراحی کیا جائے۔ چنانچہ حسب مشورہ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یکبارگی فرق آ گیا اور ضعف طاری ہوگیا۔ بعد ازاں دو تین بار نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردی ہوتی گئی۔ لہٰذا مولوی صاحب اور ان کے اعزہ و احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ ممبئی جا کر علاج کیا جائے۔ چنانچہ ۱۱/ جون ۱۸۹۵ء معہ اہل وعیال ممبئی تشریف لے گئے۔ ۱۵/ جون ۱۸۹۵ء کی صبح گیارہ بجے بجتے بجتے دارفنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طئے کر کے راہی ملک بقا ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ممبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یہ مختصر حالات زندگی مولوی چراغ علی صاحب کے تھے جو مولوی عبدالحق صاحب بابائے اُردو نے مولوی چراغ علی صاحب کی انگریزی کتاب پروپوزڈ پولیٹکل، لیگل اینڈ سوشل ریفارمز انڈر مسلم رول کا ترجمہ چار حصوں میں کیا ہے۔ ترجمہ کا نام ہے اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام جو ایک یورپین عالم ریونڈر میلکم میکال ۱۸۸۲ء اس کے ضمن میں اسلام سے متعلق دوسرے یورپین مصنفین مثلاً سرولیم میور اور بارسوتھ اسمتھ وغیرہ کی غلط بیانیوں کی اصلاح بھی مشرقی ومغربی حوالوں سے کی گئی ہے ترجمہ ۱۹۱۵ء میں کیا گیا۔

(اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مترجم: بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب۔ ۱۹۱۰ء)

مرزا ابوالفضل صاحب کی لغت القرآن میں احمدیہ علم کلام کی تائید

اخبار سیاست روزنامہ حیدرآباد مورخہ ۱۷/ جون ۲۰۰۲ء میں ایک انگریزی ترجمہ قرآن پر تبصرہ از پروفیسر محمد علی قیصر شائع ہوا ہے جس کے مترجم مرزا ابوالفضل مرحوم ہیں۔ اس کے چار ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۱۱، ۱۹۱۶، ۱۹۵۵ء اور اب ان کی وفات کے پچاس سال بعد ۲۰۰۲ میں چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے تبصرہ کے ساتھ ابوالفضل صاحب کی تالیف لغات، قرآن جو

غریب القرآن کے نام سے ۱۹۴۲ء میں ابوالفضل کی زندگی میں شائع ہوئی۔ اس کا بھی ذکر موجود تھا۔ چنانچہ خاکسار نے ۲۰۰۲ء کا قرآن کا انگریزی ترجمہ اور ساتھ ہی اصل نسخہ غریب القرآن لغات تلاش بسیار کے بعد ایک لائبریری سے حاصل کیا اور پوری لغات کی فوٹو کاپی کروائی۔

میں نے سب سے پہلے ''رفع'' کے معنی لغت میں تلاش کئے' اس کے بعد ''خاتم'' کے معنی تلاش کئے۔ دونوں الفاظ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور مرتب لغات کی دیانت داری پر ان کے لئے دل سے دعا نکلی۔ اس سے ہمارے مؤقف کی پرزور تائید ہوتی ہے۔

مکرم میرزا ابوالفضل مرحوم کے حالات زندگی انگریزی قرآن کے ترجمہ ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں جناب حسن الدین احمد صاحب ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر نے Fore Word ترجمہ قرآن میں تحریر کئے ہیں۔ اس میں حضرت اکبر یار جنگ بہادر مرحوم چیف جسٹس ہائیکورٹ سابق حکومت حیدرآباد جو ایک مخلص احمدی تھے ان کا بھی ذکر موجود ہے۔ مترجم قرآن انگریزی ڈاکٹر میرزا ابوالفضل صاحب مرحوم اسی ترجمہ قرآن کے صفحہ VIII پر Preface to the forth revision میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء کے بعد جو تراجم قرآن انگریزی میں شائع ہوئے ہیں اس میں بہترین اور طرز جدید ترجمہ مولانا محمد علی صاحب کا ہے اور یوسف علی صاحب کے ترجمہ کو Orthodex قرار دیتے ہیں۔ خیر جو بھی ہو دو احمدی حضرات کا ذکر شامل ہے۔

اب پہلے ذیل میں وہ تبصرہ درج کیا جاتا ہے جو اخبار سیاست نے اس ترجمہ قرآن مجید کے تعلق سے کیا ہے' پھر ان کی لغت قرآن ''لغات القرآن فی غریب القرآن'' سے رفع اور خاتم کے معانی پیش کئے جائیں گے۔

''قرآن مجید کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں موجود ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی زبان انگریزی میں قرآن مجید کے زائد از ۴۵ ترجمے ہوئے ہیں' جن میں عبداللہ یوسف علی' مولانا عبدالماجد دریا بادی' نومسلم انگریز محمد مارماڈیوک پکتھال اور نومسلم امریکن ٹیمی اروِنگ (تعلیم علی) کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔

میرزا ابوالفضل (پیدائش ۱۸۶۵ء وفات ۱۹۵۶ء) کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا' وہ ایرانی نژاد شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پڑدادا حاجی علی شیرازی ایران سے ہندوستان آئے

تھے۔ مشرقی بنگال ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کلکتہ سے ایم اے کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی جس کی بنا پر ان کو اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی بھیجا گیا' وہاں انہوں نے ایک ہزار مستند احادیث کا مجموعہ اپنے پیش لفظ کے ساتھ پیش کیا' جس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ اس مختصر پیش لفظ میں جو نو صفحات پر مشتمل ہے علم حدیث کے بارے میں تمام اہم معلومات کو یکجا کر کے دریا کو کوزہ میں بند کیا گیا۔ مرزا صاحب عربی کے علاوہ سنسکرت زبان پر بھی عبور رکھتے تھے' جرمنی میں مرزا صاحب نے ہومیو پیتھی کی تعلیم بھی حاصل کی۔

میرزا صاحب نے سیرت النبیؐ پر ایک جامع کتاب لکھی نیز ''ہندوازم اور اسلام'' ''بدھ مت اور اسلام''، ''عیسائیت اور اسلام'' نامی تین رسالے لکھے جن کا مطالعہ ایسے طالب علموں کے لئے جو مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں ناگزیر ہے۔

ان کی انگریزی کتاب Faith of Islam اہم تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ''اسلام اور اس کی حقیقت'' کے نام سے شائع ہوا۔ یورپ اور امریکہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد مرزا ابوالفضل ہندوستان واپس ہوئے۔ کچھ عرصہ کلکتہ میں رہے پھر الٰہ آباد منتقل ہوئے۔ وہاں موتی لال نہرو نے ان کی صلاحیتوں کی قدر کی۔ ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد آئے اور ساگر ٹاکیز کے سامنے ہومیو پیتھی کا کلینک قائم کیا۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ با صلاحیت نوجوانوں میں قرآن مجید سے دلچسپی پیدا کریں اور حقیقی اسلام کے تعلق سے اپنوں میں اور دوسروں میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کریں۔ حیدر آباد قیام کے دوران مرزا صاحب نے قرآنی لغت ''غریب القرآن'' شائع کی جس میں قرآنی الفاظ کے معانی اردو میں دیئے گئے ہیں۔

مرزا ابوالفضل کے انگریزی ترجمہ قرآن کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ انگریزی زبان میں کسی مسلمان کا کیا ہوا اولین ترجمہ تھا۔

مرزا ابوالفضل صاحب نے اپنی زندگی میں اس ترجمہ کے چار ایڈیشن شائع کئے۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں ممبئی سے شائع ہوا۔ طباعت کے سلسلہ میں اپنی عمر کے آخری زمانہ میں بمبئی میں قیام کر کے انہوں نے تصحیح کا کام خود انجام دیا۔ اس اشاعت کے کچھ ہی ماہ بعد ان کا انتقال ہوا۔ وہ ایک متبحر عالم دین ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج تھے اور عمر بھر گمنامی میں رہے۔

اب ذیل میں میرزا ابوالفضل صاحب کی لغت قرآن ''غریب القرآن فی لغات القرآن'' سے خاتم اور رفع کے معانی درج کئے جاتے ہیں۔

خَتَمَ : خَتَمَ (+علی) مہر کردینا۔ (س۲:۶)

◆ افرئیت من اتخذ الھه ھوایه واضل الله علی علم و ختم علی سمعه وقلبه وجعل علی بصره غشاوۃ۔ (س۴۵:۲۳)

◆ ختم اللّٰہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ (س۲:۶)

= لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا . اولئک ھم الغافلون۔ (س۷:۱۷۹)

خَاتَمٌ : (۱) ما یختم به جس سے مہر لگائی جائے۔ جس سے تصدیق کی جائے۔ مہر۔
(۲) مصدق۔ تصدیق کرنے والا۔

◆ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله و خاتَم النبین ۔ (س۳۳:۴۰)

◆ رسول من عند اللّٰہ مصدق لما معھم۔ (س۲:۱۰۱)

◆ قول حضرت عائشہؓ : قولوا انه خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ. (درمنثور)

(۳) افضل. اشرف.

(۴) زینة ۔ خاتم بمعنی زینة ماخوذ من الخاتم الذی ھو زینة للاسبه۔ (مجمع البحرین)

ختــام مهــر ۔ مہر کرنے کے سامان مثلاً گالے وغیرہ۔ (س۸۳:۲۶) مختوم (اسم مفعول) مہر کیا ہوا۔ (س۸۳:۳۵) صفحہ ۹۶۔۹۵۔

رَفَعَ:

رفع: (۱) اونچا کرنا۔ بلند کرنا۔ رفع السموات بغیر عمد ۔ (س۱۳:۲) ۔ رفع سمکھا۔ (س۷۹:۲۸)

(۲) اعزاز بخشنا۔ مرتبہ بلند کرنا۔ ورفعنا لک ذکرک (س۹۴:۴) اور ہم نے بلند کیا تیرا نام تیرے (کمال) کی وجہ سے۔

◆ ورفعنا بعضهم بعض (س۴۳:۳۲)۔

◆ یرفع الله الذین امنوا (س۵۸:۱۱)۔

◆ ورفع ابویه علی العرش (س۱۲:۱۰۰)۔

◆ ورفعنا مکانا علیا (س۱۹:۵۷) اور ہم نے ادریس کو عالی مقام اعزاز بخشا۔

(۳) اٹھالینا بہ معنی وفات دینا، طبعی موت دینا۔

......وما قتلوه یقینا بل رفعه الله الیه (س۴:۱۰۸) اور بلاشک انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اس کو اپنے پاس اٹھالیا۔ (اسے طبعی موت دی)۔

لاترفعوا اصواتکم (س۴۹:۲) نہ اونچی کرو اپنی آواز (دھیرے بولو)۔

یا عیسیٰ انی متوفیک ورافعک الی (س۳:۴۸) اے عیسیٰ میں تجھ کو طبعی موت دونگا اور تجھے اپنے پاس اٹھالونگا (یعنی اپنی قربت میں جگہ دونگا)۔

(۴) مکان اٹھانا یا زمین پر کوئی عمارت قائم کرنا۔ نیو ڈالنا۔

◆ واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت (س۲:۱۲۷)۔

◆ فی بیوت اذن الله ان ترفع (س۲۴:۳۶)۔

◆ واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور ۔(س۲:۶۳) اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا تھا درآنحالیکہ ھم نے کھا تمار (سر) پر کوہ طور کھڑا کر رکھا تھا (یعنی کوہ طور کے نیچے اس کی وادی میں ہم نے تم سے اقرار لیا تھا)۔

رافع (اسم فاعل) اعزاز بخشنے والا۔

◆ خافضة رافعة۔ رفیع اونچا۔ بلند۔

◆ رفیع الدرجات (س۴۰:۱۰)

◆ مرفوع (اسم مفعول) (۱) اونچا کیا ہوا اونچا بنا ہوا۔

◆ والسقف المرفوع (س۵۲:۵)

(۲) عالی مرتبہ۔ اونچے درجہ کا۔ عمدہ سے عمدہ۔

◆ وفرش مرفوعة (س۵۶:۳۴)۔

◆ فیها سرر مرفوعة (س۸۸:۱۳)

◆ فی صحف مکرمة مرفوعة مطهره (س۸:۱۴) (صفحہ 138-137)

(ہفت روزہ 'بدر قادیان' جلد ۵۱ شمارہ ۳۹، ۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء)

مرزا سلیم بیگ صاحب رکن اعلیٰ، عدالت العالیہ حیدرآباد اور سیاح بلاد اسلامیہ

مرزا سلیم بیگ صاحب کے دادا مرزا عبدالقادر بیگ صاحب اور حضرت ام المومنینؓ کی نانی اماں محترمہ حضرت قادری بیگم صاحبہ دونوں حقیقی بھائی بہن تھے۔ ان خاندانی تعلقات کی تجدید مرزا سلیم بیگ صاحب کو دوبارہ فتح / دسمبر ۱۳۱۸/۱۹۴۰ء میں قادیان لے آئی۔ مرزا سلیم بیگ صاحب کی آنکھ نے مرکز احمدیت میں کیا دیکھا؟ اس کی تفصیل خود ان کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"۱۹۰۹ء کی بات ہے جب کہ میں دہلی میں میاں بشیر الدین محمود احمد (خلیفۃ المسیح) اور آپا نصرت جہاں بیگم (ام المومنینؓ) سے ملا تھا۔ عرصہ تک پھر ملنا نہیں ہوا۔ حالانکہ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب سے بارہا دہلی میں ملتا جلتا رہا۔ حیدرآباد کی ملازمت نے وطن سے دُور کردیا۔ بیگانے اپنے ہوگئے اور اپنے بیگانے۔ کنبہ کے بہت سے لوگ نئی پیداوار کے ہیں۔ یہ نہ جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں۔ اور ان باتوں کا موقع بھی نہیں ملتا۔ دہلی کا کنبہ ہندوستان کے چاروں کھونٹوں میں آباد ہوگیا ہے۔ ہر شخص نے اپنا نیا کنبہ بنالیا ہے اور نئی جنت بناڈالی ہے۔ میں بھی اپنی دُنیا میں بہرحال آباد ہوں۔ اسی طرح قادیان میں ایک کنبہ آباد ہے جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔ زندگی میں دوچار دفعہ ملنا ہوگیا ہے۔ ہم ختم ہوئے اور کنبہ داری کی زنجیر ٹوٹی۔ شجرے کی کسی ٹہنی میں ہمارا بھی نام لٹکا ہوگا۔ گرچہ بسے گذشت کہ نوشیروان نماند۔

اکثر دل چاہتا تھا کہ قادیان جاؤں اور ایک دفعہ تو مل آؤں۔ مگر دہلی تک جاکر اتنی دلچسپیاں بڑھ جاتی تھیں کہ رخصت کا مختصر زمانہ دہلی کی جنت میں ختم ہوجاتا اور قادیان جانے کی

نوبت نہ آتی ۔تمنا تو ہمیشہ رہی مگر کبھی شرمندہ تعمیل نہ ہوئی ۔حسن اتفاق تھا کہ ۱۹۳۹ء میں حضرت میاں محمود احمد صاحب حیدرآباد تشریف لائے اور عزیزوں سے ملنے کا انہوں نے خاص انتظام کیا۔ دید اور باز دید ملاقاتوں میں تجدید محبت ہوئی ۔ یایوں کہئے کہ بچھڑے ہوئے اپنی زندگی میں پھر ملے ۔حیدرآباد کی یہ ملاقاتیں میرے قدیم خیال کو تقویت پہنچانے لگیں ۔۱۹۴۰ء میں کلکتہ گیا تو جنگ کی وجہ سے بازاروں میں سرد بازاری پائی اور طبیعت نے قرار نہ لیا۔ اور قادیان کے ارادہ سے کلکتہ سے دہلی پہنچا ۔ اور دہلی سے قادیان ۔ قادیان اور جماعت احمدیہ کی جو تصویر میں نے ذہن میں تیار کی تھی' وہ اور اس کے خدوخال تازہ کرنا چاہتا تھا کہ علی الصبح گاڑی بدلنے کے لئے امرتسر کے اسٹیشن پر اُترنا پڑا۔ پلیٹ فارم پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر قادیان کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر ایک دوسرے کا پُرسان حال ہوا ۔ چنانچہ میرا تعارف بھی بہت سے اشخاص سے ہوا ۔ اور کرایا گیا ...... ناشتہ کے لئے کئی اصحاب نے مجبور کیا ......بعض احباب نے تو اتنا کھلایا کہ میں نے اُن کے دسترخوان پر سے اُٹھنے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ کھانا وہ لوگ کھا رہے تھے اور میں ہاضمہ کی دوا اور ہیضہ کے انسداد پر غور کر رہا تھا۔ گاڑی جب بٹالہ پہنچی تو چاء میں مجھے شریک ہونا پڑا۔ تواضع اور اخلاق کی مشین گن نے ایک پیالی چائے کی گنجائش نکال ہی لی اور قہر درویش برجان درویش شکریہ کے ساتھ چائے پی ۔ بٹالہ سے گاڑی بدل کر قادیان جانے والی گاڑی میں سوار ہوگے ۔

لیجئے صاحب میں قادیان پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اور عرفانی صاحب نے اسٹیشن پر ہی گلے لگایا۔ گلے ملتے اور باتیں کرتے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے ۔ ہاتھ منہ دھویا۔ چاء اور تکلفات تو یہاں بھی بہت تھے مگر مجھے اپنی سلامتی کی ضرورت تھی ۔محمود احمد صاحب عرفانی کو لے کر نکل گیا۔ یہ وہ شہر ہے جس کا نام برسوں سے سنتا آ رہا تھا۔ ہر مکان کو دیکھتا۔ ہر مکین پر نظریں جماتا' بازار کو دیکھتا' اور دوکانداروں کو گھورتا' اس شہر نما قصبہ میں گزرتا رہا۔ قادیان کی وضع تو پنجاب کے اور قصبوں کی سی ہے مگر جماعت کے اتحاد' اتفاق اور تنظیم نے اس کو چار چاند لگا دیئے ہیں ۔ بڑے بڑے بنگلہ خانہ باغ' سڑک' مدرسے' بورڈنگ ہاؤس' اسپتال' بازار اور ساہوکارہ' برقی پریس' اطباء یونانی' ویدک دواخانہ' کارخانے جیسی چیزیں یہاں موجود ہیں ۔ یہاں کی آبادی

میں حضرت مسیح موعودؑ کے خاندان کے افراد آباد ہیں ۔ جماعت کے کارکن آباد ہیں ۔ وہ بھی آباد ہیں جو اعتقاد وایمان سے قربت چاہتے ہیں اور وہ بھی جو قربت حاصل کر چکے ہیں ۔ایسے بھی ہیں جو ترکِ وطن کر کے آباد ہوئے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو جماعت کی خاطر مقیم ہیں ۔ایسے طالب علم بھی ہیں جو شوق تبلیغ میں علم حاصل کر رہے ہیں ۔ ایسے طالب علم بھی ہیں جو مدارس میں ابتدائی تعلیم کے لئے بورڈنگ میں ہیں ۔ جماعت کا ہر شعبہ ایک افسر کی نگرانی میں ہے اور اس افسر کا عملہ اور دفتر علیحدہ ہے ۔تمام دنیا کے ڈاک خانوں سے یہاں ڈاک آتی ہے اور جاتی ہے ۔ تار آتے ہیں اور جاتے ہیں ۔اس لئے قادیان کو قصبہ کہنا تو غلطی ہے ۔ اچھا خاصہ شہر ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ روز بروز ترقی ہی ہوگی کیونکہ جواں ہمت اور جواں عزم جماعت کام کر رہی ہے اور پابند ملت مسلمانوں کی بستی ہے جو بستے بستے بستی ہے ۔

عرفانی صاحب کے ساتھ میں جماعت کے مقامات دیکھتا' یادگاروں پر نظر ڈالتا قدیم بستی میں آپا نصرت جہاں بیگم کے پاس پہنچا ۔ یہاں جماعت کی طرف سے مسلح پہرہ ہے ۔ اطلاع کرائی گئی اور زنانہ میں بلالیا گیا ۔آپا نے بڑھ کر مجھے اپنے کمرہ میں لیا اور نہایت کراری آواز سے سلام علیکم کہا۔ مزاج پوچھا۔ خیریت دریافت کی ۔ حالات پوچھے ۔گذرے ہوؤں کا ذکر کیا۔ زندوں کو دعا دی ۔عزیزوں کو نام بنام دریافت کیا اور پھر حاضر ہونے کے وعدہ پر میاں بشیر الدین محمود احمد صاحب سے ملنے باہر چل دیا۔ میاں مجھ سے ایک سال چھوٹے ہیں ۔ پنجاب کی آب و ہوا میں رہ کر وہ کسبِ عالم اور جماعت کی ضروریات کے انہاک میں رہ کر مجھ سے بڑے معلوم ہوتے ہیں ۔قویٰ مغلوں کے سے ہیں ۔آنکھوں میں چمک ویسی ہی ہے چہرے کے دونوں ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں ۔ کشادہ پیشانی' بلند قامت ہیں ۔ گفتار اور رفتار میں مردانہ وضع ہیں۔ میاں جس مکان میں رہتے ہیں یہ اور بھائیوں کے مکانات سے ملا ہوا ہے ۔ حصے جدا جدا ہیں مگر آپس میں سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ۔ ان مکانوں تک موٹر آجاتی ہے ۔ یہاں سے قریب ہی مسجد اقصیٰ ہے اور اسی مسجد میں مینارۃ المسیح ہے ۔یہیں نماز جمعہ ہوتی ہے ۔ مسجد شاندار نہیں کیونکہ تھوڑی تھوڑی بنی ہے اور ہر حصہ اپنے پہلے حصہ سے جدا معلوم ہوتا ہے ۔

قادیان کے قیام میں میرا ناشتہ تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہوتا ۔ اور وقتوں کے کھانے'

دعوتوں کے کھانے دعوتوں کی صورت میں ہوتے ۔ دعوتوں سے وقت بچتا تو قادیان کے قرب و جوار کے مقامات دیکھنے میں صرف کرتا۔ محمود احمد عرفانی میرے ساتھ تھے اور جدھر مُنھ اٹھتا اُدھر نکل جاتے ۔ پنجاب کی آب و ہوا دسمبر کا مہینہ' مرغن اور مکلّف کھانے کھاتا اور ہضم بھی کر جاتا۔ اگر حیدرآباد میں ایک ہفتہ بھی بد پرہیزی کر جاتا تو آپریشن نہیں تو کم از کم تنقیہ معدہ کی ضرورت لاحق ہو جاتی ۔ عزیزوں نے محبت سے کھلایا اور ایک عزیز مسافر نے آنکھیں بند اور دل کھول کر مسافر نوازی کی داد دی ۔ میرا قیام تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں تھا مگر مہمانی پورے قادیان نے ادا کی ۔ ڈاکٹر صاحب اکثر جگہ ساتھ ہوتے مگر وہ نقرس کے مرض سے مجبور ہو گئے ہیں ۔ آہستہ چلتے ہیں' آہستہ بات کرتے ہیں ۔ نہایت متین' سنجیدہ اور حلیم ہیں ۔ سب سے محبت سے پیش آتے ہیں ۔ سب کی خاطر کرتے ہیں ۔ سب سے خوش ہو کر ملتے ہیں ۔ دہلی کی قدیم وضع کا مکان ہے جس میں پائین باغ ہے ۔ پنشن لے لی ہے اور قادیان میں اطمینان کی زندگی گذار رہے ہیں ۔

جب تک میں قادیان میں رہا گویا دارالسّلام میں رہا ۔ نہ تو موسم کی تیزی نے کوئی بُرا اثر کیا اور نہ میری بد پرہیزی نے میرا کچھ بگاڑا ۔ آپا صاحبہ (ام المومنین) کا یہ وطیرہ رہا کہ علی الصبح میرے پاس پہنچ جاتیں اور دروازہ کو کھٹک کر اندر آ جاتیں ۔ سلام علیکم کرتیں اور باتیں شروع کر دیتیں ۔ میں لحاف اوڑھے پلنگ پر بیٹھا ہوتا اور ٹہل ٹہل کر باتیں کرتی جاتیں ۔ آواز میں کرارہ پن باقی ہے ۔ ہاتھ پاؤں تندرست اور سیدھے ہیں ۔ آنکھیں کام دیتی ہیں ۔ قویٰ میں توانائی اور چستی معلوم ہوتی ہے اور بات کو معقولیت سے سنتی اور معقولیت سے جواب دیتی ہیں ۔ زندگی کے ہر شعبہ پر گفتگو کرتی ہیں اور بے دھڑک خیالات کا اظہار کرتی ہیں ۔ پان کا زیادہ شوق ہے باتیں کرتی جاتیں ہیں اور پان کھاتی جاتی ہیں ۔ دلی والوں کا سا لباس ہے ۔ اُونی پائتابہ پہن کر گرم رنگین تنگ موری پاجامہ پہنتی ہیں ۔ گرم اُونی کرتہ پر سویٹر پہن کر کشمیری شال سر سے اس طرح اوڑھتی ہیں کہ سر بھی ڈھک جاتا ہے اور مفلر بھی معلوم ہوتا ہے ۔ اوور کوٹ پہن کر ان سب کو ایک جگہ کر لیتی ہیں ۔ ایک ہاتھ میں تسبیح اور ایک ہاتھ میں دستانہ ہوتا ہے ۔ علی الصبح بعد نماز گھر سے نکلتی ہیں ۔ پہلے عزیزوں کے ہاں' دوستوں کے ہاں' اخلاص مندوں اور معتقدوں کے ہاں جاتی ہیں اس میں مزاج پرسی' دریافتِ حال' عیادت اور تیمار داری سب ہی کچھ ہوتا ہے ۔ کہیں بچوں کا

علاج کرتی ہیں اور کہیں بڑوں کی مزاج پرسی' کسی جگہ دوا بتاتی ہیں اور کہیں دوا خود تیار کر کے دیتی ہیں ۔ دلی کی بڑی بیگمات کا یہ طریقہ تھا کہ بچوں کے درد دُکھ کا علاج گھر کی بڑی بوڑھی بیگمیں کیا کرتی تھیں ۔ وہی آپا صاحبہ کا طریقہ کار ہے اور اس علاج معالجہ میں ان کو اچھی دستگاہ ہے ۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے بچوں کے معمولی امراض میں بہت مفید ہوتے ہیں ۔ دس گیارہ بجے تک وہ اپنی اس مصروفیت سے فارغ ہو کر گھر پہنچ جاتی ہیں ۔ دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتی ہیں ۔ ظہر اور عصر کی نماز تک گھر میں بہو بیٹیوں سے ملتی رہتی ہیں اور شام کو پھر چہل قدمی کو نکل جاتی ہیں ۔ اس پروگرام کی وہ حتی المقدور پابندی کرتی ہیں ۔ اس وقت ان کی عمر (۷۵)[1] سال ہے مگر ارادہ میں جوان ہیں ۔ عمل میں جوان ہیں ۔ اپنے عزم میں جوان ہیں ۔ ایک بارُعب کمانڈر کی طرح قادیان کی آبادی پر اثر ہے ۔ جس طرح خلوص اور محبت سے ملتی ہیں ۔ اسی طرح رُعب اور اثر سے کام لیتی ہیں ۔ ان امور میں اُن کو دلچسپی ہے اور اسی کو انہوں نے اپنا شغل بنا رکھا ہے جس طرح کنبہ کو اُن کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح قادیان کی آبادی کو ان کی ضرورت ہے ۔ یہ بلالحاظ مذہب وملت ہر ایک سے حسن سلوک کے ساتھ ملتی ہیں ۔ جو کچھ ممکن ہوتا ہے اس کی خدمت کرتی ہیں ۔ اطمینان اور دلاسہ دیتی ہیں ۔

بہرحال برسوں کی آرزو پوری کر کے عزیزوں سے مل کے' قادیان کو دیکھ کے' قادیان سے رخصت ہو گیا ۔ جی تو چاہتا ہے کہ ایک دفعہ اور ہو آؤں مگر ع

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

اب تک تو یہی ہو رہا ہے آئندہ کی خبر خدا جانے ۔ والسّلام ۔

سلیم بیگ"[2]

(۱) اصل بیان میں واوین کے درمیان کوئی لفظ نہیں تھا ۔ مگر چونکہ حضرت ام المومنین کی ولادت ۱۹۶۵ء میں ہوئی اس لئے یہاں مرتب کی طرف سے معین عمر لکھ دی گئی ہے ۔

مرزا سلیم بیگ صاحب کا ایک اور تحریری بیان

مرزا سلیم بیگ صاحب نے اپنے سفر قادیان کے تاثرات کا اظہار اپنے ایک دوسرے تحریری بیان میں بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

''۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ مجھے قاہرہ (مصر) جانے کا اتفاق ہوا۔ میں قاہرہ میں ٹھہر گیا۔ اور میرے ہمسفر دوست دوروز قاہرہ میں ٹھہر کر یورپ چلے گئے۔ تقریباً ایک ہفتہ کے بعد مجھے قاہرہ میں محمود احمد صاحب عرفانی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ کچھ وطنیت کچھ سلسلہ واقفیت نے ہم دونوں کو اس طرح متحد کیا کہ میرا اکثر وقت محمود احمد صاحب عرفانی کے ساتھ گذرنے لگا۔ عرفانی صاحب قاہرہ میں جماعت احمدیہ کی طرف سے مبلغ اسلام تھے اور وہاں اپنے مشن کا کام مصریوں میں نہایت ہی خوبیوں کے ساتھ کررہے تھے۔ اجنبیت اور غیر ملکی ہونے کے باوجود عرفانی صاحب نے مصری شرفا کی مجلسوں میں اچھا رسوخ پیدا کرلیا تھا۔ نامور اور ذمہ دار ہستیوں سے مراسم رکھتے تھے۔ اس لئے عرفانی صاحب کی وجہ سے مجھے قاہرہ اور زندگی قاہرہ کے مطالعہ کا کافی موقع ملا۔ اور میں اس مشن کی کوششوں کو بھی دیکھتا رہا جو عرفانی صاحب مبلغ کی حیثیت سے وہاں انجام دے رہے تھے۔ عرفانی صاحب کی ہی رہبری سے فلسطین اور شام میں جماعت احمدیہ کے تبلیغی مشن کی کوشش کو دیکھا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۳۰ء میں قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ عرفانی صاحب موجود تھے۔ اوران کا مشن نہایت کامیابی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ اس مرتبہ کی ملاقات تجدید اتحاد کا باعث ہوئی اور مشن کی کارگذاری پر' مشن کی رُسُوخ پر' مبلغ کے خلوص پر غور کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا۔ میں ان تاثرات کو لئے ہوئے فلسطین' شام' استنبول اور برلن وغیرہ گیا۔ یہاں مجھے جماعت احمدیہ کی تنظیم اور کوششوں کا ثبوت ملتا گیا۔ مجھے حقیقتاً نہایت صدق دل سے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے ہر جگہ جماعت احمدیہ کے مبلغوں کی کوششوں کے نقوش دیکھے۔ ہر جگہ اسلامی روایات کے ساتھ تنظیم دیکھی۔ ہر جگہ اس جماعت میں خلوص اور نیک

(۲) ''سیرۃ حضرت سیدۃ النساء ام المومنین نصرت جہاں بیگم'' صفحہ ۱۹۶ تا ۱۹۸ (حصہ دوم) ناشر حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی کبیر حیدرآباد دکن۔ تاریخ اشاعت ۲۵/جولائی ۱۹۴۵ء (مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن)

نیتی پائی۔ جماعت احمدیہ میں سب سے بڑی خوبی اتحاد عمل اور امام جماعت کے احکام کی پابندی ہے۔ اس لئے اس کے اراکین کہیں اور کسی حال میں شعار اسلام اور احکام اسلام کو نظر انداز نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی اصلی غرض اور فرض سے انجان ہوتے ہیں۔ تقریروں' تحریروں یا ملاقاتوں میں ان کا نقطۂ نظر موجود ہوتا ہے اور وہ اشارۃً کنایۃً اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ محنت برداشت کرتے ہیں۔ غیر مانوس اور غیر مشرب لوگوں میں رسوخ پیدا کرکے اپنے فرائض کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور اپنی تبلیغی حیثیت کو نمایاں رکھتے ہیں۔ محمود احمد صاحب عرفانی نے ۱۹۳۰ء میں قاہرہ سے ایک اخبار ''اسلامی دنیا'' بھی اُردو زبان میں ٹائپ پریس سے شائع کیا تھا۔ یہ اخبار مصور بھی تھا اور اُردو میں اسلامی دُنیا کی خبریں نہایت شرح و بسط سے شائع ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ ناگزیر مجبوریوں نے اس اخبار کو جاری نہ رہنے دیا اور اشاعت بند ہوگئی۔ اس اخبار میں کچھ حصہ میرے سفر کا بھی شائع ہوا تھا۔

شام و مصر کی ان ملاقاتوں کا یہ اثر ہوا کہ مجھے جماعت احمدیہ کے صدر مرکز قادیان جانے کا اتفاق ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں قادیان دارالسّلام پہنچا۔ قادیان امرتسر سے تقریباً ۵۰ میل ہے۔ ریل جاتی ہے مگر دو تین جگہ اس کو بدلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جہاں جماعت احمدیہ کے عروج کے ساتھ اس قصبہ کو بھی عروج ہورہا ہے۔ سڑکیں بن گئی ہیں۔ مکانات تعمیر ہوگئے ہیں۔ باغ اور کھیلوں کے میدان تیار کئے جارہے ہیں۔ اسپتال' مدارس اور بورڈنگ ہاؤس تیار ہیں۔ جہاں اس جماعت کے اساتذہ جماعت کے ہونہار بچوں کی تعلیم و تربیت پر لگے ہوئے ہیں۔ ہسپتال جس کا خرچ جماعت احمدیہ برداشت کرتی ہے۔ منظّم اور ایک حد تک آلات و ادویات سے آراستہ ہے۔ بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بہت وسیع اور شاندار شاہجہانی وضع پر تعمیر کی گئی ہے جو ایک پُرفضا مقام پر سکول کے متصل ہے۔ اس کے قریب وہ میدان ہے جہاں جماعت کے ضروری اور سالانہ اجلاس کی تیاری اس میدان میں نہایت وسیع پیمانے پر ہورہی تھی۔ مہمانوں کے قیام' مہمانوں کے طعام و ضروریاتِ زندگی کی فراہمی پر اراکین کی سعی بلیغ قابل تحسین و قابل تقلید تھی۔ اوقات و اہتمام کی تقسیم جو اس جماعت کی نمایاں خوبی ہے' سُرعت و خلوص نیت کے ساتھ کارفرما تھی۔ گو میں سالانہ اجلاس کے وقت تک قیام نہ کرسکا مگر انتظام و اہتمام کے نقوش

میرے سامنے تھے اور ہر وقت میں اُن کی یک جہتی کا قائل اور اُن کی مدنیت کا شیدائی ہوتا گیا۔

قبرستان کا اہتمام اور اس میں صف بندی میں نے پہلی مرتبہ قادیان میں دیکھی۔ بغیر کسی آرائش اور لحاظ منصب کے اس قبرستان میں قبور ایک صف میں بنائی گئی ہیں۔ مدفن کی لوح' مدفونوں کی ایک مختصر تاریخ وفات اور وصیت نامہ کی رجسٹری کے ساتھ کندہ ہوتی ہے۔ ہر قبر پر بالالتزام یہ لوح ہوتی ہے۔ ہر قبر دوسری قبر سے معقول فاصلہ پر ہوتی ہے۔ ہر صف کے آمد و رفت کے لئے راستہ چھوڑا جاتا ہے اور ممکن طریقہ پر اس قبرستان کو سایہ دار درختوں سے خوش نما کیا گیا ہے۔ قادیان میں اکثروں نے ترک وطن کر کے سکونت اختیار کرلی ہے۔ یہاں ایک ایسی انجمن بھی ہے جو اپنی جماعت کو قادیان میں تعمیر مکان کے لئے قرضہ دیتی ہے۔ بالاقساط وصول کرتی ہے۔ اس جماعت کے اراکین اپنی املاک جماعت کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور اس کا انتظام بھی ایک خاص محکمہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ خزانہ' داد وستد' امور مذہبی' نشر و اشاعت' اہتمام ترکہ و وقف کے لئے محکمہ جات قائم ہیں۔ ہر ایک کے لئے مقررہ عملہ اور عہدہ دار ہیں۔ ان سب دفاتر پر خلیفہ ثانی حضرت میاں بشیر الدین محمود صاحب کی نگرانی ہے جو بالذات روزانہ اس کی خدمت کی جانچ کرتے ہیں۔ جس زمانے میں مجھے قادیان جانے کا اتفاق ہوا حضرت خلیفہ صاحب تفسیر قرآن لکھنے میں مصروف تھے۔ یہ تفسیر قادیان میں شب و روز کی محنت سے بروقت شائع ہوئی اور حضرت صاحب کی عنایت سے یہ تفسیر کبیر کی ایک جلد مجھے بھی حیدرآباد میں ملی جس کا میں بے حد ممنون ہوں۔ خدا تعالیٰ ان کے کام میں برکت دے۔ اور ہمیں احکام قرآنی کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین[1]۔ فقط

۱؎ کتاب ''قائداعظم میری نظر میں'' صفحہ ۲۱۲۔۲۱۳۔

نواب بہادر یار جنگ کی نظر میں جماعت احمدیہ

نواب بہادر یار جنگ کل ہند شہرت کے ممتاز قائد، مملکت حیدرآباد کی واحد نمائندہ مسلم سیاسی جماعت انجمن ''اتحاد المسلمین'' کے صدر ہونے کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور ''لسان الامت'' کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ آپ قائداعظم محمد علی جناح کے بہترین اور بے تکلف دوستوں اور گہرے رفقاء میں سے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی نظر میں ان کی شخصیت کتنی بلند پایہ تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ ایک بار نظام حیدرآباد دکن نے قائداعظم سے ایک ملاقات کے دوران کہا کہ ''بہادر یار جنگ حیدرآباد کے ایک جاگیردار اور جمعدار ہیں۔ میں انہیں شہر بدر کرسکتا ہوں، انہیں سزا دے سکتا ہوں'' قائداعظم نے اس کے جواب میں فرمایا:

''کیا میں اسے آپ کا چیلنج سمجھوں۔ اگر یہ واقعہ ہے تو میں اسے اپنے اور مسلمانان ہند کی طرف سے قبول کرتا ہوں۔ میں اسے جانتا ہوں کہ یہاں بہادر یار جنگ کی وہی حیثیت ہے جس کی آپ نے ابھی توضیح کی ہے، لیکن اس کے سوا بھی ایک مقام ہے جس پر آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق جو کچھ بھی ہوگا اسے لازماً سارے مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر محسوس کریں گے۔ پھر میں جانتا ہوں کہ جاگیر اور منصب سے زیادہ انہیں قوم کی عظمت اور خود آپ کی سلامتی عزیز ہے تاکہ حیدرآبادی مسلمان اقلیت کی زد میں نہ آجائیں۔ آپ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ نتیجہ ہے اس سازش کا جو حیدرآباد میں قومی تحریک کو کچلنے کے لئے کی جارہی ہے[1]''

تحریک پاکستان کو برطانوی ہند کے طول و عرض میں پھیلانے اور مقبول بنانے میں قائداعظم کے دوش بدوش جن زعمائے مسلم لیگ نے نمایاں حصہ لیا، ان میں نواب بہادر یار جنگ مسلمہ طور پر صف اول میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ جون ۱۹۴۴ء (احسان ۱۳۲۳ہش) میں آپ نے انتقال کیا جس

پر قائداعظم نے فرمایا کہ ریاستی مسلم لیگ کے صدر کا انتقال نہیں ہوا بلکہ میرا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے[1]

نواب صاحب کے تاثرات حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے تعلق سے

نواب بہادر یار جنگ کو جہاں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے از حد محبت تھی وہاں آپ جماعت احمدیہ کی اسلامی تنظیم اور اسلامی خدمات سے نہایت درجہ متاثر اور حضرت سیدنا خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے از حد مداح تھے۔ چنانچہ جناب سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآباد کا بیان ہے کہ:

''حضرت مصلح موعودؓ کی آمد حیدرآباد (اکتوبر ۱۹۳۸ء) کے موقع پر نواب بہادر یار جنگ بہادر الہ دین بلڈنگ سکندرآباد پر جہاں حضور فروکش تھے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اور اس موقع پر مسلمانان حیدرآباد کے مسائل پر حضور نے تخلیہ میں طویل گفتگو کی تھی۔ نواب بہادر یار جنگ مجلس اتحاد المسلمین مملکت اسلامیہ آصفیہ کے صدر تھے۔ ان کے طویل دور صدارت میں راقم الحروف ان کی مجلس عاملہ کا سینئر رکن تھا۔ کئی مرتبہ اپنی مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں دو شخصیتوں کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ ایک ''حضرت امام جماعت احمدیہ'' کی۔ دوسری قائداعظم محمد علی جناح کی۔ ان کے اس بیان اور تاثر کے گواہ پاکستان میں ان کے اور میرے قدیم ساتھی اور دوست اور اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ کے رکن احمد عبداللہ المسدودی مصنف ''مذہب عالم'' اور افریقہ ایک چیلنج'' وغیرہ ہیں۔ حال میں مجھ سے مسدودی صاحب نے

[1] رسالہ ''نقوش'' (لاہور) خطوط نمبر ۲ صفحہ ۲۸۱۔ ''جموں کے ممتاز لیڈر چودھری غلام عباس صاحب نے اپنی کتاب ''کشمکش'' میں لکھا ہے کہ جن دنوں نواب بہادر یار جنگ کی وفات ہوئی قائداعظم سرینگر میں فروکش تھے۔ میں نے نواب صاحب کی وفات کے المناک حادثہ کی اطلاع دی تو پانچ منٹ کے بعد قائداعظم نے فرمایا کہ غالباً پہلی دفعہ مجھے کسی کی موت سے اتنا شدید صدمہ ہوا ہے پھر نواب صاحب کی خوبیاں بیان کیں...... اس کے بعد مرحوم کی بیگم کو بذریعہ تار پیغام تعزیت بھجوایا۔'' (''کشمکش'' صفحہ ۲۴۷۔ ناشر اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور)

حضرت مصلح موعودؓ کی وفات پر نواب بہادر یار جنگ کے مذکورہ بالا تاثر کا ذکر کیا تھا۔ ان کے ذہن میں حضور کے نام کے ساتھ دوسرا نام مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسن کا تھا۔ بہر حال میری اور ان کی یادداشت میں حضرت امیر المومنین کا نام مشترک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نواب صاحب نے کسی موقع پر مفتی اعظم فلسطین کا بھی نام لیا ہو''[1]

سیٹھ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''میں نے اپنی توضیح میں اس کا ذکر کیا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے کئی مرتبہ اس امر کا ذکر کیا تھا کہ وہ دو اصحاب کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ دماغی صلاحیت سے متاثر تھے۔ ایک حضرت امام جماعت احمدیہ اور دوسری قائداعظم محمد علی جناح کی ذات۔ حُسنِ اتفاق سے ۲۰ مئی کو مولوی محمد لقمان صاحب پریسیڈنٹ جماعت ۶ ۷ گ۔ ب تحصیل و ضلع لائل پور جو تقریباً دس سال غالباً ۳۴۔۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۴ء تک حیدرآباد میں مقیم رہے تھے۔ مجھ سے ملنے یہاں اسکندرآباد[2] آئے تھے۔ ان کے قیام حیدرآباد کے زمانے کی باتیں چل نکلیں۔ انہوں نے بغیر میرے ذکر کے خود کہا کہ وہ ایک مرتبہ نواب بہادر یار جنگ سے ملے تھے اور اس موقع پر نواب صاحب نے ان سے وہی بات کہی تھی جو میں نے اپنے بیان میں کہی ہے۔ دوسری بات جو مولوی صاحب نے بیان کی وہ یہ تھی کہ نواب صاحب نے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی تقریر ''سیر روحانی''[3] کے متعلق ان سے کہا تھا کہ وہ اس تقریر سے اس قدر متاثر تھے کہ اس کو انہوں نے تین دفعہ پڑھا تھا۔

......نواب صاحب نے غالباً فروری یا مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں محمد یعقوب کی ایک دعوت میں چودھری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کی زبانی اس تقریر کا خلاصہ سنا تھا، چنانچہ حیدرآباد واپس آ کر ایک علمی صحبت میں بہت تفصیل کے ساتھ انہوں نے یہ خلاصہ سنایا تھا (نواب صاحب کا حافظہ ایسا تھا کہ وہ کسی کی گفتگو یا تقریر کو سن لیتے

[1] مکتوب جناب سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآبادی (بنام مولف ''تاریخ احمدیت'') مرقومہ ۱۹ ہجرت / مئی ۱۳۴۵ھ ۱۹۶۶ء از سی ۴۲/ ہوزنگ کالونی اسکندرآباد (ضلع میانوالی)۔

[2] ضلع میانوالی۔ [3] اس کا تذکرہ جلد ہشتم میں ہو چکا ہے۔

تو تقریباً لفظ بلفظ سنایا کرتے تھے۔خود ان کی اپنی جو تقریریں شائع شدہ ہیں وہ تقریر کے بعد انہوں نے لفظ بلفظ لکھوائی تھیں ......) حضرت مصلح موعودؓ کی یہ تقریر ''سیر روحانی'' جب شائع ہوئی تو محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ نے اس کی ایک جلد جس پر انہوں نے نواب صاحب کا نام اور اپنے دستخط فرمائے تھے، میرے ذریعے نواب صاحب کو بھجوائی تھی اور نواب صاحب اس کے مطالعہ کے بعد اکثر اپنی مجلسوں میں اس پر بڑے تعریفی کلمات کہا کرتے تھے''[1]

جماعت احمدیہ سے گہرے روابط:

نواب بہادر یار جنگ کے جماعت احمدیہ سے مراسم کا یہ عالم تھا کہ پروفیسر الیاس برنی (ولادت ۱۸۹۲ء۔ وفات ۱۹۵۸ء) نے ۲۲ر تبلیغ رفروری ۱۳۱۹ھ ۱۹۴۰ء کو شاہ حسین میاں پھلواری شریف کے نام ایک خط میں نواب صاحب اور جماعت احمدیہ کے تعلقات پر بڑی تشویش و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''یہاں مہدویوں[2] کی اچھی خاصی جماعت ہے، جس میں نواب بہادر یار جنگ بھی شامل ہیں۔ یہ جماعت حضرت سید محمد جونپوری کو مہدی مانتی ہے اور اگرچہ شاید صریحاً ان کو نبی نہیں کہتی تاہم عقیدۃً ان کو رسول اللہؐ کے ہم پلہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مانتی ہے اور اپنے طرز پر تاویلات کرتی ہے۔ قادیانیوں سے ملتے جلتے عقائد ہیں۔ البتہ عقائد کی عام اشاعت نہیں کی جاتی بلکہ ایک حد تک عقائد مخفی رکھے جاتے ہیں...... چونکہ نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں کی سیاسیات میں شامل ہوگئے ہیں اور نمایاں حصہ لے رہے ہیں مسلمانوں نے بھی تفریق کو نظر انداز کر دیا اور ان کو اپنا

(۱) مکتوب جناب سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآبادی (بنام مولف ''تاریخ احمدیت'') مرقومہ ۲۵ ہجرت ر مئی ۱۳۴۵ھ ۱۹۶۶ء از سی ر۴۲ ہوزنگ کالونی اسکندر آباد (ضلع میانوالی)۔

(۲) فرقہ مہدویہ کے تفصیلی حالات و عقائد کے لئے ملاحظہ ہو ''رود کوثر'' صفحہ ۱۹ تا ۲۹ مرتبہ جناب شیخ اکرام صاحب ایم اے شائع کردہ فیروز سنز لاہور۔

سرگروہ بنالیا۔ مولوی ابوالحسن سید علی صاحب کا بھی یہی معاملہ ہے۔ مسلمانوں میں لیڈر مانے جاتے ہیں اور ہر دلعزیز ہیں۔ جب سے قادیانیوں کا بھانڈا پھوٹا، وہ دینیات ،اسلامیات اور سیاسیات میں بہت نامور ہوگئے،لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کے رہنما نواب بہادر یار جنگ قادیانیوں سے میل جول بڑھا رہے ہیں، بلکہ بعض لوگ سازباز کا شبہ کرتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں بددلی پیدا ہو رہی ہے،توجہ بھی دلائی گئی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ خدا کرے آئندہ سمجھ آئے۔ میں تو سیاسیات سے الگ تھلگ رہتا ہوں۔ تاہم میرا جو علم تھا آپ کو لکھ دیا، لیکن یہ بات آپ ہی تک رہے، باہر نہ جائے...... اپنے اثرات اور مسلمانوں کی عدم توجہی سے فائدہ اٹھا کر اسی جماعت نے سرکاری جنتری میں حضرت سید محمد جونپوری کی تعطیل میں لفظ ''میلاد شریف'' درج کرالیا......

علی ہذا جو نظم رسول اللہ کی توصیف میں لکھی جاتی ہے وہ نعت کہلاتی ہے لیکن مہدوی لوگ سید محمد جونپوری کی منظوم توصیف کو بھی نعت کہتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی اصطلاح میں ایسی نظمیں منقبت کہلاتی ہیں''[1،2]

(۱) اس مراسلہ سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہے کہ تحریک پاکستان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس میں مضمر تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زبردست ذہانت اور فراست سے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر ہر قسم کے نقطہ خیال رکھنے والے مسلمانوں کو جمع کر دیا تھا۔ آپ سیاسیات کے میدان میں اختلاف عقائد کا لحاظ نہیں کرتے تھے اور ہر مسلمان کہلانے والے کو مسلم لیگ کے اسٹیج پر آ کر کام کرنے کا موقع دیتے تھے۔ (۲) رسالہ ''نقوش'' لاہور خطوط نمبر ا صفحہ ۔۴۸۰۔

مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے بعد قادیان میں آمد:

۲۱۔۲۲۔۲۳/امان/۱۳۱۹ھ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرارداد پاکستان پاس کی گئی۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے نواب بہادر یار جنگ ۱۸/ مارچ ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد سے عازم لاہور ہوئے۔ آپ کے ساتھ مسٹر سید احمد محی الدین ایڈیٹر رہبر دکن مسٹر ابوالحسن علی (مجلس اتحاد المسلمین)، مولانا سید پاشاہ حسین صاحب (سکریٹری مجلس علمائے دکن) بھی تھے[1]

مسلم لیگ کے اجلاس میں سرگرم حصہ لینے اور دوسری متعدد مجالس سے پر اثر خطاب کرنے کے بعد حیدرآباد واپس جاتے ہوئے آپ قادیان بھی تشریف لے گئے۔ جہاں چودھری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کی کوٹھی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے مفصل ملاقات ہوئی جس میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کے علاوہ سیٹھ محمد اعظم صاحب بھی موجود تھے۔ اس اہم ملاقات کے علاوہ آپ نے مرکز احمدیت کے اداروں اور تنظیم کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے تاثرات اپنے قلم سے لکھ کر شیخ محمود احمد صاحب عرفانی مدیر ''الحکم'' کو ارسال فرمائے، جو ان کی کتاب ''مرکز احمدیت قادیان'' کے آخری صفحات میں طبع شدہ ہیں۔

نواب صاحب کے تاثرات:

نواب بہادر یار جنگ صاحب نے اپنے تاثرات میں لکھا کہ:

''مارچ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں لاہور مسلمانانِ ہند کا مرکز بنا ہوا تھا، ایک تو اس وجہ سے کہ وہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ اہم اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس نے ہندوستان کی سیاسیات میں ایک نئے باب کو کھولا۔ دوسرے اس لئے کہ خاکساروں کی جماعت پر حکومت پنجاب کی بے دردانہ آتش باری نے سارے ہندوستان کے

[1] روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء [2] ملاحظہ ہو کتاب ''انجمن'' (مؤلفہ فقیر سید وحید الدین مرحوم) ناشر لائن آرٹ پریس (کراچی) لمیٹیڈ فریئر روڈ کراچی طبع اول اپریل ۱۹۶۶ء۔

مسلمانوں کو آتش زیر پا کر دیا تھا۔ اجلاس مسلم لیگ کے اختتام پر میری تمام تر توجہ خاکساروں کے مسئلہ پر مرکوز تھی۔ اسی سلسلہ میں ضرورت پیش آئی کہ میں اپنے کرم فرما چوہدری سر ظفر اللہ خاں صاحب سے ملاقات کروں جو اس زمانہ میں وائسرائے کی مجلس وزراء کے اہم ترین رکن تھے۔ اس لئے ...... مارچ ۱۹۴۰ء میں چند گھنٹوں کے لئے قادیان گیا۔ جہاں چوہدری صاحب مقیم تھے گو میں نے قادیان میں چند گھنٹے بسر کئے، لیکن ان چند گھنٹوں کی یاد ابھی تک باقی ہے۔

اسٹیشن پر میرے قدیم کرم فرما مولوی عبدالرحیم صاحب نیر اور مولوی محمد اعظم صاحب نے استقبال کیا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب نیر جماعت احمدیہ قادیان کی طرف سے کئی سال تک حیدرآباد میں مقیم رہے ہیں اور ان چند اصحاب میں سے ہیں جنہوں نے مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کا سنگِ بنیاد رکھا اور سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآباد کی مشہور دکان محمد اعظم معین الدین کے مالک اور مجلس اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ کے قدیم ترین رکن اور میرے رفیق کار ہیں اور ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی رفاقت پر میں فخر کرتا ہوں۔ ان دونوں حضرات نے زوالِ آفتاب تک مجھے قادیان کی ایک ایک گلی میں گھمایا اور جماعت احمدیہ کے ایک ایک ادارہ کی سیر کرائی۔

قادیان پنجاب کے ضلع گورداسپور کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے، لیکن جماعت کا مرکز ہونے کی وجہ سے آج اس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ہر سال ماہ دسمبر میں وہاں اس جماعت کے متوصلین کا کثیر اجتماع ہوتا ہے، جس کی خصوصیت مرزا غلام احمد صاحب کے جانشین مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا خطبہ ہے۔ ان خطبات کو احمدی عقائد سے اپنے کامل اختلاف کے باوجود میں التزاما پڑھا کرتا ہوں۔ تمام ہندوستان کے احمدیوں کی نمائندگی کا، دوسرا اجتماع ہر سال ایسٹر کی تعطیلات میں ہوا کرتا ہے جس کو یہ لوگ اپنا بجٹ مشن کہتے ہیں۔ اتفاق سے میں اسی زمانہ میں قادیان پہنچا تھا اور ان نمائندوں میں سے بعض سے مجھے ملاقات کا موقع ملا۔

احمدی جماعت کو اپنی بقا و استحکام کے لئے جن شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے قدرتاً ان میں ایک مکمل تنظیم پیدا کردی ہے اور چونکہ کوئی تنظیم ایثار کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ اس لئے میں قادیان کے تمام اداروں کے تفصیلی معائنہ کے بعد یقین رکھتا ہوں کہ اس جماعت کے پیرو اپنے اندر اطاعت امیر اور ایثار کے حقیقی جذبات رکھتے ہیں۔

قادیان کا مدرسہ العلوم، عربی کی درسگاہ، دارالاقامۃ، دارالاشاعت، بین الاقوامی تبلیغ کا مرکز، نوجوان فدائیانِ احمدیت کا تنظیمی ادارہ، مہمان خانہ، میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امیر جماعت کا دفتر یہاں تک کہ قبرستان، ان میں سے ہر ایک اپنی باقاعدگی اور خوش سلیقگی کے اعتبار سے کارکنوں کی دلچسپی اور فرض شناسی کا ثبوت دے رہے تھے اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی جماعت کے تنظیمی اداروں کو نہیں بلکہ کسی حکومت کے مختلف محکمہ جات کا معائنہ کر رہا ہوں۔

...... خذ ما صفا کے اصول کے تحت میری دلی تمنا ہے کہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس چھوٹی سی جماعت کی طرح منظم اور ایک مرکز کے تحت جو اصول اسلامی کے مطابق ہے حرکت کرتا ہوا دیکھوں۔ اس وجہ سے قادیان کے سفر کو میں اپنی زندگی کے وہ لمحات سمجھتا ہوں جن میں میری نظر ہوشیار نے کچھ دیکھا اور حاصل کیا۔

لال گڑھی (جاگیر) ۲۰رشوال المکرم م ۳۱راکتوبر ۱۹۴۲ء‘‘ (۱)

تفسیر کبیر کی اہمیت نواب بہادر یار جنگ کی نظر میں

جناب سیٹھ محمد اعظم صاحب حیدرآبادی بیان کرتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاکستان کی معروف شخصیت نواب بہادر یار جنگ (جن سے سیٹھ صاحب کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور سالہا سال ان کے رفیق کار رہے ہیں) جس کمرہ میں سویا کرتے تھے اس کی ایک دیوار پر قرآن

(۱) ’’الفضل‘‘ ۱۷رنومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۳ کالم ۴۔

کریم رکھنے کے لئے انہوں نے ایک خوبصورت تختہ لگوایا تھا۔ تفسیر کبیر جلد سوم کی اشاعت پر اس کی ایک جلد نواب اکبر یار جنگ بہادر نے سیٹھ صاحب موصوف کے ذریعہ نواب بہادر یار جنگ کو بھجوائی تھی، جس کا انہوں نے بالاستیعاب مطالعہ ایک سے زیادہ مرتبہ کیا تھا اور ان کی وفات تک جو جون ۱۹۴۴ء میں واقع ہوئی وہ جلد اس تختہ پر قرآن کریم کے نسخہ کے نیچے رکھی ہوئی، سیٹھ صاحب نے دیکھی ہے۔ سیٹھ صاحب کہتے ہیں کہ نواب بہادر یار جنگ اپنی صحبتوں میں تفسیر کبیر کا اکثر ذکر کرتے تھے اور اس کی عظمت کا ہمیشہ اعتراف کرتے تھے کہ اس کے بیان کردہ معارف سے انہوں نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

حیدرآباد کی ایک تاریخی رات ایک یادگار جلسہ

’’الحمد للہ آج میری گذشتہ ایک ہفتہ کی کوشش بارآور ہوئی جس کے باعث میں روزنامہ لکھنے سے بھی قاصر رہا۔ آج بڑی شان وشوکت کے ساتھ مغرب کے بعد میرے یہاں مجلس میلاد النبی صلعم منعقد ہوئی جس میں میری دیرینہ آرزو کے مطابق اسلام کے چار مختلف فرقوں کے علماء نے اپنے اندرونی اختلافات کو قطع نظر کرکے آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے مقدس حالات زندگی بیان کئے۔ فرقہ اہل سنت کی جانب سے نواب زین یار جنگ بہادر کا وعظ ہوا۔ حضرات اہل تشیع کی طرف سے مولوی سید حسین صاحب‘ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے فلسفۂ اسلام پر تقریر کی۔ حضرت مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ اور حضرت مولوی مرتضٰی صاحب قبلہ نے گروپ مہدویہ کی جانب سے خُلق عظیم اور تکمیل دین پر اظہار خیال فرمایا۔ اور جماعت احمدیہ کے نمائندہ نواب اکبر یار جنگ بہادر نے تردید معترضین اسلام کے عنوان کے تحت عیسائیوں اور آریوں کے ان تین زبردست اور لغو اعتراضات کا نہایت عام فہم اور مدلّل جواب دیا جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔
۲۔ آنحضرت صلعم نے امت کے عام ضابطہ کے خلاف ۹ بیویاں رکھیں۔
۳۔ اسلام نے غلامی کو مٹانے کے بجائے اور ترقی دی؟

غرض جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ مجموعہ اتنا عظیم تھا کہ دیوڑھی کا دیوان خانہ دو بڑے دروازہ تک صحن بھر جانے کے بعد آنے والوں کے نشست کا انتظام مشکل ہوگیا تھا۔ تین ہزار سے زائد مجمع کا انتظام کیا گیا۔ مہاراجہ صدر آعظم بہادر اور بہت سے امراء وعہدہ داران بلدیہ بھی شریک جلسہ تھے۔ جلسہ کے مطابق عام خیال کا نچوڑ نواب زین یار جنگ کا یہ جملہ ہے کہ :

”آج کی رات ایک تاریخی رات اور آج کا جلسہ ایک تاریخی جلسہ“

آریہ سماجیوں سے مباحثہ

آریہ سماج کے جلسہ سالانہ میں جو اسلام پر سخت کلامی کی گئی اور رفع شکوک کی دعوت دی گئی تھی (مسلمانوں کو) اس کے جواب کے لئے (مکرم محترم بہادر یار جنگ نے اس کے جواب کے لئے قادیان سے ربط پیدا کیا۔ اس کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے مولانا مولوی ابوالعطاء (اللہ دتہ صاحب کو) ۱۳۳۹ف م ۱۹۳۰ء اور ۱۳۴۰ف م ۱۹۳۱ء ان دونوں سالوں میں تین دن جوابی تقاریر کروائی گئیں۔ جس میں مکرم محترم مولوی عبدالحمید صاحب امیر جماعت حیدرآباد اور مکرم مولوی بشارت احمد صاحب کا ذکر ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین ۱۹۲۷ء میں قائم کی گئی۔

ماہ اردی بہشت ۱۳۳۹ف م ۱۹۳۰ء میں

(مولوی بہادر یار جنگ صاحب کی ڈائری سوانح بہادر یار جنگ' مولفہ نذیر احمد صاحب)

سلسلہ ہائے جماعت احمدیہ کا مرکز مولوی بہادر یار جنگ کی نظر میں

مکرم بہادر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں:

مارچ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں لاہور مسلمانان ہند کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے وہاں آل انڈین مسلم لیگ کا وہ اہم اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس نے ہندوستان کی سیاست میں ایک نئے باب کو کھولا۔ دوسرے اس لئے کہ خاکساروں کی جماعت پر حکومت پنجاب کی بے دردانہ آتش باری نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو آتش زیر و پا کر دیا تھا۔ اس اجلاس مسلم لیگ کے اختتام پر میری تمام تر توجہ خاکساروں کے مسئلہ پر مرکوز تھی اسی سلسلے میں ضرورت پیش

آئی کہ میں اپنے کرم فرما چودھری سرظفر اللہ خاں سے ملاقات کروں جو اس زمانے میں وائسرائے مجلس وزرا کے اہم ترین رکن تھے اس لئے بتاریخ مارچ ۱۹۴۰ء چند گھنٹوں کے لئے قادیان گیا جہاں چودھری صاحب مقیم تھے۔ گو میں نے قادیان میں صرف چند گھنٹے بسر کئے لیکن ان چند گھنٹوں کی یاد ابھی تک باقی ہے۔

اسٹیشن پر میرے قدیم کرم فرما مولوی عبدالرحیم صاحب نیر اور سیٹھ اعظم صاحب (ابن محمد غوث صاحب) نے استقبال کیا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب نیر جماعت احمدیہ قادیان کی طرف سے کئی سال تک حیدرآباد میں مقیم رہے ہیں۔ (بطور مبلغ) اور ان چند اصحاب میں سے ہیں جنہوں نے مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کا سنگ بنیاد رکھا اور مولوی محمد اعظم صاحب' حیدرآباد کی مشہور دوکان محمد اعظم معین الدین کے مالک اور مجلس اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ کے قدیم ترین رکن اور میرے رفیق کار ہیں اور ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی رفاقت پر میں فخر کرتا ہوں۔ ان دونوں حضرات نے زوال آفتاب تک مجھے قادیان کی ایک ایک گلی میں گھمایا۔ اور جماعت احمدیہ کے ایک ایک ادارہ کی سیر کروائی۔

قادیان پنجاب کے ضلع گرداسپور کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے لیکن جماعت کا مرکز ہونے کی وجہ سے آج اس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ہر سال ماہ ڈسمبر میں وہاں اس جماعت کے متوصلین کا کثیر اجتماع ہوتا ہے جس کی خصوصیت مرزا غلام احمد صاحب کے جانشین مرزا محمود احمد صاحب کا خطبہ ہے۔ ان خطبات کو احمدی عقائد سے اپنے کامل اختلاف کے باوجود میں التزاماً پڑھا کرتا ہوں۔ ہندوستان کے احمدیوں کی نمائندگی کا دوسرا اجتماع ہر سال ایسٹر کی تعطیلات میں ہوا کرتا ہے۔ جس کو یہ لوگ اپنا بجٹ سیشن کہتے ہیں۔ اتفاق سے میں اسی زمانہ میں قادیان پہنچا تھا۔ اور ان نمائندوں میں سے بعض سے مجھے ملاقات کا موقع ملا۔

احمدی جماعت کو اپنی بقا اور استحکام کے لئے جن شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے قدرتاً ان میں ایک مکمل تنظیم پیدا کر دی ہے اور چونکہ کوئی تنظیم ایثار کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اس لئے میں **قادیان کے تمام اداروں کے تفصیلی معائنہ کے بعد یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس جماعت کے پیرو اپنے اندر اطاعت امیر (خلیفہ) اور ایثار کے حقیقی**

جذبات رکھتے ہیں۔

قادیان کا مدرسۃ العلوم' عربی کی درس گاہ' دارالاقامہ' دارالاشاعت' بین الاقوامی تبلیغ کا مرکز' نوجوان فدائیانِ تنظیمی ادارہ' مہمان خانہ' مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امیر جماعت کا دفتر' یہاں تک کہ قبرستان ان میں سے ہر ایک اپنی باقاعدگی اور خود سلیقگی کے اعتبار سے کارکنوں کی دلچسپی اور فرض شناسی کا ثبوت دے رہے تھے۔اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی جماعت کے تنظیمی اداروں کو نہیں بلکہ کسی حکومت کے مختلف محکمہ جات کا معائنہ کر رہا ہوں۔

قادیان سے نہ مجھے کوئی عقیدت ہے نہ مذہبی حیثیت سے دلچسپی۔ میں قادیانی عقائد نبوت اور مہدویت کا اتنا ہی مخالف ہوں جتنا ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہوسکتا ہے۔ لیکن (قصما صفا) کے اصول کے ماتحت میری دلی تمنا ہے کہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس چھوٹی سی جماعت کی طرح منظم اور ایک مرکز کے تحت جو اسلام کے مطابق حرکت کرتا ہوا دیکھوں۔اسی وجہ سے قادیان کے سفر کو میں اپنی زندگی کے وہ لمحات سمجھتا ہوں جن میں میری نظر ہوشیار نے دیکھا اور کچھ حاصل کیا۔ (لاگھڑی جاگیر ۲۰/شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۳۱/اکتوبر ۱۹۴۲ء)

اللہ تعالیٰ کی خاطر لبیک کہنے والے حیدرآباد، سکندرآباد یادگیر کے پانچ ہزار مجاہدین تحریک جدید

حیدرآباد دکن:

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
مکرم سیٹھ محمد اعظم صاحب (سالار جنگ بلڈنگ)	۲۵۷۹ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" عزیزہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۷۵۴ ۰ ۰	"
" سیٹھ محمد اکرم صاحب (ابن)	۲۶۳ ۰ ۰	"
" عطیہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۳۰ ۰ ۰	"
" امتہ الحکیم بیگم صاحبہ (بنت)	۲۲۵ ۰ ۰	"
" صبیحہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۲۵ ۰ ۰	"
" امینہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۲۵ ۰ ۰	"
" انیسہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۲۵ ۰ ۰	"
" محمد انور صاحب (ابن)	۲۲۵ ۰ ۰	"
" سیٹھ محمد معین الدین صاحب	۲۲۹۷ ۰ ۰	"
" محمودہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۷۲۲ ۰ ۰	"
" سیٹھ غلام محمود صاحب	۶۴۹ ۰ ۰	"
" حضرت سیٹھ محمد غوث صاحب رضی اللہ عنہ	۷۴۷۵ ۰ ۰	"
" حلیمہ بیگم صاحبہ (اہلیہ مرحومہ)	۹۴۱ ۰ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 رحیم النساء بیگم صاحبہ (اہلیہ مرحومہ)	۴۹۰ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
” حکیم محمد حسین صاحب قریشی مرحوم	۱۷۲ ۴ ۰	”
” ڈاکٹر محمد یونس صاحب	۸۲۰ ۰ ۰	”
” امۃ الحی بیگم صاحبہ	۶۱۶۹ ۰ ۰	”
2 محمد اسمٰعیل صاحب (جڑ چرلہ)	۱۱۸ ۲ ۰	”
” عبدالقادر صاحب	۸۷۸ ۱۲ ۰	”
1 شیخ محمد محبوب صاحب (رائے چوٹی)	۱۲۴ ۳ ۰	”
2 ہاجرہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۱۰۰ ۵ ۰	”
” والدہ صاحبہ مرحومہ ہاجرہ بیگم صاحبہ	۸۳ ۱۲ ۰	۱ تا ۱۶ سال
1 مولوی عبدالرحیم صاحب مرحوم	۶۱ ۴ ۰	وفات سنہ ۴۱ء
” امۃ الحفیظ بیگم اہلیہ خلیل احمد ناصر واشنگٹن	۲۱۹۲ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
1 ناصرہ خلت صاحبہ بنت خلیل احمد صاحب ناصر	۲۶۳ ۰ ۰	”
2 سیٹھ محبوب علی صاحب حال کراچی	۱۵۸۳ ۰ ۰	”
1 سلیمہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۴۲۶۶ ۰ ۰	”
2 ضیاء الدین صاحب (ابن)	۲۲۷ ۹ ۰	”
” منور احمد صاحب (ابن)	۲۲۷ ۹ ۰	”
” منصورہ بیگم صاحبہ اہلیہ عزیز حسین صاحب	۲۲۷ ۹ ۰	”
” امۃ الرشید بیگم صاحبہ اہلیہ لطیف احمد صاحب طاہر	۲۲۷ ۰ ۰	”
” منیر احمد صاحب ابن محبوب علی صاحب	۲۲۷ ۹ ۰	”
” بشریٰ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۴۳ ۱۰ ۰	”

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
2 بشیرہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۴۳ ۱۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
” مبارکہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۴۳ ۱۰ ۰	”
” زبیدہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۴۳ ۱۰ ۰	”
” رضیہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۴۳ ۱۰ ۰	”
” حکیم میر سعادت علی صاحب مرحوم	۱۳۷۴ ۶ ۰	وفات سنہ ۴۹ء
” مولوی محمد عمر صاحب مرحوم	۲۳۸ ۸ ۰	وفات سنہ ۵۰ء
” ہمشیرہ مرحومہ مولوی بہاء الدین صاحب مرحوم	۱۵۰ ۵ ۰	وفات سنہ ۵۰ء
” مرزا دلاور علی بیگ صاحب مرحوم	۱۰۹۱ ۰ ۰	وفات سنہ ۴۹ء
” اہلیہ صاحبہ	۲۷۰ ۲ ۰	وفات سنہ ۴۹ء
” حضرت مولانا عبدالحمید صاحب آزاد مرحوم	۲۷۰ ۰ ۰	وفات سنہ ۳۸ء
” خوشدامن صاحبہ مرحومہ سید بشارت احمد صاحب	۳۰ ۰ ۰	وفات سنہ ۳۵ء
” مولوی بہاء الدین خانصاحب مرحوم	۳۳۵ ۰ ۰	وفات سنہ ۳۹ء
” محمد علی صاحب مرحوم آف چنور	۱۰۱ ۲ ۰	وفات سنہ ۴۳ء
” میر احمد علی صاحب	۱۹۰۱ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
” سعیدہ بیگم صاحبہ اہلیہ مرحومہ	۲۰۹۳ ۴ ۰	”
” افتخار احمد صاحب ابن میر احمد علی صاحب	۲۶۱ ۴ ۰	”
” میر ذوالفقار علی صاحب (ابن)	۲۵۶ ۴ ۰	”
” مبارک احمد صاحب (ابن)	۲۵۶ ۴ ۰	”
” امۃ العزیز صاحبہ مرحومہ (بنت)	۲۱۱ ۴ ۰	”
” ناصرہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۵۶ ۴ ۰	”

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 محمودہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۵۶ ۴ ۰	۱ تا ۱۹سال
3 سیٹھ محمد عبداللطیف صاحب	۸۲۶ ۰ ۰	''
'' غلام احمد صاحب	۲۵۳۹ ۴ ۰	''
1 امتہ الحی صاحبہ اہلیہ	۲۷۰ ۱۳ ۰	''
2 سیٹھ حمید احمد صاحب	۵۷۸ ۰ ۰	''
'' مومن حسین صاحب	۵۹۸ ۶ ۰	''
1 سیٹھ محمد خواجہ صاحب مرحوم	۱۲۹ ۱۳ ۰	''
2 عائشہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۳۳۰ ۸ ۰	''
1 خلیل احمد صاحب (ابن)	۲۱۲ ۱۲ ۰	''
'' نورالدین صاحب مرحوم (ابن)	۲۱۹ ۱۳ ۰	''
2 احمد حسین صاحب ابن مومن حسین صاحب	۱۳۵۶ ۱۵ ۰	''
2 بشیر احمد صاحب ابن مومن حسین صاحب	۴۰۸ ۰ ۰	''
1 اکبر حسین صاحب ابن مومن حسین صاحب	۹۷۰ ۸ ۰	''
'' کمال الدین احمد صاحب ابن مومن حسین صاحب	۸۴۵ ۴ ۰	''
2 مولوی سید بشارت احمد صاحب وکیل	۱۱۶۶ ۳ ۰	''
'' امتہ العزیز بشریٰ صاحبہ (اہلیہ)	۴۳۵ ۱۴ ۰	''
'' شہزادی بیگم صاحبہ (بنت)	۲۹۵ ۵ ۰	''
'' نواب اکبر یار جنگ صاحب	۱۷۷۵۵ ۰ ۰	''
'' بیگم صاحبہ اکبر یار جنگ صاحب	۷۴۶ ۱ ۰	''
'' مولوی حیدر علی صاحب	۱۴۰۰ ۸ ۰	''

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
2 سعیدالنساء بیگم اہلیہ مولوی حیدر علی صاحب	۶۸۵ ۱ ۰	۱ تا ۱۹سال
1 امتہ السلام صاحبہ (بنت)	۱۷۷ ۱۴ ۰	''
2 سید عبدالہادی صاحب	۳۲۲ ۱۴ ۰	''
1 زاہدہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۲۰۸ ۱۳ ۰	''
'' مولوی محمد عثمان صاحب	۱۴۹ ۸ ۰	''
'' اہلیہ صاحبہ مرحومہ	۱۴۹ ۸ ۰	''
2 محمد عبداللہ صاحب بی۔ ایس۔ سی	۳۲۲ ۲ ۰	''
1 اہلیہ صاحبہ ''	۱۹۵ ۱۳ ۰	''
2 حکیم عبدالصمد صاحب	۲۱۹ ۱۱ ۰	''
'' محمد عبدالسلام صاحب	۵۶۳ ۴ ۰	''
'' محمد عبدالقادر صاحب صدیقی	۶۲۴ ۹ ۰	''
'' شرف النساء بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۶۲۰ ۱۳ ۰	''
'' امتہ القیوم صاحبہ (بنت)	۱۳۷ ۱ ۰	''
'' رضیہ بیگم صاحبہ (بنت)	۱۳۷ ۱ ۰	''
'' محمد عبدالحی صاحب (ابن)	۱۳۷ ۱ ۰	''
'' محمد عبدالماجد صاحب (ابن)	۱۳۷ ۱ ۰	''
'' سیٹھ سید جعفر علی صاحب مرحوم	۲۸۸ ۷ ۰	۱ تا ۱۶سال
'' اہلیہ صاحبہ ''	۱۵۱ ۱۵ ۰	''
1 محی الدین صاحب غوری	۲۹۲ ۴ ۰	۱ تا ۱۹سال
2 محمد امام صاحب غوری	۴۷۱ ۱۶ ۰	''

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 اہلیہ صاحبہ امام صاحب غوری	۲۱۵ ۱۲ ۰	۱ تا ۱۹سال
" والدہ صاحبہ	۱۶۵ ۸ ۰	"
" محمد اسحاق صاحب	۸۹۰ ۷ ۰	"
" قاری محمد عثمان صاحب مرحوم	۳۳۸ ۱۴ ۰	"
" فاطمہ بیگم صاحبہ اہلیہ	۱۲۰ ۱۱ ۰	"
2 سید مصطفیٰ حسین صاحب گیلانی حیدرآباد دکن	۱۰۹۳ ۸ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ	۳۲۳ ۹ ۰	"
" فرزند	۲۵۲ ۱۳ ۰	"
" ابو حامد صاحب	۱۶۴ ۸ ۰	"
" جبہتہ النساء بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۱۴۱ ۰ ۰	"
1 محمد موسیٰ خان صاحب	۱۳۰ ۱۳ ۰	"
2 عبدالرشید خان صاحب	۳۴۹ ۱۱ ۰	"
" میر احمد سعید صاحب	۱۱۷۰ ۱۴ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ	۱۳۶ ۰ ۰	"
1 میر یوسف سعید صاحب (ابن)	۱۴۸ ۱۰ ۰	"
3 غلام حسن خان صاحب	۲۸۶ ۱۴ ۰	"
2 زاہدہ بانو بیگم صاحبہ اہلیہ عبدالرحیم مرحوم	۱۴۱ ۱۵ ۰	"
" ہدایت علی صاحب	۲۴۴ ۰ ۰	"
1 ظہیر النساء صاحبہ (اہلیہ)	۲۸۷ ۰ ۰	"
" محمد عبدالحی صاحب مچھلی بندری	۱۲۵۵ ۸ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 سید منظور احمد صاحب عادل نظام آباد	۴۲۶ ۰ ۰	۱ تا ۱۹سال
2 زینب النساء صاحبہ (اہلیہ)	۳۷۸ ۷ ۰	"
" بشیر احمد خان صاحب مرحوم ملم پلی	۲۷۱ ۴ ۰	۱ تا ۱۸سال
" حکیم سید مسیح اللہ صاحب مرحوم	۱۲۲ ۶ ۰	۱ تا ۱۹سال
1 سیٹھ محمد حسین صاحب چنتہ کنٹہ	۶۲۴۶ ۰ ۰	"
2 سیٹھ محمد معین الدین صاحب	۳۹۷۵ ۰ ۰	"
" سیٹھ محمد اسماعیل صاحب	۸۷۲ ۱۲ ۰	"
" سیٹھ محمد اعظم صاحب	۸۶۸ ۰ ۰	"
" محمود احمد صاحب	۸۶۸ ۰ ۰	"
" رشید احمد صاحب	۸۸۶ ۰ ۰	"
2 حسن محمد صاحب (چنتہ کنٹہ)	۸۷۵ ۰ ۰	"
1 اہلیہ صاحبہ مرحومہ	۱۷۰ ۰ ۰	۱ تا ۱۰سال
2 خواجہ حسین صاحب	۹۱۸ ۰ ۰	۱ تا ۱۹سال
" راج محمد صاحب	۹۲۰ ۰ ۰	"
" بشیر الدین ابن سیٹھ محمد معین الدین صاحب	۳۶۱ ۰ ۰	"
" اہلیہ مرحومہ سیٹھ محمد حسین صاحب چنتہ کنٹہ	۳۸۶ ۰ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ موجودہ	۴۸۵ ۱۲ ۰	"
1 والدہ صاحبہ مرحومہ	۱۶۴ ۰ ۰	۱ تا ۱۰سال
2 اہلیہ سیٹھ محمد معین الدین صاحب	۴۰۱ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" اہلیہ عبدالرسول صاحب مرحوم	۳۰۵ ۱۲ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
2 نصیرہ بیگم صاحبہ بنت سیٹھ محمد حسین صاحب	۳۱۲ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" سارہ بیگم صاحبہ (بنت)	۳۱۲ ۰ ۰	"
1 شیخ علی صاحب ظہیرآبادی	۳۳۱ ۱۳ ۰	"
" بشیر محمد خان صاحب	۵۱۳ ۸ ۰	"
" محمد سلیمان صاحب (ورنگل)	۳۸۳ ۰ ۰	"
" سردار محمد خان صاحب	۳۵۹ ۷ ۰	"
" محمود احمد صاحب گلبرگہ	۷۰۲ ۵ ۰	"
" احمد عبدالعزیز صاحب سرسپوری	۲۰۰ ۷ ۰	"
" احمد عبدالعزیز صاحب تلاپوری	۱۸۹ ۶ ۰	"
" محمد ادریس ابن ڈاکٹر محمد یونس صاحب	۲۰۹ ۱۳ ۰	"
" سید محمد عقیل صاحب جوبلی ہال	۷۳۹ ۴ ۰	"
" عبدالرحمان صاحب مرحوم رائے چوری	۱۵ ۰ ۰	وفات سنہ ۳۷ء
2 مولوی محمد یعقوب صاحب شہید عثمان آباد	۵۵۱ ۸ ۰	شہادت سنہ ۴۸ء
1 حکیم محمد الدین صاحب افضل گنج جوبلی ہال	۵۵۱ ۸ ۰	۱ تا ۱۹ سال
2 مولوی فضل حق خان صاحب حیدرآباد دکن	۱۲۵۴ ۸ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ "	۶۸۱ ۰ ۰	"
" احمد عبداللہ صاحب مولوی فاضل	۲۸۲ ۹ ۰	"

سکندرآباد دکن:

حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کا سب کچھ جان و مال اسلام اور احمدیت کے لئے فدا ہے۔ رضاء الٰہی کے حصول کے لئے مجسم قربانی ہیں۔ آپ کا سارا خاندان بھی آپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

جماعت سکندرآباد جو ۳۶ افراد پر مشتمل ہے۔ ان کا تحریک جدید کے مالی جہاد میں حصہ ۱۰۴۹۱۱ روپے ہے۔ قریباً ہر ایک نے ہرسال اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ انہیں اخلاص میں اور ترقی دے اور ان کے نفوس اور اموال میں برکت ڈالے۔ آمین

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب امیر جماعت	۶۲۰۶۵ ۰ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۴۵۹۲ ۹ ۰	"
" سیٹھ یوسف احمد الہ دین صاحب سیکرٹری مال	۱۶۳۷ ۰ ۰	"
" سیٹھ علی محمد الہ دین صاحب ایم۔اے	۳۰۶۷ ۰ ۰	"
" محترمہ فیض النساء بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۱۴۷۹ ۰ ۰	"
" صالح محمد صاحب بی۔ایس۔سی (ابن)	۲۵۱ ۱۲ ۰	"
" راشد محمد صاحب	۱۵۱ ۱۲ ۰	"
" سیٹھ فاضل الہ دین صاحب	۳۰۶۷ ۰ ۰	"
" فاطمہ بائی صاحبہ	۱۷۱۲ ۰ ۰	"
" محمد صالح صاحب (ابن)	۲۵۹ ۱۲ ۰	"
" محمود احمد صاحب (ابن)	۲۵۳ ۱۲ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 مبارکہ بیگم صاحبہ (بنت)	۲۵۳ ۱۲ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" ہاجرہ بیگم اہلیہ رشید الدین احمد خانصاحب	۶۰۸ ۰ ۰	"
" خان بہادر احمد نواز جنگ بہادر صاحب	۱۱۸۶۲ ۸ ۰	"
" سیٹھ جی۔ ایم۔ ابراھیم صاحب مرحوم	۳۴۵ ۰ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ "	۲۰۳۲ ۸ ۰	"
شہر بانو صاحبہ مرحومہ (بنت)	۱۳۳۸ ۰ ۰	"
2 عبدالصمد صاحب چرچرٹہ مالک بسم اللہ ہوٹل	۵۲۳ ۲ ۰	"
" سید حسین صاحب کاچی گوڑہ	۶۳۸ ۱۰ ۰	"
" حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی کبیرؓ	۳۱۵۵ ۰ ۰	"
" اہلیہ صاحبہ	۲۲۱ ۱۵ ۰	"
" شیخ داؤد احمد صاحب (ابن)	۱۰۰ ۱۰ ۰	"
" غلام قادر صاحب شو	۱۲۴۰ ۱۳ ۰	"
1 سارہ بیگم صاحبہ مرحومہ (اہلیہ)	۶۴۷ ۶ ۰	"
" جی۔ نذیر احمد صاحب (ابن)	۶۴۷ ۶ ۰	"
" سیٹھ غلام حسین کرم علی ماڑپلی	۳۵۴ ۰ ۰	"
2 سیٹھ فاضل کرم علی صاحب سید علی گوڑہ	۴۰۹ ۱۵ ۰	"
" لیلےٰ بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۱۱۱ ۱۲ ۰	"
3 مسیح الدین احمد صاحب	۱۶۶ ۰ ۰	"
" بشیر الدین احمد صاحب	۲۵ ۰ ۰	"
" غلام دستگیر صاحب مرحوم (فلک نما)	۲۸۸ ۱۲ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
3 محمد عبدالغفور صاحب مرحوم کتب فروش	۴۴۵ ۲ ۰	۱ تا ۱۹ سال
1 مولوی مبارک علی صاحب	۲۵ ۲ ۰	۱ تا ۵ سال
" عبدالرحمان صاحب مرحوم مدراسی	۵۳ ۰ ۰	۱ تا ۱۰ سال
" دیندار عبدالرحمان صاحب مرحوم	۱۱۶ ۰ ۰	وفات سنہ ۴۰ء
" محمد یٰسین شریف صاحب	۱۵۱ ۴ ۰	"
یادگیر		
1 سیٹھ محمد عبدالحی صاحب امیر جماعت یادگیر	۶۴۰۷ ۱۲ ۰	۱ تا ۱۹ سال
" فاطمہ بیگم صاحبہ اہلیہ	۴۹۴ ۷ ۰	"
1 حضرت سیٹھ شیخ حسن صاحبؓ	۴۱۸۶ ۸ ۰	"
" محترمہ رسول بی بی صاحبہ (اہلیہ)	۵۳۶ ۱۵ ۰	"
" خواجہ بیگم صاحبہ (اہلیہ ثانیہ)	۴۱۲ ۱ ۰	"
" پیرساں بی بی صاحبہ مرحومہ (اہلیہ)	۵۲ ۱۳ ۰	۱ تا ۱۰ سال
مولوی محمد اسماعیل صاحب مولوی فاضل وکیل	۲۴۹۱ ۸ ۰	۱ تا ۱۹ سال
امتہ الحی بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۵۴۸ ۷ ۰	"
محمد اسماعیل صاحب غوری	۳۶۹ ۵ ۰	"
احمدی بیگم صاحبہ (اہلیہ)	۱۸۹ ۲ ۰	"
منشی پیر محمد صاحب لاڑچی	۳۲۲ ۰ ۰	"
عبدالرحیم صاحب احمدی	۲۰۳ ۱۰ ۰	"
عبدالغفار صاحب تیرگر	۱۴۹ ۱۲ ۰	"

اسماء مجاہدین	میزان رقوم	کیفیت
1 مولوی عبد حسین صاحب انعامدار وکیل	۰ ۱۵ ۱۷۷	۱ تا ۱۹ سال
" غلام حسین صاحب ھوڈری	۰ ۱۵ ۳٦۴	"
" محمودہ بیگم صاحبہ اہلیہ اکبر حسین صاحب	۰ ۴ ۳۲۸	"
" غلام دستگیر صاحب مرحوم	۰ ۴ ۲۰	وفات ۱ تا ۴ سال
" عبدالرحمان صاحب مرحوم آف بمبئی	۰ ۰ ۵	وفات سنہ ۳٦ء

جغرافیہ مملکت آصفیہ حیدرآباد (دکن)

سطح مرتفع دکن جو برصغیر ہندوستان کے تقریباً نصف حصے پر مشتمل ہے۔ کوہِ ست پڑا سے جزیرہ نما ہند کے انتہائی جنوبی سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بذاتِ خود ایک جداگانہ وحدت ہے۔ اس کو ہندوستان کے ماقبی حصوں سے طبعی حالات، نباتات، حیوانات آب وہوا باشندوں کے نسلی اور ثقافتی خصوصیات ، زبانوں اور دیگر امور میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ کہ سطح مرتفع دکن کے شمال مغربی حصہ کو شمالی سطح مرتفع یعنی مالوے کے پلیٹو سے قدیم چٹانوں کی ساخت کے اعتبار سے جو لاوا سے ڈھکی ہوئی ہیں، ایک حدتک مطابقت ہے، لیکن زمین کے ڈھلان کے لحاظ سے وہ اس سے بالکل ہی مختلف ہے۔ شمال میں ڈھلان مغرب کی جانب سے لمبی اور تنگ وادیوں میں پائی جاتی ہے تو دکن میں وہ کشادہ اور مسطح میدانوں کی شکل میں مشرقی جانب چلی گئی ہے۔

سطح سمندر سے اوسطاً ۱۲۵۰ فٹ بلند ریاست حیدرآباد ایک وسیع سطح مرتفع پر واقع تھی ، جس پر کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ایسی بھی ملتی ہیں جن کی بلندی ۳ ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ ریاست میں زمین کی ڈھلان بالعموم شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف ہے جو نیچے آتے آتے مشرقی گھاٹ کے پیچھے تقریباً ایک ہموار میدان میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

تمام دریا بھی عام طور پر اسی رخ پر بہتے ہیں۔ صحیح معنوں میں ریاست میں کوئی پہاڑ نہیں ہے، بلکہ ساری پہاڑیاں ہی ہیں۔ اس ریاست میں پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی اورنگ آباد کے شمالی مغربی حصے میں سر پاناتھ ہے، جس کی اونچائی ۲۱۴۴ فٹ ہے اور اس مملکت میں سب سے زیادہ نشیبی حصہ دریائے گوداوری کے مغربی کنارے پر بھدراچلم کے آس پاس واقع ہے، جو سطح سمندر سے صرف ۱۵۷ فٹ بلند ہے۔

خاص دریا شمال میں گوداوری اور جنوب میں کرشنا اور تنگبھدرا ہیں۔ اس وسیع مملکت کا

بڑا حصہ دو دریاؤں، کرشنا اور گوداوری سے سیراب ہوتا ہے۔ ان دریاؤں نے بھی اپنے معاونین کے ساتھ اس سطح مرتفع کو تراش خراش کر کے اِسے ایک ہموار میدان کی شکل دے دی ہے۔ چنانچہ ان سے ملحقہ چوڑی چوڑی کھلی ہوئی اور مکمل طور پر گھسی پٹی وادیاں ہر طرف نظر آتی ہیں اور ان میں قدرے بلند پہاڑوں کے سلسلے اب بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں سنگ خارہ سے ٹوٹے ہوئے مختلف سائز کے سنگریزوں کے ڈھیر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مملکت حیدرآباد سے بہت سے پہاڑی سلسلے گذرتے ہیں، جن کی چوٹیاں بالکل مسطح ہیں اور بعض مقامات پر تو سیڑھیوں کے سلسلے کی طرح نظر آتے ہیں اور بعض جگہ ان کا اتار بالکل ڈھلوان تختے کی طرح ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے مغربی گھاٹ کی شاخیں یا توسیعی حصے ہیں، جن میں سہیادری پربت اور سلسلہ بالا گھاٹ بہت اہم ہیں، مگر یہ مشرقی جانب بہت کم اونچے ہیں جو رفتہ رفتہ مسطح چوٹیوں کی پہاڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

محل وقوع اور رقبہ:

سابق برطانوی ہند میں حیدرآباد اپنے رقبے کی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان کی تمام ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست تھی اور اس کا محل وقوع جزیرہ نمائے ہند کے عین وسط میں تھا۔ اس کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل تھا، جو ممبئی اور مدھیہ پردیش سے تو کم تھا، لیکن بہار اور آندھرا پردیش سے بہت بڑا تھا۔ یہ مملکت رقبہ میں فرانس کے مساوی اور سوئٹزرلینڈ کی خودمختار ریاست سے پانچ گنا زیادہ تھی اور آبادی میں مصر، عراق، ایران اور افغانستان سے بڑھ کر تھی۔

یہ مملکت ۱۵ درجہ ۱۰ دقیقہ اور ۲۱ درجہ ۵۰ دقیقہ عرض البلد شمال کے درمیان واقع تھی اور اس کا طول بلد ۷۴ درجہ ۴۰ دقیقہ سے ۸۱ درجہ ۲۵ دقیقہ شرقی تک تھا۔ یہ مکمل طور پر منطقہ حارہ میں واقع تھی اور اس کے مشرقی و مغربی کناروں کے درمیان وقت کا فرق نصف گھنٹہ سے کچھ کم تھا۔

یہ مملکت تقریباً پنج گوشہ شکل کی تھی، جس کا سب سے چھوٹا خط شمال مغرب میں اورنگ آباد کے قریب تھا۔ اس کے شمال میں دریائے گوداوری بہتا تھا جس کے معاونین پین گنگا اور

واردھا ہیں۔ دوسری جانب جنوب میں دریائے کرشنا رواں دواں تھا، جس کا اہم معاون تنگبھدرا اسی علاقے میں بہتا ہے۔ مملکت حیدرآباد چاروں طرف سے مکمل طور پر خشکی سے گھری ہوئی تھی۔ کسی طرف بھی سمندر سے اس کا فاصلہ ۶۰ میل سے کم نہیں تھا۔ مملکت کا انتہائی مشرقی نقطہ جو دریائے گوداوری پر تھا کوکناڈا سے ۶۲ میل دور تھا اور واڑی بجواڑہ ریلوے لائن پر سرحدی مقام پر پروپالم، خلیج بنگال کی چھوٹی سی بندرگاہ مسولی پٹم (مچھلی بندر) سے ۶۵ میل دور تھا۔ دریائے کرشنا پر جو گاؤں آباد ہیں، ان میں قریب ترین گاؤں کا فاصلہ مدراس سے (۲۴۰) میل ہے۔ اس مملکت کے مغربی حصے سے بحرۂ عرب تو اور بھی زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، البتہ انتہائی مغربی نقطہ سے ممبئی کا فاصلہ ۱۴۰ میل ہے۔ اور ساحل کونکن پر واقع رتن گیری دریائے بھیما پر واقع افضل پور سے ۲۰۵ میل دور ہے۔ مملکت حیدرآباد کا طول مشرق سے مغرب یعنی ورنگل سے رائچور تک ۲۵۰ میل اور عرض شمال سے جنوب یعنی اورنگ آباد سے رائچور تک ۳۸۰ میل تھا اور اس کا سب سے طویل فاصلہ شمال مغرب سے شمال مشرق کی سمت میں ۲۸۰ میل تھا۔

مملکت حیدرآباد مرکزی محل وقوع کی حیثیت سے اہم تھا، کیوں کہ ایک طرف شمال میں دہلی اور انتہائی جنوب میں ٹریونڈرم کے درمیان تمام ریلوے لائن اور ہوائی راستے اسی مملکت میں سے ہو کر گذرتے ہیں اور دوسری طرف ممبئی اور مدراس کے درمیان کی بھی ہر قسم کی آمد و رفت اسی مملکت میں سے گذرتی ہے۔

حدودِ اربعہ:

مملکت حیدرآباد کے شمال میں برار، صوبہ متوسط اور صوبہ ممبئی کے اضلاع خاندیس واقع تھے۔ مشرق میں دریائے واردھا اور گوداوری مملکت کو صوبہ متوسط کے اضلاع اور صوبہ مدراس کے گوداوری اضلاع سے جدا کرتے تھے، جنوب میں دریائے کرشنا اور تنگبھدرا مملکت کی جنوبی سرحد بناتے ہوئے اس کو صوبہ مدراس کے گنٹور، کرنول، بلاری اور کرشنا کے اضلاع سے الگ کرتے تھے۔ اس کی مغربی سرحد مصنوعی نوعیت کی تھی، جو اس کو صوبہ ممبئی کے اضلاع احمد نگر، شولاپور، بیجاپور اور دھارواڑ کی حدود سے الگ کرتی تھی۔

بڑا حصہ دو دریاؤں، کرشنا اور گوداوری سے سیراب ہوتا ہے۔ ان دریاؤں نے بھی اپنے معاونین کے ساتھ اس سطح مرتفع کو تراش خراش کر کے اِسے ایک ہموار میدان کی شکل دے دی ہے۔ چنانچہ ان سے ملحقہ چوڑی چوڑی کھلی ہوئی اور مکمل طور پر گھسی پٹی وادیاں ہر طرف نظر آتی ہیں اور ان میں قدرے بلند پہاڑوں کے سلسلے اب بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں سنگ خارہ سے ٹوٹے ہوئے مختلف سائز کے سنگریزوں کے ڈھیر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مملکت حیدرآباد سے بہت سے پہاڑی سلسلے گذرتے ہیں، جن کی چوٹیاں بالکل مسطح ہیں اور بعض مقامات پر تو سیڑھیوں کے سلسلے کی طرح نظر آتے ہیں اور بعض جگہ ان کا اتار بالکل ڈھلوان تختے کی طرح ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے مغربی گھاٹ کی شاخیں یا توسیعی حصے ہیں، جن میں سہیادری پربت اور سلسلہ بالاگھاٹ بہت اہم ہیں، مگر یہ مشرقی جانب بہت کم اونچے ہیں جو رفتہ رفتہ مسطح چوٹیوں کی پہاڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

محل وقوع اور رقبہ:

سابق برطانوی ہند میں حیدرآباد اپنے رقبے کی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان کی تمام ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست تھی اور اس کا محل وقوع جزیرہ نمائے ہند کے عین وسط میں تھا۔ اس کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل تھا، جو ممبئی اور مدھیہ پردیش سے تو کم تھا، لیکن بہار اور آندھرا پردیش سے بہت بڑا تھا۔ یہ مملکت رقبہ میں فرانس کے مساوی اور سوئٹزرلینڈ کی خودمختار ریاست سے پانچ گنا زیادہ تھی اور آبادی میں مصر، عراق، ایران اور افغانستان سے بڑھ کر تھی۔

یہ مملکت ۱۵ درجہ ۱۰ دقیقہ اور ۲۱ درجہ ۵۰ دقیقہ عرض البلد شمال کے درمیان واقع تھی اور اس کا طول بلد ۷۴ درجہ ۴۰ دقیقہ سے ۸۱ درجہ ۲۵ دقیقہ شرقی تک تھا۔ یہ مکمل طور پر منطقہ حارہ میں واقع تھی اور اس کے مشرقی و مغربی کناروں کے درمیان وقت کا فرق نصف گھنٹہ سے کچھ کم تھا۔

یہ مملکت تقریباً پنج گوشہ شکل کی تھی، جس کا سب سے چھوٹا خط شمال مغرب میں اورنگ آباد کے قریب تھا۔ اس کے شمال میں دریائے گوداوری بہتا تھا جس کے معاونین پین گنگا اور

واردھا ہیں۔ دوسری جانب جنوب میں دریائے کرشنا رواں دواں تھا، جس کا اہم معاون تنگبھدرا اسی علاقے میں بہتا ہے۔ مملکت حیدرآباد چاروں طرف سے مکمل طور پر خشکی سے گھری ہوئی تھی۔ کسی طرف بھی سمندر سے اس کا فاصلہ ۶۰ میل سے کم نہیں تھا۔ مملکت کا انتہائی مشرقی نقطہ جو دریائے گوداوری پر تھا کوکناڈا سے ۶۲ میل دور تھا اور واڑی بجواڑہ ریلوے لائن پر سرحدی مقام پروپالم، خلیج بنگال کی چھوٹی سی بندرگاہ مسولی پٹم (مچھلی بندر) سے ۶۵ میل دور تھا۔ دریائے کرشنا پر جو گاؤں آباد ہیں، ان میں قریب ترین گاؤں کا فاصلہ مدراس سے (۲۴۰) میل ہے۔ اس مملکت کے مغربی حصے سے بحرۂ عرب تو اور بھی زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، البتہ انتہائی مغربی نقطہ سے ممبئی کا فاصلہ ۱۴۰ میل ہے۔ اور ساحل کونکن پر واقع رتن گیری دریائے بھیما پر واقع افضل پور سے ۲۰۵ میل دور ہے۔ مملکت حیدرآباد کا طول مشرق سے مغرب یعنی ورنگل سے رائچور تک ۲۵۰ میل اور عرض شمال سے جنوب یعنی اورنگ آباد سے رائچور تک ۳۸۰ میل تھا اور اس کا سب سے طویل فاصلہ شمال مغرب سے شمال مشرق کی سمت میں ۲۸۰ میل تھا۔

مملکت حیدرآباد مرکزی محل وقوع کی حیثیت سے اہم تھا، کیوں کہ ایک طرف شمال میں دہلی اور انتہائی جنوب میں ٹریونڈرم کے درمیان تمام ریلوے لائن اور ہوائی راستے اسی مملکت میں سے ہو کر گذرتے ہیں اور دوسری طرف ممبئی اور مدراس کے درمیان کی بھی ہر قسم کی آمد و رفت اسی مملکت میں سے گذرتی ہے۔

حدودِ اربعہ:

مملکت حیدرآباد کے شمال میں برار، صوبہ متوسط اور صوبہ ممبئی کے اضلاع خاندیس واقع تھے۔ مشرق میں دریائے واردھا اور گوداوری مملکت کو صوبہ متوسط کے اضلاع اور صوبہ مدراس کے گوداوری اضلاع سے جدا کرتے تھے، جنوب میں دریائے کرشنا اور تنگبھدرا مملکت کی جنوبی سرحد بناتے ہوئے اس کو صوبہ مدراس کے گنٹور، کرنول، بلاری اور کرشنا کے اضلاع سے الگ کرتے تھے۔ اس کی مغربی سرحد مصنوعی نوعیت کی تھی، جو اس کو صوبہ ممبئی کے اضلاع احمد نگر، شولاپور، بیجاپور اور دھارواڑ کی حدود سے الگ کرتی تھی۔

قدرتی تقسیم:

سطح زمین کے ڈھلان اور دریاؤں کے بہاؤ کے لحاظ سے اس مملکت کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) گوداوری اور کرشنا کا طاس۔ (۲) گولکنڈہ کے آبی خط تقسیم پر واقع پہاڑ اور کرشنا اور گوداوری کے طاس کے شمال اور جنوب میں واقع پہاڑی علاقے۔

گولکنڈہ کا خط تقسیم آب جنوبی بالاگھاٹ کے نیم دائروں کی شکل کے سلسلے کے ساتھ ساتھ ہے اور ضلع بیڑ سے کھمم میٹھ تک شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک مرتفع زمین کا علاقہ ہے جس کی بلندی کہیں کہیں ۲۴۰۰ فٹ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ اصل خط تقسیم آباد ہے جو کرشنا اور گوداوری کے طاسوں کو بھی تقسیم کرتا ہے۔

دکن اسلامی سلطنت کے قیام کا پس منظر:

۱۔ علاؤالدین (خلجی) نے اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے فضا ہموار کی۔

۲۔ علاؤالدین (حسن گنگو بہمنی) نے اسلامی خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔

خلجی خاندان کا بانی جلال الدین فیروز شاہ ۱۲۹۰ء میں تخت پر بیٹھا، اس نے اپنے داماد علاؤ الدین خلجی کو ۱۲۹۲ء میں کڑہ کا گورنر بنایا تھا۔ مہاراشٹرا کے یادو راجاؤں کی راجدھانی دیوگڑھی کی بے شمار دولت کے عجیب وغریب قصے سن سن کر علاؤ الدین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اس کو فتح کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔ بالآخر فوج میں مزید بھرتی کے بہانے اپنے چچا سے چندیری کی طرف پیش قدمی کرنے کی اجازت طلب کی، لیکن چپکے ہی چپکے دہلی سے سات سو میل جنوب کی جانب دیوگری کی طرف چلتا بنا۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس وقت تک کوئی مسلمان فاتح دکن کے علاقے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ علاؤ الدین خلجی پہلا شخص ہے جس نے دہلی سے دور دراز فاصلہ پر واقع دکن کی تسخیر کا ارادہ کیا اور وندھیاچل کے دشوار گذار جنگلوں اور خطرناک دروں سے گذرتا ہوا دو ماہ کے اندر دیوگری پہنچ گیا۔ وہاں کا راجہ رام

دیو اس اچانک یورش سے حیران ہو گیا۔ علاؤ الدین کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر راجہ کو سر اطاعت خم کرتے ہی بنی۔ بے شمار زر و جواہر و اجناس و نفائس علاؤ الدین کے ہاتھ آئے۔ نذرانہ و پیش کش وہاں غنیمت کے طور پر چھ من سونا، ایک ہزار من چاندی، سات من موتی، دو من جواہرات اور ریشم کے چار ہزار تھان ملے۔ خوش بختی و خوش اتفاقی دیکھئے کہ صوبہ برار بھی مل گیا۔ مزید برآں راجہ رام چندر دیو نے ایلچ پور کا مالیہ علاؤ الدین کو ہر سال پابندی سے ادا کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

علاؤ الدین ۲ جون ۱۲۹۴ء کو کڑہ واپس گیا۔ مال غنیمت کی اتنی بہتات جلال الدین فیروز شاہ خلجی اور اس کی سلطنت کے لیے خطرہ کا باعث سمجھی گئی، کیوں کہ اس دولت سے علاؤ الدین بہت بڑی فوج تیار کر سکتا تھا۔ سلطان نے اپنے بھتیجے کو دہلی طلب کیا، مگر اس نے خود سلطان کو کڑہ آنے پر راضی کر لیا۔ سلطان بھتیجے کے جھانسے میں آ گیا۔ اپنے انجام سے بے خبر کڑہ پہنچ کر کشتی سے قدم باہر رکھا ہی تھا کہ بھتیجے کی بجائے ملک الموت نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ سلطان قتل کر دیا گیا۔ اس طرح علاؤ الدین نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دکن میں ایک علاؤ الدین (خلجی) نے اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے فضا ہموار کی اور دوسرے علاؤ الدین (حسن گنگو بہمنی) نے آزاد خود مختار اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

دکن میں خود مختار سلطنت بہمنیہ کا قیام

گلبرگہ، دکن میں مسلم اقتدار کا نقشِ اول ہے:

جنوبی ہند میں مسلم خود مختار سلطنت کی ابتدا اسی وقت ہو چکی تھی جب کہ شمالی ہند میں خاندانِ تغلق حکمرانی کر رہا تھا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں دارالخلافہ دہلی سے جو حاکم فوج کشی کے ارادے سے گلبرگہ آیا تھا اسے ظفر خان نامی افغان سردار نے شکست فاش دی۔ پھر کسی اور کو مدمقابل نہ پا کر سلطنت دکن کی بنیاد رکھی اور پایہ تخت گلبرگہ کو قرار دے کر اس کا نام حسن آباد رکھا

(اس طرح گلبرگہ، دکن میں مسلم اقتدار کا نقش اول ہے) اور خود اپنا لقب بھی اپنے پرانے آقا بہمن گانگو کی مناسبت سے علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی اختیار کیا۔ بہمنی سلطنت حسن بہمنی سے کلیم اللہ بہمنی تک ۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء سے ۹۳۶ھ م ۱۵۲۹ء تک قائم رہی۔ سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ پر دکن میں پانچ علیحدہ خودمختار سلطنتیں قائم ہوگئیں۔

پانچ خودمختار سلطنتیں:

اول: عماد شاہی	دارالحکومت برار	۸۹۵ تا ۹۹۸ھ م ۱۴۸۴ء تا ۱۵۸۲ء
دوم: برید شاہی	دارالحکومت بیدر	۹۳۶ تا ۱۰۱۸ھ م ۱۴۹۲ء تا ۱۶۰۹ء
سوم: نظام شاہی	دارالحکومت احمد نگر	۹۲۴ تا ۱۰۴۳ھ م ۱۴۹۰ تا ۱۵۹۵ء
چہارم: عادل شاہی	دارالحکومت بیجاپور	۸۹۶ تا ۱۰۹۷ھ م ۱۴۸۹ تا ۱۶۸۶ء
پنجم: قطب شاہی	دارالحکومت گولکنڈہ	۹۱۸ تا ۱۰۹۸ھ م ۱۵۱۲ تا ۱۶۸۷ء

قطب شاہی سلاطین

(۱) سلطان قلی قطب شاہ:

کون جانتا تھا کہ موضع سعد آباد ہمدان میں ۸۶۰ھ م ۱۴۵۵ء پیدا ہونے والا لڑکا قطب شاہی سلطنت کا بانی کہلائے گا۔ سلطان قلی کے باپ کا نام اویس قلی ہے۔ بائیس سال کی عمر میں اپنے چچا قلی بیگ کے ساتھ سوداگری کے ارادے سے بیدر آیا، پھر امراء کے توسط سے سلطان محمود بہمنی کے پاس داخل ہوکر پرورش و تربیت پانے لگا۔ بالآخر وصولی پیش کش قلعہ گولکنڈہ پر مامور ہوکر تلنگ کا ناظم بنا اور قطب الملک خطاب پایا۔ پھر کچھ مدت بعد قلعہ گولکنڈہ کا کمانڈر مقرر ہوا۔ سلطنت بہمنیہ کمزور ہوگئی تو بادشاہ سے انحراف کر کے ۹۱۸ھ م ۱۵۱۲ء میں سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے خودمختار بادشاہ بن بیٹھا اور قلعہ گولکنڈہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا، لیکن بادشاہ کی زندگی تک اس کی ویسی ہی عزت کرتا رہا۔ گولکنڈہ سے دریائے شور شرقی تک ستر قلعے اپنے قبضے و تصرف میں

لایا۔ تمام تلنگانہ کو فتح کرلیا اور وہاں کے راجہ ہریش چند کو قید کرلیا۔ لیکن قسمت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ اس قدر جری اور بہادر بادشاہ کا خاتمہ بڑا ہی عبرتناک ہوا۔ اس کے فرزند جمشید قلی نے بہ آرزوئے سلطنت و حکمرانی میر محمود ہمدانی کوتوال کو باپ کے قتل پر آمادہ کیا۔ اس نے ایک روز قابو پا کر پادشاہ کو بحالت نماز عصر تین بھرپور وار ایسے کیے کہ جس سے اس کی روح پرواز کرگئی۔ یہ بادشاہ ۳۲ سال حکومت کیا اور ۹۰ سال زندہ رہا۔ سلطان قلی نیک مزاج، جفاکش اور شجاع گزرا ہے۔ مدتِ سلطنت ۳۲ سال از ۹۱۸ھ م ۱۵۱۲ء تا ۹۵۰ھ م ۱۵۴۳ء

(۲) جمشید قطب شاہ:

مدت سلطنت ۷ سال از ۹۵۰ھ م ۱۵۴۳ء تا ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء

(۳) ابراھیم قطب شاہ:

یہ سلطان قلی قطب شاہ کا چھٹا فرزند تھا۔ اس بادشاہ کے عہد میں تالاب ابراھیم پٹن، تالاب حسین ساگر (۳) کتوہ بدویل، کتوہ کنکوٹ، سنگین حصار قلعہ گولکنڈہ، کالا چبوترہ، پل قدیم (جس کی تاریخ تعمیر صراط مستقیم ہے) تعمیر ہوئے۔ اسی بادشاہ کے وقت ایک پہاڑ کوہ مولا علی کے نام سے مشہور ہوا۔ نعل صاحب کا علم بھی اسی بادشاہ کے عہد میں بیجاپور سے لایا گیا۔ ابراھیم قطب شاہ بہادر، جری، عادل اور رحم دل حکمراں تھا۔ خود بہ نفس نفیس عدالت میں بیٹھ کر انصاف کرتا تھا۔ دربار میں علماء، فضلاء، شعراء، حکماء اور اہل کمال کا مجمع رہتا تھا۔

مدت سلطنت اکتیس سال از ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء تا ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء

(۴) محمد قلی قطب شاہ:

یہ بادشاہ خاندان قطب شاہیہ ہی میں نہیں بلکہ دکن کے قدیم بادشاہوں میں اولوالعزم فرماں روا گذرا ہے۔ اس کا عہد حکومت جنگ و جدال سے بھرا ہوا ہے۔ مشہور ہے کہ دربار میں جو امراء صبح کے وقت حاضر ہوتے تھے وہ سامان سفر سے تیار ہوکر آتے تھے کہ حکم ہوتے ہی نقارہ پر چوٹ ماریں اور کوچ کریں۔

اسی بادشاہ کا یادگار شہر حیدر آباد ہے، اس کے آباد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بھاگ متی طوائف جو اس کی محبوبہ تھی ، اس کا خیال تھا' حکم دیا کہ قلعہ گولکنڈہ جاہ وحشمت کے شایان شان نہیں ہے اور آبادی بکثرت ہوگئی ہے۔ ندی کے پار شہر کی بنیاد ڈالی جائے۔ لہٰذا شہر کی داغ بیل ڈالی گئی اور آبادی شہر چار راستوں اور چار بازاروں پر قرار پائی۔ جس میں چار طاق (کمان) چودہ ہزار دکانیں، بارہ ہزار محلے بنائے گئے ، ان تعمیرات کی تیاری میں دو کروڑ روپے صرف ہوئے۔

وسط شہر میں چار کمانیں رفیع الشان اور ہر کمان کے محاذی راستہ کشادہ ترتیب دیا گیا۔
راستہ شمال کی طرف ایک بڑا دار الشفا اور اس کے پہلو میں' حمام' شمال ومغرب کی طرف خاص محل شاہی پرتکلف اور چار کمان کے مابین ایک حوض بنایا گیا، جس کا نام حوض چار سو مشہور تھا۔ کمان شرقی پر نقار خانہ، کمان غربی پر دروازہ خاص محل شاہی کا تھا جس میں صندل کی لکڑی اور سونے کی میخیں نصب تھیں۔

کمان جنوب کے متصل جامع مسجد، حمام، ندی کے کنارے ندی محل، بنی باغ آخری چہارشنبہ کے جلسہ کے لیے بنایا گیا۔ شہر میں جب وبا کا زور ہوا، تو اس کے دفع کرنے کے لیے دولت خانہ کے قریب ۱۰۰۳ھ م ۱۵۹۴ء میں ساٹھ ہزار روپے کے خرچ سے امام باڑہ بنایا گیا، جو اب بادشاہی عاشور خانہ کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متصل ایک مسجد بھی موسوم بہ موتی مسجد بنائی گئی۔ چندن محل، رنگین محل، داد محل (مقام عدالت)، عمارت کوہ طور، محمدی محل، حیدری محل، حسنی حسینی محل، جعفری محل، اسی بادشاہ کے بنوائے ہوئے ہیں۔ ابتداء میں اس شہر کا نام بھاگ نگر مشہور ہوا۔ بعد میں بھاگ متی کا لقب حیدر محل ہوا تو بھاگ نگر کا نام بھی حیدر آباد ہو گیا۔
محمد قلی قطب شاہ کی خواہش تھی کہ اس شہر کو مشہد مقدس کی طرز پر تعمیر کروائے۔ اس نے بجائے روضۂ مقدس حضرت امام ضامن کے چار مینار تعمیر کرایا (پہلے اس جگہ دفع وبا کے لیے ایک تعزیہ رکھا گیا تھا) چار مینار کی تیاری میں دو لاکھ ہن خرچ ہوئے۔
تیار چار مینار کی تاریخ ''یا حافظ'' ۱۰۰۰ھ م ۱۵۹۱ء اور تاریخ اختتام تعمیر حیدر آباد ''فرخندہ بنیاد'' ۱۰۰۶ھ م ۱۵۹۷ء ہے۔ سات سال کے عرصے میں اس شہر کی تعمیر ختم ہوئی۔
محمد قلی قطب شاہ کی محل خاص '' حیات بخشی بیگم صاحبہ'' نے کئی مسجدیں بنوائیں اور

تالاب حیات ماں صاحبہ تعمیر کروایا (جو تالاب ماں صاحب کے نام سے مشہور ہوا) یادگار ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، اس لیے اپنے حقیقی بھائی محمد امین کے بیٹے سلطان محمد کو اپنا بیٹا بنا کر رکھا، اپنی اکلوتی لڑکی کا عقد بھی سلطان محمد سے کر کے اسی کو اپنا ولیعہد نامزد کر دیا تھا۔
سلطان محمد قطبی قطب شاہ ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس نے ۳۲ سال نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکمرانی کی۔ اہل کمال کی قدردانی میں وہ کسی طرح اپنے اجداد سے کم نہ تھا۔
مدت سلطنت ۳۲ سال ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء۔

(۵) سلطان محمد قطب شاہ:

اپنے چچا کے انتقال کے بعد ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء تخت پر بیٹھا۔ ہم عصر سلطنتوں کے ایلچی چچا کی تعزیت کو آئے ، یہاں تک کہ ابوالفتح شاہ عباس صفوی نے بھی تحفے دے کر اپنا ایلچی بھیجا۔ سلطان محمد نے صلح جو طبیعت پائی تھی، متقی و پرہیزگار تھا۔ اس کی تعمیر کردہ عمارتوں میں مکہ مسجد، عیدگاہ قدیم، الٰہی محل اور باغ محمدی مشہور ہیں۔ الٰہی محل اس نے ۱۰۲۱ھ م ۱۶۱۲ء میں اپنی عدالت کے لیے بنوایا تھا۔
اس بادشاہ کی مشہور یادگار مکہ مسجد ہے جو تینس ہزار ہن کے صرفہ سے تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ نے سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر حاضر علماء وفضلا کی جانب متوجہ ہو کر کہا کہ جس شخص کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو وہ آگے آئے اور مسجد کا سنگ بنیاد رکھے۔ جب کوئی بھی آگے نہ آیا تو سلطان نے یہ کہہ کر کہ گذشتہ بارہ سال کی عمر سے میری تہجد کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی، اپنے مبارک ہاتھوں سے مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔
مشہور ہے کہ جس وقت اس کے محل میں شہزادہ عبداللہ مرزا تولد ہوا تو نجومیوں نے بہ اتفاق بیان کیا کہ اس شہزادہ کا دیکھنا بادشاہ کے لیے نحوست کا باعث ہے جب تک کہ وہ بارہ سال کی عمر کو نہ پہنچ جائے، ورنہ جان جانے کا اندیشہ ہے۔ اس مشورے کے بموجب ۱۲ سال تک شہزادہ کی علیحدہ پرورش ہوتی رہی۔ جب ۱۲ سال کی طویل مدت گذر گئی تو شہزادے اور سلطان دونوں کو دیدار کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ دیدارِ فرزند کی مسرت میں ایک جشن ترتیب دیا گیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ انہی ایام میں بادشاہ عارضۂ تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۳۴ سال کی عمر میں اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ مدت سلطنت ۲۱ سال ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ تا ۱۰۴۱ھ م ۱۶۳۱ء۔

(۶) سلطان عبداللہ قطب شاہ:

اس بادشاہ کے تخت نشین ہونے پر شاہان مغلیہ کی رقیبانہ نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ اس نے سلطنت کو وسیع کرنے کی خاطر صرف تلنگانہ میں جنگ کی اور اندرون ملک کے انتظام کو ہی ضروری سمجھا۔ اس بادشاہ کے عہد میں دہلی کے تخت پر شاہ جہاں حکمرانی کر رہا تھا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان عبداللہ ایک روز بہ سواری فیل پندرھویں ذی الحجہ کو قلعہ کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاقاً ہاتھی بہ سبب مستی جنگل کی جانب چلا اور جو لوگ ہمراہ تھے وہ درہم برہم ہو گئے۔ یہ حال سن کر سلطان کی والدہ حیات بیگم نے منت مانی کہ میرا فرزند صحیح و سالم مجھ سے آ ملے تو میں سونے کی زنجیر فیل تیار کر کے اپنے فرزند کی کمر میں باندھ کر (امام حسینؓ کی منت پوری کرنے کی غرض سے) لنگر نکالوں گی اور لنگر فقرا کو تقسیم کر دوں گی۔ اتفاقاً ہاتھی گرفتار ہو گیا اور بادشاہ صحیح و سالم محل میں داخل ہوا۔ فی الفور بیگم مذکور نے زنجیر طلائی تیار کرا کر جلوس شاہانہ سے لنگر محلّہ حسینی علم کو روانہ کیا، چنانچہ وہی رسم بعد میں مستقلاً جاری ہو گئی۔

اسی بادشاہ کے عہد میں میر جملہ کے فتور سے ابتداءً شاہ جہاں نے عالمگیر کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا تھا اور اس امر پر صلح ہوئی کہ ایک کروڑ روپے نقد نذرانہ دے اور اپنی لڑکی سلطان محمد خلف عالمگیر کے عقد میں دیوے۔

اس بادشاہ کو کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ تین لڑکیاں تھیں۔ چھوٹی صاحبزادی سے ابوالحسن کا عقد ہوا، جو بعد میں سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مدت سلطنت ۴۲ سال ۱۰۴۱ھ م ۱۶۳۱ء تا ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء

(۷) سلطان ابوالحسن تاناشاہ:

ابوالحسن عبداللہ قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی حکم صادر کیا

کہ خزانہ عامرہ کے چار حصے کیے جائیں۔ ایک حصہ خیرات کیا جائے، دوسرا حصہ سپاہ میں پیشگی تنخواہ میں تقسیم کیا جائے۔ تیسرا حصہ ضرورت کے لیے خزانہ میں جمع رہے، چوتھا حصہ شاہی اخراجات کے لیے رہے۔ تخت نشینی سے قبل ابوالحسن دکن کے ایک درویش حضرت شاہ راجوؒ کا معتقد تھا اور زیادہ وقت ان ہی کی صحبت میں گذارا تھا، جس کے باعث طبیعت میں قلندری رچ بس گئی تھی۔ تخت نشینی کے بعد یہ نازک دماغ بادشاہ کی حیثیت سے مشہور ہوا اور عوام الناس اسے تاناشاہ کہنے لگے۔

مورخین کا بیان ہے کہ اس نے بچپن میں ۱۴ سال تحصیل علم اور شاہ راجو کی خدمت میں، ۱۴ سال بادشاہی میں اور ۱۴ ہی سال قید میں گذارے۔

عالمگیر کے حملہ کا اس نے سات ماہ تک مقابلہ کیا، بالآخر عبداللہ خاں نامی ایک فوجی افسر نے بغاوت کر کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ تاناشاہ شہزادہ، معظم فرزندِ اورنگ زیب عالمگیر کی پیشوائی کے لیے شاہی پالکی میں سوار ہو کر قلعہ کے دروازہ تک گیا اور شہزادہ کو زمرد کی تسبیح نذر دی۔ تاناشاہ کے چہرے پر کسی قسم کے تردد کے آثار نہ تھے۔ قطب شاہی سلطنت کا ڈوبتا ہوا آفتاب یہی تھا۔ مدت سلطنت ۱۴ سال از ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۶ء

آصف جاہی خاندان کا تاریخی پس منظر

۱۔ خواجہ عابد قلیچ خان:

نظام الملک آصف جاہ اول کا سلسلہ نسب سترہ واسطوں سے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ہوتا ہوا بتیسویں پشت میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ نظام الملک کے جد امجد خواجہ عابد قاضی بخارا تھے، جو ۱۶۵۵ء میں بغرض حج و زیارت سمرقند سے ہندوستان آئے تھے، تاکہ بندرگاہ سورت سے جہاز کے ذریعہ جدہ روانہ ہوں۔ ان کے علم و فضل کی شہرت شاہ جہاں کو جب ملی تو اس نے شرف باریابی بخشا اور خلعت فاخرہ کے ساتھ ملازمت کی پیش کش کی جس کو انہوں نے فریضۂ حج کی ادائی کے بعد قبول کرنے کا یقین دلایا اور جدہ

روانہ ہوگئے۔ دو سال بعد جب خواجہ عابد ہندوستان واپس ہوئے تو یہاں کا سیاسی نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سورت سے وہ آگرہ نہ جاسکے، بلکہ بیجاپور کی طرف روانہ ہوگئے، جہاں شہزادہ اورنگ زیب نے محاصرہ کر رکھا تھا۔

خواجہ عابد نے شہزادہ اورنگ زیب کے لشکر میں داخل ہوکر باریابی کا شرف پایا، چوں کہ خواجہ عابد تورانی تھے، اس لیے ان کے حسب ونسب اور علم وفضل کے پیش نظر تورانیوں نے ان کے اثر کو قبول کیا۔ اس طرح اورنگ زیب کو ان کی آمد سے بڑی تقویت پہنچی۔ یہ اس خاندان کی دکن سے وابستگی کی ابتدا تھی جو تین سو سال پر منتہی ہوئی۔

۱۶۵۸ء میں داراشکوہ اور اورنگ زیب میں سموگڈھ کے مقام پر فیصلہ کن لڑائی ہوئی تو اورنگ زیب نے بھائیوں کا استیصال کرنے کے بعد شاہ جہاں کو نظر بند کرکے اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا اور خواجہ عابد کو صدر کل کے عہدہ پر مامور کیا۔ ۶ سال بعد انہیں اجمیر اور پھر ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا۔ ۱۶۷۶ء میں اورنگ زیب نے انہیں مدینہ منورہ جانے والے حاجیوں کے قافلہ کا میر حج بنا کر بھیجا۔ حج سے فراغت پاکر خواجہ عابد سورت کی بندرگاہ پر پہنچے ہی تھے کہ اورنگ زیب نے انہیں نہ صرف تحائف بھیجے، بلکہ قلیچ خان (بہ معنی شمشیر خان) کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۶۸۲ء میں وہ دوبارہ صدر کل کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۶۸۶ء میں ظفرآباد (بیدر) کے صوبہ دار بنادیے گئے۔

۱۶۸۷ء میں قلعہ گولکنڈہ کے محاصرے کے دوران چھوٹی توپ کا ایک گولہ ان کے شانہ پر آکر لگا، جس کے نتیجے میں ان کا ہاتھ شانہ سے بالکل جدا ہوگیا۔ گولہ سے زخمی ہونے اور ہاتھ بالکل اڑ جانے کے باوجود کسی اضطراب و بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہایت استقلال ومتانت کے ساتھ گھوڑے پر ہی سوار اپنے خیمے واپس آگئے۔

جمدۃ الملک اسد خان وزیراعظم مزاج پرسی کو آئے تو اس وقت جراح ان کے زخموں سے ریزہ ہائے استخواں اور زنبوسے گولہ کی کرچیں نکال رہے تھے۔ شیر دل قلیچ خان جراحوں سے باتیں کررہے تھے اور بائیں ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے۔ تین دن زخمی حالت میں رہنے کے بعد ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۷ء کو راہی دار البقا ہوئے۔ قلعہ گولکنڈہ کے قریب موضع

عطاپور میں تدفین عمل میں آئی۔

قلیچ خان جہاں ایک جری شہسوار اور مرد میدان تھے، وہاں وہ قلم کے بھی دھنی تھے۔ علم وفضل کے علاوہ متقی و پرہیزگار بھی تھے۔ اب بھی ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ یہ انہی کا فیض تھا کہ جس سرزمین میں وہ پیوند خاک ہوئے وہاں ان کا خاندان ۱۹۴۸ء تک حکومت کرتا رہا۔

۲۔ غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ عرف شہاب الدین:

شہنشاہ کے کہنے سے قلیچ خان نے اپنے بڑے بیٹے شہاب الدین کو ۱۶۶۹ء میں سمرقند سے ہندوستان طلب کیا تھا۔ اورنگ زیب نے انہیں منصب سہ صدی ذات سے سرفراز کیا اور ۲۰ سالہ نوجوان کا عقد شاہ جہاں کے وزیر سید سعداللہ خان کی صاحبزادی سے کردیا، جن کے بطن سے ۱۱/اگست ۱۶۷۱ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بادشاہ نے اس کا نام میر قمرالدین رکھا، جو بعد میں چل کر نظام الملک آصف جاہ اول کے نام سے مشہور ہوا۔ میر کا اضافہ شہنشاہ کی طرف سے کیا گیا تھا، جوان کی ماں کے سیدانی ہونے کی وجہ سے تھا۔ نومولود کا تاریخی نام ''نیک بخت'' ۱۰۸۶ھ م ۱۶۷۱ء ہے۔

مغفرت مآب نظام الملک میر قمرالدین خان

بانیٔ مملکت آصفیہ آصف جاہ اوّل:

غازی الدین خان فیروز جنگ کی شادی اورنگ زیب عالمگیر کی ایماء پر شاہ جہاں کے وزیر اعظم علامی سعد اللہ خان کی دختر سعید النساء بیگم سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے ۱۱/اگست ۱۶۷۱ء کو جو اولاد نرینہ پیدا ہوئی، اس کا نام اورنگ زیب عالمگیر نے میر قمرالدین رکھا۔ ہجری تاریخ پیدائش ''نیک بخت'' سے (۱۰۸۲) نکلتی ہے۔ ۶ سال کی عمر میں بادشاہ نے منصب چار صدی ذات عطا کیا۔ ہوش سنبھالتے ہی شاہی محلات میں داخل کرلیے گئے۔ بیس سال کی عمر میں ۱۶۹۰ء میں بادشاہ نے چین قلیچ خان (بہ معنی چھوٹی شمشیر) کا خطاب اور چار ہزار منصب سے سرفراز کیا۔

۱۶۹۷ء میں مرہٹوں کے خلاف مہمات میں بھیجے گئے ۱۷۰۰ء میں بیجاپور کی فوجداری پر فائز ہوئے۔ دو سال بعد بیجاپور و کرناٹک کے صوبہ دار بنائے گئے۔ ۱۷۰۴ء میں فوجدار کرناٹک مقرر ہوئے۔ ۱۷۰۵ء میں واکنکھیڑے کے محاصرے کے دوران محصورین نے قلعہ کی فصیلوں پر سے خوب گولہ باری کی، توپ کا ایک گولہ ایسا آیا کہ قلیچ خان کے گھوڑے کا ایک پاؤں اڑ گیا اور وہ زمین پر گر گئے۔ اس خبر کو سن کر بادشاہ نے ایک عربی گھوڑا معہ طلائی ساز و سامان آپ کے لیے بھیجا۔ قلعہ فتح ہونے کے صلہ میں اورنگ زیب نے مینا کاری شمشیر فیل خاص عطا کیا۔ نیز زمرد کی انگوٹھی پر ''چین قلیچ خان بہادر'' کندہ کروا کے عنایت کی۔ ۱۷۰۶ء میں منصب پنج ہزاری ذات کے ساتھ بیجاپور کی صوبہ داری پر دوبارہ فائز ہوئے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا احمد نگر میں انتقال ہوا اور جنازہ وصیت کے مطابق خلد آباد لایا گیا تو چین قلیچ خان نے بیجاپور سے خلد آباد پہنچ کر بادشاہ کو سپرد خاک کیا اور اپنے ہاتھوں سے مٹی دی۔

دہلی میں شاہ عالم بہادر شاہ کی تخت نشینی:

اورنگ زیب کے انتقال پر اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، لیکن چین قلیچ خان اپنے والد کی طرح غیر جانبدار رہے۔ آگرہ کے قریب اعظم اور معظم میں جو لڑائی ہوئی اس میں اعظم مارا گیا۔ معظم نے تخت نشین ہوکر شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بہادر شاہ نے چین قلیچ خان کو ''نان دوران بہادر خان'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر مقرر کیا۔ چوں کہ بہادر شاہ زمانہ شہزادگی سے ہی اس خاندان سے بغض و عناد رکھتا تھا اور اس کے دربار کا رنگ ڈھنگ دربار عالمگیری سے یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس لیے چین قلیچ خان شاہانہ نوازشوں سے خوش نہ رہ سکے، وہ بادل ناخواستہ اس عہدہ کو نبھاتے رہے، بالآخر بروز شنبہ حاضر ہوکر بادشاہ کی خدمت میں استعفیٰ پیش کر دیا اور ''ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را'' دہلی مین خانہ نشینی اختیار کر لی۔ شاہ عالم بہادر شاہ ۱۷۱۲ء کو وفات پا گئے۔

فرخ سیر کی تخت نشینی:

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی، تب بھی چین قلی خان

غیر جانبدار رہے۔ ۱۱؍جنوری ۱۷۱۳ء کو جہاں دادا اور بہادر شاہ کے پوتے فرخ سیر مین جنگ ہوئی، فرخ سیر کو فتح ہوئی۔ ۱۷؍جنوری ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر شہر دہلی میں داخل ہوا۔ چین قلی خان کو نظام الملک فتح جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا کی۔ فرخ سیر کے محل پر افغانوں نے حملہ کر دیا۔ فرخ سیر کو قید کر کے سید عبداللہ خان کے سامنے پیش کیا، سید عبداللہ خان نے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھرا کر انہیں اندھا کر دیا اور پھر بعد میں قتل کروا دیا۔

رفیع الدرجات کی تخت نشینی:

سیدون نے ۲۰ سالہ رفیع الدرجات کو تخت نشین کر دیا۔ اس وقت وہ دق کے مرض میں مبتلا تھا۔ مرض کی شدت کی وجہ سے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا گیا، اس طرح رفیع الدرجات کی بادشاہت ۴ جون ۱۷۱۹ء کو ختم ہوگئی۔ اس کے بعد رفیع الدولہ ۳ ماہ کی بادشاہت کے بعد فوت ہو گیا۔

محمد شاہ کی تخت نشینی:

محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد نظام الملک کو آصف جاہ کا خطاب بادشاہ کی طرف سے عطا ہوا۔ شکر کھیڑ کی جنگ میں جو نظام الملک کی کمان میں لڑی گئی فتح نصیب ہوئی، اس طرح سے فتح کے بعد نظام الملک اورنگ آباد روانہ ہوگئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ادھر دہلی میں مغلیہ سلطنت کمزور پڑنے لگی تو محمد شاہ رنگیلے نے نظام الملک آصف جاہ کو اورنگ آباد سے دہلی طلب کیا۔

ادھر نظام الملک دہلی پہنچے، اس وقت نادر شاہ نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ ۱۷۳۹ء کو پانی پت کے مقام پر نادر شاہ سے مقابلہ ہوا، محمد شاہ کی فوج کو شکست ہوئی، فوجی سرداروں کے مشورہ سے محمد شاہ اور تانا شاہ میں صلح ہوگئی۔ اسی دوران کسی نے افواہ اڑادی کہ نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر دہلی والوں نے نادر شاہ کے آدمیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

مغفرت مآب نظام الملک میر قمر الدین خان بانی مملکت آصفیہ آصف جاہ اول:

آپ کی پیدائش ۱۶۷۱ء میں ہوئی۔ ۷؍سال کی عمر میں بادشاہ نے نصب چار صدی

ذات عطا کی ۔ ۲۰ رسال کی عمر میں بادشاہ نے چین قلیچ خان کا خطاب دیا ۔ ۱۶۹۷ء میں مرہٹوں کے خلاف مہمات میں بھیجے گئے ۔ ۱۷۰۰ء میں بیجاپور کی فوجداری پر فائز ہوئے ۔ پھر بیجاپور کرناٹک کے صوبہ دار بنائے گئے ۔ مختصراً اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی ۔ لیکن چین قلیچ خان اپنے والد کی طرح غیر جانب دار رہے ۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کی ملازمت سے اپنے کو الگ کرلیا ۔ تب ۱۷۱۲ء کو فرخ سیر نے اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا، اور چین قلیچ خان کو نظام الملوک فتح جنگ کے خطاب سے نوازا، دکن کی صوبیداری عطا کی ۔ فرخ سیر کے بعد نظام الملوک نے گوشہ نشینی اور خاموشی اختیار کی اس کے بعد مغلیہ شہزادوں میں اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہوئی ۔ چنانچہ نظام الملک کو اس وقت کے بادشاہ نے وزارت کی ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت دی ۔ اس وقت محمد شاہ رنگیلا کی بادشاہت تھی ۔ ان کے دور میں بادشاہ کا دربار لالچی رشوت خور اور بدقماش لوگوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا ۔ بادشاہ کی عیش پسندی انتہاء کو پہنچ چکی تھی ۔ عیش طربی کے باعث بادشاہ رنگیلا کہلانے لگا ۔ وفادار نظام الملوک نے وزارت سنبھالنے کے بعد نظم ونسق کو سدھارنے کی کوشش کی ، مگر بادشاہ کے مصاحبوں نے نظام الملوک کی مخالفت شروع کی اور نظام الملک ان حالات میں دربار کا رنگ بدلا ہوا پا کر ناسازی طبیعت اور تبدیلی آب و ہوا کے لئے دلی سے سیر و شکار کے لئے بادشاہ سے رخصت لے کر شکار پر روانہ ہوگئے ۔

نظام الملک کا بادشاہ پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا ۔ شکار کھیلتے کھیلتے نظام الملک اورنگ آباد کی طرف چل پڑے ۔ اس وقت مبارز خان کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا گیا ۔ اس وقت بادشاہ کو معلوم ہوا کہ نظام الملک دکن پر حملہ کر کے خود مختار ہونا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ اس وقت کے بادشاہ محمد شاہ رنگیلے نے مبارز خان کو حکم دیا کہ نظام الملک پر فوج لے کر حملہ کریں ۔ چنانچہ ۱۷۲۴ء کو شکر کھیڑ کے مقام پر مبارز خان نے ایک لشکر جرار لے کر حملہ کردیا اور اس فیصلہ کن جنگ کو دکن کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے ، کیونکہ عملی اعتبار سے یہ نظام الملک کے خاندان کی خود مختاری کی پہلی نشانی تھی ۔ اس لحاظ سے سلطنت آصفیہ کی تاریخ تاسیس ۱۷۲۴ء قرار پاتی ہے ۔ نظام الملک کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے شکر کھیر کی فتح کے بعد اورنگ آباد سے حیدرآباد جا کر گوشہ محل کے

باغ میں قیام کیا ۔ نظام الملک کی اس فتح پر محمد شاہ بادشاہ خوش نہ تھا ۔ مصلحتاً اس نے نظام الملک کو خوش کرنے کے لئے ان کو منصب دس ہزاری کرتے ہوئے آصف جاہ کا خطاب عطا کیا اور اجازت دی کہ جب تک وہ چاہیں دکن میں رہیں ادھر محمد شاہ رنگیلے پر نادر شاہ درانی نے حملہ کر کے دلی پر قبضہ کرلیا ۔

مغل بادشاہ نے نظام الملک کو دکن سے طلب کیا کہ وہ نادر شاہ سے صلح کی بات چیت کرے ۔ اس دوران نادر شاہ کے چند سپاہیوں کو قتل کردیا گیا ۔ اور یہ افواہ چند منچلوں نے اُڑادی کہ نادر شاہ مارا گیا ۔ یہ خبر نادر شاہ کو ملنے پر اُس نے اپنے سپاہیوں کو قتل عام کا حکم دیا اور اپنے سپاہیوں کو دہلی کو لوٹ مار کرنے کی اجازت دے دی ۔ اس کے نتیجہ میں بازاروں کو آگ لگا دی گئی ۔ گلی کوچوں میں خون کے دریا بہنے لگے، ان وحشت ناک حالات میں محمد شاہ رنگیلے کے حکم سے نظام الملک آصف جاہ نادر شاہ کی خدمت میں روانہ ہوئے ۔ برہنہ سر گلے میں شمشیر نیم حمائیل کئے اور نادر شاہ کے سامنے جا کر خاموش کھڑے رہے ۔ نادر شاہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو ۔ انہوں نے بادشاہ کو مخاطب کر کے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا ۔

سلسلے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق راو باز کشی

یہ اس وقت کی بات تھی کہ ایک شعر نے نادر شاہ کے دل پر جادو کا اثر کیا اور اس نے ’’ بہ ریش سفید شاہ بخشیدم ‘‘ کہہ کر تلوار کو نیام کرلیا اور قتل عام رک گیا اور بعد مصالحت ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ نے دہلی کی دولت نقد و جواہر تخت طاؤس و کوہ نور ہیرا اونٹوں پر لاد کر رخت سفر باندھا ۔ جاتے ہوئے عالی ظرف نظام الملک کو سلطنت دہلی کی پیش کش کی تو تب آصف جاہ نے اس کو یہ جواب دیا کہ :

’’ ما مردم نوکر پیشہ ایم مارا از سلطنت چہ کار داغِ نمک حرامی بہ فرقِ اطاعت روانمی داریم ‘‘

محمد شاہ رنگیلے نے اپنی بزم نشاط پھر آراستہ کرلی ۔ نظام الملک آصف جاہ سے یہ نہ دیکھا گیا اور وہ دکن روانہ ہوگئے ۔ جہاں دکن کی صوبیداری اپنے بیٹے ناصر جنگ کے حوالے کر کے آئے تھے ۔ بعض بدطینت امراء کے بہکانے سے دکن پر اپنی صوبیداری کا اعلان کردیا ۔ آصف جاہ نے بادشاہ سے اجازت لے کر ۱۷۴۱ء میں دکن کا رخ کیا اور ناصر جنگ پر اقتدار کے

نشے کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ باپ کی نصیحتوں اور باتوں کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور اپنے باپ کے خلاف دولت آباد کے قریب دونوں باپ بیٹوں میں جنگ ہوئی ۔ گستاخ بیٹے کو شکست ہوئی ۔ جب باپ کے سامنے گستاخ نافرمان بیٹے کو پیش کیا گیا تو اس کا چہرہ مورخ لکھتا ہے کہ ندامت اور پشیمانی سے آب آب تھا ۔ آصف جاہ نے ضبط سے کام لیا اور بیٹے کا قصور معاف کیا ۔ کچھ دن اورنگ آباد میں قیام کرنے کے بعد آصف جاہ نے حیدرآباد کا رخ کیا اور کئی معرکے ایسٹ انڈیا کمپنی اور مرہٹوں کے بالمقابل سر کئے اور بعد میں انگریزوں سے مصالحت کرلی۔

اس وقت محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔ خود آصف جاہ کا مزاج ناساز ہوگیا اور ۱۷۴۸ء آصف جاہ کا ۷۹رسال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اس طرح سے آصف جاہ نے (۸۷) لڑائیاں لڑیں۔ ان کے آخری وقت میں ان کی عمل داری بہت پھیل چکی تھی ۔ سلطنت طول میں آٹھ سو میل اور ارض میں چار سو میل تھا ۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لڑکے ناصر جنگ جن کا پورا نام میر احمد خان تھا ۔ ناصر جنگ کے نام سے دکن کے صوبیدار مقرر ہوئے اور فرانسیسیوں کے حملے سے ناصر جنگ شہید ہوگئے ۔ اس کے بعد مظفر جنگ جو آصف اول ناصر جنگ کے بھانجے تھے، وہ دکن کی صوبیداری پر فائز ہوئے ۔ ان کے بعد صلابت جنگ نے انگریزوں سے معاہدہ کرکے صلح کرلی ۔ اس طرح نظام شاہی آصف جاہی کا سلسلہ شروع ہوا۔

تیسرے بادشاہ میر اکبر علی خان سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کہلائے ۔ اور ان کے بعد آصف جاہ سلطنت کے چوتھے فرمان روا میر فرخندہ علی خان ناصر الدولہ ان کے بعد میر تہنیت علی خان افضل الدولہ آصف جاہ خامس قرار پائے ۔ ان کے بعد میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس مقرر ہوئے ۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ میر محبوب علی خان کے زمانہ میں ۲۶ رستمبر ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد میں موسیٰ ندی کی طغیانی آئی تھی ۔ اس زمانہ میں ۱۹۰۹ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے میر محبوب علی خان کو ایک رسالہ تبلیغی ''صحیفہ آصفیہ'' روانہ کیا تھا ۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خان بہادر آصف سادس کا دورِ سلطنت ۱۹۴۸ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد ۱۷رستمبر ۱۹۴۸ء میں انڈین یونین کے ہاتھوں سقوط پذیر ہوا۔ چنانچہ آپ کا دور ۱۹۱۱ء میں شروع اور ۱۹۴۸ء میں ختم ہوا۔ اس طرح حیدرآباد دکن پر مسلمان بادشاہوں کا قطب شاہی اور آصف جاہی

دور زائد چار سو (۴۰۰) سال قائم رہا۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ میر عثمان علی خان بہادر سب سے لمبے عرصہ تک آصف جاہی حکمران رہے ، انہی کے دور میں جماعت احمدیہ کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ان کو ایک تبلیغی رسالہ تحفۃ الملوک کے نام سے ایک چار رکنی وفد کے ذریعہ حضور نظام میر عثمان علی خان بہادر کی خدمت میں روانہ کیا ۔ اس کے جواب میں حضور نظام نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر کئے بغیر اس رسالے کو حاصل کرلیا ۔ چنانچہ آصف جاہی تاریخ کا یہ دوسو سالہ دور ۱۷را کتوبر ۱۹۴۸ء کو ختم ہوگیا۔ رہے نام اللہ کا۔

نوٹ :- قارئین سے التماس ہے کہ اس کتاب میں املاء کی کوئی غلطی یا کوئی سقم رہ گیا ہو تو مؤلف معافی کا خواستگار ہے۔ مؤلف کی غلطیوں کی نشاندہی کی جائے تو انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اسکی تصحیح کا خیال رکھا جائیگا۔ جزاکم اللہ
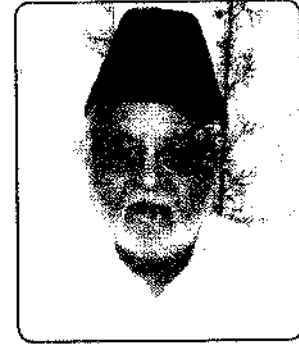
تعارف

خاکسار کے والد سید غلام دستگیر صاحب مرحوم 1920ء یا1926ء میں مشرف بہ احمدیت ہوئے۔موصوف سیٹھ عبداللہ الہ دین صاحب کے زیر تبلیغ تھے بلکہ انہیں کی تبلیغ کا ثمرہ تھے۔ان کی وفات 1946ء میں ہوئی۔انا للہ و انا الیہ رجعون اس وقت خاکسار کی عمر 15 برس کی ہوگی۔والد صاحب کی وفات کے بعد خاکسار تجارتی امور میں الہ دین فیملی سے وابستہ رہا۔انہیں کی نگرانی اور تربیت کیوجہ سے خاکسار نے اپنے بھائی ڈاکٹر سید جعفر علی کو میڈیکل کی تعلیم دلوائی۔اور تینوں بہنوں کی اچھے احمدی گھرانوں میں شادیاں کروائیں۔الحمدللہ علیٰ ذالک

خاکسار کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے 1988ء میں نائب امیر جماعت مقرر فرمایا۔اور سیٹھ محمد معین الدین صاحب مرحوم کے 1991ء میں انتقال کے بعد از راہ شفقت قائمقام امیر جماعت مقرر فرمایا۔اس سے قبل 1989ء میں صوبہ آندھرا اور کرناٹک کا نگران اعلیٰ مقرر فرمایا جس پر میں 1992ء تک اس عہدہ جلیلہ خدمت سرانجام دیتا رہا اب الحمدللہ خاکسار جماعت احمدیہ حیدرآباد کے قاضی اوّل کے طور پر خدمت سلسلہ کی سعادت پا رہا ہے۔بہرحال 40 سال کے لمبے عرصہ تک خاکسار جماعت کے کسی نہ کسی عہدہ پر خدمت کی توفیق پاتا رہا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور خلفاء احمدیت کی شفقتوں کا نتیجہ ہے۔الحمدللہ علیٰ ذلک۔میں آخر میں میری والدہ صاحب بیگم صاحبہ کو خراج تحسین ادا کرتا ہوں کہ ان کی محنت اور توجہ کیوجہ سے یہ خاندان آج اس مقام پر محض اور محض اللہ کے فضل سے پہنچا ہے۔

مؤلف تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن
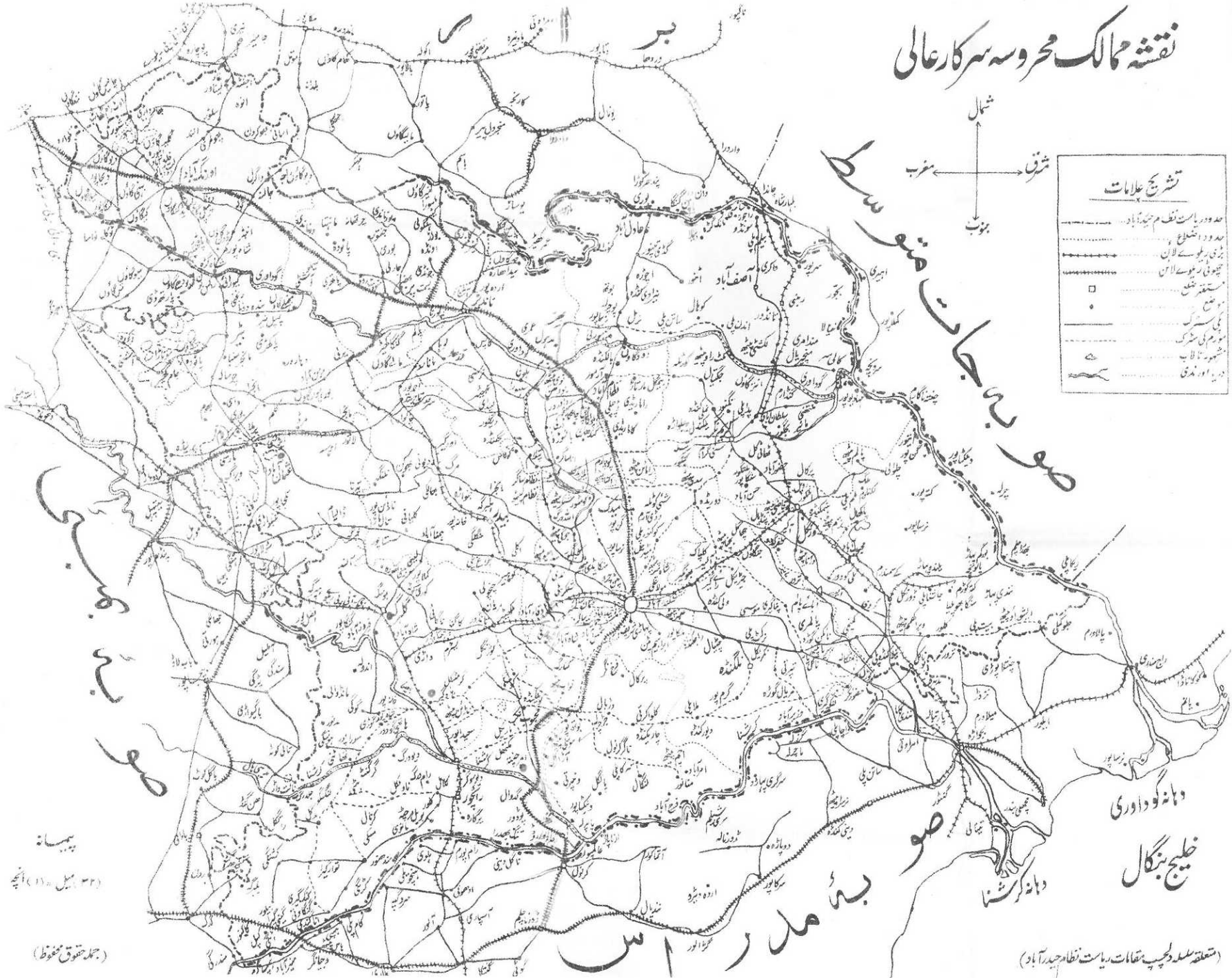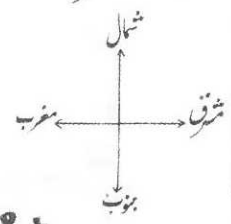
نقشہ ممالک محروسہ سرکار عالی
برار
صوبہ جات متوسط
صوبہ بمبئی
صوبہ مدراس
شمال
جنوب
شرق
مغرب
تشریح علامات
حدود ریاست نظام حیدرآباد
حدود اضلاع
بڑی ریلوے لائن
چھوٹی ریلوے لائن
مستقر ضلع
موضع
پکی سڑک
موسم کی سڑک
مشہور تالاب
دریا اور ندی
دہانہ گوداوری
خلیج بنگال
دہانہ کرشنا
پیمانہ
(۳۲ میل = ۱ انچ)
(جملہ حقوق محفوظ)
(متعلقہ سلسلہ دلچسپ مقامات ریاست نظام حیدرآباد)